اکبر بادشاہ کے 9 رتن

امیر علی خان

شہنشاہ ہند اکبر اعظم کے نورتنوں کا مفصل احوال......جن کے ذکر کے بغیر ہندوستان کی تاریخ ادھوری ہے

اکبر بادشاہ

کے

نو(9) رتن

مؤلف : امیر علی خاں

علم و عرفان پبلشرز

40-الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

042-37352332 & 37232336

نام کتاب .... اکبر بادشاہ کے ۹ رتن
مؤلف .... امیر علی خاں
ناشر .... گل فراز احمد
علم و عرفان پبلشرز، اُردو بازار لاہور
کمپوزنگ .... رفاقت علی / فراز کمپوزنگ سنٹر، لاہور
سن اشاعت .... ستمبر 2006ء
مطبع .... زاہد نوید پرنٹرز، لاہور
قیمت .... -/300 روپے

سیونتھ سکائی پبلیکیشنز

غزنی سٹریٹ، الحمد مارکیٹ
40- اُردو بازار لاہور

علم و عرفان پبلشرز

40- الحمد مارکیٹ، اُردو بازار لاہور
فون: 7232336- 042-7352332

عرض مؤلف

اللہ تعالیٰ خالق کل کائنات ہے۔ اور اس نے ساری کائنات کو اپنی حکمت اور دانائی کے اصولوں کے تحت تخلیق کر رکھا ہے۔ یہ واضح رہے کہ کائنات کی تخلیق میں نہ کسی پیغمبر، ولی، قطب یا کسی دوسری شخصیت کا کوئی دخل یا حصہ ہے بلکہ وہ خود تمام انبیائے کرام علیہم السلام، اولیائے رحمتہ اللہ علیہ کو بمعہ دیگر مخلوق کے پیدا کرنے میں خود مختار اور قادر مطلق ہے۔

اور یہ اللہ تعالیٰ کی کرشمہ سازی ہے کہ اس نے ہر دور میں اپنے بندوں کو بھی ان کے اوصاف کی وجہ سے ایک دوسرے پر فضیلت عطا کی ہے اور ان درجات میں اس باری تعالیٰ نے کسی سے مشورہ نہیں لیا۔ یعنی کہ ذہانت کے اعتبار سے اس نے مسلمانوں کی تخصیص نہیں کی۔ علم صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص نہیں کیا وغیرہ۔ چونکہ وہ ساری مخلوق کا خالق ہے اور اپنی ساری مخلوق کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس کے مقدر کے مطابق ہر مخلوق کو روزی اور دیگر سہولیات عطا فرماتا ہے۔ یہ تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور کبریائی کی عظیم شہادتیں ہیں۔

زیر طبع کتاب اکبر بادشاہ کے نو رتنوں کے مختصر حالات زندگی کی عکاسی کرے گی۔ اکبر بادشاہ جیسے کہ تمام خواندہ حضرات کو معلوم ہے کہ وہ خود تو مسلمان تھا مگر اس نے دین الٰہی بھی جاری کر رکھا تھا۔ اور چونکہ وہ ہندوستان کا حاکم تھا تو اس نے اپنے دربار میں ہندو اور مسلمان وزراء شامل کر رکھے تھے۔ ہر ایک دوسرے سے ذہانت، عقل اور تجربے کے لحاظ سے مختلف تھے۔

اکبر اعظم بڑا سمجھدار، ذہین اور جہاں دیدہ حکمران تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کو احسن طریقے سے چلانے کے لیے مختلف امور کے لیے مشیر مقرر کر رکھے تھے۔ جس میں (۹) نو مشیر کے اسمائے گرامی بڑے اہم نظر آتے ہیں۔ جن کے نام ہیں:

i- بیربل (ہندو) ii- شیخ مبارک (مسلمان) iii- شیخ فیضی (مسلمان)
iv- ابوالفضل (مسلمان) v- ملا عبدالقادر بدایونی (مسلمان) vi- راجہ ٹوڈرمل (ہندو)
vii- عبدالرحیم خان خاناں (مسلمان) viii- مہاراجہ مان سنگھ (سکھ) ix- تان سین (مسلمان)

مگر ان تمام نو رتنوں میں بیربل بہت ہی مشہور اور دانا مشیر تھا۔ جس کے اکبر بادشاہ کے ساتھ دوستانہ تعلقات بھی تھے۔ وہ سنسکرت کا عالم تھا اور ہندو برہمن تھا۔ اس کی دانائی کی شہرت پوری دنیا میں پھیل چکی تھی۔ مگر اس کے علاوہ دیگر مشیر بھی اپنے مقام پر اہمیت کے حامل تھے۔

یہ کتاب بڑے آسان پیرائے میں لکھی گئی ہے اور علم و عرفان پبلشرز کے پروپرائیٹر گلفراز احمد صاحب نے اسے بہت ہی محنت اور لگن سے تیار کروایا ہے۔ اس کی ہر دلعزیزی کی لازمی طور پر توقع کی جاسکتی ہے مگر یہ قارئین پر ہی منحصر ہے کہ وہ کہاں تک حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ شکریہ

امیر علی خاں

باب ۱

راجہ بیربر (بیربل)

(Raja veer var)

۱۔ وہ ہندو برہمن تھا۔

۲۔ بیربر شاعر بھی تھا۔

۳۔ اکبر اعظم بادشاہ کا دست راست درباری تھا۔

۴۔ اکبر اعظم بادشاہ بیربر کی مزاح لطف بیانی سے طبیعت کو محظوظ کرتا تھا اور

۵۔ بیربر اکبر اعظم کے درباریوں میں سے بڑی اہمیت کا حامل درباری تھا۔

۶۔ اکبر اعظم کے ساتھ اس کے درباری مراسم کے علاوہ دوستانہ تعلقات بھی تھے۔

۷۔ بیربر جنگی مہمات کے دوران مارا گیا تھا۔

۸۔ راجہ بیربر صاحب السیف وقلم تھا۔

۹۔ اکبری دین الٰہی شاہی کا خلیفہ تھا۔

۱۰۔ بیربل اکبر اعظم کے ساتھ

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی کے مصداق تھا۔

بیربر پر طائرانہ نگاہ

۱۔	پیدائش	کالپی (ہندوستان میں)
۲۔	نام	مہیش داس
۳۔	خطاب	کبا رائے۔ بیربر (بیربل)۔ ملک الشعراء
۴۔	تخلص	برہم
۵۔	مذہب	ہندو برہمن
۶۔	سالِ ملازمت/ دربار	۱۵۶۳ء
۷۔	دوانیہ درکاری کام	۳۶ سال
۸۔	تاریخ وفات	۱۹ فروری ۱۵۸۶ء
۹۔	علم پہ ماہر زبان	سنسکرت
۱۰۔	وطن	کالپی (ہندوستان)
۱۱۔	بیربر کا اعزاز منصب	۲۰۰ گھوڑوں کی حفاظت
۱۲۔	مقبرہ و مرگھی	کسی جگہ پر نہیں ہے
۱۳۔	بادشاہ کی سوگ	دو دن تک کھانا نہ کھایا اور نہ دربار میں ہی آیا

حالات زندگی بیربل مہیش داس

(Mahash Das)

بیربل کا اصل نام مہیش داس تھا جو کہ برہمن تھا اور وہ اکبر اعظم کے پاس ۱۵۶۲ء میں آیا۔ وہ سنسکرت کا بڑا عالم اور اکبر بادشاہ کا مشیر ہونے کے ساتھ اس کا بہترین دوست اور ہمنوا بھی تھا۔ اکبر بادشاہ بیربل سے اس کی عقلمندی، چالاکی، وفاداری اور مزاح سے بہت ہی خوش تھا۔ اکبر بادشاہ نے اس کو ویروار کا (Veer var) کا خطاب دے رکھا تھا جو کہ اردو زبان میں بیربل کے نام سے مشہور ہوا۔ بیربل نے اکبر اعظم شہنشاہ ہند کے ساتھ تقریباً ۳۶ سال کام کیا۔ بیربل کو شروع میں ۲۰۰ گھوڑوں کی حفاظت کا منصب دیا گیا تھا جو کہ اس کے لیے بڑا اعزاز اور فخر تھا۔ ان تمیں سالوں کے دوران بیربل نے اکبر بادشاہ ہند کے دل و جان پر اپنی لیاقت و صلاحیت سے قبضہ کر لیا تھا۔ بیربل سرکاری امور کے علاوہ سیر و تفریح کے مواقع پر بھی اکبر بادشاہ کے ہمرکاب ہوتا تھا۔ وہ شہنشاہ کے ساتھ چوگان جس کو آج کل کی زبان میں پولو بھی کہا جاتا ہے اکثر کھیلا کرتا تھا۔ اکبر اور بیربل دونوں آپس میں بڑی محبت کرتے تھے۔ مگر بیربل کی زندگی کا اختتام بڑا ہی بھیانک اور افسوس ناک نظر آیا۔ کیونکہ اکبر اعظم نے یوسف زئی قبیلے کی سرکوبی کے لیے اس کو زین خان کی امداد کے لیے روانہ کیا مگر وہاں اس کی رہنمائی صحیح نہ ہونے کی وجہ سے وہ تنگ راستوں میں گھر گیا۔

راجہ بیربر اکبری فوج کے ساتھ ہلاک ہو گیا اور یہ دردناک واقعہ ۱۷ فروری ۱۵۸۶ء کو پیش آیا تھا۔ اس کی زندگی کی کہانی کا دردناک حصہ یہ ہے کہ:

اس حادثے کی وجہ سے اس کے جسم کا کوئی حصہ بھی نہ مل سکا۔ اور ہندوستان کی رسم کے مطابق اس کی لاش کے ساتھ کوئی رسم ادا نہ کی جا سکی۔ مگر اکبر نے اس کے سوگ میں دو رات اور دو دن کھانے کو منہ تک نہیں لگایا۔ اور نہ اس دوران دربار میں ہی آیا تھا۔ یہ دونوں کی محبت و خلوص اور وفاداری کا واضح ثبوت تھا۔

بیربل نے اپنے پسماندگان میں دو بیٹے چھوڑے تھے جن کے نام یہ ہیں:

۱۔ لالا رائے　　　۲۔ ہارام رائے

بیربل اور اکبر بادشاہ کی زندگی کی بے شمار داستانیں مختلف کتب میں چھپ چکی ہیں جو کہ بڑی ہی سبق آموز، دلچسپ اور دانائی و حکمت کا مظہر ہیں۔ یہی ان دونوں کی وفاداری کی وجہ تھی۔ دونوں ہی بڑے جہاندیدہ اور انسان شناس شخصیت کے مالک تھے۔ اگرچہ اکبر بادشاہ بیربل کا بڑا احترام کرتا تھا مگر اس کے باوجود بیربل نے کبھی بھی اکبر بادشاہ کے احترام کو نظر انداز نہیں کیا۔ اس کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرتا رہا۔ اس کے مزاج کے مطابق اور حکومت کی حکمت عملی کے تحت ہر وقت اپنے آقا کی فرمانبرداری کو شعار بنایا۔

اللہ تعالیٰ نے بیربل کو عقل، ذہانت وفطانت سے نواز رکھا تھا اور اس ہندو کا اللہ تعالیٰ پر ایمان پختہ تھا وہ ہروقت انسان کے لیے ہر کام میں بھلائی کو تلاش کرتا تھا اور اس میں خیر سمجھتا تھا۔

بیربر کا اصل نام مہیش داس تھا اور قوم برہمن سے تعلق تھا۔ مگر اکثر کا یہ خیال ہے کہ وہ "بھاٹ" تھا اور اس کا تخلص بیربر تھا۔ اس کا وطن کالپی کا تھا۔ وہاں کا مقامی باشندہ تھا۔ اس سے قبل وہ رام چندر بھٹ کی سرکار میں ملازمت کرتا تھا۔ مگر جس طرح دوسرے بھاٹ جگہ جگہ، شہر شہر پھرتے رہتے تھے اسی طرح یہ بھی ایک جگہ پر ٹک کر نہیں بیٹھ سکتا تھا اور وہ شہر شہر کی سیر کرتا رہتا تھا۔

اکبر کے ساتھ ابتدا میں اس کی ملاقات ہو گئی اور اس کی قسمت کا ستارہ بہت بلند تھا کہ بہت جلد ہی اس کے دربار میں آ کر اعلیٰ مقام کو حاصل کر لیا۔ بیربر کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اکبر بادشاہ کے ساتھ اس کے قریبی تعلقات جیسے بھی ہوں اور ان کے رتبے کو کوئی بھی میر اور سردار نہیں پہنچا تھا مگر تاریخ سلطنت میں جو تعلق انھیں ہے وہ نہایت تھوڑا نظر آتا ہے اس کی وضاحت ذیل میں دی جاتی ہے کہ:

۹۸۰ھ میں نگر کوٹ حسین قلی خان کی تلوار پر فتح ہوا بادشاہ کو بچپن سے برہموں، بھاٹوں اور اقسام طوائف ہنود کی طرف میلان ورجحان رہتا تھا۔ اور ہر وقت ان کی صحبت میں بیٹھ کر تے تھے ان کے ساتھ محبت و پیار کرتے تھے کہ مجلس کے شروع میں ہی ایک برہمن بھاٹ جس کا نام منگا برہم داس تھا اور وہ کالپی کا رہنے والا تھا۔ اور وہ ہندوؤں کی بہت تعریف کرتا رہتا تھا۔ وہ بڑا ہی دانا اور عقلمند شخص تھا۔ اس دربار میں ملازمت اختیار کر لی اور ترقی کرتے کرتے ایک اعلیٰ مقام حاصل کر لیا۔ جس طرح کہ کہا جاتا ہے کہ:

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی

ترجمہ: تو میں ہو گیا اور میں تو گیا میں جسم بن گیا اور تو میری جان بن گیا۔ وغیرہ۔ یعنی جس طرح کہ یہ کہا جاتا ہے کہ یک جان دو قالب۔ ایک جان کے اندر دو دل ہو گئے۔ اس مہم کی اصل بنیاد یوں بیان کی جاتی ہے کہ:

بادشاہ نے کسی بات پر ناراض ہو کر کانگڑہ کی فتح کا حکم دے دیا اور راجہ بیربر کو یہ ملک مذکور دے دیا گیا۔ اور حسین قلی خان کو حکم دیا گیا کہ کانگڑہ پر قبضہ کر کے یہ ملک راجہ بیربر کو بطور جاگیر کے دے دو۔ تو حسین قلی خان نے امرائے پنجاب کو جمع کیا اور جنگ کا ساز وسامان اکٹھا کیا اور پہاڑی پر چڑھائی کرنے کا سامان بھی ساتھ لیا۔ اور راجہ بیربر کو نشان کا ہاتھی بنا کر آگے رکھ لیا۔ اور کانگڑہ روانہ ہو پڑے۔ سپہ سالار کو فوج کی گھاٹیوں پر اترنے اور چڑھائی پر چڑھنے کے لیے بڑی مشکلات کا سامنا ہوا۔ بہرحال وہ مشقت سے کانگڑہ تک جا پہنچے۔ اور وہاں انھوں نے جا کر محاصرہ کر لیا۔ فوج میں ہندو اور مسلمان شامل تھے۔ حملہ کرنے میں بڑی سختی کی گئی مگر راجہ جی بہت بدنام ہوئے اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ پنجاب پر ابراہیم مرزا باغی ہو کر حملہ آور ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے حسین قلی خان نے صلح کر کے محاصرہ ختم کر دیا۔ جس کو راجہ کانگڑہ نے بہتر سمجھا اور جو شرائط پیش کی گئیں وہ خوشی سے منظور کر لی گئی تھیں۔ مگر چوتھی شرط پر سپہ سالار نے کہا کہ:

"حضور سے (اکبر بادشاہ سے) یہ ولایت (علاقہ) راجہ بیربر کو مرحمت ہوئی تھی ان کے لیے کچھ خاطر خواہ ہونا چاہیے اور یہ شرط بھی منظور ہوئی۔ پانچ من سونا وزن اکبری رکھا گیا اور ہزاروں روپے کی عجائب ونفائس بادشاہ کے لیے رکھے گئے۔"

بیربر بھی گھوڑے پر سوار ہو کر چل دیے اور اکبر جو کہ گجرات احمد آباد کی طرف جانے کی تیاری کر رہا تھا اس کے پاس جا کر اس کے لشکر میں شامل ہو گیا۔

۹۹۰ھ کے اواخر میں اکبر بادشاہ کو دعوت پر مدعو کیا۔ جس کو اکبر بادشاہ نے بخوشی قبول کر کے ان کے گھر گئے۔ بیربر نے وہی اشیاء جو کبھی کبھی عنایت ہوئی تھیں وہ حاضر کیں۔ نقد کو نثار کیا۔ باقی پیشکش کر دیا اور سر جھکا کر کھڑے ہو کر مودبانہ کھڑے ہو گئے۔

راجہ بیربر باقی امراء کی طرح لالچی نہ تھے اور شاہانہ اخراجات کے عادی نہ تھے کیونکہ حالات و وسائل باقی امراء سے بہت مختلف تھے۔ انھوں نے بادشاہ کو جو کچھ دیا بادشاہ سے اس نے یہی کچھ حاصل کیا تھا اور اسی کو بادشاہ کو پیش کر کے مودبانہ کھڑے ہو گئے اور قطعاً اپنے کیے پر پشیمان نہ تھے۔ اگر کسی نے کچھ کہا بھی ہوگا تو برجستہ اس کا جواب صادر کر دیا۔

بیربل دربار سے لے کر محل تک ہر جگہ یعنی چھائے ہوئے تھے۔ وہ اپنی دانائی اور مزاج شناسی کی حکمت سے ہر معاملے میں حکم حاصل کر لیتے تھے۔

بیربر کی شان و عظمت

ہر بات پر حسب مراد حاصل کرتے تھے۔ اسی وجہ سے راجہ، مہاراجہ اور امراء انھیں لاکھوں روپے کے تحائف بیربر کو بھیجتے تھے اور اکبر بادشاہ بھی اکثر راجاؤں کے پاس سفیر بنا کے روانہ کرتے تھے۔ بیربر اکبر کے ذیرک اور درباری تھے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ:

ان کو قربت حاصل تھی۔ اور کچھ منصب سفارت کا اعزاز حاصل تھا۔ نیز اپنے چٹکلوں اور لطیفوں سے لوگوں کے دل موہ لیتے تھے اور ان کی وجہ سے لوگوں میں گھل مل جاتے تھے اور وہ ہر ایک سے اپنا کام نکال لاتے تھے جو کہ لشکروں سے نہیں نکلتا تھا۔ جس کی واضح مثال یہ ہے کہ:

۹۸۴ھ میں بادشاہ اکبر نے رائے لون کرن کے ساتھ راجہ ڈونگر پور کے پاس بھیجا۔ راجہ اپنی بیٹی کو حرم سرائے اکبری میں داخل کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ بعض وجوہات کی بنا پر جھجک رہا تھا تو بیربر نے جاتے ہی ایسا منتر پھونکا کہ راجہ کی تمام غلط فہمیوں کو دور کر دیا۔ اور ہنستے کھیلتے مبارک سلامت کرتے سواری لے آئے۔ یعنی راجہ ڈونگر نے اپنی بیٹی کو حرم سرائے میں داخل کرنے کے لیے رضامندی کا اظہار کر دیا اور وہ سب خوشی خوشی آئے۔ تو یہ بیربر کے آداب اخلاق کا کمال تھا۔

اس کے علاوہ ۹۹۱ھ میں زین خان کوکہ کے ساتھ راجہ رام چندر کے دربار میں روانہ کیا۔ بیر بھدر اس کا بیٹا آنے میں اندیشہ کرتا تھا۔ انھوں نے اسے بھی باتوں میں خوش کر لیا اور اپنا مطلب حاصل کر لیا۔

۹۹۱ھ کا ہی واقعہ ہے کہ راجہ بیربر کے سر سے ایک بڑی بلا ٹلی۔ جب کہ اکبر نگر چین کے میدان میں چوگان بازی کر رہے تھے تو راجہ بیربر کے گھوڑے نے اسے پھینک دیا تو وہ چوٹ لگنے سے بے ہوش ہو گئے ان کا سانس گھٹ گیا مگر مشکل سے اور محبت سے اٹھایا اور گھر روانہ کیا گیا۔

بیربر کے لیے اکبر بادشاہ کی جانثاری

ایک دفعہ کا واقع ہے کہ ایک دن میدان چوگان بازی میں بادشاہ ہاتھیوں کی لڑائی دیکھ رہا تھا اور وہاں ایک ناخوشگوار واقعہ وقوع پذیر ہوا۔ جس کی تفصیل یوں بتائی جاتی ہے کہ:

ایک دن چاچہ نامی ہاتھی شرشوری اور بدمزاجی میں بہت مشہور تھا اور وہ ایسا بدمزاجی کا عمل کرنے سے گریز بھی نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ بدمست ہاتھی تھا۔ تو ایک دفعہ وہ چاچہ نامی ہاتھی اپنی بدمزاجی سے اچانک دو پیادہ افراد پر چڑھ گیا۔ وہ دونوں بھاگے مگر بدمست چاچہ ہاتھی بھی ان کے پیچھے بھاگ رہا تھا کہ اچانک اکبر بادشاہ کا اہم درباری بیربر اس ہاتھی کے سامنے آ گیا۔ تو چاچہ ہاتھی ان دو پیادوں کو چھوڑ کر بیربر پر جھپٹ پڑا۔ راجہ بیربر کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ بڑا ہی پریشان ہوا۔ وہ بھاگنے کی بھی صلاحیت نہ رکھتا تھا۔ اس کا بدن کانپنے لگا۔ گویا کہ بیربر کی عجیب حالت دیدنی تھی۔ لوگوں نے جب بیربر کو دل چاچہ ہاتھی کی جھپٹ میں دیکھا تو انھوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ اس دن اکبر بادشاہ کہیں گھوڑ سواری کر رہا تھا تو اس نے لوگوں کے شور کی آواز سنی اور اصل معاملے کا علم ہوا تو اکبر بادشاہ گھوڑے پر سوار ہی ہاتھی کے آگے آ کر کھڑے ہو گئے مگر جب اکبر بادشاہ ہاتھی کے آگے آ کر کھڑے ہو گئے تو دل چاچہ ہاتھی اپنی کارروائی سے رک گیا اور راجہ بیربر گرتے پڑتے اور ہانپتے کانپتے بھاگ جانے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر ہاتھی چند قدم تک بادشاہ کے پیچھے آیا مگر بادشاہ سوار تھا اس لیے ہاتھی رک گیا اور بیربر ایک بڑے خطرناک حالات سے بچ گئے۔ یہ اکبر بادشاہ کی اپنے معزز درباری کے لیے ایک بڑی جانثاری کا ثبوت تھا۔

بیربر کی مہمات میں شمولیت اور اہم کردار

سواد اور باجوڑ کا علاقہ ایک وسیع ملک پشاور کے مغرب میں واقع ہے۔ اس کی زمین ہندوستان کی طرح زرخیز اور بار آور ہے۔ وہاں کی آب و ہوا بڑی ہی معتدل اور موسم کی سردی علاقے کی افادیت میں مزید اضافہ کر دیتی ہے۔ یہاں کے دلاور افغان یوسف زئی کہلاتے ہیں۔ ملک کی حالت نے انھیں سرشور اور سینہ زور بنا کر اپنی قوموں میں ممتاز کر دیا ہے اور ہندوکش کی برفانی چوٹیوں تک چڑھا دیا ہے۔ اس علاقے میں تیس تیس میل کی وسیع وادیاں پائی جاتی ہیں اور ہر میدان میں پہاڑوں کو چیر کر درے نکالے گئے ہیں۔ ان میدان یا علاقے کی ہوا کی لطافت، زمین کی سبزی، پانی کی فراوانی اور روانی میں کشمیر کو جواب دیتی ہیں۔ یہ وادیاں گھنے گھنے جنگلوں میں جا کر ختم ہوتی ہیں یا دروں پر اختتام پذیر ہوتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایسا ملک حملہ آوروں کے لیے سخت مشکل ہوتا ہے کیونکہ وہاں کے لوگ اپنے علاقے کے نشیب و فراز سے واقف ہوتے ہیں جبکہ باہر کی افواج قطعی طور پر ناواقف اور نابلد ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس علاقے کے افغان سرشوری اور راہزنی کو اپنا جوہر قومی تصور کرتے تھے۔ لیکن وہاں ایک خلیق شخص نے پیری کا ڈھونگ رچا کر اپنا نام پیر روشن رکھ لیا اور وہاں سے بہت سے جاہل لوگوں کو اپنے گرد جمع کر لیا اور انھوں نے کوہستان کے قدرتی قلعے کو اپنی پناہ گاہ بنا لیا اور وہ کنار اٹک سے لے کر پشاور اور کابل تک رستہ مارتے تھے یعنی لوٹ مار کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے لوگ ان کی لوٹ مار سے تنگ آ چکے تھے اور آبادیاں ویرانوں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔

دھیرے دھیرے یہ بات بادشاہ کے علم میں بھی آ گئی۔

اکبر بادشاہ کا حکم

بادشاہ نے ان کی سرکوبی کے لیے اپنی افواج کو روانہ کیا مگر چونکہ علاقہ کے لوگ بھی لڑائی میں بڑے ماہر تھے جب ان پر حاکم فوجیں جب حملہ آور ہوتیں تو وہ بڑی بہادری اور جواں مردی سے ان کا مقابلہ کرتے تھے اور چونکہ مقامی لوگ تھے پہاڑوں کے راستوں سے واقف تھے اس لیے وہ جا کے قوموں پر چپکے سے حملہ آور ہوتے اور حملہ کرنے کے بعد فوری طور پر بھاگ کر چھپ جاتے تھے۔ مگر حاکم فوجیوں کو ان کی کارروائیوں کا کم ہی علم ہوتا تھا اور اس طرح وہ حاکم فوجوں کی فتح کو بھی شکست میں تبدیل کر دیتے تھے۔

۹۹۳ء میں اکبر کو یہ خیال آیا کہ ان کی سرکوبی کرنی ضروری ہے کیونکہ یہ لوگ لوگوں کو بہت پریشان کر رہے ہیں اور لوٹ مار سے آبادیاں ویران ہوتی جا رہی ہیں۔ مگر حاکم افواج سے بھی وہ قابو نہیں آ رہے۔ ان وجوہات کی بنا پر اکبر بادشاہ نے سخت قدم اٹھانے کا تہیہ کیا۔ اور اس کے لیے اکبر بادشاہ نے اہم سپہ سالاروں کو اس مہم کے لیے روانہ کیا۔

زرین خاں کوکلتاش کی روانگی

اکبر بادشاہ نے اس اہم مہم کے لیے زرین خاں کوکلتاش کو چند امراء کے ساتھ فوجیں دے کر روانہ کیا۔ وہ لشکر شاہی اور دیگر سامان حرب کے ساتھ باجوڑ کے علاقے میں حملہ آور ہوا۔ اس کے قول کے مطابق یہ علاقہ بڑا ہی کٹھن اور مشکل تھا۔ راستے بڑے ہی مشکل اور ان کے بارے میں معلومات میں فقدان۔ جن کا کسی کو علم نہیں ہوتا تھا۔ تمام پہاڑی علاقہ تھا اور تمام پہاڑ بڑے بڑے چھوٹے چھوٹے درختوں سے چھائے ہوئے تھے۔ ان پہاڑوں میں چشمے تھے جو بغیر کشتی کے بغیر پار کرنا مشکل تھا۔ چشموں کا پانی بلندی سے گرنے کی وجہ سے پتھروں سے ٹکراتا ہوا زور سے نیچے گرتا تھا۔ گھوڑے بھی وہاں نہیں جا سکتے تھے۔

اس علاقے کے دائیں بائیں دروں میں کوہستان میں آباد تھے۔ وہ دنبوں اور اونٹوں کی ریشم کے کمبل، گدے، شطرنجیاں اور ٹاٹ بنتے تھے اور ان کی چھوٹی چھوٹی تھیونیاں کھڑی کر لیتے تھے اور دامن کوہ میں کوٹھے کوٹھریاں بنا کر رہتے تھے۔ اسی جگہ پر کھیتی باڑی کرتے تھے جنگلوں کے پھل یعنی سیب، بہی، ناشپاتی ان کے قدرتی باغ تھے وہی پھل کھاتے اور اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔

جب کوئی بیرونی دشمن ان پر حملہ آور ہوتا تو اس کا مردانہ وار مقابلہ کرتے اور اس میں ہر شہری کا شامل ہونا ضروری تھا۔ ان کی جنگ کرنے کا یہ طریقہ تھا کہ:

''دو تین تین وقت کا کھانا، پکھ روٹیاں پکھا تا گھر سے باندھ کر ہتھیار لگا کر جنگ کے لیے آ موجود ہوتے تو شاہی فوج ان کو دیکھ کر حیران رہ جاتی اور وہ ان مشکل حالات میں خدا کو ہی یاد کرتی رہتی تھی کیونکہ وہ اس قدر مسافت طے کر کے یہاں پہنچتی ہے وہ تھکے ماندے فوجی ہیں مگر یہ تازہ دم سامان جنگ سے لیس لوگ سامنے لڑنے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔ جن سے مقابلہ بھی کٹھن ہے۔''

افغان کے ساتھ مقابلہ

جب ان افغان کے ساتھ مقابلہ کیا جاتا ہے تو وہ لوگ بڑی بہادری اور دلیری کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ شاہی افواج کا مقابلہ کرنے کی طاقت تو نہیں رکھتے مگر مقابلہ خوب کرتے ہیں۔ ان پر جب دھاوا بولا جاتا ہے تو وہ توپوں پر آ چڑھتے ہیں اور پھر وہ جب دب جاتے ہیں تو پہاڑوں پر چڑھ جاتے ہیں اور دائیں بائیں کے دروں پر چڑھ جاتے ہیں اور ان میں گھس جاتے ہیں۔ وہ چونکہ طاقت ور اور قوی ہیکل تو ہوتے ہی ہیں۔ ان کے لیے پہاڑوں پر چڑھنا کوئی مشکل نہیں ہوتا جبکہ باہر کے آدمی کے لیے پہاڑوں پر چڑھنا بڑا ہی مشکل ہوتا ہے۔ ان افغانوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ اچانک اگر ان کے سر پاؤں یا کسی جگہ میں کوئی گولی لگ گئی یا کوئی تیر لگ گیا تو وہ گر پڑے تو مجبور ہو گئے مگر اگر کوئی گولی یا تیر ان کی ران، بازو یا پاؤں وغیرہ میں لگ گیا تو ان کی کوئی پرواہ ہی نہیں کرتے تھے۔ ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ بندروں کی طرح جھٹ درختوں پر گھستے اور پہاڑوں پر چڑھتے جاتے تھے۔ اس حالت جھٹ میں بھی اگر ان کو کوئی گولی لگ گئی تو گولی کی جگہ پر دو چار مرتبہ مالش کر لی اور انھوں نے گویا کہ ایسے ہی محسوس کیا کہ بھڑ نے کاٹ لیا ہے یا بچھو نے کاٹ لیا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں محسوس کرتے۔

مگر شاہی فوج علاقے سے ناواقف ہونے کے ساتھ ان کے طریق جنگ سے بھی نابلد اور ناواقف ہوتی ہے۔ وہ افغان لوگ شاہی فوج کے سامنے ڈٹ کر مقابلہ نہیں کرتے بلکہ گوریلا انداز میں لڑتے ہیں۔ میدان سے نکل کر پہاڑوں میں یا دروں میں چھپ جاتے ہیں اور موقع آنے پر فائر کرتے ہیں۔ جس کا شاہی افواج کو کوئی علم نہیں ہوتا اور وہ گھبرا جاتی ہے۔ جس سے ان کا کافی نقصان ہوتا ہے۔ جب ان کے پاس راشن ختم ہو جاتا ہے تو وہ اپنے گھروں کو جاتے ہیں اور راشن حاصل کر کے دوبارہ آ جاتے ہیں۔ تو شاہی فوج آگے بڑھنے کی بجائے بڑی مشکلات کا سامنا کرتی ہے۔ مگر کامیابی کے آثار نظر آتے ہیں۔

زین خان کی جنگی چال

زین خان بڑا کامیاب سپہ سالار اور جنگی طریقوں کا ماہر سپہ سالار تھا۔ اس نے لڑائی کی چال کو بڑے اچھے طریقے سے شروع کیا تھا اس نے بادشاہ کو لکھا کہ:

"دو لشکر شاہی کو آگے بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ افغانوں کے بوڑھے سردار عفو تقصیر کے لیے حاضر ہو گئے ہیں۔ مقامات قابل احتیاط اور اہم ہیں ان کے لیے کمک کی ضرورت ہے۔"

بیربر کا گرداب

ان دنوں میں بیربر اکبر بادشاہ کا بڑا ہی محبوب اور چہیتا درباری تھا۔ وہ اس کا بڑا ہی پیارا اور مخلص دوست بھی تھا۔ جب زین خان نے احتیاط مقامات کے لیے اکبر بادشاہ سے کمک طلب کی تو اس وقت دربار میں یہ عام تجویز زیر غور آئی کہ:

"اب کس امیر کو فوج کے ساتھ روانہ کیا جائے جو کہ کامیابی کے ساتھ ان برے راستوں سے فوج کو نکال کر منزل مقصود تک

پہنچائے اور جو وہاں مشکلات درپیش ہوں ان کا بھی مردانہ وار مقابلہ کرے۔''

تو اس وقت اکبر بادشاہ کے درباری ابوالفضل نے بھی اپنی پیشکش کی مگر قابل قبول نہ ہوئی اور بیربر نے بھی کہا کہ:

''غلام اس مہم کے لیے بھی حاضر ہے۔''

تو بادشاہ نے ان دونوں کا قرعہ نکالا تو موت کے فرشتے نے بیربر کا نام نکالا۔ مگر بادشاہ اسی وقت بھیجنا نہ چاہتا تھا کیونکہ وہ اس کے لطیفوں اور چٹکلوں سے بہت خوش ہوتا تھا اور اس کو ہروقت اپنے ساتھ ہی رکھنا پسند کرتا تھا۔

اس کو بیربر کی جدائی قطعاً پسند نہ تھی مگر امر مجبوری یہ تھی کہ:

''کسی جوتشی/نجومی نے کہہ دیا کہ یہ مہم بیربر ہی فتح کرے گا یا خود ان کے ذہن میں خیال آ گیا۔''

اگرچہ اکبر بادشاہ پسند نہ کرتا تھا کہ بیربر کو اس مہم کے لیے روانہ کرے مگر اس کے باوجود بادل نخواستہ بیربر کو فوج کا سپہ سالار بنا کر روانہ کر دیا اور اس کے ساتھ خاصہ سکھوں کا توپ خانہ بھی ساتھ دے دیا گیا۔ اکبر بادشاہ کے خلوص اور محبت کا اندازہ لگایئے اور جدائی کا احساس اس کو اس قدر ستا رہا تھا کہ:

جب بیربر کو اکبر بادشاہ رخصت کر رہا تھا تو اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ:

''بیربر جلد آنا۔''

جس دن بیربر کو روانہ کیا گیا اس دن اکبر بادشاہ شکار سے پھرتے ہوئے خود اس کے خیموں میں گئے اور بہت سی نشیب و فراز کی باتیں اس کو سمجھائیں اور وہ فوج وافی اور سامان کافی کے ساتھ روانہ ہوئے۔

بیربر کی فوج کا مقابلہ

جب بیربر اپنی فوج کے ساتھ ڈوک کے مقام پر پہنچا تو سامنے ایک گھاٹی تھی۔ یعنی گزرنے کا تنگ راستہ تھا اور دونوں طرف پہاڑ تھے جن پر افغان افراد اسلحہ کے ساتھ چڑھے ہوئے تھے۔ بیربر چونکہ فوجی آداب میں ماہر آدمی تو نہیں تھا اگرچہ ظاہرہ ضبط اور مخلص درباری ضرور تھا مگر جنگی معاملات سے بالکل ہی نابلد اور ناواقف تھا تو یہ اس کی تقدیر کا سب سے بدترین سانحہ تھا کہ اکبر بادشاہ نے اس کو جنگی مہم کے لیے بادل نخواستہ روانہ کر دیا۔

بیربر کی فوج کے سامنے افغان لوگ مقابلے کے لیے کھڑے ہو گئے مگر بیربر تو جنگی معاملات میں ناواقف تھا اس لیے وہ صرف غم کھاتا ہی رہا تاہم دیگر فوج کے بہادر افراد اور فوج نے آگے بڑھ کر مقابلہ سختی سے کیا۔ وہ پہاڑی لوگ تھے۔ مگر وحشی تھے ان کے پاس شاہی فوج کی طرح سامان حرب تو نہ تھا مگر وہ طاقتور لوگ تو ضرور تھے مگر انھوں نے اپنے وسائل کے تحت خوب شاہی فوج کا مقابلہ کیا اور مقابلہ بھی خوب کیا اگرچہ بہت سے افغان مارے گئے تھے۔ مگر شاہی فوج کا بھی بھاری نقصان ہوا اور بھاری نقصان کے ساتھ شاہی فوج پسپا ہوئی۔ اب دن بہت کم رہ گیا تھا اندھیرا چھا رہا تھا اس لیے جنگ کا وقت نہ رہا تھا جس کی وجہ سے وہ جنگ کو ترک کر کے اپنے خیموں کی طرف لوٹ آئے جو کہ انھوں نے دشت میں لگا رکھے تھے۔ تاکہ اگلے دن کی تیاری بھی کی جا سکے اور اپنے زخمیوں کی مرہم پٹی بھی کی جا سکے۔

اکبر بادشاہ کی بھی یہ ایک جنگی مہم کے لیے ایسے آدمی کی روانگی ایک بڑی غلطی شمار کی جاتی ہے اور اس نے گویا ایک اہم درباری کو ضائع کرنے کے لیے طریقہ سوچا یا اس کو کسی نے بیربر سے انتقام لینے کے لیے خیال ذہن میں ڈالا (واللہ اعلم) بہر حال اکبر بادشاہ کا انتخاب مناسب نہ تھا لیکن بیربر جنگ کے بارے میں حرف ابجد سے بھی واقف نہ تھا۔ اور جنگ لڑنا کوئی بچوں کا کام تو نہیں ہوتا۔ اس کے لیے دل اور جنگی طریقوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان دونوں میں بیربر صفر تھا۔ اس لیے یہ بیربر کی زندگی کا اکبر بادشاہ نے سانحہ مہیا کیا جو کہ ایک مخلص وفادار دوست کے لیے موزوں نہیں تھا۔ اکبر کی دور اندیشی نہیں تھی۔

حکیم ابوالفتح کی روانگی

اگرچہ اکبر بادشاہ بڑا ہی سمجھدار، مردم شناس اور جہاندیدہ حکمران تھا۔ مگر آخر کار انسان تھا اس کی فطرت میں بھی غلطی کرنے کا مادہ موجود تھا۔ جس کے تحت اس نے جانتے بوجھتے ہوئے بیربر کو فوج کا سپہ سالار بنا کر بھیج دیا۔ جو کہ گھریلو عورت کو جنگ کے لیے بھیجنے کے مترادف تھا اور اکبر بادشاہ سمجھتے تھے کہ مسخرے بھولے نے کیا جنگ لڑنی ہے؟ اس لیے ان حالات کا جائزہ لیتے ہوئے اکبر بادشاہ نے حکیم ابوالفتح کو فوج دے کر اس کی مدد کے لیے روانہ کیا۔ اس کو سمجھا دیا گیا کہ دشت میں پہنچ کر وہاں کی فوج کو لینا اور کوہ ملکاند کی گھاٹی سے نکل کر زین خان کی فوج میں شامل ہو جانا۔ زین خان اگرچہ ہندوستان کی سرزمین میں سرخرو ہوا تھا لیکن وہ پہاڑی زادہ تھا اس کے باپ دادا اسی خاک سے پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے وہیں کا ہی دانہ پانی کھایا اور پرورش پائی اور جوان ہوا۔ اور اس دھرتی میں دشمن کے ساتھ جنگیں لڑتے ہوئے اس دار فانی سے سدھار گئے۔

جب زین خان باجوڑ ملک میں پہنچا تو اس نے جاتے ہی چاروں طرف اپنے فوج کو پھیلایا اور لڑائی چاروں طرف سے شروع کر دی اور اس قدر زور کا حملہ کیا کہ پہاڑوں میں گویا کہ کوئی زلزلہ آ گیا ہے۔ ہزاروں کے حساب سے افغان قتل کر دیے گئے۔ اور بے شمار قبیلے قیدی بنا لیے گئے ان کے بیوی بچوں کو قیدی بنا لیا گیا اور ان مقامی افغانوں کو اس قدر تنگ اور زک کیا گیا کہ اس علاقے کے سردار اور ملک وغیرہ مجبور ہو کر صلح کرنے کے لیے تیار ہو گئے اور انھوں نے آ کر زین خان کی اطاعت قبول کر لی اور افغان سرداروں کے ساتھ زین خان سے صلح کر لی۔

زین خان کا علاقہ سواد پر حملہ

کوہ ملکند کو فتح کرنے کے بعد زین خان نے مقامی سرداروں سے صلح کر لی اور اس کے بعد وہ علاقہ سواد کی طرف بڑھا۔ وہاں افغان پہاڑوں پر چیونٹیوں کی طرح یعنی بے شمار فوج کے ساتھ مقابلے کے لیے تیار کھڑے تھے اور وہ سامان حرب سے بھی اچھی طرح لیس تھے۔ انھوں نے زین خان کی فوج کو دیکھتے ہی گولیاں، پتھر اولوں کی طرح برسانے شروع کر دیے۔ اس پر ہراول دستے کو ان کا مقابلہ کرنا مشکل لگا تو انھوں نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا مگر مقدمہ (آگے کی فوج) نے ہمت نہ ہاری اور انھوں نے مقابلہ کرنے کے لیے اپنی تلواروں کو سنبھال لیا۔

غرض جس طرح ہو انگی سے فوج نکل گئی تھی یعنی (ذوک کی منزل کی تنگی مراد ہے جہاں بیربر کی فوج کے ساتھ افغان کا مقابلہ ہوا تھا اور شاہی فوج مشکل میں پڑ گئی) اس طرح کی حالت یہاں بھی پیش آئی۔ انھیں دیکھ کر دوسروں کے دلوں میں ہمت کا جوش سرسرایا۔ بہر حال شاہی فوج

نے ہمت کر کے افغان کی طرف بڑھنا شروع کیا اور افغان شاہی فوج کو دیکھ کر ان کے مقابلے کے لیے سامنے کے پہاڑ پر چڑھ گئے یعنی ان کے آگے نکل گئے جو کہ ان کے لیے محفوظ مقام تھا۔ زین خان نے اوپر جا کر (پہاڑ کے) اوپر اپنی چھاونی قائم کر لی اور وہاں مورچے قائم کر لیے اور قلعہ باندھ لیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ:

چندرہ کے علاقہ کے بیچوں بیچ راستہ جاتا تھا اور یہاں سے ہر طرف کے لیے زور لگایا جا سکتا تھا۔ اس لیے سامنے کرا کر کا پہاڑ اور بجیر کا علاقہ رہ گیا تھا۔ باقی سارا علاقہ زین خان کے قبضے میں آ گیا تھا۔

راجہ بیربر اور حکیم ابوالفتح کا پہنچنا

زین خاں دشمنوں کو زیر کرنے کے لیے اپنی جنگی چالوں میں مصروف تھا کہ اسی اثنا میں اس کی کمک کے لیے بھیجی گئی افواج راجہ بیربر اور حکیم ابوالفتح کی سربراہی میں وہاں پہنچ گئی۔ اگرچہ راجہ بیربر اور زین خاں کی پہلے سے کسی بات پر کوئی ناراضی یا چپقلش تھی مگر جب اس کی آمد کی خبر ملی تو زین خان نے بردباری سے کام لیا اور آگے بڑھ کر راجہ بیربر کا استقبال کیا اور اس سے بڑے خوشگوار مزاج میں باتیں کرتا رہا اور سارا دن اس کے ساتھ مصروف کار رہا۔ تمام فوجوں اور بھیڑ اور بار برداریوں کو ان برف پوش پہاڑوں سے اتارا اور خود وہیں قیام کیا اور رات اس جگہ پر قیام کر کے گزاری مبادا کہ پٹھان فوج پیچھے سے موقع پا کر حملہ نہ کر دے۔

حکیم ابوالفتح فوج لے کر پہلے چندرہ کے مقام پر چلے گئے اور صبح کو قلعہ پر شامل ہو گئے یعنی اکٹھے ہوئے۔ زین خان کوکلتاش نے وہاں ایک عظیم جشن منایا اور ان کو اپنا بھائی سمجھ کر ان سب کی بڑی خاطر مدارت کی اور ان کو مہمانی کے بڑے بڑے سامان کر کے ان کو اپنے خیموں پر بلایا۔ تاکہ جنگ کے معاملہ میں سب کی رائے ایک ہو اور سب ایک پالیسی یا جنگی چال کے تحت دشمن کا مقابلہ کریں۔ تاکہ ہمیں شاہی فوج کر افغان پر فتح حاصل ہو مگر اس مقام پر راجہ بیربر نے اختلاف کیا اور بہت سی شکایات پیش کیں اور کہا کہ:

"بادشاہی توپ خانہ ہمارے ساتھ ہے۔ بندگان دولت کو چاہیے تھا کہ اس کے گرد آ کر جمع ہوتے اور یہاں صلاح و مشورہ کی گفتگو ہوتی۔

حالانکہ جنگی اصولوں کے مطابق کہ چونکہ زین خان کوکلتاش فوج کا سپہ سالار تھا تو راجہ بیربر توپ خانہ اس کے حوالے کر دیتے تو زیادہ بہتر ہوتا اور سب اس کے پاس جمع ہوتے مگر پھر بھی زین خان نے سمجھداری سے کام لیا اور اس کے ساتھ بے تکلف ہی رہا۔ اور تمام سردار بھی اس کے ساتھ چلے آئے۔ البتہ اس کو ناگوار ضرور گزرا۔ بدترین اتفاق کی بات یہ تھی کہ:

حکیم ابوالفتح اور راجہ بیربر کو بھی صفائی نہ تھی یعنی دونوں میں اتفاق رائے نہ تھا تو یہاں ان میں بات بڑھ گئی اور راجہ بیربر نے گالیاں برسانی شروع کر دیں۔ مگر کوکلتاش بڑا حوصلہ مند سپہ سالار تھا اس نے اپنے تحمل و بردباری کو کام میں لا کر اس بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھایا اور بڑی صلاحیت کے ساتھ یہ صحبت طے ہو گئی مگر تینوں سرداروں میں اگرچہ اختلاف ہی رہا یہ تینوں سردار یہ تھے:

i- زین خان کوکلتاش (سپہ سالار اول) سردار I

ii- راجہ بیربر سپہ سالار دوم (سردار II)

iii- ابوالفتح (سپہ سالارسوئم) سردار III

یہاں تک بات بڑھی کہ روز بروز ان تینوں کے اختلافات بڑھتے ہی گئے۔ کوئی بھی کسی کی بات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ ہر ایک سردار کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ

''جو میں کہہ رہا ہوں وہی صحیح ہے اسی پر عمل ہونا چاہیے بے شک وہ غلط ہی کیوں نہ ہو؟''

زین خان کی سپاہ گیری

زین خان کوکلتاش سپاہی زادہ تھا۔ گویا کہ وہ سپاہی کی ہڈی تھا۔ اور بچپن سے ہی لڑائی میں جوان ہوا تھا۔ وہ اس ملک کے حالات سے بہتر طور پر واقف تھا اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہاں کے لوگوں سے کیسے لڑائی کر کے میدان فتح کیا جاسکتا ہے۔ ان کے ساتھی حکیم ابوالفتح سپہ سالار اور سرحد فوج تک بڑے ہی دانشمند اور سمجھدار تھے مگر وہ صرف اکبری دربار کی حد تک تھے۔ ان کو بھی جنگ کے معاملات کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اور نہ ان کو یہ ہی علم تھا کہ ان بے ڈھبے علاقوں میں کس طرح دشمن کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ وہ تو صرف کرسی پر بیٹھ کر کی کاغذی تدابیر کا ماہر تھا۔ یہ بھی جاننا چاہیے کہ کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہے بلکہ زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے اور اسے بھی یہ بڑا فخر تھا کہ:

''میں بادشاہ اکبر کا مصاحب خاص ہوں اور بادشاہ میری صلاح و مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتا۔ وہ زین خاں کوکلتاش کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔''

موقع کی نزاکت کا تقاضا تھا کہ یہ حکیم ابوالفتح کی سوچ کیسی بھی ہو مگر ایسے موقع پر سخت غلطی تھی۔ اب اکبر کے دربار میں وہ بیٹھا ہوا نہ تھا بلکہ دشمن کے سامنے جنگ میں تھا۔ اور اس کے مطابق اپنے سپہ سالار اعظم کی مرضی کے مطابق عمل کرنا دانشمندی اور ضروری تھا جو کہ اس نے یہ موقع ضائع کر دیا اور تینوں میں اختلافات کی فضا وسیع ہوتی چلی گئی۔ جس کے نتائج بھی ان کو برداشت کرتے پڑے۔ اسی طرح راجہ بیربر کی حالت یہ تھی کہ:

راجہ بیربر بھی صرف دربار کا ہی کھلاڑی تھا۔ اگر چہ بڑا ہی اچھا عقلمند، زیرک اور دانشمند درباری تھا مگر جنگ کے معاملہ میں کوئی مہارت نہ رکھتا تھا۔ اس نے کبھی یہ پہاڑی علاقے نہ دیکھے تھے شکاری تھا مگر جنگلوں اور میدانوں کا ہی تھا۔

وہ پہاڑوں کو دیکھ کر گھبراتا اور ہر وقت بدمزاجی کا مظاہرہ کرتے اور اپنے مصاحبوں سے کہتے کہ:

''حکیم کی ہمراہی اور کوکلتاش زین خان کی کوتاہ اندیشی دیکھئے کہ ہمیں کہاں لے جاتی ہے۔ اور اگر راستے میں بھی ملاقات ہو جاتی تو بدزبانی کرتا اور لڑنے پر تیار ہو جاتے تھے۔''

اس کی دو اہم وجوہات تھیں کہ:

i- راجہ بیربر تو محلوں کے شیر تھے۔ وہ مرد شمشیر نہ تھے۔

ii- وہ اکبر بادشاہ کے پیارے اور لاڈلے درباری تھے۔ انھیں بھی یہ دعویٰ تھا کہ ہم اس جگہ پہنچ سکتے ہیں جہاں دوسرا کوئی جا نہیں سکتا۔ ہمیں ان کے مزاج میں وہ دخل ہے کہ ٹھہری ٹھہرائی بنی بنائی صلاح توڑ دیں۔ زین خان کوکلتاش کی کیا ہمارے سامنے حیثیت ہے؟ اور حکیم ابوالفتح کی کیا مجال؟

غرض خود پسندیوں اور غرور پسندی نے مہم کو بگاڑ دیا۔ جنگ کرنے کا دونوں میں طریقہ وسلیقہ تھا جس کی وجہ سے زین خان کوکلتاش کے لیے مسائل پیدا ہو رہے تھے اور ان کے درمیان اختلافات جنم لے رہے تھے۔

زین خان کوکلتاش کی سنہری رائے

زین خان کوکلتاش بڑا سمجھدار سپہ سالار اور تجربہ کار جنگجو سپہ سالار تھا۔ اس کی یہ رائے تھی کہ راجہ بیربر اور حکیم ابوالفتح کی فوج میں سے کچھ آدمی چکدرہ کی چھاؤنی میں قیام کریں اور ارد گرد کا خیال رکھیں اور کچھ میرے ساتھ شامل ہو کر آگے مقابلے کے لیے بڑھیں۔ تم میں سے جس کا جی چاہے آگے بڑھے۔ میری فوج چکدرہ میں رہے گی۔ یہ بڑی ہی دانشمندانہ اور صلاح پسندی کی تجویز تھی۔ تاکہ سب میں اتفاق رائے قائم ہو اور ایک تجویز پر قائم رہ کر جنگ کریں مگر

راجہ اور حکیم دونوں ہی اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے انھوں نے زین خان کو کہا کہ

حضور اکبر بادشاہ کا حکم ہے کہ "افغان کو لوٹ مار کر کے برباد کر دو۔ ملک کی تسخیر اور قبضہ مدنظر و مقصود نہیں ہے۔ ہم سب ایک لشکر لے کر مارتے دھاڑتے ادھر سے آتے ہیں اور دوسری طرف سے نکل کر حضور کی خدمت میں جا حاضر ہوں۔"

مگر زین خان کوکلتاش نے کہا:

"میں نے کس محنت و مشقت اور مہارت جنگی سے یہ علاقہ فتح کیا ہے۔ اب بڑے افسوس کی بات ہو گی کہ اس کو چھوڑ دیا جائے۔"

"اچھا اگر آپ صاحبان کچھ بھی نہیں کرتے تو یہی کرو کہ جس راستے نے آئے ہو اس راہ سے پھر کر جو تا کہ انتظام پختہ ہو جائے۔"

راجہ بیربل کا اختلاف رائے

راجہ بیربر کو اپنا گھمنڈ اور غرور تھا انھوں نے اپنے زین خان کوکلتاش کی ایک نہ سنی اور دوسرے دن اپنے ہی راستے پر روانہ ہو گئے اور زین خان اور حکیم ابوالفتح بھی اپنی فوج کو لے کر اس کے پیچھے روانہ ہو گئے اور ایک دن بھر میں صرف پانچ کوس کا سفر طے کیا۔ راستے بڑے سخت اور پہاڑی تھے۔ راستے میں کھڈے اور بے ڈھب قسم کی گزرگاہیں تھیں۔ باربرداری اور بھیڑ بکاؤ کو گزرنا سب کا ہی تھا۔ اس لیے آدھ کوس پر جا کر قیام کریں۔ دوسرے دن صبح سویرے روانہ ہوں تاکہ آرام سے برف پوش پہاڑ کو پامال کرتے ہوئے سب وہاں قیام کریں۔ اور آرام سے وہاں قیام کریں۔ اس پر سب کا اتفاق ہوا اور سب کو اس کی تحریری خطوط بھی دے دیے گئے۔ تاکہ سب اس امر کے پابند رہیں اور اس پر عمل کریں۔ کوئی نئی اپنی رائے قائم کر کے اس پر عمل شروع نہ کر دے۔

نور کے تڑکے دریائے لشکر نے جنبش کی۔ ہراول کی فوج نے ایک ٹیلے پر چڑھ کر اپنے جنگی نشان کا جھنڈا لہرایا تو اس کو دیکھ کر افغان مقابلے کے لیے تیار ہو کر آ گئے اور انھوں نے ہر طرف سے رواں دستے کو گھیر لیا۔ مگر بادشاہی لشکر نے مقابلہ کیا اور ان کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ اور جب مقام مقررہ پر پہنچے تو ہراول اور اس کے ساتھ جو خیمے ڈیرے والے تھے انھوں نے منزل کر دی اور وہاں قیام کیا۔

بیربر کی بدقسمتی اور ہلاکت کا واقعہ

بیربر کی تقدیر یالٹ گئی اس کو کسی نے اطلاع دی کہ:

یہاں افغانوں کی طرف سے شبخون کا ڈر ہے۔ چار کوس آگے نکل جاؤ تو پھر کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ انھوں نے اس مقام پر قیام نہ کیا اور آگے ہی بڑھتے گئے۔ راجہ بیربر نے سوچا کہ ابھی دن تو کافی ہے اور چار کوس چند کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اب وہاں ہی پہنچ کر آرام کریں گے۔ تو آگے میدان آجائے گا۔ پھر اس کی پرواہ نہیں ہوگی اور یہ بھی خیال رکھا کہ باقی امرا بھی پیچھے ہی بحفاظت آرہے ہوں گے ہم آگے ہی بڑھتے چلے جائیں لیکن انھوں نے آگرہ اور عسکری کا راستہ دیکھ رکھا تھا۔ انھوں نے یہ پہاڑی راستے نہ دیکھے تھے اور انھوں نے یہ راستے کب طے کیے تھے۔ جنھوں نے بادشاہی / شاہی سواری کی ہوا ان کو ان راستوں کا کیا اندازہ اور تجربہ ہو سکتا ہے؟ ایسے لوگوں کو شبخون کی کیا تعریف معلوم؟ یہ تمام باتوں کو سمجھنا تو جنگی ہی لوگوں کا ہی کام ہے۔ یہ بھاٹوں اور برہمنوں کا کام تو نہیں ہو سکتا۔ پالکیوں میں سفر کرنے والوں کو ایسے معاملات کا کیا علم؟

یہ راستہ بھی کٹھن تھا تو چاروں طرف پہاڑ تھے۔ راستے تنگ تھے درختوں کا جنگل اور تنگ گھاٹیاں تھیں جن سے صرف دو تین سے زائد آدمیوں کا گزرنا مشکل تھا۔ مگر دشمن گھات میں بیٹھا گولیاں برساتا ہی جاتا تھا اور سب کو ڈھیر کرتا جاتا تھا۔ اس حالت میں ان کا راستہ بھی لاشوں سے بند ہو گیا تھا مگر راجہ بیربر اس غلط فہمی میں آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ بخیریت آگے نکل جائیں گے مگر اس قدر دانشمند انسان کو اپنی تقدیر کا علم نہ تھا۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ساتھی افواج کے امرا بھی ہمارے پیچھے آرہے ہوں گے مگر ان کا آنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ وہ بھی راجہ بیربر کے نقوش پر آگے بڑھتے گئے۔ جب وہ آگے بڑھے تو ان کو علم ہوا کہ:

"ہمیں حکم غلط ملا ہے یا انھوں نے اپنی رائے کو بدل لیا ہے۔"

اس حالت میں سب کے اوسان خطا ہو گئے اور سب میں بھگدڑ مچ گئی اور تمام گھبرا گئے اور سب نے بھاگ جانے کی ٹھانی۔ انھوں نے اپنے خیمے اکھاڑے اور بھاگے۔ افغان کے آدمی بھی ان میں شامل تھے۔ انھوں نے جب ان کی یہ حالت دیکھی تو دوائیں بائیں پہاڑوں پر سوار ہو کر ہل چل سے فائدہ اٹھا کر لوٹنا شروع کر دیا۔ مگر لشکر شاہی کے لوگوں کے ہوش و حواس درست نہ تھے انھوں نے ان کی طرف کوئی توجہ ہی نہ دی صرف اپنی جانوں کو بچانے کے لیے ہی سوچتے رہے۔ اگر ان چند لٹیروں کا خاتمہ کر دیتے تو ان کے لیے بہت بہتر ہوتا مگر شاہی لشکر نے سوچا کہ:

"آگے نکل جائیں۔ اتنا بڑا لشکر ہے کچھ تو زندہ بچ جائیں گے جو مر جائیں سو مر جائیں ہم تو چلتے جائیں۔ ہر ایک نے نفسا نفسی کا خیال ذہن میں رکھا کیونکہ ان کا سپہ سالار برہمن بھاٹ تھا۔ جن کو جنگ کا تجربہ تھا۔"

مگر افغان کا یہ حال تھا کہ:

لوٹ مار کا کام کرتے جاتے تھے۔

راستہ بھی بڑا کٹھن تھا اور گھاٹیاں بھی تنگ تھیں۔ غرضیکہ برا حال تھا۔ تو اس حالت میں زین خان کوکلتاش بیچارہ خوب خوب لڑا۔ آگے بڑھ کر اور پیچھے والوں کو سنبھال کر جان لڑائی مگر وہ اکیلا کیا کر سکتا تھا؟ تقدیر کا مقابلہ مشکل ہوتا ہے۔ مقام بے موقع نکل گاڑیاں، چھکڑیں، اونٹ لدے پھندے لوٹ لیے گئے۔ آدمی بھی بے شمار ضائع ہوئے اور جوان کے ہاتھ آئے پکڑ کر لے گئے۔ غرض لڑتے مرتے چھ کوس کی مسافت کو طے کیا۔

زین خان کا قیام

دوسرے دن زین خان نے اس مقصد سے قیام کیا سفر کریز کیا کہ اپنے زخمیوں کی مرہم پٹی کی جائے اور ٹھہر کر اس قدر آرام بھی کر لیں۔ زین خان راجہ بیربر کے ڈیرے پر بھی گئے اور امرا کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ ان میں اکثر اہل نظر ہندوستانی ہی تھے وہ یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئے اور کثرت رائے سے یہ فیصلہ ہوا کہ:

"نکل چلو۔"

مگر زین خان نے کہا کہ:

"آگے پہاڑ اور ٹیلے بے ڈھب ہیں اور لشکر کے دل ٹوٹ چکے ہیں اور افغان دلیر ہو کر پہاڑوں پر جمع ہو چکے ہیں۔ یہاں لکڑی جلانے کے لیے اور جانوروں کے لیے چارہ وغیرہ بھی میسر ہے تو میری یہی رائے ہے کہ یہاں چند روز تک قیام کر کے آرام کریں۔ اور اپنی حیثیت درست کر کے باغیوں کی گوشمالی کریں کہ ان کے بگڑے ہوئے دماغ درست ہو جائیں اور لوگ یہ صلاح نہ ہو تو ان کے بھائی بندعیال ہمارے قبضہ میں ہیں وہ پیغام سلام کریں اور اطاعت کے لیے عفو تقصیر کریں گے اور قیدی ان کے حوالے کر کے خاطر جمع کے ساتھ یہاں سے روانہ ہوں گے۔ اگر یہ صلاح بھی پسند نہ ہو تو حضور میں سب حال لکھ کر بھیج دیں اور کمک طلب کریں۔ ادھر سے فوج آ کر پہاڑوں کو روک لے۔ ہم ادھر سے متوجہ ہوں لیکن یہ ہندوستانی دال خور جنھوں نے گھر کی مانچریاں کھائیں ہوں ان سے پہاڑ کب عبور ہو سکیں۔"

زین خان کوکلتاش کے ساتھ انھوں نے کسی بات پر بھی اتفاق نہ کیا اور انھوں نے یہی رٹ لگائی کہ:

"یہاں سے نکل چلو مر چل کر توری پھیلکے کھاؤ۔"

غرض دوسرے دن وہ خیمے وغیرہ اکھاڑ کر روانہ ہو گئے بھیر بگاڑ ہمیشہ پیچھے ہی ہوتی ہے اور افغان کا یہ قاعدہ تھا کہ:

ابھی پر گرا کرتے ہیں اس لیے زین خان آپ چنداول ہوا اور منزل سے روانگی پر ہی لڑائی شروع ہو گئی۔ افغان کا یہ عالم تھا کہ سامنے پہاڑوں پر جمع تھے۔ کھندوں، گھاٹیوں اور مارچیوں میں چھپے بیٹھے تھے اور وہ ان کو دیکھ کر اچانک کھڑے ہو جاتے تھے اور ان پر حملہ کرتے تھے جن ہندوستانی فوج چیخیں مارتے تھے اور ایک ایک کر کے ایک دوسرے پر گرتے پڑتے تھے۔ یہاں گھاٹی درہ آتا وہاں قیامت آ جاتی۔ زندہ اور مردہ کوئی نہ دیکھتا تھا۔ سب کو تباہ کرتے جاتے تھے۔ ان کو سنبھالنے اور اٹھانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ سردار اور سپاہی کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ مگر اس حالت میں زین خان کوکلتاش بیچارا ہر جگہ دوڑتا پھرتا تھا اور ان کے بچاؤ کے انتظامات کرتا تھا تا کہ لوگ آسانی سے یہ راستہ گزر جائیں۔ مگر بڑی مشکلات کا سامنا رہا اور دشمن نے موقع کو غنیمت جان کر ان کی فوج کے کشت و پشت لگا دیے۔

راجہ بیربر کا انجام

جب شام کا وقت آیا تو افغانوں کی ہمت بندھ گئی۔ مگر شاہی فوج کے اندھیرا میں جانے کی وجہ سے دل ٹوٹ گئے۔ افغان نے چاروں

طرف سے کھیر ازال کر حملہ کر دیا اور شاہی فوج تیر اندازی اور سنگ باری کرنے لگے۔ اس کا بادشاہی فوج میں ایک کہرام مچ گیا پورتہ وبالا ہو گئے۔ جس کی بڑی وجہ ان کی تباہی کی یہ تھی کہ:

راستہ بہت تنگ تھا کہ صرف دو سوار سے زائد گزر نہ سکتے تھے اور اس ہر طرح یہ تھا کہ اندھیرا چھا رہا تھا۔ جس سے راستہ نظر بھی نہیں آتا تھا۔ جس کو افغانوں نے غنیمت سمجھا تو انھوں نے ہر طرف سے تیر اندازی برسانی شروع کر دی۔ افغان نے انسانوں اور جانوروں کو تہ وبالا کر دیا۔ اسی حالت میں رات چھا گئی۔ مگر شاہی فوج کا نقصان بے شمار ہو گیا۔ شاہی فوج کے سپاہی اور جانوروں کا بہت نقصان ہوا۔ جس سے زین خان بڑا پریشان ہوا۔ اس نے غیرت کے مارے خیال کیا کہ ان حالات سے خلاصی حاصل کر کے جان قربان کر دوں مگر راہ فرار بھی میسر نہ تھا۔ مگر اس حالت مایوسی میں ایک سردار آیا تو اس نے اسپ و کشیر میں پکڑ کر باہر لایا۔ گھاٹیوں میں اتنے آدمی اور جانور مرے پڑے تھے کہ راستہ بند ہو گیا تھا اور گزر محال تھا تو زین خان کوکلتاش نے اپنے گھوڑے کو چھوڑ دیا اور پیدل چل کر دو پہاڑی پر چڑھ گیا۔ بڑی مشکل سے پہاڑی پر چڑھا اور وہاں جان بچائی لوگ بھی بڑے پریشان اور گھبراہٹ محسوس کر رہے تھے۔ شاہی فوج میں سے بعض لوگ تو سلامت و زندہ بچ گئے اور بعض سپاہی وافراد قیدی ہو گئے۔ حکیم ابوالفتح ملکندی بڑی مشکل سے کسی منزل پر پہنچے مگر بڑے افسوس کا مقام ہے کہ:

''راجہ بیر بر کا پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں ہلاک ہوا اور کب ہلاک ہوا۔ اس راستے میں بے شمار آدمی، جانور، افسر اور منصب دار ہلاک ہو گئے اور قیدیوں کا تو کوئی اندازہ و حساب نہ ہو سکا تھا۔ غرض شاہی فوج کو ایسی شرمناک شکست ہوئی کہ اکبری فوج میں ماضی بعید میں بھی ایسی کوئی شرمناک شکست نہ ہوئی تھی۔ شاہی فوج کی تعداد چالیس پچاس ہزار فوج میں کچھ نہ بچا۔ ساری فوج تباہ و برباد ہو گئی مگر زین خان کوکلتاش اور حکیم ابوالفتح کندی نے بڑی مشکل سے اٹک میں پہنچ کر جان بچائی اور افغانوں نے شاہی فوج کی اس قدر لوٹ مار کی کہ ان کی سات پشت کے لیے کافی ہو گی۔ مگر ان سب نقصانات سے بڑھ کر اکبر بادشاہ کے مصاحب اور ہمدرد و مونس دربار راجہ بیر بر کی ہلاکت کا تھا۔ اس کا بار غم تمام شاہی فوج اور اکبر بادشاہ کے لیے بہت ہوا تھا۔ اتنا غم اکبر بادشاہ کو ماضی بعید میں بھی کبھی نہ ہوا تھا۔

اکبر بادشاہ کا سوگ

راجہ بیر بر کی ہلاکت کی وجہ سے اکبر بادشاہ نے بڑا غم محسوس کیا بلکہ اکبر بادشاہ نے دو دن تک کھانا نہ کھایا۔ اس سلسلے میں مریم مکانی نے اکبر بادشاہ کو بہت سمجھایا۔ بندگان عقیدت کیش نے نالہ وزاری کی تو طبیعت کو مجبور کر کے کھانے پینے پر متوجہ ہوئے اکبر بادشاہ نے زین خان کوکلتاش اور حکیم ابوالفتح سے بات چیت بند کر دی اور ان سے سلام تک نہ لیا اور دیا۔ راجہ بیر بر کی لاش کی شاہی فوج نے بہت تلاش کی مگر کسی جگہ پر بھی میسر نہ ہوئی۔ جس کی وجہ سے راجہ بیر بر کی لاش کو نہ تو ہندوؤں کی رسوم کی طرح جلایا ہی گیا۔ اور نہ کسی دوسرے طریقے سے اس کو سپرد خاک ہی کیا گیا تھا۔ مگر راجہ بیر بر کے مخالف لوگ جن میں ملا صاحب شامل تھے وہ بادشاہ کے اس غم تاسف پر بڑے ناراض اور خفا تھے اور انھوں نے کہا کہ اس ہندو کا اس قدر کیوں رنج و افسوس کیا گیا ہے؟ کیونکہ جو لوگ سلام سے محروم ہو گئے تھے ان کی خطائیں معاف ہو گئیں اور چونکہ بیر بر کو تو ان کے آپس کے نفاق اور اختلافات نے ہلاک کیا اور وہ نفاق کی وجہ سے چند دنوں تک ساتھیوں کی نظروں سے دور اور مصائب میں گھرا رہا تو ہلاک ہونے کے بعد اس کا اس

قدر رنج کیا گیا کہ کسی اور کا ایسا رنج نہ ہوا مگر افسوس کی بات ہے کہ راجہ بیربر کی لاش کو بھی گھاٹی سے نہ نکالا جا سکا۔ اگر وہاں سے نکال لی جاتی تو اس کو ہندوؤں کی رسم کے مطابق آگ میں عزت کے ساتھ جلایا جا سکتا تھا۔ پھر آپ ہی تسلی دیتے تھے خیر ساری چیزوں سے آزاد، پاک اور الگ تھا۔ تیز علم کی روشنی اس کو پاک کرنے کے لیے کافی تھی اور پاک کرنے کی تو اسے کوئی ضرورت یا حاجت نہ تھی کیونکہ وہ شریف اور نیک آدمی تھا۔ لوگ جانتے تھے کہ راجہ بیربر بادشاہ کے لیے آٹھ پہر کا دل بہلاوہ ہے۔ اب جو بھی اس کے (اکبر بادشاہ) کے سامنے آتا اور وہ بادشاہ راجہ بیربر کی وجہ سے پریشان اور بے قرار دیکھتا تو بادشاہ کی دل تسلی کا اس کو احمق بنانے کے لیے مختلف قسم کی مصنوعی باتیں کر دیتے۔ جن میں جاتری اور سنیاسی طبقہ سرفہرست تھا۔ ایک جاتری آیا اور اس نے کہا کہ:

"میں جوالا جی سے آیا ہوں اور راجہ بیربر جوگیوں کے ایک غول میں چلا جا رہا تھا۔"

کوئی آ کر خبر دیتا ہے کہ میں نے اسے سنیاسیوں کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ بادشاہ اپنی بے قراری کی حالت میں سب کچھ سنتا اور اس کو سچ مان لیتا تھا۔ بادشاہ سلامت نے خود بیان دیا کہ:

راجہ بیربر علائق دنیا سے الگ تھا اور بڑا عزت والا شخص تھا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ وہ شکست کی شرمندگی کی وجہ سے فقیر ہو گیا ہو گا مگر احمق درباری اس بات کو اور ہوا دیتے اور ان پر طرح طرح کے حاشیے بھی لگاتے تھے۔

غرضیکہ ہر ایک شخص نے بروقت ان حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اکبر بادشاہ کو بڑا ہی بیوقوف بنایا مگر وہ بھی بیٹھا سنتا رہتا تھا۔ کسی کو کچھ نہ کہتا تھا بہرحال لوگوں نے اکبر بادشاہ کو خوب احمق بنایا۔

لاہوری افواہیں

لاہور میں نت روز افواہیں پھیلاتے رہے۔ آخر یہاں تک افواہ پھیلی کہ اکبر بادشاہ نے ایک آدمی کو کانگڑہ بھیجا تا کہ راجہ بیربر کو وہاں سے تلاش کر کے لایا جائے تا کہ بادشاہ سلامت کی بیقراری اور بے چینی ختم ہو مگر گئے آدمی کا کہاں مناتمن تھا وہ تو کسی جگہ پر بھی نہ مل سکا۔ اس کی زندگی (زندہ ہونے کا) ڈھکوسلا اور بادشاہ کا یقین ایسا مشہور ہوا کہ ہر جگہ پر یہ مشہور ہو گیا حتیٰ کہ کالنجر میں اس کی جاگیر تھی اور وہاں کے منشیوں کی عرضیاں آ گئیں کہ "راجہ بیربر یہاں تھا" ایک برہمن اسے پہلے سے خوب جانتا تھا اس نے تمیں ملنے میں خط و خال پہچانے اور کہا کہ "یہاں ضرور ہے مگر کہیں چھپا ہوا ہے۔" تو بادشاہ سلامت نے فوری طور پر کروڑی کے نام فرمان جاری کیا۔ اسی احمق نے ایک غریب مسافر کو اس کا ہم شکل سمجھ کر جو کہ مسافر تھا اور حماقت سے یا ظرافت سے بیربر سمجھ کر پکڑ رکھا۔ اب جب فرمان پہنچا اور اس کے بارے میں تحقیق کی تو سمجھا کہ یہ بیربر نہیں ہے اگر اس کو دربار میں لایا گیا تو بادشاہ سلامت کے سامنے شرمندگی شاید سزا کے طور پر نوکری سے ہی نکال دیا جاؤں۔ تو اس نے تصدق کو تو واپس کر دیا اور مسافر کو مفت میں بے گناہ کو مار ڈالا اور اس نے بادشاہ سلامت کو خط لکھا کہ:

"یہاں بیربر تو موجود تھا مگر تقدیر نے سعادت نے قدم بوسی سے محروم رکھا۔"

یہ سن کر دربار میں راجہ بیربر کی ماتم پرسی دوبارہ شروع ہو گئی۔ پھر اس کی میت کی تصدیق ہو گئی تھی اس لیے اس کی موت کی سوگواری شروع ہو

گئی۔ سروڑی اور نوکر کو وہاں سے اس جرم میں منگوائے گئے اور دریافت کیا کہ "بادشاہ سلامت کو وقت پر کیوں اطلاع نہ دی گئی؟" کیا تم قید میں تھے؟ اس کو سزا دی گئی اور ہزاروں کے حساب سے اس کو جرمانہ کیا گیا جو ادا ہونے پر رہا ہوا۔ گویا کہ راجہ بیربر اپنی علمی صفات کی وجہ سے ایک بڑا عجیب مسخرہ تھا اور اس کی ہلاکت بھی ایک مسخرہ پن ہی رہا۔ مگر اس کی ہلاکت کی وجہ سے لوگوں کی جانوں کو مفت میں مشکلات میں ڈال گیا اور پریشان کیا جاتا رہا۔

راجہ بیربر صاحب السیف القلم تھا

راجہ بیربر کا منصب تو اتنا اعلیٰ نہ تھا۔ صرف دو ہزاری اس کی تنخواہ تھی لیکن اس پر عنایت اتنی زیادہ تھی کہ وہ مہینوں میں عطا ہو جاتے تھے۔ راجہ بیربر صاحب السیف القلم تھے۔ یعنی وہ بڑی اہم قلمکار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ مراسلوں اور فرمانوں میں بڑا اہم کردار ادا کرتے تھے۔ بڑی شاندار تحریر میں فروانی تراشتے کرتے تھے۔ مثال کے طور پر راجہ بیربر نے عبدالرحیم خان خاناں کے نام چھ صفحے کا طولانی فرمان تھا جو کہ ابوالفضل کے دفتر میں موجود ہے۔ اکبر بادشاہ اسے ایسا محرم راز سمجھتا تھا کہ کسی طرح کا پردہ نہ تھا۔ اکبر بادشاہ اپنے آرام کے وقت حرم سرائے کے اندر بھی بلا لیتے تھے اور یہ حقیقت کی بات ہے کہ اس کے چٹکلوں کا یہی مناسب وقت ہوتا تھا جبکہ بادشاہ سلامت اپنی خلوت گاہ خاص اور مقام بے تکلف میں ہوتے تھے۔ گویا کہ راجہ بیربر کو اکبر نے اپنے مزاج اور پر تکلف مواقع کے لیے رکھا ہوا تھا جب اس کی طبیعت میں اچاٹ پیدا ہو جاتی تو اس کو بلا کر اس سے مزاح کی باتیں سن کر طبیعت کو محظوظ کرتے تھے اور دوبارہ کام کے لیے تازہ دم ہو کر کام میں لگ جاتے تھے۔ گویا وہ بڑا ہی دل لگی کا دلدادہ تھا اور اکبر بادشاہ کا چہیتا تھا۔

ملا صاحب کی راجہ بیربر کے ساتھ خفگی

ملا صاحب راجہ بیربر کے سخت مخالف تھے اور وہ اس کو بہت برا بھلا کہا کرتے تھے حتیٰ کہ وہ راجہ بیربر کو ملعون، کافر اور سگ بے دین بھی کہہ جاتا تھا۔ جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ سمجھتا تھا کہ راجہ بیربر اکبر بادشاہ کو وہ ہندوازم کی طرف مائل کرتا ہے اور بیربر دین الٰہی اکبر شاہی میں بھی داخل تھا۔ اور مرید باخلاص تھا۔ اور مراتب چہارگانہ کی منزلوں میں سب سے آگے دوڑے جاتے تھے۔ راجہ بیربر بنسی اور مزاح میں اس قدر رتیز تھا کہ وہ اسلام اور اسلام والوں کو بھی برا بھلا کہہ جاتے تھے اور ہر قسم کی مسلمانوں کے خلاف بات کرنے سے نہ جھجکتے تھے مگر مسلمان امیروں کو اس کی یہ چال نہایت بری لگتی تھی۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک دن شہباز خاں کہ وہ چار ہزاری منصب دار تھا جو کہ اکثر مہموں میں سپہ سالار بھی ہوتا تھا۔ اس کا نام شہر اللہ تھا اور لاہور کا باشندہ تھا۔ اس نے ایک دفعہ موقع پا کر دربار خاص میں راجہ بیربر کو بہت برا بھلا کہا جس کی وجہ سے راجہ بیربر کی طبیعت بھی اچاٹ ہو گئی اور اس کا اثر بادشاہ سلامت کی طبیعت پر بھی بہت برا ہوا اور اس کی طبیعت بے لطف ہو گئی وہ خود بھی راجہ بیربر کا طرفدار ہو گیا۔

اس سے ظاہر ہوا کہ راجہ بیربر کا بادشاہ کو ہندوازم کی طرف مائل کرتا تھا اور مسلمان امیر سردار اور درباری اس عمل کو بہت برا کہتے تھے جس کی وجہ سے ان کے درمیان اختلافات پیدا ہو چکے تھے دوسرے مذہبی اختلافات بھی تھے۔ اگرچہ راجہ بیربر بہت ہنسی مزاح کا ذریعہ تھا مگر ہندو ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے ہاں اس کی کوئی قدر اور وقعت نہ تھی۔

راجہ بیربر کو شرمندگی اور گھبراہٹ

بادشاہ اکبر نے ایک شہر رنڈیوں کے لیے آباد کیا جس کا نام شیطان پورہ رکھا گیا تھا لیکن بادشاہ یہ معلوم کرتے تھے کہ کون لوگ وہاں جاتے ہیں؟ اور امراء اور سرداروں کے لیے یہ سخت پابندی تھی کہ اس شیطان پورہ میں کوئی نہ جائے مگر جب شیطان کا عمل ہوتا ہے تو اس سے بڑے بڑے پھسل جاتے ہیں یہی واقعہ راجہ بیربر کے ساتھ پیش آیا اس نے بھی اپنا دامن شیطان پور کی برائی سے ناپاک کر لیا۔ یعنی وہ بھی وہاں چلا گیا اور لوگوں نے اسے دیکھ کر بادشاہ کے ہاں افشاں کر دیا جس کو بادشاہ نے بہت برا منایا۔ جس کی خبر راجہ بیربر کو دی گئی کہ:

"لوگوں نے تمہاری شیطان پور کی برائی کو بادشاہ سلامت کے ہاں افشاں کر دیا ہے۔ جس سے بادشاہ سلامت سخت تجھ پر خفا ہیں۔"

یہ سن کر راجہ بیربر بہت گھبرایا اور اس نے کہا کہ:

"اب میں جوگی بن کے زندگی گزاروں گا اور دربار میں نہیں آؤں گا اور جنگلوں میں رہوں گا۔"

بادشاہ سلامت کو جب راجہ بیربر کے خیالات کا علم ہوا تو بادشاہ کو ان کی جدائی کا شدت سے احساس ہوا جس کو وہ برداشت نہ کر سکتا تھا۔ آخر کار اس نے راجہ بیربر کو دلجوئی اور خاطر داری کے فرمان لکھے اور اس کو معاف کر کے واپس بلا لیا گیا جو اس کی قربت کی نشانی اور بادشاہ سلامت کے ساتھ اس کے گہرے تعلقات کا نتیجہ تھا۔

ہلاکت کے بعد اثرات

راجہ بیربر کے مرنے کے بعد یا اس کی جنگ میں ہلاکت کے بعد اکثر بادشاہ پر اس قدر بے قراری اور پریشانی کا عالم طاری ہوا کہ باقی تمام دیکھ کر حیران رہ گئے اور انھوں نے کہا کہ:

"اگرچہ بیربر بڑا ہی تجربہ کار، بہادر، علم اور مزاح کا دلدادہ تھا مگر اس سے بھی زیادہ تجربہ کار، بہادر، سردار دادا اس کے دربار میں موجود ہیں وہ اکثر اکبر بادشاہ کے سامنے ہی مرے تھے مگر اتنا کسی کا بھی تاسف نہ کیا گیا؟"

یہ کیا وجہ ہے کہ ان تمام میں سے کوئی بھی راجہ بیربر کے ہم پلہ نہ تھا اور ان کے صاحب کمال کوئی بھی نہ تھا۔ یہ بھی بات نامناسب نظر آتی ہے کہ:

"ہر ایک اپنے کام، کلام اور کرتب کا صاحب کمال ہوتا ہے اور ہر کام کے لیے خاص موقع ہوتا ہے مثلاً علما اور فقہاء کا جلسہ ہو، علمی تحقیقاتیں ہوں، شعر و شاعری ہو، وہاں خواہ مخواہ فیضی، ابوالفضل، شاہ فتح اللہ، حکیم ابوالفتح، حکیم ہمام یاد آئیں گے۔ راجہ بیربر ایسے باکمال شخصیت کے مالک تھے کہ:

"کچھ جانیں خواہ نہ جانیں، سمجھیں یا نہ سمجھیں دخل در معقولات کرنے کو موجود تھے مذاہب تقلیدی میں تو اعتراضوں کے زہر مشق بن رہے تھے۔ کتاب اور سند سے کچھ بحث نہ تھی۔ کیا ہندو کیا مسلمان وہ تمام زیر تحقیقات تھے۔"

اکبر نے راجہ بیربر کے لیے کیا کیا؟

مگر مقام تاسف ہے کہ راجہ بیربر کے لیے اکبر بادشاہ نے کیا خدمات سرانجام دیں جبکہ ان کے لیے اس نے جان تک قربان کردی۔ سنسکرت کے اشلوک تو درکنار، بھاٹ کا ایک دوہرا بھی ایسا نہیں جسے دلوں کی اُمنگ کسی خاص موقع پر دہرایا جا سکے۔ ان کے اکثر لطیفے ہی تھے جو کہ متھرا کے چوبوں اور مندروں مہنتوں کی زبان پر عام ہیں۔ جن کا وہ ورد کرتے رہتے ہیں مگر یہ تمام الفاظ تم کے کام تھے ان سے پیٹ تو نہیں بھرتا گویا کہ اس نے اپنے مزاح پسندی اور لطائف کی ظرافت سے اکبر بادشاہ کو گویا کہ اس نے اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ:

"اگلی (جون) (دنیا) میں بیربر راجہ تھا اور اکبر ان کے داس (غلام) تھے۔"

ان کے لطائف کا یہ طریقہ عام تھا کہ وہ کروٹیں بدلتے بدلتے لطیفہ گھڑ لیتے تھے جو کہ بڈھوں بڈھوں کو ہنسا لیتے تھے اور ان کی تاریخ دانی اور علم مجلس کا گراں قدر سرمایہ ہوتا تھا جس پر وہ فخر کیا کرتے تھے۔ مگر ان کے بہت کم لطیفے اور چٹکلے یاد کے طور پر موجود پائے جاتے ہیں۔

یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اتنے بڑے شہنشاہ اکبر جس نے پورے ہندوستان پر حکومت کی اور اس کا اس قدر راجم دربار مزاح پسند مشیر اور جس کی علمیت اور علمی کمالات کی شہرت کا پورے ہندوستان میں طوطی بول رہا تھا۔ اس کی تصانیف کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا اور نہ ان کا کوئی علمی سرمایہ ہی محفوظ کیا گیا ہے یہ معاشرے کی حماقت کا واضح ثبوت نظر آتا ہے۔

ولی عہد کی نوکری

راجہ بیربر کے دو بیٹے تھے جن کے نام بالترتیب یہ تھے۔

۱۔ لالہ رائے ۲۔ ہرسر رائے

بڑا بیٹا بھی حاضر دربار رہتا تھا مگر اس کے چھوٹے بیٹے کا یہ کام تھا کہ وہ دربار اور راجوں کی ملاقات وغیرہ میں خدمت سرانجام دیتا تھا۔

راجہ بیربر نے ۱۰۱۰ھ میں استعفا دے دیا اور کہا کہ:

"اب سادھو بن بھگوان کی یاد کیا کروں گا۔"

مگر بادشاہ نے خوش ہو کر اس کا استعفا منظور کر لیا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ راجہ بیربر اپنی ترقی نہ ہونے کی وجہ سے خوش نہ تھا مگر بادشاہ نے صرف اس کو عیاشی کی وجہ سے اس کی ترقی مناسب نہ سمجھی۔

غرض راجہ بیربر اکبر بادشاہ سے فارغ ہو کر الہ آباد میں جا کر ولی عہد کی نوکری کر لی۔ ابوالفضل کہتے ہیں کہ:

"تندخوئی اور خودکامی سے فضول خرچ ہے اور تمنا کو بڑھائے جاتا ہے۔ پیش نہیں جاتی۔ حماقت میں جا اور ادھر کا خیال باندھا اور وہ بات بھی نہ بن پڑی۔"

خدیو عالم نے رخصت فرماتے اس کے مرض کا علاج کیا۔

راجہ بیربر کی اگر تصویر کو غور سے دیکھا جائے تو وہ نہایت ہی بھدی شکل کا نظر آئے گا۔ مگر خدا کی قدرت اور شان کی تعریف کیے بغیر انسان

نہیں رہ سکتا کہ اس نے اس بھدے کو بدنما شکل کے مالک شخص کو اس قدر سمجھ اور دانائی کیوں کر عطا فرمائی جس کی وجہ سے وہ ہر ایک کے لیے مزاح اور تمام دنیا کے افراد اس کی ذہانت، سمجھداری اور دانشمندی کے قائل اور مداح سرا تھے اور اس سے ہر وقت خوش ہوتے تعریف و تحسین کرتے تھے تو یہ بھی قدرت کا کرشمہ ہے کہ ایک بھدے آدمی کو بھی زیرک بنایا۔

راجہ بیربر کے دوہڑے/اشعار

راجہ بیربر کے اشعار کا ذخیرہ تو کسی نے محفوظ نہیں کیا۔ شاید کسی نے اس طرف توجہ ہی نہیں کی ہوگی اگر اس کے لطائف اور مزاح کے نسخوں کا سرمایہ محفوظ کیا جاتا تو آج بھی دنیا جس طرح اس کی دیگر دانائی اور دانشمندی کے واقعات سے مستفید اور محظوظ ہوا کرتی ہے تو شاید اس کے دوہڑے اور اشعار سے بھی لوگ رہنمائی حاصل کرتے مگر ان کا اس سرمایہ کو بادشاہ اکبر کا فرض تھا کہ وہ اس معاملے میں کسی اہم آدمی کو مقرر فرماتے جو اس اہم کام کو راجہ بیربر کے تعاون سے کرتا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اکبر بادشاہ بھی اس کو اپنے لطف و مزاح کے لیے استعمال کرتا رہا اس کے لیے اس نے بھی کوئی اہم کام سرانجام نہیں دیا۔ بہر حال ان کے چند دوہڑے/اشعار جو میسر ہوئے سپرد قلم کیے جاتے ہیں۔

گھی میں غرق سوار میں بیٹھاہ بن بیلن وہ بیلا ہے
کہیں بیربل سنیں اکبر یہ بھی ایک پہیلا ہے
یہ اب حسن پہ اپنے گھمنڈ کرتے ہیں
کہ اپنے شیش محل ہی میں ڈنڈ کرتے ہیں
کھلا کے مال پوے تر تراتے موہن بھوگ
گرو جی چیلوں کو اپنے بھنڈ کرتے ہیں
شراب ان کو کبھی مت پلائیو انشاء
کہ وہ تو مست ہو مجلس کو بھنڈ کرتے ہیں

☆ ☆ ☆

باب ۲

شیخ مبارک اللہ عرف شیخ مبارک

۱۔ اس کا وطن یمن تھا۔

۲۔ وہ عطن ترک نژاد خاندان کے چشم و چراغ تھے۔

۳۔ انھوں نے ۱۲۰ سال کی عمر پائی۔

۴۔ اس نے خطیب ابوالفضل کے ہاں ملازمت اختیار کر لی۔

۵۔ شیخ مبارک بڑا اچھی عالم دین اور پرہیزگار، تقویٰ کا پابند شخص تھا۔

۶۔ شیخ مبارک بڑے مدبر عالم اور خوشامد کے خلاف تھا۔

۷۔ چار باغ میں مستقل سکونت رکھی۔

۸۔ سکندر لودھی کے وقت میں ناگور کو اپنا وطن بنایا۔

۹۔ انھوں نے سالار ناگوری سے خدا شناسی کی آنکھیں روشن کیں۔

۱۰۔ ایران توران اور دوسرے ملکوں کا دورہ کر کے عقل و آگاہی کا سرمایہ جمع کیا۔

حالات پس منظری

شیخ مبارک اللہ کے خاندان کا مدت تک وطن یمن کی زمین رہی۔ شیخ پانچ پشت میں ان کے دادا تھے۔ انھیں ابتدائے حال میں خلق سے وحشت ہوئی تو انھوں نے گھر اور گھرانے کو چھوڑ کر غربت اختیار کرلی۔ علم وعمل کو ورفہ وقت میں لیا یعنی انھوں نے علم حاصل کرکے اس پر عمل کرنا اختیار کیا اور نویں صدی میں علاقہ سندھ کے قصبہ "ریل" میں جا کر وہاں گوشہ نشین ہوگئے اور حق پرستان حقیقت کیش سے روتق کا پیوند لگا کر خانہ داری اختیار کر لی۔ ریل ایک دلچسپ آبادی علاقہ سیوستان میں ہے اور شیخ موسے اگرچہ جنگل سے شہر میں آ کر آباد ہوئے تھے مگر دنیا کے تعلقات میں نہ پھنس سکے۔ کیونکہ وہ آگاہی کے سجادہ تھے اور بے دل زندگی کو نقش بوقلموں کی اصلاح میں صرف کرتے تھے وہ صاحب اولاد تھے ان کے بیٹے اور پوتے بھی تھے۔ وہ بھی انھیں کے عمل درآمد کو آئین سمجھتے تھے۔

دسویں صدی کے شروع میں شیخ فقیر کو یہ خیال ہوا کہ ہند کے اولیاء کرام رحمتہ اللہ علیہ سے بھی شرف ملاقات حاصل کرکے فیض یاب ہوا جائے۔ اور عرب کی سیر کرکے اپنے بزرگوں کی نسل سے ملاقات کریں تو وہ اپنے کئی رشتہ داروں اور دوستوں کے ہمراہ ہند میں آئے۔ جب وہ ناگور میں پہنچے تو وہاں انھوں نے کئی بزرگوں سے شرف ملاقات حاصل کیا اور ان سے فیض یاب ہوئے تو ان بزرگوں نے ان کو شعری صعوبتوں میں پڑنے سے روک دیا جس کی وجہ سے انھوں نے اسی جگہ ناگور میں سکونت اختیار کرلی اور لوگوں کی ہدایت کا کام کرنے لگے۔ ان کی بہت سی اولاد فوت ہوئی۔ مگر قضائے الٰہی سے دارالبقا کو سدھار گئی۔

پیدائش

۹۱۱ھ میں شیخ مبارک نے اس دار فانی میں قدم رکھا۔ اور ان کا نام مبارک اللہ رکھا گیا۔ جس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ مبارک کرے۔ چار سال کی عمر میں بزرگوں کی قوت تاثیر سے عقل و آگاہی میں اضافہ ہوا شروع نو سال کی عمر میں سرمایہ کمال تک پہنچ گیا اور ۱۴ برس کی عمر میں علوم رسمی میں مہارت حاصل کرلی اور ایک علم میں ایک ایک متن یاد کرلیا۔ عنایت ایزدی ان کی قافلہ سالار تھی۔ بہت سے بزرگوں کی خدمت میں آمد ورفت رکھتے تھے اور ان سے فیض حاصل کرتے رہتے تھے مگر مبارک اللہ شیخ عطن کے پاس زیادہ آمد و رفت کرتے رہتے تھے اور ان کی تعلیم سے دل کی پیاس اور زیادہ ہوتی تھی۔

شیخ عطن ترک نژاد تھے۔ ۱۲۰ برس کی انھوں نے عمر پائی۔ انھوں نے سکندر لودھی کے زمانہ میں ناگور کو وطن اختیار کیا اور شیخ سالار ناگوری سے خدا شناسی کی آنکھیں روشن کیں۔ ایران و توران اور دور دور کے ملکوں سے عقل و آگاہی کا سرمایہ حاصل کرتے تھے جو کہ مایہ زندگی تھا۔ اس عرصہ میں شیخ خضر کو پھر سندھ کا خیال آیا کہ چند رشتہ دار وہاں ہیں انھیں جا کر لے آئیں مگر یہ سفر ان کا آخرت کا سفر شمار ہوا۔ جس کی وجہ تو قضائے الٰہی مگر

وہاں ظاہری طور پر ناگور میں سخت قحط پڑا اور قحط کے ساتھ ہی وبا بھی پھوٹ پڑی اس وبائے عام میں آدمی کو آدمی نظر نہ آتا تھا اور لوگ اپنے گھر خالی کر کے چھوڑ کر وہاں سے بھاگ نکلے بڑی آفت میں شیخ مبارک اور ان کی والدہ زندہ بچ گئے اور باقی سب خانہ افراد فوت ہو گئے تھے۔ مگر اس حالت میں بھی شیخ مبارک کے دل میں تحصیل علم اور جہاں گردی کا شوق جوش مار رہا تھا مگر ان کو والدہ مانع تھی اور ان کو باہر جانے کی اجازت نہ دیتی تھیں اور والدہ کی اجازت کے بغیر جانا ان کے لیے مناسب نہ تھا اور نہ وہ اس قدر خود سر اور گستاخ بھی نہ تھے بلکہ وہ والدہ کے بڑے ہی تابع فرمان بیٹے تھے۔ اس لیے وہیں انھوں نے قیام رکھا اور والدہ کی خدمت بھی کرتے رہے اور اسی جگہ پر قیام کر کے علم کے حصول اور کسب فنون نہایت محنت اور کوششوں کو بروئے کار کرتے رہے۔ فن تاریخ اور عام حالات سے ایسی آگاہی حاصل کی جس کی بدولت دنیا میں شہرت پائی اور چند دنوں کے بعد خواجہ عبداللہ احرار کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ وہ ان دنوں نوشدا روسے حقیقت کی تلاش میں سیاحی کرتے ہوئے ہندوستان میں آ نکلے تھے۔ ان سے تلاش الٰہی کا رشتہ معلوم کیا اور ان سے فیض معنوی حاصل کیے۔ اسی دوران میں والدہ فوت ہو گئی۔ تو والدہ کی وفات سے شیخ مبارک کی حالت بڑی ہی پریشان ہو گئی اور اس پر ایک قسم کی وحشت سی طاری ہو گئی تو اس وقت اس نے دریائے اسود کا رخ اختیار کر لیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ کرۂ ارض کا سفر کیا جائے اور ہر باکمال آدمی سے ملاقات کر کے اس سے فیض کمال حاصل کیا جائے۔ جب احمد آباد گجرات میں ڈیرے لگائے تو چونکہ گجرات شہر اپنی شہرت کے لحاظ سے اہل کمال لوگوں سے بھرا پڑا تھا اور ان کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی اور اس کے پاس علم و فضل کا ہر قسم کا کمال تھا۔

وہاں حضرت سید احمد گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ تھی جس سے لوگ جوق در جوق فیض یاب ہوتے تھے اور ان کے ہم وطن بھی تھے۔ لہٰذا وہاں انھوں نے سفر کا اختتام کر لیا اور بڑے بڑے باکمال لوگوں سے ملاقات کی اور تحصیل علوم و تدریس کا سلسلہ شروع کر لیا۔ چاروں اماموں کی کتب دینیہ کا اصول وغیرہ مطالعہ کیا اور ایسی کوششیں کیں کہ ان میں ہر ایک میں اجتہاد کا مقام حاصل کر لیا یعنی وہ اس قدر ماہر علوم ہو گئے کہ ان میں اجتہاد کا ملکہ پیدا ہو گیا۔ انھوں نے اپنے بزرگوں کی پیروی کر کے حنفی طریقہ ہی اختیار کیا مگر عمل میں ہمیشہ احتیاط کرتے رہے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ جو کچھ نفس سرکش کو مشکل ہو وہی ہو۔ اسی عرصے میں علم ظاہری سے علم معنوی کی طرف گزر ہوا۔ آپ نے بہت سی کتب تصوف اور علم اشراق کی پڑھیں اور عمدہ اور اعلیٰ قسم کی تصانیف جن میں منطق اور الٰہیات تھیں ان کا شوق سے عمیق مطالعہ کیا خصوصی طور پر حقائق شیخ محی الدین عربی اور شیخ ابن فارض اور شیخ صدر الدین قونوی اور بہت سے اہل حال اور اہل قال کی تصنیفات نظر سے گزریں۔ جتنے نکات کا عقدہ حل ہوا اور دل سے کئی غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔

ملازمت

شیخ مبارک کے لیے یہ بڑا ہی سنہری دور تھا کہ اس نے خطیب ابوالفضل گازرونی کے ہاں ملازمت اختیار کر لی اور انھوں نے اس کی اہلیت اور دانشمندی کو بڑے غور سے اعزاز دیا اور انھوں نے مردم شناسی اور آدم شناسی کا فراخدلی سے ثبوت دیتے ہوئے عالی ظرف ظاہر کیا۔ انھوں نے اس کو بہت سی معقولات کا علمی سرمایہ دیا اور انھوں نے ہزاروں بار کیا، تجرید، شفا، اشارات، تذکرہ اور مجسطی کی کھولیں۔ شیخ مبارک شیراز سے گجرات آئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس ملک میں علم و حکمت کا خزانہ تقسیم کیا اور دانش و دانائی کو نئی روشنی دی۔ انھوں نے انبوہ زمانہ کے بے شمار

دانشمندوں اور علماء و فقہاء سے ملاقات کر کے ان سے فیض یاب ہوئے تھے اور ان سے بہت کچھ علمی فنون و نقاط کو حل کرنے کے طرائق سیکھے تھے مراحل میں انھوں نے علوم حقیقی اور فنون عقلی میں حضرت مولانا جلال الدین دوانی کی شاگردی کی تھی۔ وہ بڑے اعلیٰ پایہ کے عالم اور علوم و فنون میں کمال آخر رکھتے تھے تو شیخ مبارک نے زمانے بھر کے علماء و فقہاء سے علوم حاصل کر کے دسترس حاصل کر لی تھی اور وہ باکمال صلاحیت کے مالک شخصیت کے حامل ہو گئے تھے۔

چار باغ میں قیام مستقل

شیخ مبارک نے گجرات میں عالموں اور فقہا، سیدہ بزرگوں کی خدمت میں رہ کر سعادتوں کے خزانے حاصل کیے اور تصوف کے کئی سلسلوں کی سند حاصل کی۔ شیخ عمر ٹھٹوی کی خدمت سے بڑا نور علم حاصل کیا اور سلسلہ کبرویہ کا چراغ روشن ہوا۔ وہاں ایک شیخ یوسف مجذوب کبرویہ ست جو کہ آگاہ دل ولی کامل تھا۔ ان کی خدمت میں بھی حاضر ہو کر فیض یاب ہونے لگے اور ان کی صحبت سے خیالات میں یہ تبدیلی آئی کہ:

علمی معلومات کو چھوڑ کر علوم حقیقی کا رخ کیا جائے اور دریائے شور کا سفر اختیار کیا جائے مگر شیخ موصوف یوسف مجذوب نے فرمایا کہ:

"دریا کے سفر کا دروازہ اور در وزہ تمھارے لیے بند ہو چکا ہے بلکہ آگرہ میں جا کر ڈیرے لگاؤ۔ اگر وہاں تمہارا مقصد پورا نہ ہوا تو ایران و توران کا سفر اختیار کرو اور جہاں کا حکم ہو وہاں جا کر قیام کرو اور اپنی حالت علوم رسمی کی چادر کا پردہ کر لو (تنگ ظرفوں کے دل حقائق معنوی کی برداشت نہیں رکھتے۔) آخر کار ۲ محرم ۹۵۰ھ کو آگرہ پہنچے۔ یہ ان کی قسمت کے عروج کا پہلا دور تھا۔ شیخ مجذوب علاؤ الدین سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے فرمایا کہ:

"اس شہر میں قیام مستقل کرو اور سفر کا خاتمہ کر دو۔ اور اس نے ایسی بشارتیں دیں کہ وہاں سے آپ کا قدم اٹھانا یا روانہ ہونا مناسب نہ سمجھا۔"

چنانچہ شہر کے مقابل میں دریائے جمنا کے اس پار کنارہ پر چار باغ کی بستی تھی وہاں میر رفیع الدین صفوی چشتی انجوی کے ہمسائے میں قیام کر لیا وہ ایک قریشی گھرانہ تھا جو کہ علم و حکمت کے سرچشمے سے مالا مال تھا۔ وہاں شیخ مبارک سے شادی کر لی۔ چند موصوف محلہ کے رئیس تھے ان کے رہنے کو غنیمت سمجھا اور لوگوں سے آشنائی ہوئی تھی جو کہ آشنائی رونق میں بدل گئی۔ گرمجوشی اور دریا فشانگی سے ربو ہو گیا۔ وہ صاحب دولت اور صاحب دستگاہ تھے۔ انھوں نے اپنے رنگ میں ملانا چاہا۔ مگر انھوں نے نہ اتفاق کیا بلکہ انکار کر دیا اور توکل کے آستانہ کو چھوڑنا مناسب نہ جانا کیونکہ آپ کے اندر حق شناسی کے شغل تھے اور ظاہری طور پر درس و تدریس کے دلدادہ تھے جس کو جاری کرنا ضروری سمجھتے تھے۔

ابوالفضل کی پیدائش

۹۵۴ھ میں جب سید موصوف کا انتقال ہوا تو شیخ مبارک نے پھر گوشہ عزلت (تنہائی) اختیار کر لیا۔ ان کا بڑا کام یہ تھا کہ وہ ہر وقت باطن کو صاف کرتے رہتے تھے اور ظاہر کو پاک رکھتے تھے۔ روئے نیاز کا ساز حقیقی کی طرف کیا اور علوم و فنون کے درس میں اپنا دل بہلانے لگے۔ کسی سے بات

چیت نہ کرتے تھے۔ خواہش نفسی کی زبان کا دل، اپنی خواہش کا احترام نہ کرتے تھے۔ اگر کوئی ان کے معتقدوں میں سے کوئی نذر و نیاز لاتا جو کہ ان کے خلوص کا مظاہرہ ہوتا تھا تو صرف ضرورت کے مطابق رکھ لیتے تھے اور بقایا از ضرورت کو ان کو واپس کرتے تھے اور اگر لوگ رکھنے کے لیے اصرار کرتے تو ان سے معذرت کرتے تھے اور ان کے ساتھ کسی قسم کی محبت روا نہ رکھتے تھے ۹۵۴ھ بمطابق ۱۵۴۷ء کو ۳۳ برس کی عمر میں فیضی اور ۹۵۸ھ میں بمطابق ۱۵۵۱ء کو ابوالفضل ۳۷ سال کی عمر میں پیدا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں قابل اور لائق بیٹے عنایت فرمائے جو کہ باپ کی خوش قسمتی کی نشانی تھی کیونکہ دونوں نے باپ کے نام کو روشن کیا۔ انھوں نے دنیا میں شہرت کے مینار گاڑ دیے اور رہتی دنیا تک اپنا اور باپ کا نام زندہ رکھا۔

شیخ مبارک کا روزمرہ کا معمول

آپ کو چند دنوں میں شہرت کو چار چاند لگ گئے اور ہر ایک نے آپ کے دروازے پر آکر دستک دینی شروع کر دی اور تمام دانشور اور عقلمند آدمی نے آپ کے آستانے کا رخ کر لیا اور جمع رہتے مگر دنیا میں مختلف قسم کے لوگ ہوتے ہیں تو ان میں بعض ان کی شہرت سے جلنے والے تھے جس کو حاسد کا نام دیا جاتا ہے تو وہ ان کی شہرت سے بہت جلتے تھے تو انھوں نے سازشیں کرنی شروع کر دیں۔ ان میں بعض نے تو اپنے اختلافات ختم کر لیے اور بعض الگ ہو گئے۔ مگر شیخ مبارک بالکل ہی بے نیاز شخص تھے اس کے ان لوگوں کے تعلقات اور حالات کا کوئی فکر ہی نہ تھا۔ اس نے ان کے اس عمل سے ذرا برابر بھی ملال محسوس نہ کیا اس نے کوئی رنج محسوس نہ کیا اور نہ ان کے جلنے سے وہ خوشی ہی محسوس کرتا تھا۔

شیر شاہ اور سلیم چشتی نے چاہا کہ:

''یہ خزانہ شاہی سے کچھ حاصل کرنا چاہیں تو ان کو عطا کیا جائے اور جاگیر مقرر ہو جائے۔ مگر اس مرد قناعت پسند نے انکار کر دیا کیونکہ وہ تو توکل کے بندے تھے۔ اس سے آپ کی ترقی کو اور روشنائی ملی اور عزت و احترام کو شان بخشی ہوئی۔ لوگوں کی نگاہ میں بڑی آؤ بھگت بڑھی۔''

آپ کی پرہیزگاری اور احتیاط کا یہ حال تھا کہ:

بازار میں کہیں سے گانا سن لیتے تو وہاں سے فوری طور پر بھاگ جاتے تھے۔ تاکہ ان کے کانوں میں گانے کی آواز نہ پڑے۔ اور وہ گنہگار نہ ہو جائیں اور ان کے چلنے کا یہ خاص طریقہ تھا کہ ان کا دامن اونچا اور پائجامہ اونچا کر کے چلتے تھے۔ تاکہ ان کا پائجامہ ناپاک یا پلید نہ ہو جائے۔ اور پرہیزگاری اور عبادت میں خلل محسوس نہ کریں۔ اگر کوئی شخص محفل / مجلس میں نیچا پائجامہ پہن کر آئے تو جتنا پائجامہ بڑا نیچے ہوتا اس کو کاٹ دیتے تھے۔ لال کپڑوں کے بڑے مخالف تھے اگر کسی کو پہنے دیکھ لیتے تو خود ہی طور پر ناراض ہو کر اس کے لال کپڑے اتروا دیتے تھے۔ اس حالت کو دیکھ کر ظاہر پرست اور ابوالہاس لوگ بڑے جلتے تھے اور بہت ہی گھبراتے تھے کیونکہ اس انداز سے ان کی مجلس اور مباحثوں کے جھگڑے اور دکانداری کی چمک روشن نہیں ہوتی تھی۔ جس کو وہ روشن کرنا چاہتے تھے البتہ حق کی بات کرنے اور بدکاروں کی ملامت کرنے میں وہ بالکل نرمی یا کمی نہ کرتے تھے اور جو کچھ بھی حق ہوتا تھا اس کو بیان کرتے تھے جو کچھ وہ دیکھتے اس کے مطابق وہ حق کی صورت میں کہہ جاتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ بڑے چھوٹے امیر غریب کی قطعاً پرواہ نہ کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے بعض لوگ ان سے خوش نہ ہوتے تھے اور بعض سمجھدار اور عقلمند صاحب لوگ ان کی بڑی قدر بھی

کرتے تھے۔ چونکہ محض ان کے تقویٰ اور پرہیز گاری کا ہی ثمرہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو لوگوں کی نگاہوں میں محبوب بنا رکھا تھا یہ تو اللہ تعالیٰ کی خدمات کاملہ ہے کہ وہ جس کو مرضی عزت عطا فرمائے اور جس کسی کو وہ بے عزت کر دے چونکہ اس کے اعمال کا نتیجہ ہی ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو بلاوجہ ذلیل نہیں کرتا وہ تو ایک مہربان اور رحم آتی ہے۔

شیخ مبارک سے عداوت

اس دور کے چند علماء اور فضلاء ایسے تھے جن کو شاہی دربار میں دخل تھا اور وہ اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے بڑی ہی اہمیت کے حامل افراد تھے۔ ان شخصیات میں ذیل کی بڑی اہم تھیں۔

ا۔ مخدوم الملک ۲۔ عبداللہ سلطان پوری ہمایون

۳۔ شیر شاہ ۴۔ سلیم چشتی ۵۔ شیخ عبدالنبی

اس دور میں درباروں میں شریعت کے مالک تصور ہوتے تھے۔ اس وقت شیخ عبدالنبی کی اس قدر تعظیم کی جاتی تھی کہ لوگوں کے دلوں میں ان کی بڑی عزت و احترام تھا کیونکہ انھوں نے اپنے علمی کمالات اور درباری زور کے تحت اپنے درس و تدریس، مسجدوں کی امامت، خانقاہوں کی نشست اور مجلسوں کے وعظوں سے دلوں کو قابو میں کر رکھا تھا لوگ ان کے گرویدہ ہو چکے تھے اور اس وقت ان کا عوام میں اس قدر اثر و رسوخ اور زور تھا کہ:

> ''اگر وہ چاہتے تو احکام سلطنت پر خلاف شرع کا کوئی فتویٰ بھی لگا دیتے تو لوگ اسی وقت ان کا تختہ الٹنے پر تل آتے تھے۔ ان کی معرفت (طفیل) اکثر کام بادشاہی رعایا سے آسانی سے نکل آتے تھے۔''

ان مصلحتوں پر نظر رکھتے ہوئے بادشاہ وقت بھی ان کا احترام کرتے تھے اور ان کے ساتھ نرم رویہ رکھا جاتا تھا۔ گویا اس وقت یہ حضرات حکومت پر پوری طرح حاوی تھے ان کے احکامات کے مطابق فیصلے مقدمات کے صادر ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ جب یہ لوگ بادشاہوں کی محفل کو برخاست کر کے اٹھتے تھے تو بڑے ارکان سلطنت اور بعض اوقات خود بادشاہ ان کے لب فرش تک پہنچانے آتے تھے اور بعض اوقات خود بادشاہ وقت موقع پر ان کے سامنے جوتیاں سیدھی کر کے رکھتا تھا۔

شیخ مبارک کی بے اعتنائی

حالانکہ شیخ مبارک ان لوگوں کی نسبت اعلیٰ علوم و فنون اور کمالات و جمال میں بہتر تھا مگر اس کی کوئی ان کے ہاں قدر و قیمت نہ تھی۔ اس کی تقاریر و تحریر کی بے نظیر تھی مگر ان لوگوں کے لیے وہ کچھ نہ تھا اور یہ لوگ اس کے لیے کچھ کام کے نہ تھے۔ اس کے خیالات پر یوں روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے جو کہ اس کو سمجھا جا سکے۔

شیخ مبارک ان لوگوں کو خاطر میں نہ لاتا تھا بلکہ ان کی قطعاً پرواہ نہ کرتا تھا اس کی بے اعتنائی کا عالم تھا کہ:

''کہتا تھا کہ یہ ملا مولانے دسترخوانوں کی مکھیاں ہیں یعنی یہ تو صرف کھانے کے بھوکے ہیں اور یہ ہر وقت عام علماء بیان مسائل اور فتاوٰی میں ملائے مخدوم اور شیخ صدر کا منہ دیکھتے ہوں گے۔'' تو شیخ مبارک ان کے کردار کشی کرتے ہوئے بالکل پرواہ نہ کرتے تھے اور یہ بالکل سچ بھی تھا کہ:

جس کا علم وعمل ہر وقت حق پرستوں کا دائرہ گرد رکھتا ہو اور خود دنیا کی دولت اور جاہ ومنصب کی ہوس نہ رکھتا ہو اسے کیا ضرورت ہے کہ جس گردن کو خدا نے سیدھا پیدا کیا ہے۔ اسے اوروں کے سامنے ذلیل کرے اور ان کے سامنے جھکائے جو کسی کام کے لوگ نہ ہوں اور وہ رائے جسے قدرت سے آزادی کی سند ملی ہے اسے دنیا کے لالچ کے لیے نااہلوں کے ہاتھ بیچ ڈالے۔ یہ ایسے حق پرست شخصیات سے نہیں ہوتا تاکہ وہ اس قسم کے عمل کو پسند ہی نہیں کرتے ہیں یہ ان کی فطرت اور طبع کے بالکل مخالف بات ہوتی ہے۔

شیخ مبارک کی بدنامی

ان حالات میں اگر کسی غریب ملا یا مشائخ پر مخدوم یا صدر کوئی بھی سخت قسم کی گرفت کرتا تو وہ بے چارہ بے بس ہو کر شیخ کے پاس امداد کے لیے آتا تو شیخ مبارک کی شوخ طبیعت کا یہ طرہ تھا کہ وہ مسجد میں ہی بیٹھے بیٹھے ایک اس مظلوم کو ایسا نکتہ بتا دیتے کہ جب وہ جا کر جواب پیش کرتا تھا کہ:

''حریف کبھی فقہ کی بغل جھانکتے تھے یا پھر حدیث کا سہارا لیتے مگر کہیں سے ان کو جواب نہ مل پاتا تھا۔ اور ایسی ایسی باتوں سے رقیب ہمیشہ اس کی ناک میں گھسے رہتے تھے اور طرح طرح کی تہمتوں سے طوفان برپا کرتے تھے۔''

چنانچہ ابتداء میں مہدویت کی تہمت انھوں نے شیخ مبارک پر لگائی جبکہ اس تہمت کی اصلی وجہ یہ تھی کہ:

''شیر شاہ کے عہد میں شیخ علائی مہدوی ایک فاضل تھے وہ جس طرح علم وفضل میں صاحب کمال تھے اسی طرح پرہیزگاری میں بھی حد سے بڑھے ہوئے تھے اور حدت طبع نے اس کی سحر بیانی کو آتش زبانی کے درجے تک پہنچا دیا تھا۔''

یہ ثابت نہیں ہوتا کہ شیخ مبارک ان کے معتقد یا مرید تھے کہ تاریخ ہند اس بارے میں خاموش ہے۔ لیکن خواہ اس وجہ سے کہ طبیعت ہم جنس طبیعت کی عاشق ہوتی ہے اور ہم جنس طبیعتوں میں مقناطیسی کشش ہے خواہ اس سبب سے کہ مخدوم الملک ان کے قدیمی رقیب ان کے دشمن ہو گئے تھے۔ غرض تیز طبع پرہیزگاروں میں محبت اور صحبت کا سلسلہ ضرور تھا۔ اور شیخ مبارک اکثر مجلسوں اور معرکوں پر اس کی رفاقت میں شامل ہوئے تھے جو بات اس کی حق اور سچی ہوتی تھی اس کی وہ بلاخوف وخطر تصدیق کرتے تھے اس میں کوتامل یا جھجک نہ محسوس کرتے تھے با اقتدار دشمنوں کی مطلق پرواہ کرتے تھے اور نہ ان سے ڈرتے ہی تھے بلکہ جب اپنے جلسوں میں بیٹھتے تھے تو حریفوں پر لطیفوں کے پھول پھینکتے تھے جس کا نتیجہ ہوا کہ شیخ علائی بے چارے مارے گئے اور ان کو دشمنوں نے مفت میں بدنام کرنا شروع کر دیا کیونکہ دشمن اقتدار میں تھے اور یہ بے بس محض اپنی عیست اور کمال فنون میں ہی عوام کی رہنمائی کرتے تھے۔ مگر عوام بے چارے تو حکام کے ہاتھوں مجبور اور بے بس ہوتے ہیں بلکہ حکام کی نگاہوں میں تو عوام کی غلام کی سی حیثیت ہوتی ہے۔ جس طرح حکام کی مرضی ہو وہ عوام کو اسی طرف ہانک لیتے ہیں۔ خواہ ان کا فائدہ ہو یا نقصان۔ کیونکہ حکام نے اپنے شاہی مفاد کو مدنظر رکھنا ہوتا ہے اور عوام کی بہبود کا برائے نام کوئی جواب غلط حاشی کر کے محفوظ کر لینا ہوتا ہے۔ جس سے بے شک جتنا بھی عوام کا نقصان ہو۔ اس سے ان کو کوئی غرض نہیں۔ اس کی واضح مثال آج کل کی حکومت اور عوام سے مل سکتی ہے کیونکہ ہمارے حکام بھی محض اخباری بیانات پر ہی لوگوں کو

مطمئن کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اگر حکومت کوئی الٹا سیدھا اخبار میں بیان دے دے اور اس بیان کا کہیں بھی اطلاق نہ ہو جو کہ عموماً ایسا ہی ہوتا ہے یا اس حکم کا جزوی طور پر عمل ہوتا ہے۔ زیادہ اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس کی بھی ٹھوس وجوہات ہو سکتی ہیں کہ یا تو وہ حکم ہی ناقص ہوگا یا پھر اس پر عمل کرنے والے ذمہ دار افراد ہی نااہل اور اپنے کام سے پرخلوص نہ ہوں گے۔ بہرحال جو کچھ ہو میست کی قدر ضروری ہوتی ہے خواہ وہ حکومت کا مخالف ہی کیوں نہ ہو۔

ہمایوں کے دورِ حکومت میں شیخ مبارک

پہلے ہمایوں کا دورِ حکومت تھا اور اس کے بعد شیر شاہ اور سلیم شاہ کا دورِ اقتدار آیا۔ ان کے دور میں ملک میں بڑے تغیرات رونما ہوئے جن کی وجہ سے عوام کو بڑی پریشانیاں لاحق ہوئیں۔ ان پریشانیوں کے اضافے کی ایک وجہ تو علماء زمانہ کا شاہی دربار پر دور بھی تھا۔ جس کی وجہ شیخ مبارک تنہائی میں بیٹھ کر اپنی زندگی بسر کرتے رہے کیونکہ وہ دنیادار بزرگ نہیں تھے مگر وہ اپنی زبان اور قلم سے حقیقت کا اظہار ضرور کرتے رہتے تھے۔

ہمایوں کا جب دوسرا دور آیا تو اس کے حالات نے بھی کروٹ لی اور شیخ مبارک نے اپنے مدرسے کو رونق بخشی۔ اس کے ساتھ ایران اور ترکستان کے دانا لوگوں نے بھی ساتھ دیا جس کی وجہ سے علوم و فنون میں بڑا چرچا ہوا اور ان کی مدرسے کی بھی بڑی شہرت ہوئی۔ مگر قضائے الٰہی کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تو اسی دور میں ہمایوں بادشاہ کا انتقال ہو گیا تو بہتوں نے بغاوت کر دی اس بغاوت کی حالت میں مدرسوں کی رونق ماند پڑ گئی۔ لوگ بے کار ہو کر گھروں میں بیٹھ گئے اور کچھ شہر چھوڑ کر باہر نکل گئے مگر شیخ کو اس قدر شہرت حاصل ہو گئی تھی کہ بہتوں بھی ان سے رابطہ کرنے پر مجبور ہو گیا تھا اور اس نے بھی اس سے راہ و رسم پیدا کر لیے اور شیخ مبارک کی سفارش پر اکثر اشخاص کی جان بخشی اور خلاصی بھی کر دی۔ مگر اس سے بھی بات نہ بن سکی۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ملک میں قحط پھوٹ پڑا اور تباہی عام خلقت پر اور خاص لوگوں کے لیے خصوصاً ارزاں ہو گئی۔ گھر اور گھرانے فنا ہو گئے اور اس قدر ملک میں ویرانی ہوئی کہ چند گھر بچ گئے۔ مگر شیخ کے گھر میں افراد کی بھرمار تھی یعنی ان کے اکیلے گھر میں ستر افراد موجود تھے۔ مگر وہ قناعت و صبر و ضبط سے اس قدر بے پرواہی سے گزران ہوتا تھا۔ شیخ مبارک کی اس بے پرواہی سے گزارے کو دیکھ کر لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ:

''شیخ مبارک کیمیا گر ہیں۔ یا دوسرا کہتا تھا کہ وہ تو جادوگر ہے۔'' اس کا حال یہ تھا کہ دن میں صرف ایک سیر ہی غلہ آتا تھا۔ اس اناج کو مٹی کی ہانڈی میں ابالتے تھے اور اسے آب جوش کو آپس کے افراد میں بانٹ لیتے تھے اور آرام و سکون سے کھا لیتے تھے اور اس قدر آسودہ اور خوشحال نظر آتے تھے کہ ان کو خوراک کا کوئی کسی قسم کا مسئلہ ہی نہیں ہے۔ کسی بھی فرد خانہ نے بھی روزی کی شکایت نہیں کی۔ صرف سارا دن گھر میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اوراد کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور ہر وقت کتاب الٰہی کی تلاوت زبان پر جاری رہتی تھی۔ اس وقت فیضی کی عمر آٹھ سال تھی اور ابوالفضل پانچ برس کا تھا۔ وہ بچے ہونے کے باوجود بھی اس ماحول میں بڑے خوش اور شادمان تھے۔ انہوں نے بھی کبھی کسی پر کسی قسم کی تنگی وغیرہ کا ذکر تک نہیں کیا۔ لوگوں کے مقابلے میں وہ زیادہ خوش و خرم نظر آتے تھے جبکہ عام آدمی اللہ تعالیٰ کی ہزار نعمتوں کو بھی حاصل کر کے اور ان کو کھا کر خوش نہ ہوتے تھے تو یہ پرہیزگار اور تقویٰ پسند خاندان افراد اپنی قناعت اور توکل ہی خوش و خرم تھے۔ یہ تو ان کی اولاد کا حال تھا تو باپ جو کہ بزرگانِ دین اور عالم باعمل تھا وہ تو اس حالت میں اور بھی زیادہ خوش تھا اور وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے والے تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ شخص اللہ تعالیٰ کی رضا اور تقدیر پر پورا

پابند اور ایمان کامل کا مالک تھا۔ اس کو علم تھا کہ ہر شخص کے مقدر میں جو رزق جس طرح نوشتہ اور مقرر ہے اتنا ہی ان کو نصیب ہوتا ہے۔ اس سے کم و بیش نہیں ہو سکتا اور نہ اس سے کوئی چھین ہی سکتا ہے۔ گویا ایسے حالات میں شیخ مبارک کی حالت قناعت اور زندگی کے معمول کا علم ہوتا ہے جو کہ عام آدمی کے لیے ایک مشکل راہ سے کم نہیں ہے۔

ابتدا دور اکبر اعظم

جب شہنشاہ اکبر اعظم کا دور سلطنت شروع ہوا تو اس میں ہندوستان میں امن قائم ہوا تو شیخ مبارک کے مدرسے نے دوبارہ ترقی کی راہ لی۔ اور ان سے علوم نقلی اور عقلی کی درس و تدریس ایسی چمکی کہ شیخ مبارک کے نام پر علم و کمال کے طالب گار ہر جگہ آنے لگے تاکہ وہ علم سے فیض یاب ہوں۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ عالم انسان بھی حسد سے نہیں بچ سکتا تو درباری علماء میں حسد کی آگ میں بھڑک گئے اور پرانے علم فروش لوگوں کے اپنی روزی کی فکر لاحق ہوئی اور ان حاسد لوگوں نے نوجوان بادشاہ اکبر کے کان بھرنے شروع کر دیے۔ شیخ مبارک کا حاسد آ کر اکبر بادشاہ کو اس کے خلاف باتیں کرتا تاکہ شیخ مبارک کے بادشاہ خلاف ہو کر اس کو ذلیل کرنے اور اس کو کوئی سزا بھی دے اور حاسد لوگ خوش ہوں۔

یہ بھی سب کے علم میں ہے کہ دنیا جہاں ضروریات زندگی حاصل کرنے کا مقام ہے وہاں ہی اس مقام کو برا بھی کہا گیا ہے کیونکہ جس وقت کہ شیخ عبدالنبی صدر اہل حاجت کے لیے درگاہ تھا اور آئمہ مساجد مشائخ کو جاگیروں کی اسناد ان سے ملتے تھے تو شیخ مبارک ان تمام سہولیات سے محروم تھے اور وہ اپنی زندگی میں صد ہا ہی کہتے رہے۔ مگر ان کی مدد کرنے والا سوائے خدا کی قدرت کے کوئی بھی نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو عیال بھی بہت عنایت کر رکھے تھے جن کی وجہ سے وہ ہر حالت میں ان کے لیے کچھ نہ کچھ کرنے کے لیے تیار رہتے تھے اور ان کے عیال کے بوجھ کو اشعار کی صورت میں بزبان اردو یوں شاعر نے بیان فرمایا ہے جو کہ خود ہی وضاحت پیش کر رہا ہے۔

توڑا کمر شاخ کو کثرت نے ثمر کی
دنیا میں گرانبار نے اولاد غضب ہے

ترجمہ: پھل کی بہتات اور کثرت سے شاخ کی کمر کو توڑ دیا اور دنیا میں اولاد کا زیادہ ہونا غضب ہے۔

شیخ مبارک کا تلاش روزگار

ان حالات میں شیخ مبارک نے مجبور ہو کر روزگار کی تلاش شروع کر دی تاکہ زندگی آرام و سکون سے بسر ہو مگر اس کے علاوہ اس کے ذہن میں یہ بھی آتا ہوگا کہ میں ان عالم نما زہد فروشوں سے میں کم تو نہیں ہوں بلکہ زیادہ ہی اہمیت کا حامل بندہ ہوں۔ مجھے بھی ان سے اپنا دم طلب کرنا چاہیے یہ میرا حق ہے اور جس کا حاصل کرتے میں کوئی برائی بھی نہیں ہے اس کے لیے کوشش کرنی فرض ہے دنیاوی لحاظ سے اور دینی لحاظ سے بھی۔ تو ان خیالات کے ساتھ شیخ مبارک شیخ صدری کے پاس گئے۔ مگر اس وقت بھی اپنی آزادی کو نمایاں رکھا۔ اس وقت اپنے بڑے بیٹے فیضی کو ساتھ لے گئے اور شیخ مبارک نے ایک عریضہ لکھا کہ:

''سو بگھہ زمین مدد معاش کے طور پر اس فیضی کے نام ہو جائے۔'' اس وقت شیخ صدر خدائی اختیاروں کے صدر نشین تھے تو اس وقت ان کی اسی قدر تذلیل کی گئی کہ:

''نہ تو ان کی عرضی کو ہی قبول کیا گیا بلکہ بڑی بے نیازی اور نفرت کی حالت میں یہ جواب دیا گیا کہ

''یہ رافضی مہدوی ہے اس کو یہاں سے نکال دو، تو حکومت کے کارندے بھاگے حکم کی تعمیل میں تو انھوں نے ان کو فوری طور پر وہاں سے نکال باہر کیا۔ مگر اس وقت ان کے دل کی کیفیت کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟ اللہ اللہ بڑھاپا اور اس قدر عالم و فاضل، دانشمند شخص کے ساتھ ایسا تذلیل عمل کس کو بھلا معلوم ہوتا ہے؟'' تو اس نے کہا کہ صابر شخصیت نے مسرت بھری نگاہیں آسمان کی طرف اٹھائیں اور دیکھتے رہے آخر کار افسوس کرنے لگے کہ

''یہاں آکر غلطی کی ہے مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے۔''

غرضیکہ انھوں نے بہت ہی افسوس اور تاسف کا ماتم کیا۔

مگر اصل بات یہ ہے کہ زمانے بھی کچھ اس معاملے میں دخل اندازی کی اور زمانے کے ارکان سے کہہ کہ:

''شیخ مبارک! بالکل نہ گھبرانا، ہمارا مزاج خوداں ''مجھوں'' کی برداشت نہیں رکھتا۔ یہ بڑے برج تمھارے نوجوانوں کی ٹھوکروں میں ڈھائے جائیں گے ور جلد ان کو ڈھا دیا جائے گا۔''

آپ کو ان کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

شیخ مبارک پر مہدویت کی تہمت لگنا

حکومت کے کارندے علماء کرام نے ایک موقع پا کر چند اہل بدعت تشیع اور بدمذہبی کے جرم میں چند علماء کو گرفتار کر لیا تو ان میں سے بعض کو انھوں نے قید کی سزا دی اور بعض کو ان کے جرم کی تو بہت کے مطابق پھانسی پر لٹکا دیا گیا تا کہ ایسے برے انسانوں کا خاتمہ ہوا کہ وہ معاشرے میں برائی کے کرنے کو ذریعہ نہ بنیں۔ تو ابوالفضل کہتے ہیں کہ:

''بعض بدگو ہر میرے والد محترم کو بھی شیعہ سمجھ کر برا بھلا کہنے لگے وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ:

''کسی مذہب کے اصول و فروع کو جاننا اور شے اور ماننا اور شے ہے۔''

اصل وجہ یہ تھی کہ:

''ایک سید عراق ایران کا رہنے والا تھا اور وہ یگانہ زمانہ تھا اور وہ ایک مسجد میں امامت کا کام کرتا تھا مگر وہ عالم باعمل امام تھا۔ وہ بڑا ہی پرہیزگار اور تقویٰ کا قائل شخص تھا مگر علماء کرام اس سے بھی کھٹکتے تھے۔''

مگر اکبر بڑا ہی دانا، دور اندیش اور سمجھدار بادشاہ وقت تھا۔ اس کی نگاہیں ہر ایک پر تھیں جس کی وجہ سے اس بے گناہ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے تھے۔ اور شاہ اس کو گرفتار کیا اور نہ اسے کوئی سزا ہی دی جا سکتی تھی مگر وہ اس کوشش میں ضرور مصروف کار تھے کہ کسی نہ کسی طرح اس کو کسی جرم میں

ملوث کر کے اس کو امامت سے الگ کر دیا جائے۔ تو انھوں نے ایک دن یہ ترکیب نکالی کہ:

دربار میں مسئلہ پیش کیا کہ:

"میر کی پیش نمازی درست نہیں۔ کیونکہ یہ عراقی ہیں اور حنفی مذہب کی ایک روایت ہے کہ "اہل عراق کی گواہی معتبر نہیں۔"

تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا گیا کہ جس کی گواہی معتبر نہیں اس کی امامت بھی صحیح نہیں ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس سیّد کو اس وجہ سے امامت سے الگ کر دیا گیا اور عالم فاضل باعمل شخص بے روزگار ہو کر رہ گیا۔ جس کے اس کو تنگی روزگار کا احساس ہوا۔ مگر اس کا تعلق اتحاد برادران شیخ مبارک کے ساتھ تھا تو اس سیّد نے اپنے حالات کا تذکرہ حضرت شیخ مبارک سے کیا تو انھوں نے بڑی عمدہ تقاریر سے اس کو سمجھایا بجھایا اور اس کو تسلی دی اور انھوں نے کہا کہ:

یہ لوگ تو روایت کے معنی ہی نہیں سمجھتے اور جو اسناد ان کے پاس ہیں۔ اس میں عراق سے عراق عجم مراد نہیں ہے۔ عراق عرب مراد ہے کیونکہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے زمانے میں عراق عجم کا یہ حال کہاں تھا؟ کتب میں فلاں مقامات پر ان کے جوابات موجود ہیں اور یہ سمجھتے ہیں:

"کسی مقام کے آدمی ہوں سب یکساں نہیں ہوتے۔ ان میں ایک اشرف اشراف ہیں۔ وہ علما و علا سادات ہیں۔ دوسرے اشراف! عام مراد امرا و منصبدار وغیرہ مراد ہیں اور تیسرے اوسط یعنی متوسط طبقے کے لوگ ان سے اہل حرفہ اور اہل بازار مراد لیے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ چوتھے درجے میں ادنیٰ اور پورچ لوگ آتے ہیں جو کہ متوسط طبقے سے بھی درجے کے لوگ ہوتے ہیں۔ تو اپنی درج سزا کے بھی چار درج ہیں۔ اگر نیکی بدی کا سو...... ہو تو آئین کی رعایت کیوں نہ ہو اور یہ بات حدیث میں ہے کہ اگر مجرم وایک جیسی ہی سزا دیں تو شاہ راہ عدالت سے انحراف کرے گا۔ اور یہ سن کر سید بہت خوش ہوئے اور ان کی خدمت میں عرض گزاری مگر دشمن دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ سمجھ گئے تھے اس کی وجہ کیا ہے؟ اور یہ سامان کہاں سے جمع ہو رہا ہے؟

اس قسم کی تائید میں اور امدادی کاروائیاں پہلے بھی کئی مرتبہ پیش آئیں۔

شیخ فضل لکھتے ہیں کہ:

مسئلہ مذکور جاہلوں میں رسوائی کا سرمایہ ہو گیا۔ سبحان اللہ! تمام مخلوق کا اتفاق ہے "کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جس میں ایک نہ ایک بات کی کمی نہ ہو۔ اور ایسا بھی کوئی مذہب نہیں ہے کہ سرتاپا ہی باطل ہو۔"

اس صورت میں اگر ایک ماہر شخص اپنے مذہب کے برخلاف کسی مذہب کے مسئلہ کو اچھا سمجھے تو اس کی باریکی پر غور کرتے۔ وہ دشمنی پر تیار ہو جاتے ہیں اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ شیخ مبارک کو مہدویت کے ساتھ تشیع کی بھی تہمت لگا دی گئی اور اس کو بھی ان جرم میں مورد الزام ٹھہرا لیا گیا جو کہ ایسے عالم باعمل کی شایان شان عمل نہ تھا بلکہ ان کی بڑی تذلیل اور ہتک تھی۔ اگر حالات زمانہ کا تقاضا کہ دشمنوں کا زور تھا انھوں نے اپنے عمل میں تیزی پیدا کر دی اور اپنے مخالفوں کو زیر کرنے کے لیے قابو میں کرنا شروع کر دیا۔

شیخ مبارک کو مہدویت کیوں کہا جاتا ہے؟

ملا رقمطراز ہے کہ:

میں جس زمانے میں شیخ مبارک سے تعلیم حاصل کیا کرتا تھا تو ایک فتویٰ شیخ مبارک کا تحریر شدہ فتویٰ میاں حاتم کے پاس لے گیا۔ وہ بھی اس زمانے میں فاضل الثبوت تھے۔ ان کی بات کو تسلیم کیا جاتا تھا اور ان کو فقہ میں امام اعظم ثانی تسلیم کیا جاتا تھا۔ تو میاں حاتم نے مجھ سے دریافت کیا کہ:

''شیخ مبارک کی مولویت کیسی ہے؟''

تو میں نے ان کی ملائی، پارسائی، فقر و مجاہدات، ریاضات، امر معروف اور نہی عن المنکر حال جو بھی کچھ میں جانتا تھا میں نے اس کو وضاحت سے بیان کر دیا۔ میں نے بیان کیا کہ:

''شیخ اس زمانے میں بڑی احتیاط کے ساتھ پرہیزگاری کا اور تقویٰ کا پابند ہے۔''

تو میاں حاتم نے کہا کہ:

''یہ بات درست ہے۔ میں نے بھی اس کی اس قسم کی بہت تعریف سنی ہے۔''

میں نے کہا کہ:

''میری سید محمد کی ولایت اور بزرگی کو تو مانتے ہیں مگر مہدویت کو نہیں مانتے۔''

تو میاں حاتم نے کہا کہ:

''میر کے کمالات کیسے ہیں؟''

اس مقام پر میر سید محمد عدل بھی بیٹھے تھے۔ انھوں نے بھی متوجہ ہو کر میری گفتگو کو سننا شروع کر دیا اور اس نے دریافت کیا کہ:

''شیخ مبارک کو مہدویت کیوں کہتے ہیں؟''

تو میں نے جواب دیا کہ:

''وہ نیکیوں کی تاکید اور برائیوں سے سختی سے منع کرتے ہیں امر بالمعروف کی تلقین کرتے اور نہی عن المنکر سے باز رکھتے ہیں۔''

اس کے بعد انھوں نے دوسرا سوال یہ کیا کہ:

''میاں عبدالحیی خراسانی (کہ چند روز صدر بھی کہلاتے تھے) کو ایک دن خان خاناں کے سامنے شیخ مبارک کی مذمت کر رہے تھے تم جانتے ہو کہ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟''

تو میں نے کہا کہ:

ایک دن شیخ مبارک نے ان کو ایک دفعہ تحریر کیا تھا اور اس تحریر میں بہت سی باتیں نصیحت آموز تھیں۔ اس عبارت میں یہ بھی شامل کہ:

"تم مسجد میں شامل نہیں ہوتے ہو؟"

مگر میاں عبدالنبی کے اس نصیحت کو برا جانا اور غصہ محسوس کیا کیونکہ انھوں نے جماعت کی تائید سے یہ نتیجہ نکالا کہ:

"مجھے رافضی کہا ہے۔"

تو میرے عدل موصوف بول اٹھے کہ:

"یہ استدلال تو ایسا ہے کہ کوئی شخص کسی کو کہے کہ تم نماز باجماعت نہیں پڑھتے ہو اور جو نماز باجماعت نہ پڑھے وہ رافضی ہے۔ تو تم بھی رافضی ہو کیا اس شخص کا کبریٰ مسلم نہیں ہے۔"

اسی طرح یہ مقدمہ شیخ مبارک بھی کرتا ہے اور جو امر معروف کرتا ہے وہ مہدوی ہے۔ یہ بھی نا مسلم ہے۔ غرض مسلم ہوتا ہے کہ ان کی بابت ایسے کئی چرچے بازار میں عمومی طور پر سنائی دیتے تھے اور لوگوں کی زبان زد عام تھے۔ اہل تجربہ اور زمانہ کے عالم یہ بخوبی جانتے ہیں کہ:

دنیا کے دشمن جب حریف پر غلبہ دستور رکھتے ہیں تو وہ اپنے مددگاروں اور طرفداروں کی جمعیت (فوج) بڑھانے کے لیے مخالف مذہب کا الزام اس پر لگانے سے نہیں گریز کرتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ:

"عوام الناس اس نام سے بہت جلد جوش میں آجاتے ہیں اور اس بہانے سے حریف کو خراب کرنے کو مفت کا لشکر (لوگ) ہاتھ لگ جاتے ہیں۔"

یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جب علماء زمانہ نے شیخ مبارک کو فضل و کمال کو کہیں کا نہ دیکھا بلکہ اس کو اپنے سے اعلیٰ پایا۔ یہ ان کی تعلیمات سے ہٹ کر پایا تو مختلف طریقوں سے اس کو بدنام کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ جب سلیم شاہ کے دور میں مہدویت کیطرف سے بغاوت کا خطرہ تھا تو اس مہدویت کا الزام لگا دیا اور اکبر کے اوائل عہد میں ترکان بخارا کا بڑا زور تھا۔ وہ ایرانی مذہب کے دشمن تھے تو اس کے دور میں بھی ان کو رافضی کہہ کر بدنام کر دیا تاکہ ان کے دل کی آگ ٹھنڈی ہو اور ان کی دشمن سے انتقام لینے کی حسرت پوری ہو جائے۔ اس میں کوئی مبالغہ کی بات نہیں ہے کہ:

"شیخ مبارک صاحب اجتہاد شخصیت کے مالک تھے اور وہ مزاج کے بھی آزاد تھے۔ جس طرف بھی ان کی رائے شیعوں کی طرف مائل ہوتی تھی وہ صاف صاف دلیری سے کہہ جاتے تھے۔ اس میں ذرا برابر بھی جھجک محسوس نہ کرتے تھے۔"

اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ شیخ مبارک بالکل حق گو اور حق پرست عالم دین تھے۔ انھوں نے کبھی بھی کسی قسم کی کسی سے رورعایت نہ کی تھی اور ہمیشہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہی زندگی میں پرچار کیا تھا اور شاہی دربار میں عام علماء کی طرح خوشامد کے لیے نہ تھے۔

ایرانیوں کی ہندوستان آمد اور اثرات

اس بات کی تاریخ شاہد ہے کہ ہمایوں کے عہد میں ایرانی ہندوستان میں آئے تو انھوں نے تقیہ کے پردے میں اپنے آپ کو قدرے

پوشیدہ رکھا اور وہ لوگوں پر اپنا عقیدہ وغیرہ ظاہر نہ کرتے تھے تو رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ ان میں چند لوگوں نے اقتدار شاہی بھی حاصل کر لیا اور یہ بھی امر ہے کہ جب کوئی حریف اقتدار اعلیٰ میں آ جاتا ہے تو اسے اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ ممکن انداز سے اس سے مل کر دل خوش کرتے ہیں۔ اور اس کی ہر ممکن انداز سے تعریف کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ملا مخدوم اور شیخ صدر کے جو سلوک شیعوں میں سے تھے وہ ان کے حال میں بتائے جائیں گے۔

شیخ مبارک ضرور شیعوں سے ملتا ہی ہوگا اور باتوں میں ان کی حمایت بھی کرتا ہوگا جو کہ دوسرے لوگوں کو ناگوار گزرتی ہوگی۔

علمائے کرام کا یہ خیال ہے کہ یہ بات کوئی ایسی بری بھی نہیں ہے آخر شیخ مبارک بھی تو ایک انسان ہی تھا فرشتہ تو نہیں ہو سکتا کہ اس میں کوئی بھی خامی نہ ہو بلکہ انسان کے ناطے سے اس میں ضرور خامی ہونی چاہیے چاہے وہ جس قدر بھی پرہیزگار اور تقویٰ کا قائل ہو۔ اور ہر ایک اصول زمانے ہے کہ جب انسان اپنے مقابل میں دشمنوں کو قوی پاتا ہے اور وہ ان کی قوت کا تدارک نہیں کر سکتا تو ایسے با اقتدار لوگوں سے رابطہ کر کے مراسم قائم کرتا ہے کہ جو کہ دشمنوں سے ناراض ہوں یا ان کے مخالف ہوں اور اس برے وقت میں اس کے کام آئیں۔ ان کی حریفوں کی یہ حالت تھی کہ:

وہ با اختیار تھے اور اس کو تذلیل کرنے کے لیے بڑی بے دردی سے خرچ بھی کرتے تھے اور جو عالم سنت جماعت تھے ان سے اس غریب کو بالکل کسی قسم کی امید مدد نہ تھی۔ وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا تھا۔

ان سے قطعاً کوئی امید نہ تھی۔ عزت اور ننگ ناموس ہر ایک کو عزیز ہوتی ہے اور اسی طرح عزت کے ساتھ جان بھی عزیز ہی ہوتی ہے۔ اس کی یہ مجبوری تھی کہ اس نے غیروں سے تعلقات استوار کیے اور محبتوں کی پینگیں چڑھائیں تاکہ دشمن کے مقابلے میں استعمال کر سکے۔ شیعہ سنی کا فسادات ایسے منحوس وقت میں شروع ہوئے۔ جن کی مدت تیرہ سو برس کی گزر گئی ختم کرنے کا نام نہ لیتے تھے۔ اس دوران میں فریقین کے ہزاروں افراد ضائع ہوئے اور دیگر نقصانات بھی ہوئے۔ اس صورت با صلاحیت لوگوں نے فریقین میں صلح و صفائی کرانے کی بہت کوششیں کیں مگر یہ سود مند ثابت نہ ہوئیں فریقین اپنے اپنے موقف پر اکڑے رہے اور انہی فسادات کے عالم میں اپنا نقصان کرتے رہے۔

اس دوران میں اہل حسد افراد اپنے جوش حسد میں اُبلتے رہے اور فساد کے چھتوں پر فتنہ کی بھڑیں اڑتی رہیں۔ لیکن جب اکبری سلطنت میں فروغ ظاہر ہوا تو 967ھ میں شیخ مبارک کے مدرسہ پر بھی دانش وداد کا علم بلند ہوا۔ بزرگان روزگار نے شاگردی میں قدم جمائے لوگوں نے اس مدرسہ کی طرف بڑا رجوع کیا اور لوگ علم کی روشنائی سے فیض یاب ہونے لگے۔ مگر اہل حسد کی آگ بھڑکتی رہی کہ اگر خوش ان اوصاف کا شاہ جوہر طلب تک پہنچا اور ان کے دلنشین ہو گیا تو ہمارے پرانے اعتباروں کی سب آبرو رہے گی اور انجام اس کا رسوائی تک پہنچے گا۔ چنانچہ شیخ مبارک اپنے بڑھاپے اور علم و فضل کے نشے میں اور ان کے جوان سال بیٹے جوش علم و جوانی میں بے خبر بیٹھے تھے کہ دشمنوں نے ایک اور سازش کر لی۔ اور اس کے سبب سے شیخ کو ایسی خطرناک مصیبتیں اٹھانی پڑیں کہ دل امان امان کرتا تھا۔

گویا شیخ مبارک علمائے حاسدین کی سازشوں میں گھر چکے جن سے ان کا نکلنا محال نہیں تو مشکل ضرور تھا مگر پھر بھی باہمت اور حوصلہ مند شخص تھا وہ بیرا ان دشمنوں کا علمی نقاط کے تحت مقابلہ کرتا رہا تھا۔

اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر موجود ہے

شیخ ابوالفضل نے اپنی تفصیلات میں یوں بیان کیا ہے کہ:

''علمائے حسد پیشہ بادشاہی دربار میں مکر و فریب کی جنس کو سودمندی میں لگا کر فتنہ و شر برپا کرتے تھے مگر اللہ تعالیٰ کے نیک اشخاص بھی زمانے میں ضرور موجود رہتے ہیں جن کی وجہ سے زمانے کی برکت قائم رہتی ہے اور نیک لوگ نیکی کے پانی سے آگ بجھانا پسند کرتے ہیں تو آخر شہنشاہ کے دور اقتدار میں راستی پیشہ اور سچے ملنسار الگ ہو گئے تھے۔ شیطانوں اور فتنہ پردازی نے قابو پا لیا۔ مقربان درگاہ کا گروہ عداوت پر کمر باندھ کر تیار ہوا۔ تو ان حالات میں بزرگوارم ایک دوست الٰہی کے گھر گئے اور اس وقت میں بھی ان کے ساتھ تھا کہ وہ مغرور اور تکبر فروش وہاں آیا۔ اور مسئلے کرنے لگا۔ باتیں بنانے لگا اور مجھے جوانی کے نشے میں عقل کی مستی سوار تھی کیونکہ میں نے آنکھیں کھول کر صرف مدرسے ہی دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ بازاری معاملات پر کبھی نگاہ ہی نہ پڑی تھی جس کی وجہ سے اس طرف کوئی توجہ ہی نہ تھی۔ جب وہ متکبر اور تکبر فروش ہم تمیں بنا رہا تھا تو اس کی بے ہودہ باتوں پر میری بھی زبان کھل گئی تو اس نے بھی خوب دل کھول کر ان سے باتیں کیں کہ وہ شرمندہ ہو کر اٹھ گیا۔ اس کے پاس کوئی جواب نہ بن پڑا اور دیکھنے اور سننے والے حیران رہ گئے۔ اس وقت سے احمقانہ انتقام کی فکر میں پڑا اور جو فتنہ لوگ ہار چکے تھے اس نے ان کو دوبارہ جگایا اور بھڑکایا تاکہ یہ فتنہ دوبارہ تازہ کیا جائے اور اس سے انتقام حاصل کیا جائے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ میرے والد محترم ان لوگوں کے فتنہ و فساد اور ان کی دغا بازاری سے بالکل بے پرواہ اور میں اپنے علم کے نشے اور ایک جوانی میں بالکل مست تھا۔ ان کا کسی کا فکر نہ تھا کہ ہمارے دشمن کیا کر رہے ہیں؟ اور ہمیں ان کے مقابلے میں کیا کرنا چاہیے؟ کوئی فکر نہ تھا۔

دنیا پرست بے دینوں اور عقلمند دھوکا بازوں نے دین آرائی کے رنگ میں خوب تلبیس کیں اور جلسے کئے اور چند لچوں کے دلوں پر شبخون مار کر اکثروں کو گوشہ نشینی میں پہنچا دیا یعنی ان کو قتل کروا دیا یا ان کے ساتھ کوئی دوسرا طریقہ اختیار کیا گیا اور ان کی جگہ پر دوسرے دغا باز لوگوں کو لا کھڑا کیا گیا۔ کیونکہ وہ روباہ بازی سے والد کی دانشگاہ میں نیک بن کر گھسا ہوا تھا اور اندر سے ادھر ایک دل دو قالب تھے۔ دشمنوں نے اسے ایک پٹی پڑھا کر اور بے ہوشی کا منتر سکھا کر آدھی رات کو بھیجا اور وہ سیدھا شعبدہ باز اندھیری رات میں منہ بسورتا ہوا آنکھوں میں آنسو بھرے بڑے بھائی فیضی کے کمرے میں جا پہنچا اور اپنی مکاری کی باتوں سے بھائی صاحب کو گھبرا دیا۔ مگر بھائی بڑا ہی سادہ لوح انسان تھا کہ اسے اس مکار و دغا بازی پالیسی کا کوئی علم نہ تھا۔ اس کی سادہ لوحی کا تقاضا تھا کہ وہ اس کی باتوں میں آ گیا اس نے بھائی فیضی سے یوں پورا ڈرامہ رچایا کہ:

بزرگان زمانہ مدت سے آپ کے دشمن بنے ہوئے ہیں اور ان کھوٹے ناشکروں کو قطعاً شرم نہیں آتی کہ آج انھوں نے قابو پا کر بلوہ کیا ہے۔ ان میں چند علمائے کرام بھی موجود تھے اور ان میں سے چند عمامہ بند گواہ بن چکے ہیں اور انھوں نے جو بھی الزامات، تہمتیں لگائی ہیں ان کے لیے مناسب طریقہ واردات کی منصوبہ بندی کر لی گئی ہے۔ تمام لوگوں کو علم ہے کہ ان تمام لوگوں کو بارگاہ مقدس میں کیا مقام حاصل ہے؟ یعنی ان کا کوئی خاص مقام نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی گرم بازاری کے لیے کیسے کیسے سرفرازوں کو انھوں نے اکھیڑ پھینکا ہے اور ان پر کیا کیا ظلم ڈھائے گئے ہیں۔

فیضی بیان کرتے ہیں کہ:

میرا ایک دوست ان کی رازگاہ میں تھا۔ اس نے اس آدھی رات میں آکر مجھے اطلاع دی تو میں بے قرار ہو کر ادھر بھاگا۔ ایسا نہ ہو کہ اس کا سدباب کرنے کے وقت ہی ہاتھ سے نکل جائے تو بعد میں زیادہ مشکلات کا سامنا ہو یا کوئی حل ہی نہ ہو سکے تو اس نے مشورہ دیا کہ:

شیخ مبارک کو کسی محفوظ جگہ پر چھپا دیا جائے۔ جب تک دوست جمع ہو کر حقیقت حال کا علم بادشاہ کو پہنچا دیا جائے یعنی بادشاہ کے پاس ایک گروپ کی شکل میں جا کر اس واقعہ کا حال بیان کیا جائے۔ اسی اثنا میں قدم چھپے رہیں۔ میرا بھائی بڑا ہی سیدھا سادہ تھا اسے اس کا کبھی وہم بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے اوسان خطا کیے ہوئے شیخ مبارک کی خلوت گاہ میں آیا اور اس نے پورا حال ان کے سامنے وضاحت سے بیان کر دیا تو شیخ صاحب نے فرمایا کہ:

''اس میں کوئی شک کی بات نہیں ہے کہ دشمن غالب ہو رہے ہیں مگر خدا سب سے بڑا قادر ہے وہ تو حاضر و ناظر ہے اور ہر وقت ہر جگہ پر موجود بھی ہے اس کا مطلب کہ بادشاہ ہمارے سر پر موجود ہے۔ عقلائے ہفت کشور موجود ہیں۔ اگرچہ چند حاسد بدویانت اور زمانہ کے بے دین لوگوں کو حسد کی بدمستی نے بھڑکایا ہے اور وہ بے چین و بے قرار روگ ہو چکے ہیں مگر اصل حقیقت تو موجود ہے۔ کوئی نہ کوئی تو حقیقت کے بارے میں دریافت کرے گا اور اس کے مطابق فیصلہ کرے گا اور یہ یاد رکھو کہ اگر تقدیر الٰہی میں ہمارا کوئی نقصان نہ ہو یا کسی سے نہ ہو نہیں لکھا تو کوئی ہمارا نقصان نہیں کر سکے گا بے شک سارے زمانے کے دشمن اکٹھے ہو کر آ جائیں وہ ہمارا بال بھی بیکا نہ کر سکیں گے اور ان کی مکاری اور دغا بازی کا کوئی وار بھی ہم پر کارگر نہ ہوگا۔ اور وہ خود ہی پشیمان و شرمندہ ہو کر رہ جائیں گے۔ ہاں خدا تعالیٰ کی یہی مرضی ہے تو پھر کوئی روک نہیں سکتا۔ اس کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس سے روگردانی ممکن نہیں ہے۔ ہم نے بھی اس خاک تودے سے ہاتھ اٹھا لیا ہے تو اس دنیا سے ہنستے کھیلتے زندگی ان کے حوالے کر دیں گے یعنی اس دارفانی سے دارالبقا کی طرف جانے کے لیے تیار ہو جائیں گے اور وقت آنے پر زندگی کی بازی لگا دیں گے۔ مگر فکر کی بات نہیں ہے جو کچھ بھی ہوتا ہے ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا و تقدیر سے ہوتا ہے کہ اس میں کسی بھی انسان کا کوئی دخل عمل نہیں ہوتا اور نہ آئندہ ہی کسی انسان کا تقدیر میں عمل دخل ہوگا۔

شیخ صاحب کی قسمت کا چکر

انسان کی قسمت کا چکر یا اس کی تقدیر کسی کے اختیار کی بات نہیں ہے اس میں یہ تخصیص بھی نہیں ہے کہ انسان پرہیزگار یا متقی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا عبادت گزار اور نیک و کار ہے تو اس کی قسمت یا تقدیر صحیح ہوگی یہ ضروری امر نظر نہیں آتا۔ یہ قادر مطلق ہی بہتر جانتا ہے کہ کس کام میں اس کے بندہ کی مصلحت ہے اور کس قسم کی تقدیر میں اس کی مصلحت نہیں ہے تو شیخ مبارک کی قسمت کا چکر بھی الٹا ہو گیا حالانکہ وہ بڑے عالم و فاضل اور پرہیزگار انسان تھے۔ انھوں نے فیضی کے یہ قصہ بنانے کی وجہ سے انھوں نے بھی اس پر اپنا غصہ جھاڑ دیا جو کہ بجا بھی تھا لیکن وہ تو ایک سازشی ڈرامہ تھا۔ فیضی نے خطرے کو سوں لے کر کہا کہ:

''دنیا کے معاملات تصوف کے معاملات سے بڑے ہی مختلف ہیں اگر آپ نہیں چھپتے تو میں اپنا کام تمام کرتا ہوں۔ پھر آپ جانتے ہیں کہ میں تو یہ روز بد نہ دیکھوں گا۔''

یہ سن کر باپ کی محبت جاگ پڑی اور پیر نورانی کے جگانے سے بھی میں جاگا اور مجبوراً اس اندھیری رات میں تینوں پاپیادہ نکل کھڑے

ہوئے۔ اس وقت نہ کوئی رہبر نہ پڑوس میں طاقت پدر بزرگوار خاموش زمانے کا رنگ دیکھ رہے ہیں صرف حقیقت سے ہٹ کر سازشی ڈرامے کو میں اور میرا بھائی ہی نہ جانتا تھا اور بھتا تھا مگر جو میں نہ پایا گیا اس کی معمولی حقیقت کو سمجھتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ:

"زمانہ کے کاروبار اور دنیا کے معاملات میں ہم سے نادان کون ہوگا؟"

بات چیت ہوتی رہی آخر فیصلہ ہوا کہ جائیں تو جائیں کہاں؟ جس کا بھی وہ نام لیتے تھے وہ نہ مانتے تھے اور جس کسی کا میں (فیضی) حوالہ دیتا اس پر بھی سوالات کی بوچھاڑ آ جاتی اور بھاری اعتراضات کرتے۔ اس وقت سب کی عقل حیران تھی کہ اس عالم نا مساعدت میں کیا کریں اور کس طرح کریں؟

آخر کار ابوالفضل نے اس عالم مایوسی میں یوں کہا کہ:

i- دشمنان دست کیں برآورند۔ دوستے مہربان نے یا ہم۔

ترجمہ: دشمنوں کے ہاتھوں میں آ گئے ہیں اور مہربان دوستوں سے مایوس ہو چکے ہیں۔

ii- یک جہاں آدمی ہے یا ہم مردے درمیان نے یا ہم

ترجمہ: سارے جہاں میں تمام انسان ایسے ہی پاتے ہیں۔ درمیان میں کوئی بہتر آدمی نظر نہیں آتا۔

iii- ہم بدشمن دروں گریزم از انکہ یاری از دوستان نے یا ہم

ترجمہ: ہم اندرونی دشمنوں سے ڈرتے ہیں۔ دوستوں سے رفاقت نظر نہیں آتی۔

تو فیضی کا بیان ہے کہ:

"میں تو نوجوان تھا مگر زندگی کے نشیب و فراز کا وسیع تجربہ نہ تھا۔ مجھے زمانے کی سازشوں کا کچھ علم نہ تھا۔ مگر بڑے بھائی ایک شخص کو ہی اصل حقیقت سمجھے ہوئے تھے۔ وہیں پہنچے اس نے جب وہاں لوگوں کو پرسکون حالات میں دیکھا تو وہ بھی آنسو بہانے لگے کہ سارا دنیا آرام و سکون کی زندگی بسر کر رہی ہے اور ہم ملکی حالات کی وجہ سے دربدر پھر رہے ہیں۔ اب ہم کہاں جائیں پناہ لیں؟ جس ویرانے میں بھی جاتے ہیں تو وہاں بھی پریشانی کے سوا کچھ نہیں۔ اس وقت دلچسپ منظر تھا بڑے بھائی نے بھی مجھ پر ہی اعتراضات کرنے شروع کیے کہ تم بڑے عقلمند ہو؟ کہ ہمیں خراب کر رہے ہو؟ اب بتاؤ کہ ہم کہاں جائیں اور کس کے ہاں جائیں؟ تم بڑے سمجھدار اور دانا اپنے آپ کو خیال کرتے ہو۔

تو میں نے کہا کہ:

"اب بھی کچھ نہیں بگڑا ان کو واپس لے چلو اگر کوئی سنجیدہ مسئلہ آن پڑے تو مجھے وکیل کر لو اور یہ ارباب زمانہ بنے ہوئے ہیں ان کی قلعی کھول دوں گا اور ان کی چادریں اتار لوں گا۔ اور آپ سب کی مشکلات حل ہو جائیں گی۔"

تب والد شیخ مبارک صاحب نے فرمایا کہ:

"آفرین ہے کہ میں بھی اس کے ساتھ ہوں۔"

مگر بھائی نے پھر ناراضگی کا اظہار کیا اور کہا کہ:

"تجھے ان معاملات کی کیا خبر ہے؟ ان لوگوں کی مکاری اور عیاریوں کو تو کیا سمجھے۔ اب گھر کی چھوڑو اپنے راستے کی خبر لو کہ کہاں جانا ہے؟"

مجھے زمانہ کا کوئی خاص تجربہ تو نہ تھا اور نہ زمانے کی مشکلات اور صعوبتوں کو سہا تھا آخر کار میرے دل میں یہ خیال آیا کہ پھر کہا کہ:

"دل میرا گواہی دیتا ہے کہ اگر کوئی آسمانی بلا یا مصیبت نہ آن پڑے تو فلاں شخص ہماری ضرور مدد یا ساتھ دے گا۔ البتہ اگر کوئی سخت موقع آن پڑے تو وہ نہیں رک سکتا۔"

تو اس رات کے وقت میں سفر کی مصیبتوں سے تنگ، راستے بھی خراب تھے بہرحال سفر جاری رکھا۔ مگر سخت مایوسی کی حالت تھی کہیں پر امید کی کرن نظر نہیں آتی تھی ہمارے سانس بند ہوئے جاتے تھے تو صبح ہوتے ہی اس شخص کے دروازے پر پہنچے۔ اس نے گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا اور اس نے اپنے خلوت خانے میں بٹھایا تو آرام سے بیٹھے تو قدرے غم غلط ہوئے۔ ہمارے بھی دو دن بے فکری میں بسر ہوئے اور اطمینان سے بیٹھے۔ مگر برے حالات نے ہمیں وہاں بھی چین نہ لینے دیا اور حاسدوں کی حسد کی آگ مزید بھڑکی تو انھوں نے اپنی مختلف چالوں کو چلانا شروع کر دیا اور کہ جس رات ہم گھر سے نکلے تھے تو انھوں نے عرض و معروض کر کے بادشاہ کو بھی پریشان کر دیا تو انھوں نے حکم دیا کہ:

"ملکی اور مالی کام تو تمھارے بغیر چھپتے نہیں یہ تو خاص دین و آئین کا کام ہے اس کا سر انجام دینا تمہارا کام ہے۔ ان کو عدالت میں بلاؤ اور جو شریعت فیصلہ دے اور بزرگان زمانہ قرار دیں۔ اس پر عمل کیا جائے۔"

تو انھوں نے فوری طور پر بادشاہی چوبداروں کو بلا کر روانہ کر دیا کہ:

"ان کو گرفتار کر لاؤ۔"

ان کو حقیقت کا علم تھا ان کے ساتھ چند سازشی اور شیطان لوگ بھی ہو لیے تھے ہمارے گھر میں گئے تو وہاں نہ پایا تو انھوں نے گھر کا محاصرہ کر لیا وہاں گھر پر پہرے بٹھا دیے کہ جونہی وہ گھر پر آئیں ان کو گرفتار کر لیا جائے۔ صرف اس وقت شیخ ابوالخیر (چھوٹے بھائی) تھا ان کو گھر میں پایا گیا۔ وہ اسی کو پکڑ کر بے گناہ بادشاہ کے حضور میں پیشی کے لیے لے گئے اور انھوں نے ہمیں روپوش ظاہر کر دیا مگر خدا کی قدرت بھی بڑی نرالی ہے کہ بادشاہ نے خود ہی کہا کہ:

"شیخ کی عادت ہے کہ وہ سیر کو نکل جاتے ہیں اور اب بھی حسب معمول کہیں نکل گیا ہوگا۔ ایسے درویش اور نیک سیرت شخص سے الجھنے کا کیا فائدہ حاصل ہوگا؟"

"تم لوگ اس معصوم بچے کو کیوں پکڑ لائے ہو اور گھر پر بھی کیوں پہرہ بٹھا دیا ہے؟ اسی وقت اس کو آزاد کر دو اور تمام اپنے پہرے بھی اٹھا دو۔"

اس حکم کے بعد گھر پر امن و سکون ہو گیا۔ مگر صرف مصیبت یہ تکلیف ہمارے ہی راستے میں تھی لیکن روزانہ خطرناک قسم کی خبریں سناتی دیتی تھیں تو ان کی وجہ سے ہمارا کہیں روپوش ہو جانا ہی ہماری زندگی کے لیے بہتر اور مناسب نہ تھا یا پھر خطرات مول لیتے۔ اس وجہ سے ہم تمام اپنی

مصیبت کے مارے اور قسمت کے ہارے مختلف جگہوں پر پناہ تلاش کرتے اپنی مشکل کی گھڑیاں کاٹتے رہے تا کہ ان بے دین لوگوں سے اپنی عزت کو محفوظ رکھ سکیں۔

ان کو بادشاہ کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی مگر ان کمینے گروہ نے نئے مسائل کو جنم دیا کہ:

''اس وقت یہ آزاد سرگرداں پھر رہے ہیں ان کا کام تمام کر دینا چاہیے۔ صرف دو تین سینہ سیاہ آدمی بھیجو وہ جہاں بھی ان کو پائیں ختم کر دیں (قتل کر دیں)''

اس سازشی گروہ کو یہ بھی خیال ہوا کہ:

''مبادا بادشاہ کے ہمدردی کے الفاظ اس گروہ یا رشاہ کے حضور میں آ حاضر نہ ہوں اور بادشاہ سے ہمدردی حاصل نہ کریں۔''

اس لیے انہوں نے بادشاہ کے ہمدردی کے الفاظ کو بھی پوشیدہ ہی رکھا اور ان کو مختلف قسم کی افواہوں سے ڈراتے دھمکاتے رہے تا کہ وہ ہراساں ہی رہیں۔ جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ مداخیالی سے بھی بھاگنے لگے تو اس حالت میں ایک ہفتہ گزر گیا تو صاحب خانہ بھی گھبرا گیا اس کا رویہ بھی کچھ تبدیل ہوتے نظر آیا۔ اور اس کے نوکروں نے مروت کو چھوڑ دیا بلکہ بے رخی کا مظاہرہ شروع کر دیا یہ حالت دیکھ کر ہم بھی مزید پریشان ہو گئے اب ہم نے خیال کیا کہ:

''دربار والی خبر جو نئی تھی شاید وہ غلط ہوا ور جھوٹ پر مبنی ہو اور بادشاہ خود متلاشی ہوں کیونکہ وقت برا ہے۔ پورا زمانہ پیچھے پڑا ہوا ہے۔ مبادا گھر والا ہمیں ان کو بتا کر پکڑوا دے۔''

اس حالت غیر یقینی کی ہم پر عجب حالت طاری تھی۔ تو اس حالت میں میں نے اپنے والد شیخ صاحب سے عرض کیا کہ:

''اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ دربار والی خبر ضرور صحیح ہے نہیں تو بھائی کو کیوں آزاد کرتے؟''

اور پہرے کیوں اٹھائے گئے۔ امن و امان کے زمانے میں ہزاروں قسم کی ہوائیاں اڑاتے تھے اور اچھے اچھے اشراف گھر بار چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے تھے اب تو دنیا میں آگ لگی ہوئی ہے۔ یہ گھر والا اگر ڈر گیا ہے تو کوئی نرالی بات نہیں ہے اس کا بھی کوئی قصور نہیں ہے ہر آدمی اپنی عزت کے لیے خوف زدہ ہوتا ہے اور اس کو بچانے کی کوشش کرتا ہے اس کی بھی مجبوری ہوتی ہے اور یہ بھی ایک سمجھنے کی بات ہے کہ اگر اس کو ہمیں پکڑوانا تھا تو وہ ظاہر داری کو نہ بدلتا اور اس میں دیر نہ کرتا ہاں البتہ یہ بات ضرور ہے کہ:

''بہت سے شیطانوں نے اسے بولا ہوگا اور نوکروں کو گھبرا دیا ہے کہ تنگی و بدخوئی کو دیکھ کر نکل جائیں اور اس گھر والے کا بھی پیچھا چھوڑ دیں تا کہ یہ بھی ان کا مورد الزام نہ آئے کہ اس نے ہمیں پناہ دے رکھی ہے۔''

تو ان حالات کے پیش نظر ہم نے اپنے دوبارہ حواس کو ٹٹولا اور آپس میں دوبارہ صلاح و مشورے کرنے لگے۔ مگر حالات کے بد سے بدتر ہونے کے پیغامات ہر جگہ سے آ رہے تھے ہر روز تاریک اور سیاہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ امید کی کرن کہیں سے بھی حاصل نہ ہوتی تھی۔ وقت تو واقعی برا تھا مگر سب نے اس معاملے میں میری تعریف ضرور کی کہ میں جان پہچان نکالنے اور واقفیت پیدا کرنے اور راہ و مراسم بڑھانے میں مجھے سب نے بہتر جانا اور اس کے بعد بھی انہوں نے کہا کہ:

''آئندہ کے لیے کیا آپ کا مشورہ اور صلاح ہے؟''

کم عمر ہونے کے باوجود میں نے خیال کیا کہ:

''اب ان سے کسی بھی بات پر اختلاف نہ کروں گا۔''

جب شام ہوئی قدرے اندھیرا چھا گیا تو وہاں سے روانہ ہوئے۔ مگر حالات کے سفر کرنے تھے۔ پاؤں میں چھالے پڑے ہوئے دماغ شوریدہ اور سینے زخموں سے چور تھے۔ زمانہ میں کہیں بھی امن وامان نظر نہ آتا تھا۔ ہمارے لیے تو ساری دنیا ہی تاریک ہو چکی تھی تو اس وقت آگے چل کر ایک قصبہ نظر آیا اور اندھیرے کی حالت میں دور سے بجلی چمکتی ہوئی نظر آئی اور کچھ امید بندھی اور جلدی سے قدم بڑھا کر وہاں پہنچے۔ ارادہ کر لیا مگر جائیں بھی تو کہاں جائیں؟ کس کے پاں جائیں اور کس حالت میں جائیں؟ کہ اس مصیبت کے وقت تو اچھے اچھے دوست بھی بیگانے بن جاتے ہیں تو یہ خیال ہوا کہ یہاں سے نکل چلیں اور ان دوستوں اور بے آشناؤں سے کنارہ کریں۔ ان کی وفاداریوں کا تو یقین ہو گیا ہے اور اب شہر کا رخ لو۔ کہیں چھپ کر بیٹھ جائیں شائد کوئی ناواقف اپنی پناہ گاہ میں لے لے اور وہاں سے بادشاہ کا بھی حال پوچھیں تو شاید تسلی کی خبر آئے۔ شاید وقت زمانہ بھی ہم پر ترس کرے اور حالات تبدیل ہوں۔ اس منحوس شہر پر قیامت کے بادل چھائے ہیں ایک اور امیر دربار سے اپنے علاقے کو رخصت ہوا ہے اور آبادی کے پس ہی اترا ہے اس کے روز نامہ احوال میں کچھ نور کی کرن نظر آتی ہے۔ سب کو چھوڑ دو اور اس کی پناہ میں چلیں۔ ان کا گھر بھی نمایاں نہیں ہے۔ یعنی وہ عام شہرت یافتہ نہیں ہے شائد وہاں سکون وآرام حاصل ہو۔

اگرچہ دنیاداروں کی آشنائی کا تو بھروسہ نہیں ہے مگر اتنا ضرور ہے کہ:

''اتنا فتنہ پردازوں میں سے اس کا لگاؤ نہیں ہے۔''

تو اس حالت میں میرے بھائی بھیس بدل کر اس کے پاس پہنچے تو وہ ہماری آمد کی خبر پا کر بڑا خوش ہوا اور اس نے اچھے انداز میں ہمارا استقبال کیا۔ ہمارے اوپر جو خوف وہراس پھیلا ہوا تھا اس سے ہم قدرے سکون میں آئے اور ہماری پریشانی بھی دور ہوگئی اور اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لائے۔ خوف خطر تو تھا ہی اس لیے بھائی کئی ترک ذادوں کو بھی ساتھ لے آیا۔ اندھیری رات تھی اور مایوسی کی چادر اوڑھے ہوئی تھی۔ اس وقت وہاں سے بھیس بدل کر نکل کھڑے ہوئے اور رستہ رستہ سے الگ ہو کر اس کے ڈیرے میں داخل ہوئے۔ تو اس نے بہت خوشی کے ساتھ ہمیں خوش آمدید کہا اور ہمیں بھی کوئی آرام کا سانس آیا۔ ہمارا دن بھی آرام سے گزرا اور زمانے کے فتنہ وقت سے فرصت حاصل ہوئی مگر مصیبتوں کا زور تھا۔ زمین وآسمان ہمارے خلاف ہو چکے تھے اور ہر طرف سے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا تو زمین تو پہلے مخالف تھی آسمان سے بھی یوں آگ برسی کہ:

''امیر مذکور کے لیے پھر دربار سے طلبی آئی۔ لوگوں نے جس شرارت سے پہلے احمق کو بدحواس کیا تھا۔ اس بھولے بھالے کو بھی بلوایا۔ اس نے آشنائی کا ورق بھی اچانک پھاڑ دیا اور بیگانہ بن گیا اور ہمیں وہاں سے نکل جانے کو کہہ دیا۔''

تو رات کو ہی وہاں سے روانہ ہو گئے تو ایک اور دوست کے گھر آئے تو اس نے والد محترم کو پیر نورانی سمجھ کر استقبال کیا اور ہماری آمد کو برکت اور مبارک سمجھا۔ مگر اس کے ہمسایہ میں ایک فتنہ پرداز رہتا تھا اس سے وہ بھی شخص بڑا گھبرایا اور پریشان ہونے لگا اور اس کو غیرت نے یاد دلا کر

دیا۔ جب تمام لوگ سو گئے۔ تو اس کی خاطر وہاں سے بھی نکل کھڑے ہوئے مگر اس وقت ٹھکانے کی کوئی جگہ ذہن میں نہ آئی تھی۔ آخر کار تمام خیالات دوڑانے کے بعد پھر اسی امیر کے ڈیرے پر آ گئے کیونکہ لوگوں کو ہمارے نکلنے کی کوئی خبر نہ تھی۔ تھوڑی دیر آرام کیا تو بھائی کے دل میں یہ خیال آیا مگر اس کو بھی عقل کی رہنمائی نہ تھی۔ فکر سرگرداں تھے تو وہاں سے نکلے۔ بیرچند میں نے کہا:

''اس کی حالت بدکا رنگ بدلنا اور نوکروں کا آنکھیں پھیرنا صاف دلیل ہے مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا۔''

امیر مذکور کی بدمزگی اور بے قیمتی جاتی رہی مگر اس حالت میں کچھ بھی نہیں ہو سکتا اور جب اس اوچھے تنگ مزاج نے دیکھا کہ:

''یہ قباحت کو نہیں سمجھتے اور خیمہ سے بھی نہیں نکلتے تو وہ وہاں سے نکل گیا اور نوکروں کو خیمے اکھاڑنے کا حکم دے دیا۔''

نوکروں نے خیمے اکھاڑ دیئے جس کی وجہ سے ہم آسمان تلے بیٹھ گئے نہ کوئی سایہ اور نہ کوئی پرسان حال ہی تھا۔ بے چارگی کی حالت میں فرش زمین پر پڑے رہ گئے ہماری چاروں طرف یا تو دوست آشنا یا دشمن حسد رنگ، وہاں بے وفائی اور سخت طبیعت لوگ بھاگتے دوڑتے ہی نظر آتے تھے تو اس حالت میں سوائے ہمارے خیالات کی طولانی کے اور کچھ بھی تھا؟ ہر ہم میں سے الگ الگ خیالات کا مالک تھا اور ذہن میں مختلف قسم کے تصورات اور خیالات آتے تھے اور جاتے تھے جن کا کوئی سر اور پاؤں نہ ہوتا تھا مگر سب پریشان ضرور تھے کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کہاں کا رخ کریں؟ کدھر ہمارا اچھی طرح سے استقبال کرے گی؟ اٹھنے کی بھی مجبوری تھی مگر جائیں تو جائیں کہاں؟

بادشاہ کا ہمدردانہ رویہ و حالات کا رخ بدلنا

اب وہاں سے روانہ ہونے کے علاوہ ہمارا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ برے لوگوں کے درمیان سے ہو کر گزرے قدرت کاملہ نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہم نے تو صرف خدا کی ذات پر ہی توکل کیا تھا تو اس خطرے سے نکل آئے تو ہم بیگانوں کی ملامت اور آشناؤں کی صاحب سلامت کو سلام کر کے ایک باغیچہ میں پہنچے۔ مگر وہاں آ کر بھی یہ فکر لاحق ہوا کہ:

''یہ بھوتوں کا گزر ہے (جاسوس) اور انھوں نے بھی پھرتے پھرتے تھک کر یہیں کہیں دم لیا۔''

تو خدا خدا کر کے اس خوفناک جگہ سے نکلے۔ اللہ کی قدرت جہاں بھی گئے کوئی نہ کوئی بلائے ناگہانی ہمارے تعاقب میں رہی۔ گھبراہٹ کی دوڑ تھی اور بغیر تعین منزل مقصود تھی گویا کہ اندھوں کی طرح بھاگ رہے تھے تو اس عالم میں ایک باغبان (مالی) مل گیا تو اس نے ہمیں پہچان لیا ہم گھبرا گئے تھے ہم سب سناٹے میں خاموش تھے۔ کوئی دم تسلی دینے والا بھی نہ تھا مگر اس باغبان نے ہمیں بڑی تسلی دی۔ وہ ہمیں اپنے گھر لے گیا اور اس نے اچھی طرح ہماری حاں پرسی کی۔ اگرچہ اسی حالت میں بھی میرا بھائی خوف زدہ ہو رہا تھا مگر میں خوش تھا اور میری خوشی بڑھتی جاتی تھی۔ اس کی خوشامد سے دوستی کے ورق میں پڑھ رہا تھا اور اس حالت میں تقدیر کا منظر ضرور نظر آ رہا تھا۔ رات گئے باغ کا اصل مالک بھی آ گیا تو اس نے آتے شکایت کی کہ:

''مجھ سے مخلص معتقد کے ہوتے ہوئے اس شورش کا وہیں آپ کہاں رہے اور مجھ سے اس طرح کنارہ کیوں کیا؟''

حقیقت میں یہ بے چارہ جتنا نیک تھا میرے خیال میں اتنا نہ تھا۔ ذرا دل شگفتہ ہوا تو میں نے کہا کہ:

"دیکھتے ہو طوفان آیا ہوا ہے۔ یہی خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ دوستوں کو ہماری وجہ سے دشمنوں کا آزار نہ پہنچے یعنی دشمن ان سے ہماری وجہ سے زیادتی نہ کریں۔"

تو میری باتیں سن کر وہ بھی خوش ہوا اور اس نے کہا کہ:

"اگر میرا اکھنڈ پسند نہیں تو اور جگہ نکالتا ہوں اور وہاں سکون و آرام سے بیٹھ جاؤ۔"

اس رائے کو ہم نے قبول کر لیا اور وہاں جا کر قیام کرنے لگے۔ وہ جگہ ہماری پسند کی تھی۔ تمام افراد کو تسلی ہو گئی کہ ایک ماہ سے بے چینی اور فکر مندی میں گزرا ہے اب تو اللہ تعالیٰ نے آرام عطا فرمایا تو یہاں سکون میسر ہوا تو اپنے دوستوں اور مخلصوں کو بھی رابطہ کیا اور ان کو خطوط لکھے گئے جس کی وجہ سے ان کو بھی ہماری حالت زار کی اطلاع ملی اور لوگوں نے بھی ہماری رہائی کی تدبیریں سوچنی شروع کیں اور دوسری طرف بھائی نے بھی ہمت باندھی تو وہاں سے روانہ ہو کر آگرہ سے ہو کر فتح پور میں چلے گئے اور انھوں نے اردوئے معلیٰ میں جو دوست تدبیروں میں دلسوزی کر رہے تھے انھیں اور گرما دیا۔

ایک دن صبح کا وقت تھا کہ یہ محبت کا پتلا دور اندیش بھائی ہزاروں غموں کے ساتھ پہنچا اور زرہ نہ سنگ دل کا پیام لایا کہ:

بزرگان دربار میں ایک شخص نے شیاطین کی افسانہ سازی کا حال سن کر غصے کے عالم میں بڑی تند و تیز دربار میں تقریر کی اور عرض کیا کہ:

"حضور! کیا آخری دور تمام ہوتا ہے؟ قیامت آ گئی ہے حضور کی بادشاہی میں بدکار، بدمعاشوں کو فراغتیں حاصل ہیں۔ وہ آزادانہ دندناتے پھرتے ہیں اور نیک مردوں کو سرگردانی کیا یہ قانون چل رہا ہے؟ اور کیسی خدا کی ناشکری کی ہے؟"

بادشاہ نے نیک نیتی پر رحم کر کے فرمایا کہ:

"کس کا ذکر کرتے ہو اور کس شخص سے تمہاری مراد ہے؟ تم نے کوئی خواب دیکھا ہے یا دماغ عقل پریشان ہو رہا ہے؟"

جب اس نے نام لیا تھا۔ تو حضرت اس کی کج فہمی پر بگڑے اور کہا کہ:

"اکابران زمانہ اس کی دل آزاری اور جان کھونے پر کمر باندھ کر فتوے تیار کیے ہیں۔ مجھے ایک دم چین نہیں دیتے اور میں جانتا ہوں کہ آج شیخ وہاں موجود ہے (اس نے خاص کر ہمارے مقام کا نام لے لیا تھا) مگر جان کر انجان بنتا ہوں۔ اور حد سے بڑھا جاتا ہے۔"

صبح ہوئی تو آدمی بھیج کر شیخ کو حاضر کرو اور علماء کا ہنگامہ جمع ہو۔ بڑے بھائی نے یہ شورش سنتے ہی راتوں رات یلغار کر کے اپنے تئیں ہمارے پاس پہنچایا۔

آگرہ کی طرف روانگی

اب ہم اس بے چارگی کی حالت میں آگرہ کی طرف روانہ ہو پڑے مگر اس وقت بڑی مشکل کا وقت تھا جو کہ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اگرچہ یہ سب کا علم واضح ہو گیا کہ دنیا میں لوگ کہاں تک مخلص ہیں؟ اور داد گر شہریار نے کیا کیا ہے؟ اور غیب دان کو کتنی خبر ہے؟ مگر پریشانی نے

سخت بوکھلا دیا۔ خدا جانے اونٹ کس کروٹ سے بیٹھے گا؟ پہلے موت کے خیمہ سے بھاگے جاتے تھے۔ اب موت کے منہ میں چلنے لگے ہیں۔ رات اندھیری تھی اور راستہ بھی آلودگی کا تھا۔ آخر کار چپ چاپ سناٹے کے عالم میں چلتے رہے۔ راستے میں کوئی مددگار نہیں اور نہ کوئی آرام کرنے کی جگہ ہی ہے اور نہ کوئی قیام گاہ ہی نظر آتی ہے تو آخر کار ایک ویران کھنڈر میں گھس گئے۔ شہر کے شور وشر اور دشمنوں کی نظر سے ذرا آسودہ ہوئے تو بادشاہ نوازش کا حال معلوم ہوا تھا تو سب کی یہ رائے بنی کہ:

"گھوڑوں کا سامان کریں یعنی انتظام کریں تو اور یہاں سے فتح پور سیکری چلیں۔ وہاں ایک دوست صداقت ہے اس کے گھر جا کر قیام کریں شائد کچھ عرصہ تک یہ شور ختم ہو جائے تو پھر بادشاہ عنایت فرمائیں تو دیکھ لیں۔"

بہر حال معقول لوگوں کی طرح انتظامات کر کے رات کو وہاں سے روانہ ہوئے۔ وہ حاسدوں کے خیالات سے بھی اندھیرے اور بکواسیوں کے افسانے سے کہیں لمبا تھا۔ مگر ہمارا کوئی راہبر نہ تھا۔ جس کی وجہ سے بھٹکتے پھرتے رہے۔ ساری رات چلتے رہے تو جب صبح ہوئی تو اس اندھیرے خانے میں پہنچے۔ وہ دان جگہ سے تو نہ پھسلا مگر ایسے ڈراؤنے ڈھکوسلے سنائے کہ قابل بیان نہیں ہیں۔ اس نے مہربانی کے رنگ میں کہا کہ:

"اب وقت گزر گیا ہے اور اب بادشاہ کا مزاج تم سے برہم ہو گیا ہے۔ اگر تم پہلے آ جاتے تو کوئی صدمہ نہ پہنچتا اور مشکل کام آسانی سے بن جاتا تھا۔"

نزدیک ہی ایک زمیندار کا گاؤں تھا تو خیال تھا کہ وہاں ٹھہر کر چند روز مقام کریں۔ تو وہاں گاڑی سے بھاگ کر وہاں پہنچنے کے لیے روانہ کر دیا کہ شائد بادشاہ سلامت کا مزاج رحم دلی کی طرف مائل ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہماری بھی مشکل حل ہو جائے۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ ہماری سفری صعوبتیں طولانی کے راستے پر گامزن تھیں جو کہ ختم ہوتی نظر نہ آتی تھیں اور ہر طرف ہمیں اندھیرا ہی نظر آتا جس سے ایک مزید مایوسی کا عالم سامنے آتا تھا، تو ہم نے خیال کیا کہ ہمارے لیے اب ساری دنیا ہی اندھیرا ہو چکی ہے کوئی آس و امید کی کرن کسی کے در پر نظر نہیں آتی۔ اب کہاں جائیں اور کس ذریعے سے جائیں کہ ہماری بھی کوئی مرد مومن کوئی مدد فرمائے؟ آخر کار ہم نے بھی ہمت مرداں کے مصداق سفر جاری رکھا اور آگے ہی بڑھتے رہے۔ ہمت ہارنے کا نام نہ لیا اور نہ اللہ تعالیٰ کی نعمت سے ہی مایوس ہوئے۔

دربار ہمایوں سے عنایات

جب ہم پہنچے تو معلوم ہوا کہ جس زمیندار کے ہاں انھوں نے ہمیں بھیجا ہے وہ گھر میں موجود نہیں ہے۔ وہ تو ایک اجاڑ نگری تھی۔ وہاں کے داروغہ نے ہم سے ایک کاغذ پڑھوانا تھا تو اس نے بلا بھیجا۔ وقت تنگ تھا تو ہم نے انکار کر دیا۔ ہماری ناواقفی تھی تو بعد میں معلوم ہوا کہ یہ گاؤں تو ایک سنگ دل اور بد مغز شخص کا ہے۔ انھوں نے ہمیں غلط مقام پر بھیج دیا ہے تو وہاں سے روانہ ہو گئے مگر ستم ظریفی یہ بھی تھی کہ ہمارے ساتھ ایک رہبر تھا جو کہ وہ اناڑی اور ناواقف ہی معلوم ہوتا تھا۔ تو آخر کار آگرہ کے قریب ایک گاؤں میں جا ٹھہرے تو وہاں ایک گھر میں آشنائی تھی۔ وہ بڑی مروت سے پیش آیا مگر معلوم ہوا کہ ایک جھگڑالو حساسدانی کی زمین وہاں ہے اور وہ کبھی کبھی ادھر بھی آتا ہے تو اس حالت میں ہم وہاں سے بھی نکلے۔ صبح ہوتے ہی شہر میں پہنچے اور ایک دوست کے گھر میں جا کر ڈیرے لگائے ذرا آرام آیا۔ ابھی تک دم بھی نہ بھرا تھا کہ اس نے یہ افواہ اڑا دی کہ:

"ہمسایہ میں ایک فتنہ پرداز رہتا ہے۔"

یہ سن کر ہم نے اس کو بلا قصور گیا۔ سب سے سوچ و بچار کرنا شروع کر دیا صاحب خانہ ادھر ادھر جگہ تلاش کرتا پھرتا تھا تو دو دن عجیب کشاکش میں گزرے اور ہر دم یہی کہتا تھا کہ دم آخر ہوں۔

پیر نورانی کو ایک سعادت مند کا خیال ذہن میں آیا تو صاحب خانہ نے اس کی جستجو کر کے اس کا گھر تلاش کر لیا تو ہم اس کی خلوت گاہ میں پہنچے۔ اس نے بڑی فراخدلی کے ساتھ ہمارا استقبال کیا جس سے ہمارا بھی دل خوش ہوا۔ اداسیاں دور ہو گئیں۔ سفری صعوبتوں سے قدرے سکون ملا۔ وہ شخص اگرچہ مرید نہ تھا مگر وہ بڑا ہی نیک و شریف ضرور تھا وہ کم مائیگی میں بھی امیری کرتا تھا۔ تنگ دستی میں بھی دریا دلی کرتا تھا۔ بڑھاپے میں بھی جوانی کا چہرہ چمکتا تھا۔ اس کی خلوت گاہ بھی بہت اچھی تھی تو وہاں بیٹھ کر پھر خطوط لکھنے شروع کیے۔ اس خلوت گاہ میں دو ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ اور اس وقت اللہ تعالیٰ نے بھی ہمارے دن بدل دیے اور خیر اندیش حق طلب مدد کو اٹھ کھڑے ہوئے اور کاروان اقبال مدد پاوری کرنے کو بیٹھ گئے۔ تو انھوں نے شیخ صاحب کے کمالات: نیکیاں اور خوبیاں ایک خوبصورتی کے ساتھ حضور تک پہنچائیں اور رنگ نشین اقبال نے رود بین اور قدر شناسی سے جوابات دیے جو کہ محبت و شفقت سے لبریز تھے۔ بزرگی اور مردمی کے رستہ انداز سے بلا بھیجا۔ پیر زمانی (والد صاحب) بڑے بھائی کو ساتھ لے دربار ہمایوں میں گئے۔ تو اس نے رنگا رنگ کی نوازشوں سے درجے بڑھائے۔ یہ حالت دیکھ کر حاسدوں اور ناشکروں میں سناٹا چھا گیا۔ جھگڑوں کا مجمع چپ چاپ ہو گیا اور رسالم کا تلاطم تھم گیا۔ دوستی کا ہنگامہ گرم ہوا۔ خلوت گاہ تقدس کی آئین بندی ہوئی۔ نیک مردوں کے قانون زمانہ نے جاری کیے تو ابوالفضل اس حالت میں یہ کہتے ہیں کہ:

اے شب نہ کنی آں ہمہ پرخاش کہ دوش
راز دل من چناں مکن فاش کہ دوش
دیدی چہ دراز بود دوشینہ شبم
ہاں اے شب وصل آں چناں باش کہ دوش

اس وقت ہماری حالت بڑی ہی حوصلہ افزا تھی تو کچھ چہروں پر بھی رنگت بدلی تو ہماری جان میں جان آئی تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ اور یہ بھی تاثر ملا کہ دنیا میں ایک قادر مطلق کی حکومت ہے اور وہی ساری دنیا کا کارساز اور حکمت عالی کا مالک ہے۔ جس پر ایمان اور یقین لازمی اور ضروری چیز ہے۔ اس پر ہی بھروسا اور اعتبار رد کیا جا سکتا ہے۔

خواجہ قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ میں آئے

جب دلی کے شوق نے دامن ان کا کھینچا تو چند شاگردوں کو ساتھ لے کر روانہ ہو پڑے تو آگرہ میں جا کر ڈیرے ڈال دیے۔ اس گوشہ نورانی میں عالم معنی پر اس قدر خیال جما تھا کہ عالم صورت پر نگاہ کی نوبت نہ آتی تھی تو یکایک عالم سفلی کے مطالعہ نے دل گریبان پکڑا اور محبت کا

دامن پھیلایا تو وہ مجھے کہا کرتے تھے کہ:

خاندان کی ابولاً بائی تیرے نام رہی۔ مجھ سے راز گھڑی کھولی اور آج مجھے جانماز پر نیند آ گئی۔ کچھ جاگتا تھا تو کچھ سوتا تھا۔ انوار عربی میں حضرت خواجہ قطب الدین اوشیؒ نظام الدین اولیاءؒ خواب میں آئے۔ وہاں بہت سے بزرگ جمع تھے وہاں بزم صلوٰت آراستہ ہوئی۔ اب عذر خواہی کے لیے ان کے مزاروں پر چلنا مناسب ہے کہ چند روز اس سرزمین میں ان کے طور پر مصروف رہیں۔ والد بزرگوار کے طریقہ کے موجب جب مسائل ظاہری کی بہت حفاظت کرتے تھے طنبور و ترانہ اصلاً نہ سنتے تھے۔ حال جو صوفیوں میں عام ہے پسند نہ کرتے تھے اس وقت کے لوگوں کو بلکہ مطعون کرتے تھے خود بہت پرہیز کرتے تھے اور ان کی سخت ممانعت فرماتے تھے اور دوستوں کو روکتے تھے ان بزرگوں نے اس رات اس پری زاد پرست کا دل بہایا (یہ بھی سب کچھ سننے لگے) بہت سے بزرگ اس گلزار زمین دلی میں پڑے سوتے تھے۔ ان کی خاک پر گزر ہوا دل پر نور کے طبقے کھل گئے اور فیض پہنچے۔ دولت کا دروازہ کھلا اعزاز کا رتبہ بلند ہوا اور حرص کے متوالے حسد کے لوٹے مارے لوگ دیکھ کر بولے گئے۔ میرے دل کو درد اور ان کے حال پر رحم آیا اور خدا تعالیٰ سے عہد کیا کہ:

"ان اندھوں کی ریاکاریوں کا خیال دل سے بھلا دوں بلکہ ان کے عوض میں نیکی کے سوا کچھ نہ خیال کروں۔"

توفیق الٰہی کی مدد سے اس خیال میں غالب رہا۔ مجھے عجیب خوشی اور سب کو وہی طاقت حاصل ہوئی۔ ان کی بلند پروازیاں تو دیکھیں۔ اب ملا صاحب کی بھی دو باتیں سنئے کہ ان واقعے او نیچے سے کس طرح نیچے پھینکتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

جن دنوں پر جوش اہل بدعت (شیعہ) گرفتار اور قتل ہوئے ان دنوں میں سے شیخ عبدالنبی صدر اور مخدوم الملک وغیرہ تمام علماء نے متفق اللفظ والمعنی ہو کر عرض کی کہ:

"شیخ مبارک مہدوی بھی ہے اور اہل بدعت (شیعہ) بھی ہے گمراہ ہے اور گمراہ کرتا ہے۔ غرض برائے نام اجازت لے کر درپے ہوئے کہ بالکل رفع دفع کر کے کام اس کا تمام کر دیں اور اس کو راستے سے ہٹا دیں۔"

انھوں نے محتسب کو بھیجا کہ:

"شیخ مبارک کو گرفتار کر کے حاضر کرے۔"

مگر شیخ مبارک بچوں سمیت روپوش ہو گیا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ نہ آیا۔ اس لیے اس کی مسجد کا منبر توڑ ڈالا۔ شیخ سلیم ان دنوں عروج پر تھا۔ اس کی سلطنت کا ستارہ چہروں طرف چمک رہا تھا۔ تو شیخ مبارک نے اول ان سے التجائے شفاعت چاہی تو شیخ نے بعض خلفاء کے ہاتھ کچھ خرچ اور پیغام بھیجا کہ یہاں سے تمہارا نکل جانا مصلحت ہے۔ لہٰذا گجرات چلے جاؤ تو انھوں نے ناامید ہو کر مرزا عزیز کوکہ سے توسل نکالا اس نے ان کی ملائی اور درویشی کی تعریف کی لڑکوں کی فضیلت کا بھی حال عرض کیا اور کہا کہ:

"مرد متوکل ہے۔ کوئی زمین حضور کے انعام کی نہیں کھاتا۔ ایسے فقیر کو کیا ستانا؟ غرض خلاص ہو گئی۔ گھر آئے اور پھر ویران مسجد کو آباد کیا۔

جوان عقلوں کا حریفوں کی بوڑھی تدابیر کا پچھاڑنا

شیخ مبارک کا نصیبہ نحوست سے نکاح کیے بیٹھا تھا ۶۳ برس کی عمر میں مبارکی آئی اور انھیں دیکھ کر مسکرائی یعنی ۹۷۴ھ میں شاعری کی سفارش سے فیضی دربار میں پہنچے ۹۸۱ھ میں ابوالفضل جا کر میر منشی ہو گئے اور جس عمر میں لوگ سترے بہترے کہلاتے ہیں پیر نورانی جوانی کا سینہ ابھار کر اپنی مسجد میں چہل قدمی کرنے لگے۔

اب شیخ صاحب کے اقبال و ادبار کی حالت کا جائزہ لیں کہ جوان عقلوں نے حریفوں کی بوڑھی تدبیروں کو کس طرح پچھاڑنا شروع کر دیا۔

ایک طرف ابوالفضل اور فیضی کی لیاقتیں انھیں ہاتھوں ہاتھ آگے بڑھا رہی تھیں اور مصلحت انھیں وہ رائے دکھا رہی تھی کہ اکبر اور زمانے کے دل پر ان کی دانائی کے نقش بیٹھ رہے تھے۔ ادھر شیخ الاسلام مخدوم الملک اور شیخ صدر سے ایسی باتیں ہونے لگیں کہ جن سے خود بخود ہوا بگڑ گئی۔ اکبر کی قدر دانی اور جوہر شناسی سے دربار میں بہت سے عالم ہندوستان ایران اور توران سے آ کر جمع ہو گئے۔ چاروں ایوان کا عبادت خانہ علم کا اکھاڑہ تھا۔ راتوں کو بھی علمی مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں اور اکبر خود ان میں شرکت کرتا تھا۔ ان مجالس میں علمی مسائل پیش ہوتے تھے اور دلائل کی کسوٹی پر حل کیے جاتے تھے اور جو ایذائیں ان بزرگوں کے ہاتھوں باپ نے برداشت کی تھیں اور انھوں نے بچپن میں باپ کے ساتھ دیکھی تھیں وہ ان سب کو یاد تھیں۔ اس لیے وہ ہمیشہ اس گھات میں رہتے تھے اور حریفوں کی شکست کے لیے ہر مسئلہ میں دلائل فلسفی اور خیالات عقلی سے غلط بحث کر دیتے تھے اور بوڑھوں کی بوڑھی عقل اور بوڑھی تہذیب کی جوانوں کی چورن عقل اور جوان تہذیب دبائے لیتی تھی اور بے اقبالی بڈھوں کا ہاتھ پکڑے ایسے رستوں پر لے آتی تھی جس سے خود گر گر پڑتے تھے۔

اکبر اعظم کی قدر دانی

اس کو شیخ مبارک کی دور اندیشی شمار کریں خواہ طوطا ہمت سمجھ لیں۔ انھوں نے بہر حال دانائی کا مظاہرہ ضرور کیا کہ بیٹوں کی اس قدر اقبال مندی کے باوجود انھوں نے اکبر کے دربار میں کوئی خدمت قبول نہ کی۔ مگر وہ بڑے سمجھدار اور دانشمند شخصیت کے مالک تھے۔ کبھی کبھی صلاح و مشورے کے لیے کبھی کسی مسئلہ کی تحقیق کے لیے اور اکبر خود بھی علمی مباحث کے سننے کا شوقین تھا غرض کوئی ایسی صورت پیدا کر لیتے تھے کہ اکبر جہاں ہوتا وہیں شیخ مبارک کو بلایا جاتا تھا۔ شیخ مبارک پیر نورانی نہایت شگفتہ بیان اور خوش صحبت تھے۔ اس کی رنگین صحبت دربار میں خوشبو اور خوش رنگ پھول برسایا کرتی تھی۔ بادشاہ بھی اس کی باتیں سن کر بہت خوش ہوتا تھا۔ شیخ کسی فتح عظیم بادشاہی یا عہدہ وغیرہ کی مبارکباد پر ضرور آیا کرتے تھے اور تہنیت کی رسم ادا کر کے رخصت ہوتے تھے۔

جب ۹۸۱ھ میں اکبر اعظم نے گجرات فتح کیا اور واپس آ گئے تو پرانی رسم کی خاطر تمام علماء مشائخ روسا مبارک باد کے لیے حاضر ہوئے تو ان میں شیخ مبارک بھی شامل تھا۔ انھوں نے ظرافت کی قینچی سے یہ پھول خوب کترے۔ سب لوگ حضور کو مبارک باد دینے آئے تھے مگر عالم غیب سے میرے دل پر یہ مضمون پکار رہے ہیں کہ حضور چاہتے ہیں مبارک باد دیں کیونکہ خداوند عالم نے ہمیں دوبارہ سعادت عظمیٰ عطا فرمائی ہے یعنی حضور

کا جوہر مقدس حضور نے ایک ملک فتح کیا تو حقیقت کیا ہے؟ اگرچہ بڑھاپے کا زمانہ تھا مگر یہ انداز اکبر کو بہت پسند آیا۔ اس کو اعزاز کے ساتھ رخصت کیا اور اکثر اسی نکتہ کو یاد کیا کرتے تھے۔

نقیب خاں خلوت کی صحبت میں تاریخی اور علمی کتابیں پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ اکثر حیوان الحیوان بھی پڑھی جاتی تھی اس کی عبارت عربی تھی جس کے معنی سمجھانے پڑتے تھے۔ اس لیے ابوالفضل کو حکم دیا اور شیخ مبارک سے فارسی میں ترجمہ کیا جو کہ اب بھی موجود ہیں اور اس سے لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔

اکبر اعظم بادشاہ کو علمی تحقیقات کا بہت شوق تھا اور اس کے لیے زبان عربی کا جاننا بہت ضروری تھا اس لیے خیال ہوا کہ عربی زبان سیکھی جائے تو لڑکوں نے کہا کہ:

ہمارے شیخ مبارک کو جو عربی پڑھانے کا ڈھب ہے وہ ان مسجد ملانوں میں سے کسی کو نصیب نہیں ہے وہ تو باتوں باتوں میں کتابیں دل میں اتار دیتے ہیں۔ لہٰذا شیخ مبارک بلائے گئے اور فیضی انہیں ساتھ لے کر حاضر ہوئے اور صرف "ہوائی" شروع کی اس صحبت میں فیضی نے یہ بھی عرض کی کہ:

"شیخ با تکلف اصلاً ندارد"

اکبر نے کہا کہ:

"آرے تکلفات را بمہ بہ شاگرداں گزاشتہ اند"

چند یوم کے بعد ہجوم متعلقات سے وہ شوق ختم ہو گیا اور شیخ کا آنا وہی اتفاقی تقریبوں پر رہ گیا۔ کبھی کبھی آتے اور حکمت، فلسفہ، تاریخ، نقل، حکایات، غرض اپنی شگفتہ بیانی سے بادشاہ کو خوش کر جاتے تھے۔ جس کا شیخ صاحب کا بھی اقبال چمکا اور بادشاہ اکبر کی علمیت میں اضافہ ہوا۔

شیخ مبارک کی موسیقی میں مہارت

شیخ مبارک کو موسیقی میں مہارت تھی تو ایک دفعہ بادشاہ اکبر کی ان کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو ہوئی تو شیخ سے بادشاہ اکبر نے کہا کہ:

"اس فن کا جو سامان ہم نے بہم پہنچایا ہے تمہیں دکھائیں گے۔"

چنانچہ شیخ منجو اور تان سین وغیرہ چند گویوں کو بلایا گیا کہ شیخ کے گھر جا کر اپنا کمال دکھائیں تا کہ شیخ مبارک ان کا جائزہ لے کر اکبر اعظم کو آگاہ کریں۔ شیخ نے باری باری سب کا کمال کا جائزہ لیا اور ان کو سنا اور شیخ مبارک نے تان سین سے کہا کہ:

"شنیدم تو ہم چیزے شنیدم تو ہم چیزے تیوانی گفت"

آخر سب کو سن کر کہا کہ:

"جانوروں کی طرح کچھ بھائیں بھائیں کرتا ہے۔"

اس کے حریفوں کا چلتا حربہ یہی تھا کہ وہ شریعت کے زور اور فتووں کی فوج سے سب کو دبالیا جاتا تھا اور جسے چاہتے تھے کافر بنا کر رسوا و خوار کرتے تھے۔ مگر بادشاہ وقت کو بغاوت کے خوف سے مجبوراً خاموش رہنا پڑتا تھا اور احکام اسلام کو ہر مسلمان سر آنکھوں پر رکھ لیتا تھا لیکن بعض مواقع پر یہ زور نا گوار بھی گزرتا تھا خاص کر بادشاہ کو اس کی ملکی مصلحتوں کے تحت کہ ان کے نازک موقع کسی پابندی کو سہارا نہیں دے سکتے۔ اکبر اعظم دل میں تو کڑھتا رہتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ ہر لحاظ سے برداشت کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ کیونکہ یہ اس کی مجبوری ہوتی تھی۔ جن دنوں متھرا کے برہمن کو شوالہ اور مسجد کے مقدمہ میں شیخ صدر نے قتل کروایا تھا۔ انہی دنوں میں شیخ مبارک بھی کسی مبارک بادی کی تقریب میں حضور میں آیا تھا۔ تو ان سے اکبر نے چند مسائل دریافت کیے اور اہل اجتہاد کے سبب سے جو جو دقتیں پیش آتی تھیں۔ وہ بھی بیان کیں۔

تو شیخ مبارک نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ:

''بادشاہ عادل خود مجتہد ہے۔ مسئلہ اختلافی میں مناسب وقت پر جو حضور مصلحت دیکھیں۔ اس کا حکم فرمائیں۔ ان لوگوں نے شہرت سے اصل سے ہوا باندھ رکھی ہے۔ ان کے اندر کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ کو ان سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔''

اکبر اعظم نے کہا کہ:

''ہرگاہ شما استاد ما باشید و سبق پیش شما خواندہ باشیم چرا مارا از منت ایں ملایاں خلاص نے سازید۔''

آخر سب جزئیات وکلیات پر نگاہ کر کے تجویز ٹھہری کہ ایک تحریر تیوں اور رو...... کی اسناد سے لکھی جائے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

''امام عادل کو جائز ہے کہ اختلافی مسئلہ میں اپنی رائے کے بموجب وہ جانب اختیار کرے جو اس کے نزدیک مناسب وقت ہو اور مصلحت پر ور ہو۔ اور علماء و مجتہدین کی رائے پر اس کی رائے کو ترجیح ہوگی۔''

چنانچہ مسودہ اس کا خود شیخ مبارک نے تیار کیا۔ اگرچہ اصل مطلب انہی چند اشخاص سے تھا جو احکام اور مہمات سلطنت میں سنگ راہ ہوا کرتے تھے۔ مگر علماء فضلاء قاضی القضاۃ، مفتی اور بڑے بڑے عالم جن کے فتووں کو مہمات خلائق میں بڑی بڑی تاثیریں تھیں سب بلائے گئے کہ اس پر مہریں کر دیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شان اکبری ہے کہ شیخ مبارک درباری صدر محفل میں بیٹھے تھے اور ان کے حریف ان کے طلب ہوئے تھے اور عوام الناس ان کی صف میں آ کے بیٹھتے تھے اور جبراً و قہراً مہریں کرتے چلے گئے۔

فاضل بدایونی نے اس میں یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ:

''اگرچہ عالمان مذکور میں یہ صورت کسی کو بھی پسند نہ تھی مگر دربار میں وہ بلائے گئے اور ان کو جبراً یا گیا اور جبراً و قہراً ان کو اس محضر پر اپنے دستخط ثبت کرتے پڑے۔ ان کو عوام الناس کی صف میں بٹھا دیا گیا تھا کسی نے بھی ان کو تعظیم واحترام نہ دیا اور شیخ مبارک اعلم علمائے زمان تھا خوشی خوشی دستخط کرتے اتنا زیادہ لکھا کہ:

''ایں امریست کہ من بجان ودل خواہان واز سالہا ئے تا ز منتظر آں بودم۔''

پھر شیخ صدر اور علمائے مخدوم کا جو حال ہوا ان کے حالات میں معلوم ہو جائے گا ان کے حالات کا مطالعہ کریں اور خدا تعالیٰ سے پناہ طلب

کریں۔ کیونکہ یہ دنوں کا ہیر پھیر جاری رہتا ہے۔ جس طرح نظام قدرت میں کبھی دن کا وقت ہوتا ہے تو اس وقت سورج کی آب و تاب سے لوگ فیض یاب ہوتے ہیں اور بعض اوقات یہ سورج غروب ہو جاتا ہے تو اندھیرا چھا جاتا ہے۔ کبھی اس وقت قمر کی راج دھانی ہوتی ہے اس کی روشنائی سے عوام الناس مفید ہوتے ہیں۔ ور سورج غروب ہو چکا تھا۔ اسی طرح انسانی زندگی کا بھی ایک چکر ہے کبھی تو وہ عروج پر ہوتا ہے تو دوسرے لمحے میں زوال پذیر ہوتا ہے اگر عروج میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے تو اس میں دوام ہوتی ہے اور اگر ناشکری اور عوام پر ظلم روا رکھے تو اس میں کمی بھی واقع ہو جاتی ہے مگر اس کا فیصلہ اس کی تقدیر کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔

اس لیے ہر حکمران با اختیار ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تعلیمات پر عمل کرے اور عوام الناس کو فائدہ پہنچائے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ اس کی نعمتوں میں اضافہ کرے اور اس کے اقتدار میں طوالت بخشے۔

شیخ مبارک کی سیرت

ملا صاحب علماء کے سلسلے میں رقمطراز ہیں کہ:

"شیخ مبارک زمانہ کے علمائے کبار میں سے تھے اور صلاح و تقویٰ میں ابنائے زماں اور خلائق دوران سے ممتاز تھے ان کے حالات عجیب و غریب تھے چنانچہ ابتدا میں انھوں نے ریاضت اور بہت مجاہدہ کیا امر و بالمعروف اور نہی عن المنکر میں اس قدر کوشش کی تھی کہ اگر اس کی مجلس میں کوئی سونے کی انگوٹھی یا اطلس یا لال موزے یا سرخ زرد کپڑے پہن کر آتا تھا تو اس وقت اتروا دیتا تھا اگر کسی کا آزار ایڑیوں کے نیچے ہوتی تو اتنی آزار پھڑوا ڈالتا تھا۔ راہ چلتے کہیں گانے کی آواز کان میں پڑ جاتی تو جلدی سے آگے نکل جاتے تھے آخر دل میں ایسا گانے کا عشق ہوا کہ:

"ایک دم بغیر آواز یا گیت یا راگ یا ساز کے آرام نہ آتا تھا"

غرض مختلف رستوں کا چلنے والا شخص تھا اور انواع اقسام کے رنگ بدلتا تھا۔ افغانوں کے عہد میں شیخ علائی کی صحبت میں تھا۔ اوائل اکبری میں نقشبندیہ کا زور تھا تو اس سلسلے میں لڑی ملا دی گئی۔ چند روز شیخ مشائخ ہمدانیہ میں شامل رہا۔ آخیر دنوں میں دربار پر ایرانی چھا گئے تھے تو ان کے رنگ میں باتیں کرتا تھا مگر ہر حال میں ہمیشہ علوم دینیہ کا درس رکھتا تھا۔ شعر، معما اور فنون اور تمام فضائل پر حاوی تھا۔ برخلاف اس کے علمائے ہند کے خاص علم تصوف اور خوب جانتا اور کہتا تھا۔ شاطبی سم قرات میں نوک زبان پر تھی اور اس طرح اس کا سبق پڑھاتا تھا کہ جو حق ہے۔ قرآن مجید دس قراتوں سے یاد کیا تھا۔ مگر بادشاہوں کے دربار میں کبھی نہ گیا تھا۔ خوشامد پسند شخص نہ تھا۔ باوجود ان تمام اوصاف کے نہایت خوش صحبت شخص تھا نقل و حکایت اور واقعات دلچسپ کے بیان سے صحبت اور درس کو گلزار کر دیتا تھا کہ احباب کا اس کے جلسہ کو اور شاگردوں کا سبق چھوڑنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ آخیر عمر میں آنکھوں سے معذور ہو گیا تھا۔ اس نے درس و تدریس کا کام بھی چھوڑ دیا تھا مگر علم الہیات کی تصنیف کا کام جاری تھا۔ اس عالم میں ایک تفسیر شروع کی وہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں اس قدر مبسوط اور مفصل ہوئی کہ جسے امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کا ہم پلہ سمجھنا چاہیے اور مطالب و مضامین بھی انواع و اقسام کی تحقیقوں کے ساتھ درج تھے۔ اس کتاب کا نام "منبع نفائس العلوم" رکھا گیا تھا۔ اور عجیب اس میں بات یہ تھی کہ اس کے دیباچے میں ایسے ایسے مطالب لکھے ہیں کہ ان سے دعوے مجددی اور نئی صدی کی بو آتی ہے اور جو تجدید تھی وہ تو معلوم ہی ہے یعنی دین الہی

اکبر شاہی۔ جن دنوں میں تفسیر مذکور کو مکمل کیا ہے۔ ابن فارض کا قصیدہ تائیہ کہ سات سو شعر کا ہے اور قصیدہ بردہ اور قصیدہ کعب ابن زبیر اور بزرگوں کے قصائد و وظائف کے طور پر حفظ پڑھا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۷ ذی القعدہ ۱۰۰۱ھ اس دار فانی سے رخصت ہو گئے تھے۔ اس کا معاملہ تو خدا کے حوالے ہو مگر کوئی بھی ملا آج تک ان کے پائے کا نظر نہیں آیا مگر حیف کا مقام ہے کہ:

''حب دنیا اور جاہ و حشمت کی نحوست سے فقر کے لباس میں دین اسلام کے ساتھ کہیں صاف نہ رکھا۔''

آغاز جوانی میں میں نے بھی کئی برس اس کی ملازمت گرامی میں سبق پڑھے تھے۔ الحق صاحب حق عظیم ہے مگر بعض امور دنیاداری اور بے دینی کے سبب سے اور اس لیے کہ مال و جاہ اور زمانہ سازی اور مکر و فریب اور تغیر مذہب و ملت میں ڈوب گیا جو سابق تھا وہ اصلاً نہ رہا۔

کہہ دے تم اور ہم راہ پر ہیں یا گمراہ ہیں (کون جانتا ہے؟) عوام الناس کی بات ہے کہ:

''ایک بیٹا باپ پر لعنت کرتا ہے۔''

رفتہ رفتہ قدم آگے بڑھایا گیا۔ ملا صاحب کی یہ چند ذوریاں ہیں کہ:

''بھلا بیٹا ماں باپ سے یوں کہہ سکتا ہے کہ جاؤ ہمارا تمہارا اب تعلق نہ رہا؟''

اور اس کے کہنے سے ماں باپ کے سارے حقوق اور جاتے ہیں یہ ختم ہو جائیں گے کبھی نہیں ہو سکتا۔ جب یہ نہیں ہو سکتا تو استاد کے حقوق کیونکر ختم ہو سکتے ہیں؟ اس کی معلومات کی ایک پوٹلی میں باندھ کر اس کے حوالے کر دو اور اپنے گھر کو ویسے ہی واپس چلے جاؤ۔ پھر ہم آپ کو کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا تعلق اس کے ساتھ کچھ نہ رہا اور جب یہ ممکن نہیں تو تمہارے دو حرف کہہ دینے سے کب چھٹکارا ہو سکتا ہے؟ شیخ مبارک اور اس کے بیٹوں نے کیا خطا کی۔ برسوں لکھایا پڑھایا۔ ایسا عالم بنایا کہ علمائے وقت سے کلہ بکلہ گفتگو میں کر کے سب کی گردنیں جھکا دیں۔ اس عالم میں بھی جب کوئی مصیبت آئی تو فوراً سینہ سپر ہو کر مدد کو حاضر ہو گئے۔ اس پر ان کا یہ حال تھا کہ:

''جہاں نام یاد آ جاتا تھا ایک نہ ایک الزام لگا جاتے تھے۔ اپنی تاریخ میں علمائے عصر کی شکایت کرتے کرتے کہتے ہیں کہ:

شیخ مبارک نے خلوت بادشاہی میں بیربر سے کہا تھا کہ:

جس طرح تمہارے ہاں کتابوں میں تحریفیں ہیں اسی طرح ہمارے ہاں بھی ہیں جو کہ قابل اعتبار نہیں ہیں اگر سچ پوچھیں تو اس نے کیا جھوٹ کہا۔ مگر اس کی قسمت اوروں کی باتیں اس سے ہزار من سنگین وزنی ہوتی ہیں۔ انھیں ان کی حماقت یا ظرافت میں ڈال کر ٹال دیتے تھے۔ ان کے منہ سے بات نکلی اور کفر کا فتویٰ صادر ہوا۔

وفات

ابوالفضل لکھتے ہیں کہ:

روایات اقبال (لشکر اکبری) لاہور میں آئے ہوئے تھے اور مصلحت ملکی کے سبب سے یہاں رکنا پڑا۔ اس پر حقیقت (والد ماجد) کی جدائی سے دل بڑا بے قرار تھا۔ سال جلوس ۳۴۔ ۹۹۵ھ تھے تو میں نے التجا کی کہ:

"یہیں تشریف لاتے۔ صورت و معنی کے واقف حال (والد موصوف) نے عرض قبول کی۔ ۶ رجب کو تشریف لائے۔ یہاں گوشہ وحدت میں خوشی کو افزائش بخشتے تھے۔ اب سب کام چھوڑ دیے تھے۔ علوم ظاہری پر متوجہ کم ہوتی تھی۔ ذات و صفات پروردگار میں گفتگو ہوتی تھی اور لوگوں کو عبرت کا درس دیتے تھے۔ ہمیشہ دریائے راوی کے کنارے قیام رکھتے تھے اور وہاں بے نیازی کے عالم میں براجمان ہوتے تھے کہ مزاج قدسی اعتدال بدنی سے متغیر ہوا ایسی بیماری اکثر ہوتی تھی لوا چانک واپسی کے سفر کی تیاری ہوتی تو مجھے بلایا اور انھوں نے زبان سے چند ہوش افزا باتیں منہ سے نکالیں۔ اس کے بعد رخصت دائمی کے لوازمات ظاہر ہونے شروع ہوئے۔ میرے دل سے خون کے گھونٹ گلے سے اترنے لگے اور بڑی بے قراری سے میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اس پیشوائے ملک تقدس نے زور معنوی لگایا تو جب دکا تو سات دن بعد کمال آگاہی اور عین حضوری میں ذیعقد ۱۰۰۱ ھ تھی کہ ریاض اقدس کو ٹہلتے روانہ ہو گئے۔ حق شناسائی کا سورج غروب ہو گیا عقل ایزد شناس کی آنکھ جاتی رہی۔ دانائی کی کمر خم ہو گئی۔ دانش کا وقت اخیر ہو گیا۔ مشتری نے چادر سر سے پھینک دی عطارد نے قلم توڑ ڈالا۔ جب شیخ مبارک اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے تو ان کو لاہور شہر ہی امانتاً دفن کر دیا۔ ۷ ذیقعدہ ۱۰۰۱ھ کو مبارک دانا دنیا سے رخصت ہو گئے تو بیٹوں نے ماتم میں سر، ابرو کو منڈوا کر داڑھی مونچھ سے جا ملایا۔ اس چار ضرب کی تاریخ کو شریعت جدید کہا کرتے تھے۔

شیخ مبارک کی اولاد

شیخ مبارک نے ساری زندگی حصول علم دین، سفری صعوبتوں اور آخری عمر میں اکبر اعظم کے دور میں بیٹوں کی وجہ سے ان کی عزت افزائی ہوئی مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو اولاد کے معاملے میں بڑا ہی سرخرو رکھا۔ اللہ تعالیٰ نے شیخ مبارک کو آٹھ بیٹوں اور چار بیٹیوں سے نوازا۔ ان کے بیٹوں کے یہ نام مشہور ہیں۔

ا۔ فیضی کی ولادت

فیضی کی ولادت ۹۵۴ھ میں ہوئی تھی۔ انھوں نے آتش کدہ کو آپ بیان سے بجھایا ہے۔ ان کی تصنیفات گویائی اور بینائی کے تراز و اور سرخان نغمہ سرا کا سرفراز ہیں۔

۲۔ شیخ ابوالفضل کی ولادت

شیخ ابوالفضل کی ولادت ۹۵۸ھ بمطابق ۱۵۴۷ء کو واقع ہوئی۔ اس وقت شیخ مبارک کی عمر ۴۷ برس کی تھی۔ یعنی یہ اپنے بڑے بھائی سے صرف چار سال چھوٹے تھے۔ مگر بڑے عالم فاضل و دین تھے انھوں نے اپنے زمانے میں خوب شہرت حاصل کی اور مبارک باپ کے مبارک بیٹے ثابت ہوئے۔ اکبر کے دربار میں انھوں نے خوب اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر کے علوم و فنون سے لوگوں کو فیض یاب کیا۔

۳۔ شیخ ابوالبرکات کی ولادت

ان کی ولادت ۱۷ شوال ۹۶۰ھ ہوئی علم و آگاہی کا اعلیٰ ذخیرہ نہیں جمع کیا مگر پھر بھی بڑا حصہ پایا۔ معاملہ دانی شمشیر آرائی کارشناسی میں

پیش قدم گنا جاتا ہے۔ نیک ذاتی درویش پرستی اور خیر عام میں سب سے بڑھا ہوا ہے۔

۴۔ شیخ ابوالخیر کی ولادت

۳ جمادی الاول ۹۶۷ھ کو پیدا ہوئے۔ اخلاق کی بزرگیاں اور اشرافوں کی خوبیاں اس کی عادت میں مزین تھیں۔ زمانے کے مزاج کو خوب پہچانتے تھے اور زبان کو اس طرح قابو میں رکھتے تھے کہ جس طرح اعضا کو (بڑے کم سخن تھے) شیخ ابوالفضل کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں سب بھائیوں میں ان سے تعلق خاص تھا۔ ان کی سرکار کے کاغذات اسی بھائی کے حوالے تھے۔ کتب خانہ بھی ان کے سپرد تھا۔ اکثر احباب کے خطوط میں فرمائشوں اور ضروری کاموں کا شیخ ابوالخیر پر حوالہ دیتے تھے کیونکہ ان کے خطوط کا منشی یہی تھا۔

۵۔ شیخ ابوالمکارم کی ولادت

اس کی پیر کی رات ۲۳ شوال ۹۷۶ھ کو ولادت ہوئی۔ یہ دیوانے جنون میں آجاتے تھے۔ پدر بزرگوار زور باطن سے پکڑ کر درستی کے راستے پر ڈال دیتے تھے۔ معقول و منقول اس دانائے رموز نفس و آفاق کے سامنے ادا کیے۔ حکمائے سلف کے پرانے تذکرے کچھ کچھ میر فتح اللہ شیرازی کی شاگردی میں پڑھے۔ دل میں رستہ ہے امید ہے کہ ساحل مقصود پر کامیاب ہوگا۔

۶۔ شیخ ابوتراب کی ولادت

ان کی ولادت ۲۳ ذی الحجہ ۹۸۸ھ کو واقع ہوئی ان کی ماں دوسری (سوتیلی ہے) مگر سعادت ذخیرہ دل بھر کر لایا ہے۔ وہ کسب کمالات میں مشغول ہے۔

۷۔ شیخ ابوحامد

وہ ۳ ربیع الآخر ۱۰۰۲ھ کو تولد ہوئے۔

۸۔ شیخ ابوراشد

یہ فرد جمادی الاول کو اسی سن میں پیدا ہوئے۔

شیخ ابوحامد اور شیخ ابوراشد یہ فرد دونوں لونڈی کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے لیکن اصالت کے آثار پیشانی پر چمکتے ہیں۔ پیر نورانی نے ان کے آنے کی خبر دی تھی۔ اور نام بھی انھوں نے رکھ دیتے تھے۔ ان کے ظہور سے پہلے اسباب سفر باندھا۔ خدا سے اُمید ہے کہ ان کے اقدس گرامی کی برکت سے دولت خوش نصیبی کے ساتھ آمشنیں ہوں کہ رنگ رنگ کی نیکیاں جمع ہوں۔ بڑے بھائی فیضی نے تو ہستی کا اسباب باندھا اور عالم کو غم میں ڈالا۔ امید ہے اور پہلے چھوٹے نونہالوں کو خوشی کامرانی اور سعادت دوجہان کے ساتھ خدا عمر دراز کرے اور صورت معنی دینی اور دنیاوی نیکیوں سے سربلندی دے۔

یہ شیخ صاحب کے آٹھ فرزند تھے جو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل و کرم سے عطا فرمائے سب کے سب بڑے نیک، پرہیزگاری ہونے

کے علاوہ عالم دین تھے اور سنت وقرآن کی تعلیمات کے بالکل پابند تھے۔ انھوں نے دین کی خاطر بہت ہی سخت صعوبتیں برداشت کیں مگر کسی کے سامنے نہ جھکے اور نہ کسی کی اسلام کے خلاف خوشامد کی۔ جس طرح دنیا دار علماء کرتے ہیں۔ یہ ان کے کردار کی عظمت اور شان تھی جس کی تعریف کی جاتی ہے اور یہ دنیا میں مثال ہے۔

شیخ مبارک کی بیٹیاں

مختلف تاریخ کی ورق گردانی کرنے سے معلوم ہوا ہے۔ شیخ مبارک کی چار بیٹیاں بھی تھیں۔ جن کے نام درج ذیل ہیں۔

ا۔ عفیفہ زوجہ خداوند خاں

ملا صاحب ۹۹۸ھ میں فرماتے ہیں کہ ان دنوں میں خداوند خاں (دکنی) کی رافضی کہ شیخ ابوالفضل کی بہن حسب الحکم اس کے نکاح میں آئی تھی۔ ولایت گجرات میں قصبہ کری جاگیر پا کر وہیں دوزخ کے ٹھکانے جا پہنچا۔

۲۔ پاک دامن بی بی زوجہ میر حسام الدین

دوسری بیٹی کا نکاح میر حسام الدین سے ہوا۔ وہ غازی خاں بدخشی کے بیٹے تھے۔ باپ کے بعد ہزاری منصب نصیب ہوا اور دکن بھیجے گئے۔ خان خاناں کا دربار دریائے قدرت تھا۔ دنیا موتی رولتی تھی۔ ان سے تو دو پشت کی آشنائی تھی۔ یہ بھی غوطے لگانے لگے مگر عین شباب میں محبت الٰہی کا جذبہ ہوا۔ خان خاناں نے کہا کہ:

”ترک دنیا کا ارادہ دل پر چھا گیا ہے۔ درخواست کروں گا کہ تو منظور نہ ہوگی، میں دیوانہ ہو جاتا ہوں۔ آپ حضور میں لکھ کر مجھے دلی بھیج دیجئے کہ جو عمر میری باقی ہے۔ سلطان المشائخ کے مزار پر بیٹھ کر گزاروں۔“

خان خاناں نے منتیں کرتے روکا کہ یہ دیوانگی ہزار فرزانگی سے افضل ہے۔ مگر ملتوی رکھنی چاہیے مگر وہ نہ مانا اور اپنی ضد پر اڑا رہا تو دوسرے دن کپڑے پھاڑ کر پھینک دیئے کیچڑ مٹی بدن کو ملی اور کوچہ بازار میں پھرنے لگا۔ بادشاہ کو کسی نے اطلاع دے دی تو وہاں سے دلی کی رخصت حاصل ہوگئی یعنی ان کو دلی جانے کی اجازت مل گئی تو تیس سال کمال زہد وتقویٰ اور پرہیزگاری میں گزار دیئے۔ علم سے بہرہ کامل رکھتے تھے مگر بہت آپ فراموشی سے دھو کر تلاوت قرآن پاک اور ذکر الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ حضرت شاہ باقی اللہ ﷺ اصل آبائی وطن سمرقند تھا اور ولادت کابل میں ہوئی تھی اور ان کا مزار اب بھی قدم شریف کے راستہ کو آباد کرتا ہے اس وقت وہ حیات تھے چنانچہ ان سے ہدایت حاصل کی۔

۱۰۳۳ھ ان کا انتقال ہو گیا تو پاک دامن بی بی نے شوہر کے اشارے سے تمام زر و زیور فقط، مساکین کو بانٹ کر آلائش دنیا سے دامن پاک کیا تھا وہ جب تک حیات رہیں بارہ ہزار روپے سالانہ خانقاہ کے خرچ کے لیے روانہ کرتی رہی تھی۔

۳۔ زوجہ راجہ علی خاں

شیخ مبارک کی تیسری بیٹی کی شادی راجہ علی خاں حاکم خاندیس کے بیٹے سے ہوئی۔ اس کا بیٹا صفدر خاں ۴۵ جلوس میں ہزاری منصب دار ہوا۔

۴۔ لاڈلی بیگم زوجہ اسلام خاں

شیخ مبارک کی چوتھی اور آخری بیٹی کا نکاح اعتقاد الدولہ اسلام خاں شیخ علاؤالدین چشتی سے ہوا تھا کہ شیخ سلیم چشتی کے پوتے تھے اور حسن اخلاق اور خصائل مرضیہ کے سبب سے خاندان کی برکت تھی۔ جب جہانگیر تخت نشین ہوا تو انھیں اسلام خان کا خطاب، پنجہزاری منصب اور بہار کا صوبہ عنایت ہوا کہ دکشاش کا رشتہ ملا ہوا تھا۔ ۳ جلوس میں بنگالہ بھی مرحمت ہوا، باوجودیکہ اکبر کے عہد میں ملک مذکور پر لاکھوں آدمیوں کے خون بہے تھے۔ پھر بھی پٹھانوں کی کمر چین کناروں پر لگی ہوئی تھی۔ ان میں عثمان خاں قتلو لوہانی کا بیٹا تھا۔ کہ اب تک اس کی جڑ نہ اکھڑی تھی۔ چنانچہ ۶ جلوس میں شش ہزاری منصب سے اعزاز پایا اور ۱۰۲۲ میں دنیائے کوچ کرکے فتح پور سیکری وغیرہ میں کام کرتے رہے۔ بھوک و پیاس کی شدت کو بھی صرف محسوس ہی کیا جا سکا کہ وہ ۱۰۲۲ھ میں انھوں نے دار فانی سے کوچ کیا اور اس کے بعد فتح پور سیکری بزرگوں کا مدفن تھا خواب آرام سے آیا۔

شیخ مبارک کی سخاوت

شیخ مبارک کی سخاوت کے حالات پڑھ کر یا سن کر ہر انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ اپنے دسترخوان خاص کے علاوہ ایک ہزار طبق طعام اور اس کے لوازمات ملازموں کے لیے مخصوص رکھتے تھے۔ گرانقدر زیور اور قیمتی کپڑے کے خوان نوکر لیے کھڑے ہوتے تھے جس کی قسمت و مقدر ہوتا تھا وہ انعام دیتے تھے جھروکہ درشن دیوان عام، دیوان خاص وغیرہ مکانات دربار کے لازم سلاطین ہیں۔ انھوں نے بھی آراستہ کیے تھے۔ اور شغل و تفریح کے لیے ہاتھی بھی لڑاتے تھے اس کے ساتھ ہی وہ بڑے متقی اور پرہیزگار بھی تھے۔ مگر کسی قسم کا نشہ یا دیگر ممنوع چیز یعنی شراب، افیون اور چرس وغیرہ کا قطعاً استعمال نہ کرتے تھے لیکن کل بنگالہ کی کنجیاں نوکر تھیں۔ اسی ہزار روپیہ مہینہ جس کا ۹ لاکھ ۶۰ ہزار روپیہ سال ہوا ان کی سالانہ تنخواہ تھی۔ اس کے باوجود اس کے اپنے لباس میں ذرا برابر بھی تکلف کو شان نہ تھی صرف دستار کے نیچے موٹے کپڑے کی ٹوپی اور قبا کے نیچے ویسا ہی کرتا پہنا کرتے تھے۔ دسترخوان پر ان کے سامنے پہلے مکی اور باجرے کی روٹی اور ساگ کی بھجیاں اور سیٹھی چاول خشکہ آتا تھا لیکن ہمت و سخاوت میں حاتم کو بھی مات کرتے تھے۔ جب بنگالہ میں تھے تو ۱۲۰۰ ہاتھی اب منصبداروں اور ملازمین کو دیے ۲۰ ہزار سوار و پیادے فرقہ شیخ زادے سے نوکر تھے۔ اکرم خاں ہوشنگ لاڈلی بیگم کا بیٹا تھا۔ وہ دکن میں تعینات تھا۔ پھر اسیر کا تعلقہ مل گیا۔ شیر خاں تنور کی بیٹی کا اس سے عقد ہوا مگر طبیعت کے لحاظ سے دونوں میں بن نہ آئی۔ اس کے بھائی بہن کو واپس لے گئے اور دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ اصل میں یہ مزاج اور ظالم طبع تھا۔ مگر شاہجہان کے عہد میں کسی وجہ سے معزول ہو کر دوہزاری کے منصب سے گرا۔ مگر ان کی نقدی مقرر ہو گئی تو فتح پور سیکری میں دادا کی قبر کے متولی ہو کر بیٹھ گئے۔

شیخ مبارک اور خاندان کے مدفن

تاریخ کے حوالے سے انبیائے کرام، اولیائے کرام کے مزارات کا بعض کو تو علم ہے مگر ان کے بارے میں صحیح معلومات اللہ تعالیٰ ہی کو ہیں تو اسی طرح اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی قبور کا بھی تعین مشکل ہی مسئلہ نظر آتا ہے کیونکہ تاریخ میں مختلف مقامات کا ذکر پایا جاتا ہے اور تاریخ وقت کے تعین میں بہت ہی اختلاف پایا جاتا ہے۔ جس سے قارئین حضرات میں غیر یقینی کی فضا عود آتی ہے مگر شیخ مبارک اور ان کے خاندان کی قبور کا حال تو

ہندوستان کی تاریخ میں میسر ہے جو کہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ:

آگرہ میں اکبر کے روضہ سے کوس بھر شرق کی طرف ایک مقبرہ ہے جو کہ شیخ مبارک کی سب سے چھوٹی اور درجے کے لحاظ سے چوتھی بیٹی ہے اس کا مقبرہ ہے۔ وہاں کے بوڑھے لوگ یہ کہتے ہیں کہ:

پہلے اس کے گرد بڑا احاطہ اور عالیشان دروازہ تھا اور اس کے اندر بہت سی قبور تھیں مگر کسی پر کتبہ نہ تھا مگر صرف ایک پر تعویذ سنگ مرمر کا تھا۔ اس کے گرد فتح پور کے سنگ مرمر کی دیوار تھی۔ منشی صاحب مفتاح التاریخ میں کہتے ہیں کہ:

"شیخ مبارک، فیضی اور ابوالفضل یہیں دفن ہیں۔" "لیکن ابوالفضل نے خود آئین اکبری میں لکھا ہے:

"بادشاہ نے جو جمنا کے اس پار چار باغ یادگار آباد کیا ہے اس شرف زاکا نقش وہیں پیدا ہوا ہے۔ والد اور بڑا بھائی وہاں سوتے ہیں (دفن ہیں) شیخ علاؤالدین مجذوب اور میر رفیع الدین صفوی اور بہت سے کارآگاہ بھی وہیں آرام فرما ہیں۔ خیر مردہ بدست زندہ ہوتا ہے اگر وہاں سے اٹھا کر کسی نے یہاں رکھ دیا ہوگا اب پتا نہیں لگتا کہ بوسیدہ ہڈیاں کب یہاں لائی گئیں ہوں گی اور کس نے یہ عمل کیا ہوگا اور کن حالات کے تحت اس نے ان بوسیدہ ہڈیوں کو وہاں سے نکال کر یہاں رکھی ہوں گی مگر ہاں عالیشان دروازہ کا کتابہ بلند آواز سے یہ پکارتا رہا ہے کہ:

"شیخ مبارک یہاں دفن ہیں۔"

هذه الروضة للعالم الربانی و العارف بسم الله الرحمن الرحیم و به ثقتی عارف الصمدانی جامع العلوم شیخ مبارک قدس سرہ قد وقف بنیانه بحر العلوم شیخ ابوالفضل سلم الله تعالی فی ظل دولة الملك العادل یطلبه المجد و لا قبال و الكريم جلال الدین و الدنیا اکبر بادشاہ غازی خلد الله تعالی ظلال سلطنة باهتمام حضرت ابی البرکات فی سنة اربع و الف۔

شیخ عمر نے ۹۰ برس کی عمر میں اس دارفانی سے دار البقا کی طرف کوچ کیا۔ وہ اوصاف حمیدہ اور اوصاف علوم وفنون میں بڑے ماہر اور علمائے کبار میں شامل تھے۔ انھوں نے ساری عمر کسی کی خوشامد نہیں کی اگرچہ ان کو اس کی پاداش میں کچھ بھی ہوا۔ اس کو برداشت کیا گیا مگر کسی سے شکایت نہ کی صبر کیا تحمل و بردباری کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ آخیر عمر میں وہ آنکھوں کی بینائی سے محروم ہو گئے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے دینی علوم کی نعمت کے ساتھ دنیاوی نعمتوں سے بھی مالا مال کر رکھا تھا۔ بڑے سخی اور غلاموں، ناداروں، مساکین اور غربا پر بڑے ہی مشفق اور مہربان تھے۔ لوگوں میں سخاوت کرتے تھے۔ ہر ایک کی مدد کرنے کو تیار رہتے تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے ۸ بیٹے اور چار بیٹیاں عطا فرمائیں۔ جن کا مختصر طور پر ذکر گزشتہ سطور میں کیا جا چکا ہے۔

شیخ مبارک تو اس دارفانی سے رخصت ہو گئے مگر ان کی یاد اب بھی عوام الناس کو ستاتی ہے۔ ان کا خلا آج تک کوئی پر نہیں کر سکا۔ اور شاید مستقبل میں ان سے بہتری پیدا کر دے وہ تو قادر مطلق ہے اور بے نیاز ہستی ہے۔ ان کی کرامات بھی بیان کی جاتی ہیں مگر ان کا مواد میسر نہیں ہے۔

شیخ مبارک بڑے نیک اور شریف النفس انسان تھے۔ اور انھوں نے مسلمانوں کی طرح زندگی گزار کر اعلیٰ مراتب حاصل کیے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے ضوفشاں فرمائے۔ (آمین)

باب ۳

ابوالفضل فیضی فیاضی

۱۔ ۹۵۴ھ میں پیدا ہوئے۔

۲۔ باپ کا نام شیخ مبارک تھا۔

۳۔ ہندوستان میں آگرہ کے قریب چار باغ میں پیدا ہوئے۔

۴۔ اصل نام ابوالفیض رکھا گیا۔

۵۔ وہ بلند خیال شاعر اور ایک شگفتہ مزاج عالم تھے۔

۶۔ ماہ صفر ۱۰۰۴ھ کو اس دار فانی سے رخصت ہوئے۔

۷۔ اکبر کے اہم درباریوں میں سے تھے۔

۸۔ فیضی کا دل و دماغ فیضان قدرت سے شاداب تھا۔

۹۔ فن طب کا بھی ماہر تھا۔

۱۰۔ لوگوں کا مفت علاج کرتا تھا اور مفت ادویات دیتا تھا۔

فیضی پر ایک طائرانہ نگاہ

پیدائش	:	آگرہ میں ۹۵۴ھ میں (چار باغ کے پاس)
نام	:	ابوالفیض
والد	:	شیخ مبارک
تخلص	:	فیضی۔ فیاضی
اوصاف	:	شاعر بلند خیال۔ شاہزادگان اتالیق۔ مصنف
خطاب	:	ملک الشعراء (سلاطین چغتائیہ)
وفات	:	۱۰صفر۱۰۰۴ھ کو
عمر	:	۵۴ سال تقریباً
مرض موت	:	ضیق النفس (دمہ)
برادران	:	۸
ہمشیرگان	:	۴
عہدہ دربار	:	اکبری درباری

حالات زندگی

۹۵۴ھ میں جبکہ ہندوستان کی سلطنت سلیم شاہ کی سلامتی کے لیے فکر مند تھی اور وہ اللہ تعالیٰ سے استحکام کی دعا گو تھی۔ تو ان پریشان حال ایام میں شیخ مبارک آگرہ میں چار باغ کے قریب رہائش پذیر تھے کہ یہ نہال امید میں پہلا پھول کھلا جس نے سب کو باغ باغ کر دیا اور اہل خانہ کی مردنی جاتی رہی تو اقبال پکارا کہ دور کا پھل خاندان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصیب ہوا اس کی کامیابی کے لیے سب دعا گو ہوئے تو اس نہال میسر کا نام ابوالفیض رکھا گیا۔ یہ معصوم بچہ باپ کے برے حالات میں پلا اور اس کی غربت وافلاس میں ہی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ دشمنوں کی عداوت کے کانٹے بھی چبتا رہا۔ حتیٰ کہ ان ناسا عدت حالات زندگی میں وہ معصوم بچہ جس کا نام ابوالفیض تھا پرورش پا کر جوان ہو گیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ماں باپ کے لیے دوسرا احسان تھا اور بچے کے اندر فضیلت اور کمالات بھی پروان چڑھ کر جوان ہو گئے اس نے علم وہنر کا سرمایہ باپ سے ہی حاصل کیا اور علوم عقلی جو ایشیا میں رائج تھے ان سب میں مہارت حاصل کر لی مگر فن شعر میں جو کمال دکھایا وہی ثابت کرتا ہے۔

فیضی کا دل ودماغ فیضان قدرت سے شاداب تھا اور ملک الشعراء اپنی شاعری لے کر آیا تھا اگرچہ اس کا باپ شاعر نہ تھا لیکن ہمہ دان فاضل تھا اور وہ بیٹے کے کلام کو سمجھتا تھا اور اس کی نقطہ نقطہ پر رہنمائی کرتا تھا اور اس کی زبان، فصاحت وبلاغت کی ترغیب ضرور دیتا تھا جو کہ اس کی بہترین رہنمائی تھی جس سے فیضی کے سربستہ سخن کے سرچشمے کھولتے تھے۔ فن طب کو حاصل کیا مگر کچھ اجرت بھی وصول نہ کرتا تھا مگر اس سے فائدہ فقط اتنا حاصل کیا کہ بندگان معالجہ سے فیض پہنچاتا تھا۔ جب ہاتھ میں زیادہ رسائی ہوئی تو دوا بھی اپنے پاس سے دینے لگے یعنی لوگوں کا مفت علاج کرنے لگے اور جب ہاتھ میں زیادہ رسائی ہوئی تو دوا بھی اپنے پاس سے دینے لگے۔ یعنی لوگوں کا مفت علاج کرنے لگے اور فرصت نے تنگی کی تو رفاہ کی نظر سے ایک شفا خانہ قائم کر دیا۔ جہاں عوام الناس کو مفت علاج کی سہولت میسر تھیں۔

قادر مطلق کی قدرت نمائی کا عمدہ نمونہ

فیضی اور اس کے باپ کا حال قادر مطلق کی قدرت نمائی کا ایک عمدہ نمونہ تھا اور ان کے عداوت پسند لوگوں کا حملہ ان پر طوفان نوح علیہ السلام کی طوفان کی طرح گزر گیا اور وہ صحیح وسلامت اس طوفان نوح سے بچ گئے تو وہ خدا کا شکر بجا لائے۔ اس میں اکبر بادشاہ کی نیک اندیش نیت کا بھی بڑا دخل تھا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ دربار کا رنگ کیسے کیسے متغیر ہوتا رہتا ہے؟" آخر کار بوڑھا عالم وفاضل شخصیت کا مالک اپنے تباہ حال گھر اور گری مسجد میں آکر بیٹھ گیا۔ تو اس نے بیٹھ کر مسجد میں درس وتدریس کا کام شروع کر دیا اور تعلیم وہدایت کے چراغ روشن کیے اس نے محسوس کیا کہ:

" بادشاہ فضل وکمال کا طالب ہے اور اہل دانش اور باتدبیر لوگوں کو ڈھونڈتا ہے اور جو اشخاص اس سلسلے میں نامزد ہوتے ہیں دربار میں پہنچ کر معزز مقام پاتے ہیں۔ اس کا کمال اپنے بازوئے پرواز کو دیکھتا تھا اور رہ جاتا تھا مگر آفرین ہے کہ غیور، ہمت اور بے نیازوں کو کہ امراء کے

دروازوں کی طرف دیکھتا بھی نہ تھا۔ چہ جائیکہ ان دروازوں پر جا کر دستک برائے امداد دی جاتی ہے اور ان سے کسی قسم کی مدد کا سوال کرتا۔

شیخ فیضی جس کا آئے دن کے صدموں سے دم گھٹ رہا تھا اب اس کی طبیعت بھی ذرا سنبھل کر روشن ہونے لگی اور پھولوں کی طرح مہک دینے لگی اور یہ مہک میدان عالم میں بھی پھیلنے لگی اور آخر کار اس کا اثر دربار شاہی تک پہنچ گیا تو ۹۷۴ھ بادشاہی لشکر نے چتوڑ پر علم اٹھائے تھے جو کسی تقریب میں دربار میں اس کا ذکر ہوا۔ کمال کے جوہری کو جوہر کے شوق نے ایسا بے قرار کر دیا اور اس نے حاکم آگرہ کے نام ایک مراسلہ لکھا کہ:

''فوراً گھر سے بلاؤ اور سواروں کے ساتھ روانہ کرو۔''

کچھ رات تو گزر گئی تھی کہ چند ترکوں نے آ کر گھر پر غل مچایا انہیں آ کر گھر پر کہ دشمن بھی لگے ہوئے ہی تھے انھوں نے سب نے مل کر کہا اور ہم بادشاہ کے شوق کا گلدستہ لینے آئے ہیں یا مجرم کو پکڑنے آئے ہو۔ دشمنوں نے بہادران شاہی کو بہکا دیا کہ:

''شیخ بیٹے کو چھپائے رکھے گا۔ اور حیلے بہانے کرے گا۔ ڈراوے اور دھمکاوے کے بغیر نہ دے گا۔ کچھ جو بھی ہو تو شیخ اور اس کے عیال تھوڑی دیر پریشانی و گردانی میں تو رہیں۔ شیخ کو اس کے عیال تھوڑی دیر پریشانی و سرگردانی میں رہیں گے تو اس وقت کا یہ خیال تھا کہ انھیں شیخ صاحب کو خبر ہوتی تو اور اس نے بے تکلف کہہ دیا کہ آپ نے بھی ساری زمین کا ذمہ لیا ہے۔

اہل حسد کا یہ مطلب تھا کہ وہ ڈر کر بھاگ جائے گا اور اگر کچھ بھی نہ ہو تو شیخ اور اس کے عیال تھوڑی دیر پریشانی و سرگردانی میں رہیں گے۔

جب شیخ کو علم ہوا تو اس نے بے تکلف کہہ دیا کہ وہ گھر میں موجود نہیں ہے بلکہ وہ گھر سے باہر ہے۔ سپاہی ازبک خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور وہ کم عقل اور ناتجربہ کار آدمی تھا۔ وہ نہ تو ان کی بات کو سمجھتا تھا اور نہ اس کی کوئی بات جانتا تھا۔ اس سے یہ گمان ہو سکتا تھا کہ شاہی حکم اور شیطان کا دل میں وسوسہ ڈالا ہوا فریب تھا کہ حاسدوں کا دسواس پیچ کا روپ بدل کر فتنہ برپا کر دے تو قدرت خدا کی کہ انہی لمحات میں باہر سے فیضی بھی آ گئے ان کی آمد سے وہ شاہی اہلکار شرمندہ ہو گیا۔ ان کی آمدنی کے راستے بند ہو گئے سفر کا سامان کہاں؟ شاگردوں اور اہل ارادت کی سعی سے یہ مشکل سامان ہو گئی اور رات کو ہی فیضی روانہ ہو گئے۔ گھر اور گھرانے کے لوگ غم میں ڈوب گئے۔ سب پریشان تھے کہ اب ان کا کیا حال تھا؟ کئی دن کے بعد ان کے بارے میں اطلاع ملی کہ ''خسرو آفاق نے غریب نوازی فرمائی ہے کچھ خطرہ کا مقام نہیں ہے۔'' فیضی بادشاہ کے سامنے حاضر ہوئے تو حضور جس بارگاہ میں تھے اس کے گرد جالی کا کٹہرا تھا۔ فیضی کو اکبر اعظم نے کٹہرے سے باہر کھڑا کیا۔ یہ سمجھے کہ اس طرح کلام کا مزہ نہ آئے گا تو فیضی نے اسی وقت ذیل قطعہ پڑھا۔

بادشاہ		درون	پنجرہ	ام
از	سر	لطف	خود	مرا جا دہ
زانکہ	من	طوطی	شکر	خائیم
جائے		طوطی درون	پنجرہ	بہ

ترجمہ: بادشاہ پنجرے کے اندر ہے اور اس سے لطف نہیں آتا۔

میں طوطی کا شکریہ ادا کرتی ہوں ۔ طوطی کی جگہ پنجرے سے بہتر ہے ۔ تو اکبر فیضی کی اس حاضر کلامی سے بہت خوش ہوا اور اس کو پاس آنے کی اجازت دے دی ۔ فیضی نے جو قصیدہ اول دربار میں پڑھا اس کا مطلع یہ ہے ۔

فیضی کی شاعری

سحر	نوید	رساں	قاصد	سلیمانی
رسید	بہجو	سعادت	کشادہ	پیشانی

ترجمہ: صبح سویرے پیغام رساں نے خوشخبری دی ۔ کشادہ پیشانی سے اس طرح سعادت ملی اس کے تقریباً تین سو اشعار تھے ۔ ان کے ہر شعر سے کمال شاعری کے ساتھ فضیلت اور علم و حکمت کے فوارے جاری ہوتے تھے اور یہ چونکہ انھوں نے رستے میں کہے تھے اور موقع وقت سامنے ہے ۔ اس لیے اکثر مناسب حال مضمون نہایت خوبصورتی سے ادا ہوئے ہیں ۔ چنانچہ بادشاہی سواروں کے پہنچنے کا گھر میں گھبراہٹ پھیلی اور اپنی طبیعت کو جو پریشانی تھی ۔ ان کی تصویر عجب انداز سے کھینچی ہے مگر دشمنوں کا منہ بند ہو گیا اور وہ بڑے پریشان ہوئے ۔

فیضی بڑے بلند خیال شاعر اور ایک شگفتہ مزاج عالم تھا ۔ وہ اپنی شگفتہ بیانی اور دانش خداداد اور فراخ دلی کی بدولت نہایت کم عرصہ میں درجہ مصاحبت تک پہنچ گیا تھا اور چند ہی ایام میں اس کے اقبال کا عالم تھا اس کی جدائی کوئی بھی برداشت نہ کرتا تھا ۔ اس نے ہر ایک کے دل میں اپنا مقام اور ہر دلعزیزی پیدا کر لی تھی ۔ شیخ مبارک کے دوسرے بیٹے ابوالفضل کو بھی دربار اکبری میں بلا لیا گیا تھا ۔ اور اب ان کی مقبولیت اور اعتماد کی یہ حالت تھی کہ جو دربار میں کوئی بھی فیصلہ خواہ وہ مہمات کے سلسلے میں یا ملکی نظم و نسق کا ان کے صلاح و مشورے کے بغیر طے نہ پاتا تھا مگر فیضی نے کوئی ملکی و مالی خدمت حاصل نہ کی ۔ اور اس ممکن بھی نہیں تھا کہ کیونکہ اگر وہ ادھر ہاتھ ڈالتا تو شاعری نہیں کر سکتا تھا ۔ لیکن ملک مال کے جزوی جزوی معاملے ان کی اصلاح پر منحصر تھے اور ان کے صلاح و مشورے سے تمام فیصلے طے پاتے تھے جو کہ وہ بڑی دانشمندی اور دانائی سے صلاح و مشوروں میں دلچسپی رکھتے تھے ۔

دفتری اصول وضوابط کی ترتیب بنانا

ہندوستان میں قومی زبان ہندی ہے ۔ جس کے تحت تمام دفتری امور کا تبادلہ خیالات یا خط و کتابت ہندی زبان میں ہوا کرتی تھی ۔ تو اس قومی زبان میں ہی دفتری خط و کتابت ہوتی تو ہندوستان کے شاہی دفتروں کے کاغذات ہندو ملازم اپنے ہندی اصولوں کے مطابق رکھتے تھے اور ان کے برعکس انگریز یا دوسرے لوگ تو وہ اصول وضوابط کے مطابق کاغذات خط و کتابت رکھتے تھے ۔ اس اختلاف کی وجہ سے دفتر شاہی میں عجب غلط ملط ہو رہا ہے ۔ جس سے شاہی کاغذات کو تلاش کرنے میں مشکلات کا لوگوں کو سامنا تھا تو یہ مشکل دور کرنے کے لیے شہنشاہ اکبر نے حکم جاری کیا جس کے تحت ٹوڈرمل، فیضی، میر فتح اللہ شیرازی، نظام الدین بخشی، حکیم ابوالفتح، حکیم ہمام وغیرہ سب نے مل کر اکٹھے بیٹھ کر کاغذات دفتری کے لیے قواعد وضوابط تیار کیے ۔ اس ضمن میں حساب کے قواعد وضوابط بھی تیار کیے گئے تھے کہ سب محاسب ایک طور پر عمل درآمد کریں اور تحریروں میں اختلاف نہ ہو۔ بلکہ ایک جیسی ہی ہو تاکہ سب اس کو سمجھ سکیں اور ان پر عمل کرنے میں کوئی مشکل یا دقت نہ ہو۔

ان قواعد وضوابط کے تیار کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فیض کا اکبر کے دربار میں بڑا عمل دخل تھا اور اس کا مقام اپنے ہم عصر درباریوں میں بہت بلند تھا۔ ان قواعد وضوابط کے بعد دفتری کاغذات میں ایک مطابقت پیدا ہوگئی اور ہندی ملازموں اور ولائتی ملازموں کے طریقوں سے اختلاف بھی جاتا رہا۔

اکبر کا فیضی کو اعزاز

جو شاہزادہ تعلیم حاصل کرنے کا شوق رکھتا تھا تو اس کو علم کرنے کا شعور اور شوق ہوتا تھا تو اکبر اس کو فیضی کی شاگردی میں بھیجتا تھا۔ جو کہ فیضی کے لیے اکبر کا یہ بہت بڑا اعزاز تھا اور وہ اس بات پر فخر بھی کرتا تھا۔ اکبر فیضی کے حوالے کر کے اس کو کہتا تھا کہ:

"اس کی تعلیم وتربیت کرو۔"

چنانچہ سلیم شاہ، مراد اور دانیال یہ تمام فیضی کے شاگرد تھے اور فیضی کو بھی ان کا شاگرد ہونے کی وجہ سے فخر تھا۔ اس کو اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان اور کرم تصور کرتا تھا تو وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے اپنی ہر تحریر میں دو باتوں کا شکر درگاہ الٰہی میں یوں بجالاتا ہے۔

i- اول یہ کہ درگاہ شہنشاہی میں اس کو اس قدر قربت اور اعلیٰ مقام ملا جس سے کئی لوگ محروم تھے حالانکہ وہ بڑی کوشش کرتے تھے۔ یہ بھی اس پر اللہ تعالیٰ کا بڑا کرم اور احسان تھا۔

ii- دوسرے شاہزادوں کی استادی سے ان سے جو اعزاز پایا مگر بار بار عجز وانکسار سے کہتا تھا کہ:

"ان کے دل روشن سے سب کچھ روشن ہے مجھے آتا ہی کیا ہے؟ جو میں انھیں سکھاؤں؟ میں ان سے آپ آداب اقبال کا سبق حاصل کرتا ہوں۔"

حریفوں کے انداز معرکہ آرائی

اگر غور سے مطالعہ کیا جائے کہ ان کے حریفوں کی معرکہ آرائی کے انداز اور آئین جنگ بالکل ایک دوسرے کے خلاف تھے۔ حریف کہتے تھے کہ:

"سلطنت شریعت کے تابع ہے۔ ہم صاحب شریعت ہیں اس واسطے صاحب سلطنت کو واجب ہے کہ جو کچھ بھی کرے ہماری اجازت کے بغیر نہ کرے۔" اس کے مقابلے میں مخالف گروپ کا یہ کہنا تھا کہ:

"صاحب سلطنت خدا کا نائب ہے جو کچھ وہ کرتا ہے عین مصلحت ہے۔ اور جو مصلحت ملکی ہے وہی شریعت ہے۔ ہم کو ہر حال میں اس کا اتباع اور اطاعت واجب ہے جو وہ سمجھتا ہے ہم نہیں سمجھتے جو وہ حکم کرے اس کا بجالانا حکم ہے اور ہمارے لیے باعث فخر ہے نہ کہ اس کا حکم ہمارے فتویٰ کا محتاج ہے۔"

مگر ان دونوں کے برعکس ایک آزاد گروہ بھی ہے جس کا یہ خیال ہے کہ:

"دونوں بھائی (گروہ) جو زیادہ خوشامدی تھے یہ بھی درست ہے کہ بجلی چمکتی ہے مگر پیچھے تو اندھیرا ہے ان کو کیا علم ہے کہ موقع وقت کیا تھا؟

اور میدان کیسے پرانے پرزور اور جنگ آزمودہ دشمنوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہی آئین جنگ اور لشکر تھے۔ جنھوں نے ایسے حریفوں پر فتح یاب کیا۔ یہ بیٹھ کر جس طرح مرضی باتیں کرتے رہیں مگر یہ ایک امن وامان کی حکومت ہے۔ نئی سلطنت کا بنانا اور اپنے حسب مطلب بنانا اور پرانی برائی کی جڑوں کو نکال باہر کرنا انہی لوگوں کا کام تھا۔ جو کر گئے خوشامد کیا آسان بات ہے۔ پہلے کوئی کرنی تو سیکھے۔ ۹۹۰ھ میں آگرہ کا پشتن کا تجر کی تحقیقات معافی کے لیے صدر الصدور کی مسند پر بیٹھے۔

ملک الشعراء کا خطاب

سلاطین چغتائیہ کی حکومت کا دور تھا جو کہ بڑے عروج پر حکومت تھی۔ اس کے دور میں ۹۹۶ھ میں فیضی کو ملک الشعراء کا خطاب دیا گیا تھا۔ یہاں کا دوسرا خطاب تھا جس سے پہلے غزالی شہیدی کو ملا تھا۔ اس کے بعد فیضی کو دیا گیا مگر یہ خطاب حاصل کرنے کے لیے نہ تو اس نے کوئی کسی سے التجا کی اور نہ کسی قسم کی درخواست ہی دی تھی بلکہ اس کا اعلیٰ درجے کی قربت اور اقتدار حاصل تھا اور نہ اس شخص نے کسی قسم کی حکومت رعایت لینے کی بھی کوشش نہ کی۔

ملک سخن کی حکمرانی خدا تعالیٰ سے لایا تھا اور وہ اس پر تابع تھا یہ بھی اس کے لیے ایک گرانقدر نعمت تھی۔ اکبرنامہ میں شیخ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ:

اس خطاب کے ملنے سے دو تین دن قبل شگفتگی طبع نے ایک قصیدہ کے اشعار میں اپنا رنگ دکھایا جو کہ اکبر کو بہت پسند آئے اور اکبر کہتا اور جانتا تھا کہ:

”دونوں بھائی ہر خدمت کو ایسی سنجیدگی اور خوبصورتی سے بجا لاتے ہیں کہ جو اس کے لیے مناسب ہے اس سے بہتر درجہ پر پہنچا دیتے ہیں اور ہر کام کو جانفشانی سے اور دل عزیزی سے انجام دیتے ہیں۔ انھیں وہ اپنی ذات سے وابستہ رکھتا تھا اور بڑی عزت اور خاطرداری سے ان سے کام لیتا تھا۔ اکبر کی فیضی کے لیے عزت کا یہ مقام تھا کہ اسے شیخ جیو (شیخ جی) ایک مرتبہ اکبر بادشاہ نے فیضی سے کچھ لکھنے کی فرمائش کی تھی اور فیضی اکبر بادشاہ کے حکم کی تعمیل میں وہ لکھ رہے تھے اور اکبر خاموش دیکھ رہا تھا۔ مگر اکبر کے دربار کا اہم درباری راجہ بیربر (بیربل) بھی بڑا منہ پھٹ آدمی تھا۔ اس نے فیضی کے بارے میں کوئی الٹی بات کر دی مگر اکبر نے زبان سے تو اس کو منع نہ کیا مگر آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا اور بیربر کو کہا کہ:

”حرف مزنید۔ شیخ جیو چیزے مینویسد“

ترجمہ: ”بات مت کرو شیخ جی کچھ لکھ رہے ہیں۔“

ان الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ بادشاہ فیضی کو شیخ جی کیا کرتا تھا۔ جو کہ اس کے احترام کی انتہا ہے۔ حالانکہ وہ ایک درباری کا رکن ہی تھا۔ اس کے پاس کوئی قلمدان نہیں تھا مگر وہ اکبر کے دل پر اور دماغ پر حکومت کرتا تھا جو کہ اس کے دربار اور اس علم وفنون وحکمت کے طفیل تھا جو کہ دوسرے کسی کو ایسا مقام حاصل نہ تھا۔

اکبر کی خواہش

اکبر اعظم کی پہلی آرزو تھی کہ......

''کل ہندوستان اس کے زیرِ قلم ہو۔''

اور سلاطین دکن کو ہمیشہ آزاد رہنا چاہتے تھے اور اکثر آزاد رہتے تھے چنانچہ یہ حکومت کے انداز بھی کچھ نرالے ہی تھے جو کہ اہل دکن کو پسند نہ تھے اور وہ اس طرح کی اطاعت کو بڑی اپنی توہین اور بے عزتی تصور کرتے تھے کیونکہ وہ یہ پسند کرتے تھے کہ وہ:

سکہ، خطبہ، بحالی برطرفی، تبدیلی یا خطبہ جنبلی وغیرہ میں کسی حکم کے تابع ہوں ان کی صورت حال کچھ ایسی تھی کہ ان باتوں کو اک کھلم کھلا ظاہر بھی کرسکتا تھا اسے وہ کبھی خط یا نام و پیام وغیرہ بھیجتا تھا اور کبھی ان کو آپس میں لڑوا بھی دیتا تھا یا کبھی حدود دکن پر کسی امیر کو بھیج کر خود ہی لڑائی ڈال دیتا تھا۔ انہی میں سے برہان الملک فرمانروائے احمد نگر بھی تھے کہ وہ اپنے ملک سے تباہ ہو کر دربار اکبری میں حاضر ہوا تھا۔ مگر چند روز یہاں رہا۔ انھوں نے روپے اور سامان سے مدد کی اور راجی علی خاں حاکم خاندیس کو بھی فرمان سفارش لکھا۔ چنانچہ اس کی مدد سے اپنے ملک پر قابض رہا ہوا۔ مگر جب حکومت حاصل ہوئی تو جو امیدیں اس نے اس سے وابستہ کر رکھی تھیں۔ وہ پوری نہ ہوسکیں۔

اس کے بعد ارادہ کرلیا کہ فوج کشی کریں لیکن یہ بھی ان کے آئین تھا کہ جہاں تک ممکن ہو سکے تو دوستی اور محبت کے نام سے ہی کام نکالا جائے چونکہ وہاں کے حاکم شاہانہ زور رکھتے تھے اور سکہ خطبہ بھی اپنے نام کا رکھتے تھے اس لیے ۹۹۹ ھ بمطابق ۱۵۹۱ء ایک ایک امیر دانا کو ہر ایک کے پاس بھیجا راجی علی خان حاکم خاندیس کی سفارت شیخ فیضی کے سپرد ہوئی اور برہان الملک کی فرمائش امین الدین کے نام پر ہوئی۔ شیخ ابو الفضل کی تجویز سے یہ قرار پایا کہ:

راجی علی خان ملک دکن کی کنجی تھا اور امارت موروثی عمر کی درازی عقل و تدبیر، دولت وافر جمعیت سپاہ نے اس کی کوشش کو ملک مذکور میں بڑی تاثیر دی تھی۔''

اکبر دربار کے بہت سے آئین و آداب روشن تھے اور ان آئین و آداب کو فیضی نے بھی تیار کیا تھا جو کہ ارسطو اور سکندر کو آئینہ گری سکھائے تھے ان کی تحریر سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس خدمت سے خوش نہ تھا۔ اگرچہ یہ منصب بڑا اعتبار اور اعزاز کا عالی منصب تھا۔

اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ:

''وہ اپنے آقا کی حضوری کا عاشق تھا۔''

فیضی کی بیماری

فیضی کے ذمہ جو راجی علی خاں کی سفارت کا کام لگایا اور اس کے ساتھ ہی امین الدین برہان الملک کے پاس سفارت کے لیے گئے تو ان امور سے فارغ ہو کر جہاں اس کو ایک سال ۸ ماہ اور ۱۲ دن لگ گئے۔ وہ ان دونوں سفارتوں سے آسانی سے فارغ ہوا۔ ۱۰۰۱ ھ کو حضور میں حاضر ہوئے تعجب کی بات تھی کہ برہان الملک پر ان کا جادو نہ چل سکا بلکہ جو پیشکش بھیجے وہ بھی معیاری نہ تھے۔ راجہ علی خاں بڑا تجربہ کار بوڑھے آدمی تھے۔ انھوں نے اعلیٰ درجے کے تحائف و نفائس تحفہ کے ساتھ بھیجے اور بہت ہی عجز و انکساری کے ساتھ مودبانہ مضامین تحریر کیے۔ یہاں تک کہ شاہانہ چیزوں کے ساتھ سلیم بیٹے کے لیے بھی تحائف روانہ کیے۔ غور تصنیف کان سے جواہر نکالتی تھی مگر اس سفر سے واپس آ کر زندگی کے طور طریقے ہی بدل گئے

تھے ان میں بڑی تبدیلی واقع ہو گئی تھی۔ انھوں نے زیادہ وقت خاموشی میں اپنا شروع کر دیا کسی کے بات نہ کرتے تھے اگر کرتے بھی تو بہت کم کرتے تھے۔ اسی حالت میں بادشاہ کی تحریک سے خمسہ پر ہاتھ ڈالا۔ تفسیر وغیرہ کتابیں بھی آخیر میں ہی نکالیں انھیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے:

''کرتے کیا تھے آٹھو پہر کے دن رات کے تو یہ کام ہیں۔''

۱۰۰۳ء کے آخر میں طبیعت بے لطف ہوئی۔ ضیق النفس، دمہ، تنگ کرنے لگا۔ چار ماہ پہلے دق ہو کر یہ رباعی زبان سے نکلی:

دیدی کہ فلک بمن چہ نیرنگی کرد
مرغ دلم از قفس آہنگی کرد
آں سینہ کہ عالمے درو میگنجید
تا نیم نفس بہ آوردم تنگی کرد

وفات

آخیر میں سب چیزوں سے دل برداشتہ ہو گئے اور ان کو امراض بھی بہت سے لاحق ہو گئے۔ جن کی وجہ سے وہ دن بالکل چپ رہے۔ شاہ دانش (اکبر بادشاہ) خود عیادت کے لیے تشریف لائے۔ انھوں نے آنے کی اطلاع ہوئی اور انھوں نے پکارا تو:

''آنکھوں آداب بجا لائے مگر ان سے کوئی بات نہ کر سکے صرف دیکھتے ہی رہ گئے۔''

مگر اس وقت ان پر کسی کا زور نہ چل سکتا تھا۔ جس کی وجہ سے شاہ دانش نے بھی افسوس کا اظہار نہ کیا اور نہ کسی قسم کا رنج ہی دل میں پایا کیونکہ مریض کی حالت خراب تھی اور خاموشی سے اپنی حالت لے کر واپس چلے گئے تو بادشاہ اسی دن شکار کے لیے روانہ ہوئے اور آخرت کے مسافر (فیضی) نے بھائی سے کہا کہ:

''تم حضور سے چار دن کی رخصت لے لو۔ چوتھے دن خود روانہ ہو گئے۔''

۱۰ ماہ صفر ۱۰۰۴ھ کو انھوں نے وفات پائی اور ان کا گھرانا ایک دفعہ تم کدہ بن گیا بلکہ گھر میں کہرام مچ گیا۔ اصل میں شعر و سخن نے نوحہ خوانی کی کہ لفظوں کا صراف اور معنی کا مرصع کار مر گیا۔ اس دار فانی سے دار البقا میں کوچ کر گیا۔ وہ بیماری کی حالت میں یہ شعر کہا کرتے تھے کہ:

گر ہمہ عالم بہم آید جنگ
پے نشود پائے یکے مور لنگ

ترجمہ: اگر سارے جہاں اکٹھے ہو کر جنگ کے لیے آئیں تو وہ ایک مور کو بھی لنگڑا نہیں کر سکیں گے جب قدرت کو منظور نہ ہو۔

فیضی کے مرنے کی کیفیت زار

قدرتی امر ہے کہ ہر انسان کو اس کی جان عزیز ہوتی ہے اور اس کے لیے ہر جتن کرتا ہے۔ موت کا نام سن کر ہر انسان کا دل پگھل جاتا ہے۔

۱۰ صفر کو ملک الشعرا فیضی اس عالم سے گزر گیا۔ انھوں نے چھ ماہ تک ایسے امراض کی تکلیفیں برداشت کیں کہ جو ایک دوسرے کی ضد

امراض تھے ان امراض میں یہ اہم تھیں۔

i- ضیق النفس ii- استسقاء iii- ہاتھ پاؤں کا ورم

iv- خونی قے

خونی قے نے بہت طول کھینچا۔ اور یہ شخص مسلمانوں کو وحشی لحاظ سے کوفت پہنچانے کے لیے کتوں سے کھلا ملا رہتا تھا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ:

''اس کی جان کندن کی سختی میں کتے کی آواز منہ سے نکلتی تھی۔''

اس کی اپنی مشرعی حالت یہ تھی کہ:

''ایجاد شرائع اور دین اسلام کے انکار میں بڑا تعصب رکھتا اور موت کے وقت بھی دین کے مقدمہ میں ایک متقی پرہیزگار صاحب علم سے لایعنی بے ہودہ کفر کی باتیں کرتا تھا جو کہ اس کی عادت میں داخل تھیں اور یہی باتیں کرتا ہوا وہ آخری موقع تک پہنچ گیا۔''

آدھی رات کا وقت تھا کہ وہ حالت نزاع میں تھا کہ بادشاہ سلامت خود تشریف لائے تاکہ ان کی مزاج پرسی اور عیادت کریں کیونکہ وہ ان کا درباری مصاحب تھا مگر اس وقت فیضی بے ہوش تھے۔ بادشاہ سلامت نے ان کا سر پکڑ کر اٹھایا اور کئی دفعہ پکار پکار کر کہا کہ:

''شیخ جیو! ہم حکیم علی کو ساتھ لائے ہیں تم کیوں نہیں بولتے۔ مگر وہ بے ہوش تھا۔ انھوں نے کئی مرتبہ پکارا مگر کوئی جواب نہ دیا۔ دوبارہ پکارا تو غصے سے پگڑی زمین پر دے ماری۔ آخر کار بادشاہ سلامت اور حکیم علی فیضی کو شفا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی تسلی و تشفی دے کر روانہ ہو گئے اور اس کے ساتھ انھوں نے اس کی موت کی تصدیق کر دی۔

خاتمہ کتاب میں شعراء کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ:

''فنون حرب میں اپنے زمانے میں ثانی نہ رکھتے تھے۔ اوائل عمر میں تخلص مشہور سے شعر کہتے تھے۔ چھوٹے بھائی کی نسبت سے اس کو علامی کہتے ہیں اور شان کو دوبالا کرنے کے لیے فیاضی کا لقب اختیار کیا مگر یہ مبارک نہ ہو سکا۔ جلدی ہی ایک دو ماہ میں رخت سفر یار رخت زندگی باندھ دار البقا کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ تو سفاہت اور سفلہ پن کا موجد تھا۔ غرور و گھمنڈ اور کینہ کا مخترع نفاق، خباثت، ریا، حب جاہ، نمود اور شیخی و تکبر جیسی اخلاقی اور روحانی امراض کا مجموعہ شخص تھا۔ وہ اہل اسلام کے عقائد و عبادات کی وادی میں اور اصل اصول دین کے طعن میں صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین اور تابعین رحمۃ اللہ علیہ کی مذمت میں اور اگلے پچھلے متقدمین متاخرین مشائخ کے باب میں کہ وہ فوت ہو چکے ہیں یا وہ حیات ہیں ان کے حق میں بے دھڑک بے ادبی کرتا تھا (نعوذ باللہ) تمام علماء صلحاء و فضلاء کے باب میں خفیہ اور ظاہرا اگرات ان میں یہی اس کا حال تھا۔ کل یہود و نصاریٰ، ہنود اس سے کئی درجے بہتر اور اچھے تھے کیونکہ وہ مسلمان ظاہر کرتا تھا۔ نظار یہ اور صابحیہ تمام اشیاء حرام کو دین محمدی کی ضد سے مباح سمجھتا تھا اور فرائض کو حرام۔ جو بدنامی سو دریا سے بھی صاف نہ ہو سکے گی۔ اس کے دھونے کے لیے تفسیر بے نقطہ عین حالت مستی اور جنابت میں لکھا کرتا تھا یعنی وہ ناپاکی کی حالت میں تفسیر کے لیے غسل جنابت بھی نہ کرتا تھا جو کہ ضروری تھا اور اس کے کتے پامال کرتے رہتے تھے۔ ان کے روپ پھرتے رہتے تھے۔ یہاں تک اسی انکار اور

گھمنڈ کے ساتھ اصلی قرار گاہ کو چلا گیا اور ایسی عبرت ناک حالت میں گیا کہ خدا کی پناہ۔ کسی کے سامنے بیان کرنے کی ہمت نہیں ہے۔

جس وقت بادشاہ سلامت عیادت کے لیے تشریف لائے تو اس کے سامنے کتے کی آواز نکالی اور اس نے بھی سنی اور اس بات کا ذکر بھی انھوں نے دربار کے اندر دیگر مصاحبوں کے ساتھ بھی کی۔ ان کا بیماری کی وجہ سے منہ سوج اور ان کے ہونٹ سیاہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ بادشاہ نے ابوالفضل سے دریافت فرمایا کہ:

"بے شک جو مذمت اور طعن حضرت خاتم المرسلین کی شان میں کرتا تھا اس کے مقابلے میں تو یہ بہت کم ہیں (کیونکہ اللہ پاک بڑا ہی مہربان ہے) لوگوں نے مذمت آمیز تاریخیں کئی انداز سے نکالی ہیں۔"

جب وہ زندہ و حیات تھا تو اس وقت بھی ملا صاحب پر کبھی ناراض یا غصے نہ ہوا تھا مگر تو وہ اپنے اعمال بد کی گرفت میں پکڑا ہوا ہے۔ (استغفر اللہ) اب وہ کیا بات کرے گا؟ اس نے زندگی میں ہر وقت ملا صاحب کی مدد اور خدمت ہی کی تھی۔ مگر ملا صاحب کا بھی اپنا ضمیر ہے اب وہ مر رہا ہے جو پچھا اس کو کھو کر لو۔ آخر کار یہ بیا گیا کہ:

یہ	کیا	کہا	مجھے	او	بد	زبان	بہت	اچھا

سنا لے اور بھی دو گالیاں بہت اچھا

فیضی کی خصوصیات

ملا صاحب فیضی کے بارے میں رقمطراز ہے کہ:

فیضی نے چالیس سال تک شعر و شاعری میں طبع آزمائی کی مگر اس کے اشعار سب کے سب غلط، استخوان بندی خاص بے مغز اور سراپا بے مزہ۔ وادی سطحیات و فخریات و کفریات میں مشہور سلیقہ رکھتا تھا لیکن ذوق حقیقت میں معرفت اور چاشنی روحانی عرفانی اور مقبول خاطر خدا نہ کرے۔ اس کے دیوان میں اور مثنوی میں بیس ہزار سے زیادہ شعر تھے مگر اس کی بجھی ہوئی طبیعت کی طرح ایک بیت میں بھی شعلہ بیان نہیں تھا جو کہ پڑھنے والے کو متاثر کرتا۔ مطرودی اور مردودی کے سبب سے کسی نے اس کے کلام کی ہوس نہ کی اور نہ کسی نے اس کے پڑھنے کے شوق کا اظہار ہی کیا اس کے برعکس خلاف اور ادنیٰ شاعروں کے اشعار لوگ خریدتے اور پڑھتے رہتے تھے اور عجیب ترین بات یہ ہے کہ ان چھوٹے چھوٹے ڈھکوسلے کے انداز اشعار کی نقل کرنے میں بڑی بھاری رقوم تنخواہ کسی صورت میں خرچ ہوئیں اور لکھوا لکھوا کر معیت آشناؤں کو دور دراز نزدیک کے لوگوں کو روانہ کیے گئے تھے مگر کسی نے بھی ان اشعار کو نہ پڑھنے کی زحمت گوارہ کی اور نہ کسی نے ان اشعار کی تقریظ ہی لکھی۔ بلکہ کسی نے مزید حاصل کرنے کے لیے بھی کبھی مطالبہ نہ کیا۔ یعنی ان کے اشعار اس قدر بے مزہ یا بے لطف اور سادہ قسم کے تھے جن کی کوئی قدر نہ ہوتی۔

ملا صاحب کی یہ بے مروتی مثال ہے کہ فیضی نے ان کے لیے دکن سے ایک سفارشی خط بادشاہ سلامت کی خدمت میں لکھا۔ جس سے اس کا کام سدھر گیا تو اس کو دیکھ کر جب ملا صاحب کی مذمت کے ساتھ مقابلہ کیا جاتا ہے اور اس کی درشتی میں فیضی کے بارے میں مخالفت کا انداز مطالعہ کیا جاتا ہے تو ملا صاحب کی بے مروتی ظاہر ہوتی ہے۔ خصوصی طور پر مرنے کے بعد جب کہ وہ کوئی جواب نہ دے سکتا ہے کہ نہ اس کا کوئی

جواب ہی اس کو دے سکتا ہے۔ اب وہ شخص زندہ لوگوں کے ہاتھ میں دعاؤں کا محتاج ہوتا ہے۔ مرنے والے کسی کو بھی برا کہنا مناسب نہیں۔ یہ بات تو ایک قسم کی عہد شکنی کی نشان دہی کرتی ہے کیونکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ:

لَا تَذْكُرُوْا اَمْوَاتَكُمْ اِلَّا بِالْخَيْرِ۔

ترجمہ: ''کسی کے مرنے کے بعد اس کی بھلائی کے علاوہ کچھ نہ کہو۔''

(بے شک وہ برا ہی ہو) کیونکہ وہ اپنے اعمال کو پہنچ چکا ہے۔ اس کے اعمال کی سزا اس کو مل چکی ہے۔ مزید اگر کوئی اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا ہے تو اس کی غیبتوں میں اس کی تعریف کر کے خیرات کر کے کلام الہامی پڑھ کر اس کی نیکیوں میں اضافہ کرنے کی کوشش کرے تو بہتر ہے برائی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

حق دین اور اس کے عہد کی حفاظت سب نیکیوں سے بالاتر ہے۔ اس کے مزاج میں فساد آتا گیا اور حالتوں میں خلل پڑتا گیا اور رفتہ رفتہ اس کا خلل مرض اس کی موت میں بدل گیا۔ کسی دوسرے کے لیے مرنے کے بعد اس کو برا کہنا قطعاً مناسب نہیں ہے۔ اب ان کا اس دنیا میں کوئی حق نہ رہا اور ان کی محبت ختم ہو گئی ان تمام معاملات کے ہم نے بھی خدا کی بارگاہ میں جانا ہے اور اپنے اعمال کی جزا اور سزا ضرور پانی ہے۔ جہاں سب کو انصاف ملے گا۔ ملا صاحب مزید فرماتے ہیں کہ:

''مال متروکہ میں سے چار ہزار چھ سو جلدیں نفیس تصحیح کی ہوئی تھیں جنہیں بہ طریق مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ اکثر بخط مصنف یا عہد تصنیف کی تھیں۔ ان سب کو سرکار بادشاہی میں داخل کر دیا گیا تھا۔ فہرست کے مطابق ان کو تین اقسام میں تقسیم کیا گیا تھا جو کہ یہ ہیں:

i- اعلیٰ قسم: ان میں نظم، طب، نجوم، موسیقی شامل تھیں۔

ii- وسط قسم: اس میں تصوف، حکمت، ہیئت اور علم ہندسہ وغیرہ شامل تھا۔

iii- ادنیٰ قسم: اس میں تفسیر، حدیث، فقہ اور باقی شرعیات وغیرہ کی کتب کا شمار کیا گیا۔

ان میں ایک سو ایک جلد نلدمن کی تھیں۔

اب کہنے کی بات یہ ہے کہ دونوں عالم آخرت میں پہنچ کر اپنے اعمال کے مطابق حساب دے چکے ہیں۔ اب ان کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے فلاں من ہر کتب فروش سے مل سکتی ہے جو بھی خرید لے۔ انشاء پردازی اس کے قلم کو سلام کرتی ہے۔

فیضی کی تصنیفات

فیضی بڑے عالم و فنون کے ماہر تھے اور اکبر کے دربار میں بڑی اہمیت کے حامل تھے انھوں نے اکبر کے دربار کے اصول و ضوابط کو مرتب کیا۔ بہرحال ان کی ذہن کی تصنیفات بڑی اہم ہیں۔

i- تباشیر الصبح ii- قصائد

iii- لیلاوتی iv- مہابھارت کا ترجمہ

v- بھاگوت اور اتھرون بید vi- انشائے فیضی

vii- تفسیر سواطع الالہام viii- موارد الکلم

ix- موارد الکلم سلک درر الکلم x- مقصد الشعراء

xi- مرکز ادوار

ان تصنیفات کے بارے میں مختصر طور پر یوں تحریر کیا جاتا ہے تاکہ قارئین کے لیے دلچسپی میں اضافہ ہو۔

دیوان

یہ فیضی نے خود مرتب کیا تھا۔ اور دیباچہ لکھ کر لگایا "تباشیر الصبح" اس کا نام لکھ دیا اور جب ترتیب دیا گیا تو ایک دوست کو اس کی خوشخبری لکھ کر اپنا دل خوش کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۳۲ برس سے زیادہ کی کمائی ہے۔ اس میں نو ہزار بیت (شعر) تھے اس کے اندر غزلیں جو کہ شستہ فارسی میں ہیں۔ استعاروں کے پیچوں سے بہت گریز کرتے تھے اور لطف زبان کا بہت خیال رکھتے تھے جس پر انھیں قدرت کامل حاصل ہے۔ ان کی طبیعت جوش میں آ جاتی تھی۔ مگر ان کی زبان اعتدال سے نہیں ہٹتی اور اپنی طرف سے ایک نقطہ بھی زائد کا اضافہ نہیں کرتے۔

قصائد

قصائد میں پہلے لوگوں کے قدم بقدم چلتے تھے۔ انھوں نے قصائد میں جو کچھ بھی کہا ہے وہ نہایت شستہ کہا ہے۔ غزلیں مع قصائد نو ہزار شمار میں آتی ہیں اکبر کو ان کے کلام کی پسندیدگی کی یہ ذیل کی دو وجوہات تھیں۔

i- ان کا کلام عام فہم اور سادہ ہوتا تھا جو کہ آسانی سے سمجھ سے آ جاتا تھا اور کم پڑھے لکھے لوگ بھی پڑھ سکتے تھے۔

ii- دوسری خوبی یہ تھی کہ وہ اکبر اعظم کی طبیعت کو سمجھ چکے تھے اور ان کی طبیعت کے مطابق ہی لکھتے تھے۔ وہ حالات عصر پر نظر رکھتے تھے۔ وقت شناس شخص تھے مردم شناس بھی تھے۔ مطلب کو خوبصورتی اور برجستگی سے ادا کرتے تھے۔ دل لگی اور من بھاتی بات ہوتی تھی۔ اکبر ان کا کلام سن کر خوش ہو جاتا تھا اور اس کی حدیث میں سارا دربار بھی تعریف کرنے لگ جاتا تھا اور اس کی داد میں واہ واہ کرنے لگتے تھے جو کچھ شائد محض بادشاہ کو خوش کرنے کا طریقہ ہو۔ ان کو اشعار یا قصائد کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو۔ اور اس کو ناپسند ہی کیوں نہ کرتے ہوں۔ بہر حال اکبر کے ساتھ درباری بھی اس کے قصائد کی ضرور تعریف کرتے تھے۔

اکبر احمد آباد گجرات وغیرہ کی مہمیں فتح کر کے واپس لوٹا تو ساری فوج پیچھے پیچھے سب نے میدان جنگ کا لباس اور اوتار حرب پہن رکھے تھے اور اکبر کی بھی یہی حالت تھی مگر فوج کی کمان کرتے ہوئے آگے آگے تھے۔ فتح پور کے قریب پہنچا تو کئی کوس آگے آ کر امرا اور وزرا نے استقبال کیا تو فیضی نے آگے بڑھ کر غزل پڑھی۔ جس کا مطلع یوں لکھا گیا ہے۔

نسیم خوش دلی از فتح پور مے آید

کہ بادشاہ من از راہ دور مے آید

ترجمہ: ٹھنڈی ہوا فتح پور سے آئی ہے اور پھر بادشاہ دورے سے آیا ہے۔ ۹۹۷ھ میں جب کشمیر کی مہم سے اطمینان ہوا تو بادشاہ گلگشت پہنچے تو موسم بہار سے دل شگفتہ ہوئے تو فیضی نے بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے فوری طور پر قصیدہ لکھ دیا۔ جس کا ایک مطلع یہ ہے۔

ہزار قافلہ شوق میکند شب گیر
کہ بار عیش کشائد بخطہ کشمیر

فیضی کے ساتھ عرفی سے بھی بڑے زور کا قصیدہ اگل دیا۔ مگر اس کے مضامین خیالیہ اور بہاریہ میں بلند پردازی اور معنی آفرینی تھی۔ ان کے قصیدہ میں حالات حاضرہ کی تصویر تھی جب دربار شاہ یا جلسہ احباب میں پڑھا گیا تو خوش ہو کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ ان کی ہچکی بندھ گئی۔ اور اکبر کابل میں ڈاک کی منزل پر گھوڑے سے گر پڑا اور انھوں نے اس قطعہ سے آنسو صاف کیے۔

دوش از آسمان ضمیرم را
گرد غصہ پرجبین افتاد
حالت رفت کر تصور آں

غرض: ۹۹۳ھ میں اکبر بادشاہ نے فیضی کو حکم دیا کہ:

خمسہ نظامی پر تمام نے طبع آزمائی کی ہے تم بھی اپنے مزے کی رسائی کرو اور یہ قرار پایا کہ۔

۱۔ مخزن اسرار۔

۲۔ مرکز دوار پہ۔

۳۔ خسرو شیریں پر۔ تین ہزار بیت کی لکھو۔

۴۔ سلطان و بلقیس۔ ۴ ہزار بیت پر ہوں۔

۵۔ لیلیٰ مجنوں پر۔

۶۔ نل دمن۔

۷۔ ہفت پیکر پر ہفت کشور ۵ ہزار بیت ہیں۔

۸۔ ہفت کشور۔ ۵ ہزار بیت ہیں۔

۹۔ سکندر نامہ۔

۱۰۔ اکبر نامہ۔ اتنے ہی شعروں میں ہو۔

فیضی نے پہلی کتاب حکم کی تعمیل میں اس دن شروع کر دی یعنی مخزن اسرار پر فوری طور پر طبع آزمائی شروع ہو گئی جب بادشاہ نے سنا تو فرمایا کہ:

''مرۃ الانقلوب ہے باقی کتابوں کے بھی مختلف مقامات لکھے۔ مگر سلطنت کے کاروبار تھے مہمات ملکی و مالی کے ہجوم تھے جس کی وجہ سے تین نسخے مکمل نہ ہوسکے۔''

۱۰۰۳ھ میں فیضی نے اکبر بادشاہ نے لاہور کے مقام پر بلا کر ایک دن پھر خمسہ کی تکمیل کے لیے تاکید فرمائی اور فرمایا کہ:

''پہلے نل و من مکمل کرو۔''

چنانچہ چار ماہ کے اس کے اعلان سے نل و من کی کتاب مکمل کر دی۔ اور اس کتاب کے مضامین بڑے ہی فصیح زبان لفظوں کی عمدہ تراش اور دلکش تراکیب تھیں۔ جس دن اس کتاب کو اکبر بادشاہ کے حضور میں پیش کیا گیا تو اس کتاب کے اوپر پانچ اشرفیاں بھی رکھیں۔ وہ یہ زبان پر چہرہ رنگ کامیابی سے شگفتہ تھا اور ان کے دل میں خوشیاں لوٹ لوٹ کر آ رہی تھیں۔ اکبر بادشاہ کے حکم کی تعمیل میں یہ کتاب مکمل کر کے پیش کرے گا اس کے دل کی مرادیں بر آئیں گی۔ اس کتاب میں کئی رقعے دیکھے گئے ہیں اور عجیب خوشی کے خیالات میں ختم کی خبریں دی گئی ہیں۔

بکرماجیت کے عہد میں کالیداس نے بھی نل و من پر ایک داستان لکھی مگر فیضی کی نل و من کتاب ایک صاحب کمال کے ہاتھ سے نکلی ہوئی اس کے مقابلے میں بہت ہی بہتر اور اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔ فیضی کی نل و من کتاب ہندوستان کے شعراء کے بیے قابل فخر ہے۔ فیضی سنسکرت کا عالم اور ماہر تھا اس کی مثنوی مذکور کی لطافت و نزاکت کا سبب اس کی مہارت اور قابلیت ہے۔ ان کو فارسی زبان پر پوری قدرت تھی اس کے خیالات ابھر لایا اور اس طرح لایا کہ شرافت و لطافت اصل سے بڑھ گئی اور فارسی میں ایک نئی بات نظر آنے لگی۔

ملا بہائی صاحب فرماتے ہیں کہ:

ان دنوں ملک الشعراء فیضی کو بادشاہ اکبر کی طرف سے حکم ہوا کہ:

''شیخ گنج تصو''

تو اس نے حضور کے حکم کی تعمیل میں کام شروع کر کے تقریباً پانچ ماہ میں نل و من لکھی۔ عاشق و معشوق تھے۔ اس کے اندر چار ہزار دو سو اشعار موجود ہیں۔ بادشاہ کو یہ نسخے بہت پسند آیا تو حکم ہوا کہ خوشنویس لکھے اور مصور تصویر کھینچے۔

یہ حقیقت ہے کہ ایسی مثنوی تین سو برس میں خسرو شیریں بعد ہندوستان میں شاید ہی کسی نے لکھی ہو۔

نعت کی کیفیت تو بیان کی جا چکی۔ اس کے بعد مگر دین داری خوش اعتقادی و حسن و اخلاق وغیرہ کے اوصاف کے ساتھ اس کے اشعار سے فیضی کی خوب مٹی خراب کی ہے تو ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

فیضی کو جس قصیدہ پر ناز اس کا پہلا شعر ہے۔

شکر	خدا	کہ	عشق	بتانست	راہبرم
در	ملت	برہمن	و	در	دین	آذرم

تمر نکائی نے اس کے جواب میں یہ شعر لکھا۔

شکر خدا کہ چیرہ دین پیغمبرم
حب رسول و آل رسول است رہبرم

مرکز ادوار

۱۰۰۴ھ شیخ ابوالفضل لکھتے ہیں کہ:

ان کے کلام کی تلاش و ترتیب کے حالات میں ایک بیاض نظر آئی کہ وہ بہت شوریدہ لکھی ہوئی تھی معلوم ہوا کہ انھوں نے بیماری کی حالت میں یہ کتاب ضبط تحریر میں لائی اشعار کو دیکھا تو مراۃ القلوب (مرکز ادوار) کے وزن میں تھے وہ کتاب پڑھی نہ جاتی تھی۔ اس کی ہم نشینوں اور ہم زبانوں نے کہا کہ:

''وہ تھک کر بیٹھے اور ناامید ہو کر اٹھے۔''

آخر میں متوجہ ہوا تو آگاہی اور دانش الٰہی سے بڑھ کر مطلب مطلب اور مضمون مضمون کے شعر الگ الگ لکھے اور ترتیب دے کر داستان داستان کی سرخی کے نیچے لکھی۔

جس پریشان نظم و نثر سے سخن آشنا مصاحبوں کا فکر ناامید ہو گیا تھا اور مرتب ہو کر کتاب تیار ہو گئی تو جب میں نے اپنے بھتیجے کو خوشخبری سنائی تو مجھ پر خوشی کا عالم تھا اور اس پر حیرانی پھیل گئی۔ باقی تینوں کتابوں کے بھی کچھ اشعار اور بعض داستانیں تہیں لکھی تھیں۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ:

''فارسی کا کل کلام نظم و نثر میں پچاس ہزار بیت اندازہ میں ہیں۔''

بعض کتابوں کے مطابق اس کی ترتیب ۱۰۰۹ھ میں مکمل ہوئی۔

لیلاوتی

لیلاوتی حساب کی کتاب تھی جو کہ سنسکرت میں لکھی گئی تھی۔ اس کے منہ سے ہندوستان کا ابتدا ہو کر فارسی کا گلوٹ ملا۔ اس کے دیباچہ کی ابتدا یوں ہوئی۔ (رباعی)

i- اول زثنائے بادشاہ کریم

ترجمہ: پہلے تو میں بادشاہ کی تعریف کرتا ہوں۔

ii- وانگہ ستائش الٰہی کریم

ترجمہ: اس کے بعد الٰہی (اللہ تعالیٰ) کی تعریف بیان کرتا ہوں۔

iii- ایں عقدہ معنی بقلم بکشایم

ترجمہ: یہ مشکل نقطہ اپنی قلم سے کھولتا ہے۔

۴۷۔ وین نکتہ سربستہ کماہی کورقم

ترجمہ: دین کا یہ راز اس طرح بیان کرتا ہوں۔

مہابھارت

مہابھارت کا ترجمہ بادشاہ اکبر نے فیضی کو دیا اور ان کو کہا کہ

''نثر درست کرو اور مناسب مقام پر قلم سے آرائش دو۔''

انھوں نے صرف دو پرب (فن) درست کیے تھے کہ اس سے ضروری کام اس کے ذمہ لگا دیا گیا اور آرائش ادھوری رہ گیا۔

بھاگوت اور آتھروں بید

اس کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا تھا مگر کتاب سے ثابت نہیں ہوتا یہ بھی مشہور ہے فیضی عالم جوانی میں بنارس گیا اور کسی بڑے گنوان پنڈت کی خدمت میں ہندو بن کر رہا۔ جب تحصیل کر چکا تو رخصت کے روز راز ظاہر کر دیا اور عفو تقصیر چاہی مگر پنڈت نے بڑا افسوس کیا مگر اس کی ذہانت اور لیاقت سے بہت خوش تھا۔ اس سے عہد لیا کہ ''گاتیری کا منتر اور چاروں وید بھاشا فارسی میں نہ کرنا۔ اس کہانی کا بھی کتاب سے سراغ نہیں ملتا۔''

انشائے فیضی

۱۰۲۵ھ میں نورالدین محمد عبداللہ خلف حکیم حسن الملک نے ترتیب دی ہے اور لطیفہ فیاضی اس کا نام رکھا ہے۔ اس کتاب کے باب اول میں عرضداشتیں ہیں کہ اکثر سفارت دکن سے حضور بادشاہ میں عرض کی ہیں۔ یہ عرضیاں بڑی غور طلب رپورٹیں ہیں۔

جو کہ رموز سلطنت کی بابت ہیں۔ وہ خاکساری مضمون کو جسے وہ انشا پرداز محقق آفرین کس کس رنگ بدل کر پیش کرتا ہے اور مستعمل اور فرسودہ جنس کو کیسا خوش رنگ بنا بنا کر سامنے لاتا ہے۔ خدمت حضور سے جدائی کا غم بھی بہت ہے۔ جس جس شہر سے گزرا اس شہر کی روداد، حاکم کیفیت اور کاروائی اگر ضرورت سمجھا تو ماتحتوں کی بھی خدمت گزاری۔ ملک میں دکن میں پہنچے تو سرزمین کی کیفیت، ملک کی حالت، ہر مقام میں پیداوار، پھول پھل کیا ہیں اور کیسے ہیں؟ اہل صنعت وحرفت کے صنائع، علماء، حکماء، شعراء وغیرہ اہل کمال کے حالات ان کی شاگردی کا سلسلہ کن کن استادوں تک پہنچتا ہے۔ ہر ایک کی لیاقت، اخلاق، اطوار، آ وہ ہر ایک پہنچی رائے کہ کوئی پرانی لکیر کا فقیر ہے؟ اور کون سا نئی روشنی سے اثر پذیر ہیں اور کون ان میں سے حضوری دربار کے قابل ہے؟

بعض لشکر کا میں وہاں سے قریب تھیں معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے جاتے ہی سب طرف اپنے آدمی پھیلا دیے تھے تا کہ وہ وہاں سے معلومات معلومات اکٹھی کر کے لائیں تو وہاں سے جو آدمی خبر لائے کہ عبداللہ ازبک سے ہرات پر لڑائی ہوتی جس کی تفصیل یوں دی تھی اور اس کا انجام بھی کیا ہوا؟ آئندہ ان کے کیا ارادے ہیں؟ شاہ عباس نے تحائف تیار کیے اور فلاں شخص کو ایلچی بنا کر حضور میں بھیجے گا۔ وہاں فلاں فلاں اشخاص علم اور صاحب فضل وکمال موجود ہیں۔

اکبر اعظم کی خوشی کے راز

اس عرض سے یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ اکبر بادشاہ کی طبیعت کیسی تھی؟

وہ کن باتوں سے خوش ہوتا نظر آتا تھا؟

باوجود سامان شہنشاہی کے وہ ان اہل علم اور اہل دانش کے ساتھ کس درجہ بے تکلف تھا؟

اور وہ کیسی لطافت سے اسے خوش کرتے تھے؟

اور کس درجہ کی ظرافت و لطافت ہوتی تھی جو کہ اس کے دل کو بھاتی تھی اور شگفتہ کرتی تھی؟

اکبر کے دربار میں زیادہ تر درباری، امراء وغیرہ تمام بخاری و سمرقندی تھے۔ اور وہ زوروں پر چڑھے پرواز کر رہے تھے۔

تفسیر سواطع الالہام

۱۰۰۲ھ میں یہ تفسیر لکھی گئی تھی وہ زمانہ بڑا علم و فضل، زور طبع اور جدت تک کا زمانہ شمار ہوتا تھا۔ اس کتاب کے ۷۵ جزو ہیں اور تمام بے نقطہ قریب ایک ہزار کے دیباچہ ہیں۔ اس میں اس نے اپنا باپ کا اور بھائیوں کا تحصیل علم کا حال لکھا ہے۔ بادشاہ کی تعریف اور قصیدہ لکھا ہے فقرے کا خاتمہ ہے کہ ادائے مطلب بھی ہے اور ہر فقرہ، تاریخ اختتام ہے۔ اس پر فضلائے عصر نے تقریظیں لکھی ہیں۔ شیخ یعقوب کشمیری صیرفی تخلص نے عربی زبان میں لکھی ہے۔ میر امان اللہ سرہندی نے آغاز تصنیف کی تاریخ لکھی لا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین نظر ثانی کرنے لگے تو خود اس کی تاریخ احرار اثانی کہی۔ میر حیدر معمائی ایک فاضل کاشان سے آتے تھے انھوں نے سورہ اخلاص میں سے ایک تاریخ نکالی۔ مگر یہ بسم اللہ ملک الشعراء نے انھیں دس ہزار روپے انعام دیے۔ ملا صاحب نے ایک تقریظ اور دو تاریخیں لکھیں۔

یہ بھی فرماتے ہیں کہ:

''تفسیر مذکور میں مولانا جمال علامہ نے بہت اصلاح کی ہے اور درست کردی تھی خیر یہ جو چاہیں فرمائیں۔''

فیضی کو اس نعمت الٰہی کی بڑی خوشی ہوئی۔ اس کے انشاء میں کئی خط احباب علما کے نام ہیں۔ لکھتا ہے اور معلوم ہے کہ ''پھولا نہیں سماتا۔ ان فقرات سے خوشی برستی ہے۔''

موارد الکلم

اس کتاب میں ہندونصائح کی زیادہ باتیں ہیں جو کہ آسان اور چھوٹے چھوٹے فقرات میں لکھی ہیں۔ اس کی اصل بات تو یہ ہے کہ تفسیر مذکور کو لکھ کر طبیعت میں زور، زبان قدرت کلام میں روانی اور لفظوں کی بہتات پیدا ہوگئی ہے کہ جس پہلو سے چاہتا تھا مطلب ادا کر دیتا تھا۔ اس لیے وہی آیات و احادیث و کلام حکماء کے مضامین ہیں جن کو بے نقط الفاظ میں ادا کر دیا گیا ہے۔ ''موارد الکلم در الحکم'' تاریخی نام ہے جو کہ مشہور ہے۔

فیضی کی تصانیف کی تعداد بعض کتابوں سے ۱۰۱ ظاہر ہوتی ہے۔

فیضی کا مذہب

فیضی کے مذہب کا معاملہ بھی اس کے باپ کی طرح گولگوں ہی رہا۔ اس کے بارے میں ملا عبدالقادر بدایونی نے جو کچھ لکھا ہے تم نے مطالعہ کر لیا ہو گا اس کو کوئی۔

i- دہریہ کہتا ہے۔

ii- کوئی آفتاب پرست قرار دیتا ہے۔

iii- مگر میرے خیالات کے مطابق وہ موحد کامل تھے۔

اب اس کی اس بدنامی نے کیوں اس قدر اشتہار پایا؟ اس پر ذرا غور سے مطالعہ کر کے قلم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ اس کی بڑی وجہ ملاحظہ ہو کہ:

اکبر کے آغاز سلطنت میں اور اس سے قبل ہمایوں اور شیر شاہ تک مخدوم اور ان کے خادموں کے اختیارات کس قدر زیادہ اور بڑھے ہوئے تھے۔ ان کی خود بینی، خود پسندی تکبر اور روکھی سوکھی دینداری کے مذور دوسرے کو دنیا میں اپنا حق نہ دیتے تھے ان کا کہنا تھا کہ

''علم فقط علم دین ہے جو ہم ہی جانتے ہیں اور جو ہم کہتے ہیں وہی درست ہے اور اس پر قیل وقال کرے وہ کافر ہے۔ فیضی کو ابوالفضل نے خود مشاہدہ کر لیا اور انھوں نے باپ سے بھی سن لیا تھا کہ ان بے اکیل دعویداروں کے ہاتھ سے کس آفت وعذاب میں عمر بسر ہوئی یہ بھی سب کو علم ہے کہ مخدوم وصدر نے قسمت کے زور سے ملک گیر بادشاہوں کے زمانے میں پائے تھے اور شمشیر زنی اور فوج کشی کے عہد دیکھے تھے۔ اب وہ زمانہ آیا کہ:

اکبر کو ملک گیری کم اور ملکداری کی زیادہ ضرورتیں پڑ رہی تھیں۔ انھیں یہ بھی یاد تھا کہ جب ہمایوں ایران میں تھا تو شاہ طہماسپ نے ہمدردی کی خلوتوں میں اس سے پوچھا کہ:

''سلطنت کی اس طرح خانہ بربادی کا کیا سبب ہوا؟''

تو اس نے جواب دیا کہ:

''بھائیوں کی نا اتفاقی''

تو شاہ نے کہا کہ

''رعایا نے رفاقت نہ کی؟''

تو ہمایوں نے کہا کہ:

''وہ غیر قوم اور غیر مذہب ہیں؟''

شاہ طہماسپ نے کہا کہ:

''اب کی دفعہ وہاں جاؤ تو ان سے موافقت کر کے ایسی اپنائیت پیدا کرو کہ مخالفت کا نام درمیان نہ رہے۔''

اکبر یہ بھی جانتا تھا کہ:

''مخدوم وغیرہ علماء جو دیگ کے چمچے ہیں۔ ہمالوں کے دور میں اس کے خاص الخاص تھے۔''

جب شیر شاہ کا عہد آیا تو یہ تمام اس کے ہم نوا ہو گئے اور اس کے بعد جب شیر شاہ آیا تو اس کی تعریف کرنے لگے لطف کی بات یہ بھی ہے کہ وہ سب جانتے تھے بلکہ خاص الخاص خلوتوں میں بیٹھ کر کہتے تھے کہ:

''اسے مخدوم نہ سمجھو۔ یہ بابر کا پانچواں بیٹا ہند میں پیدا ہوا ہے۔ پھر بھی اس کی عظمت اور نذر و نیاز میں فرق نہ لائے تھے۔''

اکبر یہ بھی جانتا اور سمجھتا تھا کہ:

''کہ ان عالموں نے بادشاہ اور امراء بادشاہ کو ملک گیروں کے لیے قربانی سمجھا ہے ملک رانی اور حکمرانی کے مزے احکام شریعت کی آڑ میں ان کا شکار ہیں۔''

وہ (اکبر) سمجھتا تھا کہ:

''ان کے فتویٰ کے بغیر بادشاہ، بادشاہ کو ایک پتا ہلانے کا بھی اختیار نہیں ہے۔''

چنانچہ بے گناہوں کو قتل کروا دیے ہیں۔ خاندانوں کو تباہ و برباد کروا دیتے تھے۔ مزہ مزہ دیکھتا تھا مگر اس کے سامنے دم نہ رسکتا تھا۔ اکبر یہ بھی سمجھتا تھا کہ بابر میرے دادا کو فقط ہم وطن امراء کی نمک حرامی نے خدا داد سلطنت سے محروم کیا اور جو ادھر کے ترک ساتھ ہیں۔ وہ بھی خاص نمک حرامی کا مصالح ہیں عین وقت پر دغا دینے والے ہیں۔ اکبر یہ جانتا تھا کہ بہت سے ایرانی یا شیعہ میرے باپ کے ساتھ تھے اور سب میرے بھی ساتھ ہیں۔ وہ جان نثاری کے میدان میں اپنی جانوں اور قربان کرنے کا تھیں آئے۔ اس کے باوجود ان کو چھپ کر زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ امرائے ترک انھیں دیکھنا پسند نہیں کرتے۔

اکبر یہ بھی جانتا تھا کہ:

''سب علماء حسد کے پتلے ہیں آپس میں بھی ایک دوسرے کے روادار نہیں۔ روشن دماغ بادشاہ یہ سب حال دیکھ رہا تھا اور وہ سوچ بھی رہا تھا کہ کیا کرے؟ اور کس طرح پرانوں زوروں کو توڑے؟''

فیضی کی تفسیر سواطع الالہام اور موارد الکلام موجود ہے کہیں اہل تن کے اصول سے بال بھی نہیں سرکا۔ تمام آیات واحادیث اور بزرگوں کے کلمات وطلیبات کے مضامین ہیں۔ زبانی باتوں میں ملا صاحب جو چاہیں کہیں مگر نفس مطالب میں جب شباب کوئی دم مار سکتا تھا ورنہ ظاہر ہے کہ وہ بے دینی و بد نفسی کی باتیں کریں یا کرنے پر تل جائیں تو جو جتنے لکھ جاتے تھے انھیں کسی کا ڈر نہیں تھا اور نہ وہ کسی سے ڈرتے ہی تھے۔

فیضی پر سب سے بڑا یہ الزام تھا کہ:

''انھوں نے اکبر بادشاہ کو مسلمان نہیں رہنے دیا۔ صلح کل اور ملحدی کے رنگ سے رنگ دیا۔ آپ فیضی دہریہ تھے اور اکبر کو دہریہ کر دیا۔''

میرے دوستو! تین سو برس کی بات ہے کہ کیا خبر ہے؟

فیضی نے اسے رنگ دیا یا مطیع وفرمان نوکر اپنے آقا کی مصالحِ ملکی میں رنگے گئے تھے۔ اگر انھوں نے ہی اکبر کو اپنے رنگ میں رنگا تو اس کی عقل رنگ آمیز کی تعریف نہیں ہو سکتی جو حریف کہ فتاوئے شریعت کے بہانوں سے ہر وقت قتل کے درپے رہتے تھے ان سے جان بھی بچائی اور فتح بھی پائی۔

فیضی والوں کا کہنا ہے کہ:

"دنیا میں ہزاروں مذہب ہیں۔ خدا کا خود کونسا مذہب ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ دنیا کے لحاظ سے ایک مذہب نہیں۔ ورنہ وہ کل عالم کی پرورش کیوں کرتا؟ اپنے فیض کو عام کیوں رکھتا؟ اور سب کو ترقی کیوں دیتا؟ ایک مذہب جو حق ہے وہی رکھتا ہے باقی سب فنا۔ جب یہ بات نہیں ہے اور وہ رب العالمین تو بادشاہ اس کا سایہ ہے اس کا مذہب بھی وہی ہونا چاہیے۔ اس لیے واجب ہے کہ جو درگاہِ الٰہی سے ملا ہے اسے سنبھالے۔ سب مذہبوں کی پرورش اور حفاظت وحمایت اور رعایت برابر کرے۔ اس طرح گویا وہی اس کا مذہب ہے۔ اکبر اس بات کو خوب سمجھتا تھا اور یہ تو سلطنت کے ہاتھ تھے۔ سلطنت کی زبان تھے۔ سلطنت کے دل وجان تھے۔ ان کا مذہب کیوں کر قرار دے سکتے ہیں؟ علمائے وقت کی دست درازی جو اپنے مخالف مذہبوں کو فنا وبرباد کیے دیتی تھی۔ اگر یہ اس کے روکنے میں ساعی ہوئے تو کیا برا کیا؟

مذہب کے معاملے میں انگریز کا اصول

مصنف رقمطراز ہے کہ مذہب کے معاملے میں انگریز کا خواب اصول با قاعدہ ہے۔ ان میں بھی دو فرقے ہیں اور ان میں سخت مخالفت بھی ہے جو کہ یہ اہم فرقے ہیں۔

۱۔ پروٹسٹنٹ ۲۔ رومن کیتھولک

دو دوست بلکہ دو بھائی بلکہ میاں بیوی کے مذہب بھی الگ الگ ہوتے ہیں اور وہ ایک گھر میں بخوشی رہ رہے ہوتے ہیں۔ اور وہ ایک میز پر کھانا کھاتے ہیں، ہنسنا، بولنا، کھیلنا، رہنا سہنا سب ایک جگہ پر مذہب کا کبھی ذکر نہیں کرتے۔ اتوار کے دن وہ اپنی اپنی کتابیں اٹھاتے ایک ہی بگھی میں سوار ہوتے بات چیت کیں اور چلتے بنے۔ اگر ایک کا گرجا راستے میں ہے تو وہ اتر جائے گا اور دوسرا آگے نکل جائے گا۔ جب گرجے میں عبادت سے فراغت ہوئی تو وہ بگھی میں سوار ہو کر آیا اپنے رفیق کو ساتھ لیا تو گھر پہنچے۔ اس نے اپنی کتاب میز پر رکھ دی تو دوسرے نے اپنی کتاب اپنے میز پر رکھ دی۔ پھر وہ زندگی کا ہنسنا، بولنا اور کاروبار۔ اسکا ذکر بھی نہیں کہ تم کہاں گئے تھے؟ اور وہاں کیوں نہ گئے جہاں ہم گئے تھے۔ وغیرہ تو گویا کہ عیسائیوں کا طریقہ مذہب کرنے کا آزادانہ اور سہل نظر آتا ہے سادہ بھی ہے کیونکہ ان کی عبادت ہی مسلمانوں کے نسبت مختصر ہے ممکن ہے کہ گھروں میں اتوار کے علاوہ عبادت کرتے ہوں مگر کبھی مشاہدہ نہیں ہوا۔ انگریز نے مذہب کو ذاتی معاملہ رکھا ہے۔ تو ذاتی معاملے کو ذاتی انداز میں ادا کرنے کی پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ جس سے مذہب کے نام پر ان کے ہاں جھگڑے پیدا نہیں ہوتے۔

فیضی کے اخلاق وعادات

فیضی بڑا کمال علوم وفنون کا دلدادہ اور ماہر شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی تصنیفات سے اس کے حالات سے جو مصنفین نے اپنی تحریر میں لاتے ہیں ان کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ:

''فیضی شگفتہ مزاج، خوش طبع، خندہ جبیں شخص ہوگا۔ وہ ہمیشہ ہنستا بولتا رہتا تھا۔ شوخی اور ظرافت اس کے کام پر پھول برساتی ہوگی ان پر متانت اور وقار چھائے ہوتے ہیں۔ اگر آپ غور سے اشعار کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ:

ان کے اشعار کس قدر شگفتہ ہیں۔ خطوط اور رقعوں کو دیکھو کہ ان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بے تکلف دوست بیٹھے ہنستے ہیں اور کہتے جاتے ہیں۔ ان میں جابجا لطائف اور چٹکلے چھوڑ گئے ہیں۔

ملا صاحب نے بھی کئی جگہ پر لکھا ہے کہ:

''ایک جلسے میں فلاں شخص سے اور مجھ سے فلاں مسئلے پر گفتگو ہوئی۔ اس نے یہ کہا اور دل کو میں نے یہ کہا۔ شیخ فیضی جس موجود تھے۔ ستم ظریفی صرف اس کی عادت کی تھی۔ یہ بھی اسی کے ساتھ ہمداستان تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ بے شک فیضی ہنسی ہنسی میں سب کچھ کہہ جاتا تھا اور سخت بات کو بھی ہنسی ہنسی میں ٹال دیتے تھے۔

ملا صاحب جو ان کے مخالف تھے لہٰذا وہ ان کے ہر کام میں مٹی ڈالتا تھا جو کہ مخالف لوگوں کا وطیرہ ہوتا ہے وہ دشمن کو آگے آتے دیکھ کر چنانچہ ملا صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

ستم ظریفی اس کی روش قدیمی تھی گرمئ مجلس اور ہمزبانی کے لیے دوستوں کے احتیاج کا دل وجان سے طلب گار رہتے مگر سر کچلے ہوئے اور دل بجھے ہوئے رکھتا تھا۔ شیخ فیضی بڑا سخی اور مہمان نواز بھی تھا۔ ان کا جاداں خانہ علماء شعراء اور اہل کمال کے لیے ہوٹل کا کام دیتا تھا۔ فیضی کے ہوٹل کا دروازہ وا رہتے باغ اور ہر قسم کے شخصیات کے لیے کھلا تھا اور جو بھی اہل کمال تھے ان کے گھر میں قیام کرتے تھے۔ جو خود بھی بڑا عمدہ سلوک کرتے تھے۔ حضور میں پیش کرتے تھے۔ خدمتیں دلواتے تھے اور جو ان کی قسمت میں ہوتا تھا وہ ان کو بطور انعام واکرام کے طور پر دلواتے تھے۔ عرفی بھی جب سے آئے تو ان کے گھر میں ٹھہرے اور انھوں نے میزبان کے فرائض ادا کیے۔

فیضی حسن اخلاق، لطف طبع، شگفتگی مزاج ہر وقت فضل وکمال کے گلدستوں سے ان کا دیوان خانہ سجائے رکھتی تھی۔ ملا یعقوب صیرفی کشمیری جنھوں نے ان کی تفسیر بے نقطہ پر عربی میں تقریظ لکھی ہے۔ جب کشمیر چلے گئے تو وہاں سے ملا صاحب کو کئی خطوط لکھتے تھے اور ہر ایک خط میں بے شمار مضامین لکھے تھے اور یہاں کی صحبتوں کو یاد کر کے کہتے تھے کہ:

نواب فیضی کے حسن وفیض میں دوپہر کی گرمی میں ستیل، پانی کے فرش ہے کہ ہوائے کشمیر سے بھی زیادہ سرد ہے۔ جب بیٹھو اور برف آب پیو اور ان کے نکات شریف اور مقالات لطیف سنو تو امید ہے کہ:

مجھ اسیر محبت وحرمان کو بھی یاد کرو

عرضیوں سے سبق آموز چند باتیں

۱۔ فیضی کی عرضیاں پڑھنے سے درج ذیل بڑی عمدہ باتیں ظاہر ہوتی ہیں جو کہ ہمارے لیے باعث رہنمائی بھی ہوں گی تحییں۔ اور ان کے مکہ میں شیرینی اور قوت قرار دا ہے۔

۲۔ اس عہد کے ملازم اپنے آقا کے ساتھ کس قدر آداب و تعظیم کے لباس میں ادائے مطلب کرتے تھے اور تعظیم کے علاوہ دلداری اور دلربائی کا اثر کس قدر بھرتے تھے جس کی ہم ہجو کرنا چاہیں تو فقط اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ:

''خوشامد، خوشامد''

مگر کہتا ہوں کہ:

یہ اگر قوت مدنی ہے مگر یہ قوت و قصد نہ تھی ان کے دل اس قدر احساسات سے بھرے ہوتے تھے کہ تمام خیالات خوشامد اور دعائیں ہو کر دل میں چھلکتے تھے۔

۳۔ ان خطوط کو پڑھ کر معلوم ہے کہ:

''لکھنے والا ان کا ایک شگفتہ مزاج خوش باش آدمی ہے۔ خط لکھ رہا ہے اور مسکرا بھی رہا ہے۔''

۴۔ یہ بھی مطالعہ سے اخذ ہوا ہے کہ اس زمانے کا جو ملازم کسی خدمت پر جاتے تھے تو اس روز رخصت سے لے کر منزل مقصود تک جو جو باتیں ان کے متعلق ہوتی تھیں اپنے آقا کے علم میں لاتے تھے۔ وہ آکر بیان کرتے تھے بلکہ ان کا پہنچانا اس کی خدمت میں شامل تھا۔

۵۔ فیضی کی میک انشاء جو فقط عبارت آرائی کے شوق سے کس نے جمع کر دی تھی۔ اس سے یہ بھی نکتے کھلتے کہ ورنہ اور امراء جو ادھر کی سرحد پر تھے۔ یہ باتیں ان کی خدمت کا جزو ہوں گی افسوس ایسی نیست و نابود ہوئیں کہ ان تک پہنچنے کی امید بھی نہیں ہو سکتی۔

۶۔ اکبر کا جہازی شوق (جہ زرانی) بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسے لنگر گاہوں اور سمندر کے کناروں پر قبضہ کرنے کا بڑا شوق تھا اور پھر پہلو سے دریائی قوت کو بڑھاتا تھا اور یہ خیال فقط شاہانہ شوق نہ تھا بلکہ نظام سلطنت اور ملکی سلطنت پر تھا۔

۷۔ دوران سفر راستے کے شہروں، گزر تیر لکھتا جاتا تھا اور بعض شہروں کی تفصیل حالات بھی لکھتا جاتا تھا۔ راستے کے مشہور مقامات پیداوار، عمدہ اشیاء کی تیاری، کپڑے کے کارخانے وغیرہ دیکھتے تھے مگر یہ بھی بات ہے کہ وہ وہی باتیں لکھتا تھا جو کہ تاحال بادشاہ تک کسی نہ کسی وجہ سے نہیں پہنچیں۔ وہ بادشاہ کی بہت تعریف کرتا تھا۔ آج ہم اکبر کے عہد سلطنت کے بارے میں شوق سے مطالعہ کرتے ہیں۔

بہشت	آنجا	کہ	آزارے	نباشد
کسے	را	با کسے	کارے	نباشد

۸۔ فیضی کے اشعار اور لطائف و ظرافت کو پڑھ کر اکبر کی طبیعت کا تصور قائم ہو جاتا تھا کہ وہ کن خیالات کا بادشاہ ہے؟ شیعہ سنی کے طائف کا

بھی مطالعہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ:

"یہ غلطی ان لوگوں کی جو یہ کہتے ہیں کہ فیضی وابوالفضل شیعہ تھے یا شیعوں کے طرفدار تھے۔"

جب یہ اکبر کے گرد بیٹھے ہوں گے اور شیعوں سنیوں کو جھگڑتے دیکھتے ہوں گے تو وہ خوب ہنستے ہوں گے اور لطف اندوز ہوتے ہوں گے کیونکہ اصل معاملہ کو سمجھ چکے اور وہ یہ بھی جانتے کہ:

"بات ایک ہی ہے۔ تنگ چشم، کم حوصلہ، سخن پروری، ضدیوں نے اور بھوکے پلاؤں خوروں نے خواہ مخواہ جھگڑے پیدا کر دیے ہیں۔"

۱۰۔ فیضی نے آپ وادا کا استخراص کردہ خط سے جو کہ انھوں نے ملا صاحب کی سفارش میں لکھا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ:

"وہ ان کے مخالف رائے تھے جو عنادی مخالفت نہ رکھتے تھے۔"

اس سے ان کی مخالفت اس نقطہ پر آ کر ختم ہو جاتی ہے کہ:

"تمہاری رائے یہ ہے اور اس کے بارے میں میری رائے یہ ہے اگرچہ خلاف ہے۔"

مگر ان کی مخالفت رائے انھیں عداوت اور کینہ پروری اور انتقام کے درجے پر نہ پہنچاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر مجلس میں اکٹھے بیٹھتے تھے اور مجلس سے محظوظ ہوتے تھے اور خوش ہو کر مجلس برخاست کرتے تھے۔

مصنف کی دعا ہے کہ:

"اللہ تعالیٰ ہمیں بھی خوش رکھنے والی طبیعت عطا فرمائے تاکہ ہم بھی اکٹھے بیٹھ کر سارے اختلافات دور کر کے خوش ہوں۔"

باب ۴

شیخ ابوالفضل

۱۔ ۶ محرم ۹۵۸ھ کو پیدا ہوئے۔

۲۔ باپ نے استاد کے نام پر ابوالفضل نام رکھا۔

۳۔ انھوں نے اس قدر سلامت روی سے زندگی کے مراحل طے کیے کہ اکبر اعظم شہنشاہ ہند کی وزارت تک پہنچ گئے۔

۴۔ پندرہ سال کی عمر میں پدر بزرگوار کے خزائن عقل کا خزانچی اور جواہر معانی کا پہرہ دار بن گیا اور خزانہ پر پاؤں جما کر بیٹھ گئے۔

۵۔ ابوالفضل اعلیٰ درجے کا مقرر پہلوان تھا۔

۶۔ ابوالفضل نے باپ کے ساتھ دشمنوں سے بڑی ٹھوکریں کھائیں مگر ہمت نہ ہاری اور حوصلہ نہ چھوڑا۔

۷۔ ۲۰ برس کی عمر میں دربار اکبری میں داخل ہوئے جو کہ تعجب خیز کمال ہے۔

۸۔ شیخ ابوالفضل بلا کے واقعہ نویس تھے۔

۹۔ دن کو مدرسے میں عقل کا نور پھیلاتا تو رات کو ویرانوں میں جا کر گھومتا تھا۔

۱۰۔ کوچہ نامرادی کے دیوانوں کو ڈھونڈتا اور ان مفلس خزانچیوں سے ہمت کی گدائی کرتا۔

شیخ ابوالفضل پر ایک طائرانہ نگاہ

۱۔	پیدائش	:	۶ محرم ۹۵۸ھ کو
۲۔	نام	:	ابوالفضل (استاد کے نام پر)
۳۔	والد	:	شیخ مبارک اللہ
۴۔	درباری بنا	:	۹۷۸ھ کو بعمر ۲۰ سال طبعی
۵۔	اہم خوبی	:	انشا پردازی کا بادشاہ تھا
۶۔	اہم خدمات	:	سورہ فتح کی تفسیر اور آیۃ الکرسی کی تفسیر لکھی
۷۔	وفات	:	۱۰۱۰ھ کو
۸۔	عمر	:	۵۲ سال تقریباً
۹۔	دفن	:	انتری میں جو کہ گوالیار سے پانچ چھ کوس کے فاصلے پر ہے
۱۰۔	اولاد	:	بیٹا عبدالرحمٰن (اکلوتا)
۱۱۔	مذہب	:	رافضی یا مہدوی ٹھہراتے (واللہ اعلم)
۱۲۔	شادی	:	اکبر نے سعادت خاں کوکی کی بیٹی سے کرائی
۱۳۔	تہمت	:	مہدویت ہونے کی

پیدائش

شیخ ابوالفضل ۶ محرم ۹۵۸ھ کو پیدا ہوئے۔ وہ اسلام شاہ کے عہد حکومت میں پیدا ہوئے تو باپ نے اپنے استاد کے نام کی نسبت ابوالفضل نام رکھا۔ وہ بڑا ہو کر فضل و کمال کی تمام منازل طے کر کے دنیا میں روشن ہوا۔ اس کے والد کی زندگی بڑی تلخیوں سے گزری تھی تو ابوالفضل نے بھی اپنا بچپن کس قدر افسوس اور مصیبتوں میں گزارا ہوگا۔ انھوں نے حوصلے اور تحمل سے ان مصائب اور نامساعد حالات کا سامنا باپ کے ساتھ کیا اور انھی مصائب کو برداشت کے صلے میں اس کو اللہ تعالیٰ نے اکبر بادشاہ کے دربار تک رسائی نصیب فرمائی۔ اس نے مبارک باپ کے دامن میں پل کر جوانی کا رنگ دیکھا اور اسی کے چراغ سے چراغ جلا کر قندیل عقل کو روشن کیا۔ اس زمانہ میں علماء، مخدوم اور صدر وغیرہ علماء بادشاہی بلکہ خدائی اختیار رکھتے تھے۔ جوں جوں ان کے جابرانہ احکام اور سینہ زور فتوے جاری ہوتے تھے۔ ان کی تحصیل کا ذوق اور مطالعہ کا عرق ریز شوق زیادہ ہوتا تھا۔ اقبال جوش و خروش کر رہا تھا اور حال استقبال کو کھینچتا تھا کہ حریفوں کی فنا میں کیوں دیر کر رہا ہے؟

انسان آخر کار انسان ہے۔ اس پر مختلف اوقات میں مختلف حالتیں گزرتی ہیں البتہ نیک طبع لوگ اس سے بھی نیکی کا سبق حاصل کرتے ہیں۔ ردی طبع انسان صورت پھسلتے ہیں اور دلدل میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔

شیخ ابوالفضل کے ابتدائی حالات

شیخ ابوالفضل پر اللہ تعالیٰ نے سال سوا کی مدت میں اپنا احسان فرمایا کہ وہ صاف باتیں کرنے لگے تھے کہ ان کی فطین اور ذہین ہونے کی نشانی تھی جب وہ پانچ برس کے ہوئے تو قدرت نے استعداد کی کھڑکی کھول دی۔ ایسی باتیں سمجھ میں پڑنے لگیں جو اوروں کو نصیب نہیں ہوئیں۔

جب پندرہ برس کی عمر کو پہنچے تو پھر بزرگوں کے خزانہ عقل کا خزانچی اور جواہر معانی کا پہرے دار ہو گیا اور خزانہ پر پاؤں جما کر بیٹھ گیا۔

تعلیمی مطالب سے سدا دل مرجھا جاتا تھا۔ اور زمانہ کی رسموں سے طبیعت کوسوں بھاگتی تھی۔ والد اپنے طریقے سے عقل و دانش کے منتر پھونکتے تھے۔ ہر فوج میں ایک رسالہ لکھ کر یاد کرواتے تھے اگرچہ ہوش پڑھتا تھا مگر مکتب علم کا کوئی مطلب دل کو نہ لگتا تھا کبھی تو ذرا بھی سمجھ میں نہ آتا تھا اور کبھی شبہے دستہ روکتے تھے اور اس یاوری نے کہیں رکاوٹ ہکلا ذکر دیتا۔ زبان مدد نہ کرتی تھی۔ تقریر کا پہلوان تھا مگر بیان نہ کر سکتا تھا لوگوں کے سامنے آنسو نکل آتے تھے اور اپنے تئیں آپ ملامت کرتے تھے۔

اس دفتر میں ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ:

”جو اہل علم کہلاتے ہیں انھیں بے انصاف پایا اس لیے تنہائی اور غربت کو جی چاہتا تھا۔ دن کو مدرسہ میں عقل کا نور پھیلاتے اور رات کو ویرانوں میں جاتا کوچہ مرادوں کے دیوانوں کو ڈھونڈتا اور ان مفلس خزانچیوں سے ہمت کی گدائی کرتا۔“

حکمت کی حقیقتوں نے چاندنی کھلا دی جو کتاب دیکھی بھی نہ تھی پڑھنے سے زیادہ روشن ہو گئی۔ آگرہ خاص عطائے الٰہی تھی۔ خمت نے عرض مقدس سے نزول کیا تھا لیکن پدر بزرگوار نے بہت مدد کی انھوں نے تعلیم کو منقطع نہ ہونے دیا۔ ان کو یہ بھی سوجھتا تھا کہ میں بھوکا ہوں یا پیٹ بھرا ہوا ہوں۔ خلوت میں ہوں یا جلوت میں۔ خوشی میں باقی میں نسبت الٰہی تھی اور رابطہ علمی کے سوا ان کو کچھ نہ سمجھتا ہی نہ تھا۔ نفسانی دوست حیران ہوتے تھے۔ کیونکہ دو دو تین تین دن ان کو غذا نہ پہنچتی تھی۔ وہ عقل کا بھوکا تھا۔ کچھ پرواہ نہ ہوتی تھی بلکہ اعتقاد پختہ ہوتا جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے ولی ہو گئے۔

بہت سی کتابیں کہتے سنتے حفظ ہو گئیں۔ علوم کے عالی عالی مطالب کہ پرانے ورقوں میں پڑے پڑے گھس گئے تھے۔ صفحہ دل پر روشن ہونے لگے۔ ابھی دل کی نے وہ پردہ بھی نہ کھولا تھا کہ بچپن کی پستی سے عقل کی بلندی پر بھی نہ صرا جاتا تھا۔ اسی وقت سے متقدمین پر اعتراضات سوجھتے تھے۔ اس کے لڑکپن پر نظر کر کے لوگ مانتے نہ تھے۔ میرا دل جھنجلاتا تھا ان کو تجربہ نہ تھا جب طبیعت میں جوانی کا جوش آتا تو اس کو صبر و تحمل سے برداشت کر لیتے اور اس کو بعض اوقات بالکل ہی پی جاتے تھے۔ اور آہستہ آہستہ ان پر معرفت کا دروازہ کھلا۔

ابتدا میں جب میں نے پڑھنا شروع کیا تو حاشیہ اصفہانی کا ایک نسخہ ہاتھ لگا کہ آدھے سے زیادہ صفحات دیمک کھا چکی تھی۔ لوگ مایوس تھے۔ تھا ہے۔ میں نے اول گلے سڑے کنارے کتر کر پیوند لگائے۔ ذرا سوچتا اور ہر جگہ پر مطلب واضح ہو جاتا تھا۔ اسی کی وجہ سے مسودہ کرکے عبارت جماتا تھا اور اسے صاف کر دیتا تھا۔ انہی دنوں میں وہ پوری کتاب بھی مل گئی۔ مقابلہ کیا تو ۳۲ جگہ مترادف لفظوں کا فرق تھا اور تین چار جگہ قریب قریب سب دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ جہت کی دل کی جتنی زیادہ ہوتی تھی اتنی ہی روشن دل کو زیادہ روشنی کرتی تھی۔ بیس برس کی عمر میں آزادی کی خوشخبری پہنچی اس سے دل بھر گیا۔ اب ان کا پہلا جنون شروع ہوا۔ علوم و فنون کی آراستگی پر جوانی کی امنگ کا زور شور، دعوؤں کا دامن پھیلا ہوا تھا دانش و بینش کا آئینہ جہاں ہاتھ میں تھا۔ نئے جنون کا غل ان میں پڑا اور ہر کام سے رکنے کے لیے زور کرتے لگا ان دنوں میں شہنشاہ اکبر روشن دل نے مجھے یاد فرما کر چھپاؤ کے گوشے سے گھسیٹا وغیرہ وغیرہ۔

چنانچہ ۹۷۴ھ میں شیخ فیضی باریاب حضور ہوئے۔ ۹۸۱ھ ۲۰ برس کی عمر پائی کہ ابوالفضل پر بھی خدا کا فضل ہوا اور دیکھو کہ انھوں نے اس عالم میں اس نعمت کو کس سلیقے کے سنبھالا اور انھوں نے کس قدر شہرت پائی کہ جس پر تمام فخر کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور شیخ ابوالفضل مبارک باپ کا بیٹا مبارک بن کر ابھرا۔ اکبر کے دربار میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ اس کے ملکی و ور سلطنت کے معاملات میں ان کے مشورے کو بڑا دخل حاصل ہوا۔

ابوالفضل دربار اکبری میں

اکبری حکومت وسیع ہوتی جا رہی تھی، مگر سلطنت، انتظام اور اصول و قانون کی محتاج ہوتی ہے ملک کو محض تلوار کے زور سے وسیع کرنا مصلحت نہیں بلکہ وہاں کے ساتھ مل کر تقویت: یہ چاہتا تھا جو قوم اور مذہب اور رسم و رواج کل باتوں میں مخالف تھے اس کے علاوہ ترک جو خود اپنی قوم تھی وہ تنگ خیال، متعصب اور اس کام کے لیے ناقابل تھے اور ان کی بدنیتی جو باپ دادا کے ساتھ دیکھی تھی اس سے اس کا دل بے اختیار اور بیزار تھا۔ دربار پر مذہبی علماء اور پرانے خیالات کے لوگ امراء چھائے ہوئے تھے۔ نئی بات تو درکنار کوئی مناسب وقت تبدیلی ہوتی۔ تو ذرا سی بات پر چمک اٹھتے تھے اور اس میں بے اختیاری اور بے عزتی سمجھتے تھے۔ ملک پرور بادشاہ نے اسی لیے ایک مکان عالیشان بنا کر چار ایوان نام رکھا اور علماء

اور اہل طریقت اور امراء وغیرہ کے گروہ بنا کر رات کو جلسہ مقرر کیا کہ شاید مصلحت وقت اور امر مناسب پر اتفاق رائے پیدا ہو مگر ان لوگوں میں مباحثوں اور مناظروں سے اور آپس کے رشک وحسد سے خود آپس میں جھگڑے پڑنے لگے۔ کسی مسئلہ کا حل ہی نہ نکلتا تھا کہ اصل حقیقت کیا ہے؟ وہ ہر چند ایک ایک کو ٹٹولتا ہے اور تقریروں اور تجویزوں کے چقماق کو ٹکراتا تھا مگر اصلیت کا چنگارا نہ چمکتا تھا۔ دق ہوتا تھا اور رہ جاتا تھا۔ اس دوران ملا صاحب بھی آ پہنچے۔ انھوں نے جوانی کے عالم میں اکثروں کو توڑ دیا اور ایسی مثالیں قائم کیں کہ جس سے ظاہر ہوا کہ:

''نئے دماغوں میں نئے خیالات پیدا ہونے کی امید ہو سکتی ہے۔ اس نوجوان کے خیالات کو خوب شہرت ملی۔''

اور جس چشمہ سے ملا صاحب نے پانی پیا تھا وہ اسی کی مچھلی تھی۔ بڑا بھائی فیضی خود دربار میں موجود تھا۔ اس کے حالات وخیالات دیکھ کر اکبر نے دربار میں اس کو رکھ لیا۔ اگرچہ دربار میں اس کے موروثی خون کے پیاسے دشمن چھائے ہوئے تھے۔ اس نے موت کے منہ میں اپنے آپ کو دھکیل ہی دیا۔ غرض چراغ سے چراغ روشن ہونے لگا۔ ۹۸۱ھ میں اکیسواں سال جلوس تھا کہ اس نگارنامہ کے نقشبند ابوالفضل مبارک نے درگاہ مقدس میں سر جھکا کر رتبہ بلند کیا۔ ابوالفضل بڑا ہی سمجھدار اور عالم وفاضل شخص تھا اس نے ۱۵ برس کی عمر میں ہی فنون حکمی اور علوم نقلی سے آگاہی حاصل کر لی۔ اگرچہ ابوالفضل دربار اکبری کا جزو تو بن گیا تھا مگر قسمت کی بے یاری سے خود بینی اور خود آرائی میں تھا۔ جن کی وجہ سے چند روز تک رونق پیدا کرنے میں کوشاں رہا۔ طالبان دانش کے ہجوم نے غرور کا سرمایہ بہت بڑھایا اور اس فرقہ کو بے تمیز اور بے انصاف پایا اس لیے خیال پیدا ہوا کہ تنہائی اختیار کی جائے اور غریب الوطن ہو کر رہیے۔ دانایان ظاہر بین کا اختلاف اور تقلیدی صورت پرستوں کا رواج تھا۔ میں صرف تماشے بین بنا رہا مگر زبان سے کچھ کہہ نہ سکتا تھا۔ پدر بزرگوار کی چند و نصائح بھی ذہن سے نہ بھولی تھیں ان پر عمل کرنا ضروری تھا مگر پریشانی بھی از حد تھی تو اس عالم میں مختلف داناؤں کی طرف خیالات دوڑتے تھے کیونکہ دیوانوں اور عقلا دونوں سے دل بیزار ہو چکا تھا۔ شیخ ابوالفضل کا بیان ہے کہ:

صرف اس کے مقدر نے اس کا ساتھ دیا اور اکبر شاہ کے حضور دربار میں علم وفضل کا چرچا ہوا تو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ان کے دربار کی طرف سے طلب ہوئی تو برادر ان گرامی اور دوستان خیر اندیش ہم زبان ہو گئے کہ بادشاہ صورت ومعنی کا دربار ہے۔ ضرور وہاں حاضر ہونا چاہیے۔ یہاں دل کا جنون تعلق کی زنجیریں توڑے ڈالتا ہے۔ خدائے مجازی (والد بزرگوار) نے پردہ کھول کر سمجھایا اور رونق نشین اقبال (اکبر) کے کمالات حقیقی کو کوئی نہیں جانتا کہ وہ دین ودنیا کا مجمع البحرین اور صورت ومعنی کا مشرق انوار ہے جو عقدے دل میں ہوتے ہیں وہیں جا کر کھلتے ہیں اور ان کی خوشی تو اپنی مرضی پر مقدم سمجھا۔ دنیا کی رو سے گنجینہ دار معنی کا میر ابا محمد خان تھا۔ آیۃ الکرسی کی تفسیر تحریر کی۔ بادشاہ سلامت آگرہ میں آئے ہوئے تھے۔ وہاں ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی اور بادشاہ سلامت نے منظور نظر فرمائی اور قبولیت کا شرف بخشا۔ شیخ ابوالفضل نے بھی اس سے دلی سکون محسوس کیا۔ بادشاہ کے دل میں بھی ان کے بارے میں محبت کا اظہار ہوا۔ اس وقت بنگال کی مہم کا کام درپیش تھا۔ اشغال سلطنت کی وجہ سے گمنام گوشہ نشین کے حال پر توجہ نہ ہوئی تو وہ چلے گئے اور وہیں رہ گئے۔

وہاں سے بھی بھائی فیضی کے خطوط آئے کہ ''بادشاہ تمھیں یاد کرتے ہیں۔''

شہر میں نے سورۂ فتح کی تفسیر بھی شروع کر رکھی تھی۔ جب پٹنہ فتح کر کے واپس لوٹے اور اجمیر شریف پہنچے تو بادشاہ سلامت نے وہاں بھی

یاد فرمایا اقبال کے نشان فتح پور میں آئے تو میں والد بزرگوار سے اجازت حاصل کر کے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پہلے اپنے بھائی فیضی کے پاس جا کر ٹھہرا اور دوسرے دن مسجد شریف جامع میں جو کہ شہنشاہی عمارت میں تھی۔ وہاں جا کر حاضر ہوا جب بادشاہ سلامت تشریف لائے تو میں نے دور سے سلام کر کے کونے میں بیٹھا۔ شہریار جو کہ جوہر شناس نے خود نظر دوربین سے دیکھ کر بلایا۔ زمانے کے حالات سے واقفیت تھی۔ بیٹھا بھی دور تھا۔ خیال کیا کہ شاید کسی اور کو جو کہ میرا ہمنام ہوگا اس کو بلایا ہوگا۔ مگر جب معلوم ہوا کہ میری ہی مقدر نے چمک دی ہے تو میں اٹھ کر حاضر ہوا اور بادشاہ سلامت نے کچھ دیر میرے ساتھ تبادلہ خیالات فرمایا۔ اس وقت تک میں نے سورہ فتح کی تفسیر مرتب کر لی تھی تو وہ ان کی خدمت اقدس میں پیش کر دی۔ بادشاہ سلامت نے مجھ سے بہت سے حالات کی تفصیل دریافت کی جن کا علم میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ان کی وجہ سے میری طبیعت کافی عرصہ تک بیزار اور اچاٹ رہی۔ میرا دل تنہائی کی طرف کھینچا چلا گیا تھا اگرچہ گردن میں بہت سی ذمہ داریاں ڈال دی گئی تھیں۔ حتیٰ کہ بیت المقدس مقصود کی کنجی ہاتھ میں آ گئی۔ گویا دربار میں حاضر ہوا اکبر کا دل ہاتھ میں آ گیا۔

ہر وقت سخن گفتگو دونوں بھائیوں کی طرف ہی ہوتا تھا۔ اور ان کے علاوہ مخدوم اور صدر کے گھر میں ماتم سا بچھ گیا ان کی شایان شان میں بڑا فرق پڑ گیا اور وہ حق بجانب تھا کیونکہ شیخ مبارک کے فضل و کمال کو وہ اگر دبا سکتے تھے تو حکومت و دربار کے زور سے ہی کر سکتے تھے۔ اب میدان ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور چند ہی دنوں میں اس کے نوجوان لڑکے مقدمات دربار اور مہمات میں شامل ہونے لگے۔

اجمیر سے واپسی پر ۹۸۲ھ میں بمقام فتح پور تھے اور خانقاہ کے پاس بادشاہ نے عبادت خانہ مرتب کیا جو کہ ایوان پر مشتمل تھا اور انہی دنوں میں شیخ ابوالفضل شیخ مبارک ناگوری کا سپوت بیٹا جسے ملا صاحب علامی کے نام سے یاد کرتے ہیں اور جس نے جہان میں عقل و دانش کا تہلکہ مچا دیا تھا۔ اور صحابیوں کے عقیدوں کا چراغ روشن کیا تھا کہ صبح روشن میں چراغ جلاتا تھا۔ اس نے تمام مذاہب کی مخالفت کو اپنا فرض سمجھ کر اس کے خلاف بولنا شروع کر دیا اور تفسیر اکبری تاریخ ہوئی۔ اور اس میں نسبت سے وہ نکات اور نکات قرآنی درج تھے اور کہتے ہیں کہ:

''وہ باپ کی تصنیف تھی۔ بادشاہ نے ملایان فرعون صنعت کے کان ملنے کے لیے (جس کی مراد مجھ سے ہے) اس کو خاطر خواہ پایا۔''

اس کے بعد ملا صاحب لکھتے ہیں کہ:

اب شیخ ابوالفضل کا دور شروع ہوا اور شیخ ابوالفضل نے بھی موقع کو غنیمت جان کر بادشاہ کی حاکت اور زور خدمت اور زمانہ سازی اور بے دیانتی اور مزاج شناسی اور بے انتہا خوشامد سے بھی گروہ نے چغلیاں کھائیں اور ناروا کوشش کی تھیں۔ انھیں بری طرح رسوا کیا۔ ان پرانے مسندوں کو جڑ سے اکھاڑ دیا بلکہ تمام بندگان خدا مشائخ علماء بیوہ اور یتیم سب ضعفاء کے وظیفے اور مدد معاش کاٹ لینے کا باعث وہی ہوا۔ پہلے زبان حال سے کہا کرتا تھا کہ:

یارب   بھانیاں   دلیلے   بظرست

فرعون   عفت   چوپشہ   چیلے   بظرست

فرعون و شان دست برآور دستہ
موسیٰ و عصاؤ رود نیلے بغرست

اس طریقے سے ایک طوفان کھڑا ہو گیا تو بحث کے وقت اگر کوئی کلام حجت یا دلیل کے طور پر پیش کرتا تو ان کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا جاتا کہ یہ کلام ''تو فلاں حلوائی کا ہے یا فلاح موچی کا ہے یا فلاح چرم گر کا ہے۔ ان اقوال پر ہم سے بحث کرتے ہو۔ ان سب کو دلیل کرتے تھا۔ گویا تمام علماء و مشائخ کا انکار اسے مبارک ہوا۔ وہ اس وقت کسی کی بھی بات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے حالانکہ ملا صاحب جیسے بڑے بڑے بڑے درباری بڑے کہنہ مشق اور تجربہ کار تھے مگر ان کی ایک بھی بات تسلیم نہ ہوئی تھی ابوالفضل کی خوش قسمتی یہ تھی کہ وہ صرف ملا زادے ہی نہ تھے اور وہ مسجد سے اٹھ کر دربار شاہی میں نہیں پہنچ گئے بلکہ انھوں نے فوری طور پر درباری شاہی کو قبول فرمایا اور جو خدمت حصہ میں آئی اس کو بحسن خوبی بجالائے اور انھوں نے جلدی ہی ترقی کے منازل طے کر لیے اور باقی ملا کے ملا ہی رہ گئے کیونکہ وہ زمانے کی روش کو اختیار نہ کر سکتے تھے اور وہ مصائب میں گھر گئے۔

شیخ ابوالفضل انشاپردازی کا بادشاہ تھا اور اکبر نے بھی اس کو پرکھ لیا تھا کہ اس کا دماغ بہ نسبت ہاتھوں کے بہت خوب اترے گا کیونکہ وہ بڑے ذہین اور فطین تھے اور اکبر نے یہ بھی خیال کیا کہ:

''اس کا ذہن بڑا تیز ہے اس لیے ہاتھ میں قلم تلوار سے زیادہ کاٹ کرے گا۔''

اس لیے اکبر نے ابوالفضل کے ذمے دارالانشاء کی خدمت سپرد کر دی اور مہمات سلطنت کی تاریخ بھی اس کے ذمہ لگا دی۔ اس کے علاوہ ہر علم کو بڑی احتیاط اور عرق ریزی سے صلاح و مشورے میں اس کی رائے ضروری ہو گئی تھی یہاں تک کہ پیٹ میں درد ہوتا تو حکیم صاحب بھی ان کے مشورے سے تجویز ہوتا تھا۔ گویا کہ ابوالفضل نے اب ملائی کے کوچے سے گھوڑا دوڑا کر امراء اور منصبداران کے میدان میں جھنڈا گاڑا۔

شیخ ابوالفضل کی قسمت کے ستارے

۹۹۳ھ کے جشن کا حال یوں تحریر کرتے ہیں کہ

اسی جشن میں بہت سے منصبداروں کو ان کی خدمات کے صلے میں مختلف قسم کے منصب اور انعامات عطا کیے گئے۔ مگر راقم شکر گزار ہے کہ کسی نے بھی سفارش نہ کی تو حضور نے ہزاری منصب عطا ہو گیا امید ہے کہ عہدہ خدمتیں سعادت کے چہرے کو روشن کریں۔ گویا کہ اسے بھاری عنایت کی سعادت حاصل ہوئی۔

اسی طرح ۹۹۷ھ میں بادشاہ کے ساتھ لاہور میں تھے تو اسی دوران ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تو ان کا بڑا رنج پہنچا وہ اس دکھ و رنج کی حالت سے بہت بے قرار ہوئے اور بار بار یہ شعر پڑھتے رہتے تھے جو کہ عرفی نے اپنے موقع پر کہا تھا:

خون کہ از مہر تو شد شیرو ز طفلی خوردم
باز آں خون شد و از دیدہ بروں مے آید

پھر اس کے بعد تحریر کرتے ہیں کہ یہ اقبال کا ستارہ ذرا بے ہوش ہو گیا جو کہ محض والدہ کے انتقال کے غم سے ہی ہوا ہو گا تو بانو سے خاندان

خاتون دودمان عصمت کی ماں بہرہ اندوز جہاں ناپائیدار سے عالم علوی کو چلی گئی اور شہریار غمگین نواز سے آ کر بھی سایہ عاطفت و شفقت کا ڈالا اور انھوں نے اپنی زبان سے یہ الفاظ ادا فرمائے کہ:

''مگر سب اہل جہاں پائیداری کا نقش رکھتے اور ایک کے سوا کوئی ہستی میں رہ جاتا تو بھی اس کے دوستوں کو رضا و تسلیم کے سوا چارہ نہ تھا۔ جب اس کارواں سرا میں کوئی نہ ٹھہرے گا تو خیال کرو کہ بے صبری کی ملامت کا کیا اندازہ کر سکیں۔ اس گفتار دلآویز سے دل ہوش میں آ گیا اور جو منصب وقت تھا اس میں مصروف ہو گیا۔''

فرزند عبدالرحمٰن کے گھر پیدائش

۹۹۹ھ میں فرزند عبدالرحمٰن کے گھر میں روشن ستارے نے روشنی بڑھائی تو طرح طرح کے انداز سے شادمانیاں بجائی گئیں اور خوشی کا عالم پیدا ہوا اس دن خوب نگاہ آرائی ہوئی۔ حضور کو شہنشاہ نے خود ''پشوتن'' نام رکھا اور دعا کی کہ فرخی و فیروزی بڑھائے اور فرخی شگفتگی عمر درازی حاصل ہو اور ۹۹۹ھ کے سال میں شہزادہ سلیم (جہانگیر) کے فرزند مال بیٹے خسرو کی بسم اللہ کا دربار منایا گیا تو وہ سب سے پہلے بادشاہ کے حضور میں عجز و انکساری کے ساتھ آداب بجا لائے اور کہا کہ ''الف'' پھر ان کو حکم دیا گیا کہ:

''ہر روز تھوڑی دیر بیٹھ کر اس کو پڑھا دیا کرو تو انھوں نے چند دنوں کے بعد اپنے چھوٹے بھائی شیخ ابوالخیر کو اس خدمت کے لیے مامور کر دیا۔''

۱۰۰۰ھ میں اس اقبال نامہ کے نقش کو دو ہزاری کا منصب عطا ہوا۔ تو امید ہے کہ اپنی زبان سے اس کا شکریہ ادا کرے اور حضور کی جوہر شناسی کا دور و نزدیک اعلان بھی ہو۔ ۱۰۰۴ھ بمطابق ۱۵۹۵ء میں اپنے بڑے بھائی فیضی کی تصنیفات کا مشاہدہ کیا تو بڑے متفکر ہوئے کہ ان کے تمام اجزا بکھرے ہوئے تھے۔ بڑے بھائی کے جگر کے ٹکڑے اس طرح بکھرے ہوئے دیکھ کر بہت ہی پریشان حال ہو گئے تو ان کی ترتیب پر دھیان دینے لگے اور دو سال تک یہ کام کرتے رہے۔ آخر ۱۰۰۶ھ بمطابق ۹۷۔۱۵۹۶ء میں ان کی ترتیب سے فارغ ہوئے۔ اس عرصے میں دو ہزاری پانصدی کے عہدے پر سرفراز ہوئے یعنی اڑھائی ہزار کا عہدہ مل گیا جو کہ بڑے اعزاز کی بات تھی اور اکبر کے دربار کے منصب داروں میں نام لکھا گیا۔ ابوالفضل بڑے دانا اور سمجھدار درباری تھے وہ اچھی طرح یہ سمجھتے تھے کہ:

''اکبر کے سوا تمام دربار میں کوئی بھی ان کا دل سے خیر خواہ نہیں ہے تمام میرے سامنے منافقت ہی کرتے ہیں جو کہ ظاہری حالت ہے۔''

شیخ مبارک نے قرآن پاک کی تفسیر لکھی تھی تو انھوں نے اس کی نقول تیار کر کے دوسرے روم، ایران اور توران کے علاقوں میں بھجوا دیں۔ اس سے دوسرے درباری بڑا حسد کرنے لگے ان کے ہاں حسد کی آگ بھڑک اٹھی اور وہ اپنی حسد کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اس میں خامیوں کی تاک میں لگے تھے انھوں نے نامعلوم کس پیرائے میں اس مضمون کو اکبر بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا جو کہ اکبر کو ناگوار گزرا تو وہ کہتا کہ:

''کیا کیا موتی پروئے ہوں گے۔ یا یہ کہا کہ حضور کے سامنے یہ اہل دین کو مقلد کہتا ہے اور مغلیہ کی قباحتیں اور دینیات کی خرابیاں ظاہر کرتا ہے اور دل سے اعتقاد منصرانہ رکھتا ہے۔ یا یہ کہا کہ ''حضور سے کہتا ہے کہ میں آپ کے سوا کسی کو نہیں جانتا

بلکہ حضور کو صاحب شریعت اور صاحب ملت اعتقاد کرتا ہے اور باطن میں شاید یہ کہا ہو کہ تغیر مذکور کے خطبے میں حضور کا نام داخل نہیں کیا۔ شاید سلاطین مذکورہ کے دربار میں راستے نکالنا ہو۔ غرض جو کچھ بھی کہا اس نے بادشاہ کے دل پر اچھا اثر نہیں کیا بلکہ برے اثرات مرتب ہوئے۔"

ایک تاریخ میں لکھا گیا تھا کہ:

جہانگیر نے یہ ماجرا اپنے باپ کے گوش گزار کر دیا مگر ابوالفضل بھی بڑے ادا شناس شخص تھے۔ اس بات کا انہیں بھی بڑا رنج ہوا تو افسردہ ہو کر گھر بیٹھ گیا اور دربار میں آنا جانا ترک کر دیا۔ جب بادشاہ کو اس الت کا علم ہوا تو بادشاہ سلامت نے کہلا بھیجا کہ:

"دربار میں آ کر اپنی خدمات سنبھالو۔ اور اس دوران میں بہت سے پیام وسلام ہوئے۔"

آخر کار ابوالفضل کو اپنی غلطی اور نافہمی کا احساس ہوا اور سوچا کہ ایسی عمل دشمنوں کی آرزوئیں پوری کرتی ہیں یعنی وہ فائدہ اٹھاتے ہیں اور دوسروں کو نقصان دلاتے ہیں۔

تو جب بادشاہ سلامت نے بلایا تو پہلے تقش مٹا کر درگاہ والا میں گئے اور عواطف گوناگوں نے غموں سے سبکدوش کر دیا یعنی غم سارے دور ہو گئے۔

مزید رقمطراز ہیں کہ ۱۰۰۵ھ کو کشمیر کے سفر پر چوڑی کے مقام پر شاہزادہ سلیم (جہانگیر) درگاہ میں بغیر اجازت کے داخل ہو گیا۔ جس کی وجہ سے رستہ میں بدانتظامی ہو گئی تو چند روز کورنش (سلام) سے محروم رکھ کر عتاب کی ادب گاہ میں رکھا (پیچھے ہٹ کر ڈیو کرو) اس بدگری کی تحقیق میں انہیں بھی شامل کیا اور شاہزادے کی اظہار شرمساری سے خطا معاف ہوئی۔

مورخین نے لکھا ہے کہ ابوالفضل اکبر بادشاہ کا مصاحب، مشورہ کار، صاحب اقتدار میر منشی اور وقائع نگار، واضع قوانین صاحب ایوان تھا مگر اس کی زبان نہیں تھیں۔ اس کی عقل کی چابی پایہ یہ ہو کہ:

"سکندر کے سامنے ارسطو تھا اور زبان سے لوگ جو کچھ بھی کہیں کہ وہ ان رتنوں یا عہدوں کی لیاقت یا اہلیت بھی رکھتا تھا تو غیب سے آواز آئے گی کہ اس کا رتبہ اس سے بہت بلند تھا۔ اس کے احکام کی طرز بیان اور امرا کے کاروبار پر صلاحیتیں اور ان کی جانفشانی ہی ہیشہ کوتاہیاں جتانا بھی غضب تھیں۔"

شیخ ابوالفضل بڑا ہی چالاک، دانا اور موقع شناس درباری تھا۔ وہ نہ صرف اکبر کے پاس بیٹھ کر ملوطا مینانہ بناتا تھا بلکہ وہ مہمات وسر کرنے کی بھی صلاحیتیں رکھتا تھا۔ جب بھی اس پر کوئی مشکل آن پڑی تو اسے انتہائی مردانگی اور نہایت خوش اسلوبی سے سنبھال لیتا تھا اور اپنا مقصد پورا کرتا تھا تو لوگ بڑے حیران ہوتے تھے کہ ایک ملا کا بیٹا کس طرح اتنا بھاری سلطنت کے کو اپنے کندھے پر اٹھا کر چلا جا رہا ہے۔

شیخ ابوالفضل کی کاروائی کے نمونے

۱۰۰۹ھ میں شیخ ابوالفضل کی ترقی کے اندازوں میں ترقی واقع ہوئی کیونکہ دکن کے معاملات بڑے پیچیدہ ہو گئے تھے تو اکبر نے شاہزادہ

مراد کے نام پر یہ مہم کر دی تھی اور اس کے ساتھ بہت سے تجربہ کار اور بہادر سپہ سالار کر دیے۔ شاہزادہ نوجوان لڑکا تھا۔ اور ایسے پرانے تجربہ کار اور کینہ مشق سپہ سالاروں کا دبانا شہزادے کے بس کا کام نہ تھا۔ تو وہ اس کے خلاف ہو کر اس کی محنت کو بھی ضائع کرتے تھے۔ ان کے لیے سب سے بڑی یہ مشکل کی بات تھی کہ:

''شہزادہ کو شراب کی لت پڑ چکی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کی حالت بڑی ہی غیر ہو چکی تھی۔ جس کی وجہ زیادہ کا مزاج ہو گئے۔ جب یہ اطلاع اکبر کو پہنچی تو وہ اس فکر میں ہوا تو اس وقت بادشاہ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ شیخ ابوالفضل کو اس کام کے لیے مامور کرے مگر اس کی جدائی بھی بادشاہ کو گوارا نہ تھی۔''

مگر اکبر بادشاہ کی خود یہ حالت تھی کہ وہ پانچ سال سے پنجاب میں پھر رہا تھا اور اس نے لاہور کو مستقل قیام گاہ بنا رکھا تھا۔ لاہور میں فوج کی بڑی چھاؤنی قائم کر لی گئی جس کے بڑے اچھے نتائج برآمد ہوئے اور انھوں نے کشمیر کو فتح کر لیا اور وہاں کے یوسف زئی وغیرہ علاقہ سرحد کی مہمیں حسب دلخواہ سرانجام ہو گئیں اور کشمیر میں عبداللہ خاں ازبک کے رستے بند ہو گئے اور ملک گیر بادشاہ ۱۰۰۵ھ میں ناخلف بیٹے کی بداعمالی سے راجی ملک بقا ہوا یعنی فوت ہوا تو اس کے ملک کا انتظام درہم برہم ہو گیا تو اکبر نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پر قبضہ کر لیا۔ لیکن برہان الملک کی تباہی مملکت کی وجہ سے دکن کا دستر خوان بھی سامنے نظر آتا تھا اور طویل مدت سے امرا اور افواج کی آمد و رفت جاری تھی۔ بادشاہ کو شاہزادہ مراد کی اصل حالت کا بھی علم ہو گیا تھا اور خیال کیا کہ دکن کی سپاہ سپہ سالاروں سے خالی ہونا چاہتی ہے تو آپ نے دونوں بیٹوں کو طلب فرمایا کہ بادشاہ سلامت کا یہ ارادہ تھا کہ:

''شاہزادہ سلیم کو فوج دے کر ترکستان کی مہم پر بھیجے کیونکہ وہ شرابی کبابی لڑکا بدمست ہو رہا تھا۔''

بادشاہ سلامت کو دانیال کی طرف سے اطلاع ملی کہ وہ الہ آباد سے آگے نکل گیا ہے اور اس کا ارادہ اچھا معلوم نہیں ہوتا تو بادشاہ سلامت خود لاہور سے روانہ ہوئے کہ اس کو ساتھ لے کر احمد نگر کو جائے اور دکن سے فارغ ہو کر توران کی مہم کا بھی بندوبست کرے۔

اکبر بادشاہ کا ابوالفضل پر اعتماد و یقین

یہ سب پر واضح تھا کہ اکبر بادشاہ کو ابوالفضل کی نیک نیتی اور عقل و تدبیر پر ایسا اعتماد و یقین تھا کہ گویا وہ ابوالفضل کے کہے کو اپنا کہا سمجھتا تھا۔

غرض ۱۰۰۶ھ میں شیخ ابوالفضل کو سلطان مراد کے لانے کا حکم دیا گیا اور بادشاہ سلامت نے فرمایا کہ:

''اگر مہم دکن کے امرا اس ملک کے رکھنے کا ذمہ لیں تو شاہزادے کے ساتھ چلے آؤ۔ ورنہ شہزادے کو روانہ کر دو اور خود وہیں رہو کہ آپس میں اتفاق و اتحاد قائم رکھو اور مرزا شاہ رخ کے ماتحت رہنے کی اور مرزا کو بھی علم و تدبیر دے کر مالوہ کی طرف روانہ کر دیا کیونکہ وہاں اس کی جاگیر تھی اور وہ وہاں سے اپنی جاگیر سے سپاہ کا انتظام کرے گا۔ جب دکن میں بلائیں تو فوری طور پر پہنچ جائے۔ شیخ برہان پور کے پاس پہنچے تو بہادر خاں فرمانروائے خاندیس آمیر کے قلعے سے اتر کر چار کوس سے آیا تھا۔ کمال آداب سے فرمان و خلعت لے کر آداب بجا لایا۔ انھیں ٹھہرانا چاہا مگر وہ نہ رکے اور وہاں سے روانہ ہو کر برہان پور جا پہنچے۔ بہادر خاں وہیں پہنچ گیا۔ انھوں نے بہت سی تلخ و شیریں باتیں کہہ کر مصلحت کا راستہ دکھایا کہ

فوج کشی میں شامل ہو۔ اس نے آسمان سی بات کے لیے مشکل طریقے تجویز کیے البتہ کبیر خاں نے اپنے بیٹے کو دو ہزار فوج دے کر روانہ کر دیا تھا۔ انھیں گھر لے جانا چاہا کہ ضیافت کرے تو انھوں نے کہا کہ:

تم ساتھ چلتے ہو تو ہم بھی چلتے ہیں۔ اس نے بہت سے تحائف پیش کیے۔ ابو الفضل باتوں کا تو کھلاڑی تھا اس نے ایسے باتیں بنائیں کہ اس کے حواس باختہ ہو گئے اور وہ آسیر کی طرف روانہ ہو گیا اور یہ بھی اپنے پروگرام کے مطابق آگے نکل گئے اور جو نازو نیاز کا زور اس پر دکھاتے وہ بجا تھا کیونکہ:

"اس کے چچا خداوند خاں سے ان کی بہن کی شادی ہو چکی تھی اور راجی علی خاں اس کا باپ دربار اکبری میں پورا نیاز و اخلاص رکھتا تھا۔ چنانچہ سہیل خاں دکنی کی مہم میں خان خاناں کی رفاقت میں موجود تھا اور کمال مردانگی سے ساتھ میدان میں مارا گیا تھا۔ یعنی بہادری سے اڑ کر مرا تھا۔"

امراء کو خدمت کا ناگوار لگنا اور مہمات

ابو الفضل خود بیان کرتے ہیں کہ:

بہت سے امراء کو میرے لیے اس خدمت کا نامزد ہونا بہت ہی ناگوار لگا تو انھوں نے متفق ہو کر ایسے داؤ پیچ لڑانے شروع کیے کہ ان کی تراکیب سے میرے پرانے رفیق اور ساتھی بھی میرا ساتھ چھوڑ گئے تو میں نے مجبور ہو کر سپاہ کا انتظام کیا۔ میری قسمت نے یاوری کی تو بہت سا لشکر جمع ہو گیا مگر بدخواہوں سے خالی لگا کر مجھ سے کہا کہ:

"کیا کرتے ہو اس میں خطا ہے۔"

مگر میں نے ان کی رائے کے ساتھ اتفاق نہ کیا اور اپنے منصوبے پر عمل ہو رہا مگر انھوں نے شورش پر کام جاری رکھا کہ میں شاہزادہ کی چھاؤنی سے ۳۰ کوس پر پہنچ گیا تو یہاں قاصدان تیز رفتار مرزا یوسف خاں وغیرہ شاہزادہ کے لشکر کے خطوط لے کر یہاں پہنچے کہ عجب بیماری نے گھیر لیا ہے۔ پھر سے شائد حکما دل بدل سے کچھ فائدہ حاصل ہو اور اعلیٰ ادنیٰ سے بچ جائیں اگرچہ یہ زبان درگاہ کی طرف سے دب کھلایا ہوا تھا اور ہم اپنی بھی روکتے تھے مگر میں سب کو شیطان کے وسوسے ہی سمجھتا رہا اور اپنی پھرتی کو تیز کر دیا۔ مجھے سارا یہی فکر تھا کہ:

"زندگی ولی نعمت کے کام میں کھپا دوں، اور دربانی اقبال مندی کو کار گزری سے دکھا دوں۔ دیول گاؤں سے اور تیز ہو گیا شام ہوتے جا پہنچا اور وہاں سے جا کر ایسا منظر سامنے آیا جو کبھی نظر نہ آیا تھا۔ کام علاج سے گزر چکا تھا۔ گرد گروا ہو وہ رسا ہجوم آدمی آوارہ سرداروں کو یہ خیال ہوا کہ:

"شہزادہ کو شہر پور لے کر پھر چلو۔"

تو میں نے کہا کہ:

اس عالم میں چھوٹے بڑے شکستہ دل ہو رہے ہیں اور عجب قسم کا بلوہ ہونے والا ہے۔ غنیم پاس ملک بیگانہ پھر چلنا گویا کہ آفت کو دعوت دینا تھا۔ گفتگو میں اس گلدستہ (شہزادے) کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ حالت بگڑ گئی اور شہزادہ جاں بحق کیا تو کچھ لوگ بدنیتی سے اور کچھ

اسباب سنبھالنے میں بعض بال بچوں کی حفاظت میں الگ مصروف تھے۔ مدد الٰہی سے اس شورش میں دل قائم رکھا اور حوصلے کو بلند کیا اور جو کچھ موقع کے مطابق کرنا چاہیے تھا اس کے کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ شہزادے کو کفن دے کر عورات سمیت شاہ پور روانہ کر دیا گیا اور اس مسافر کو وہیں خاک میں امانت رکھ دیا تو بعض اشخاص پرانی پہاڑی سے نکل کر فتنہ انگیزی کرنے لگے۔ جتنی فہمائش ہوئی اتنی ان کی نخوت زیادہ ہو گئی۔ تو اس عرصہ میں میری سپاہ جو پیچھے رہ گئی تھی وہ بھی آن پہنچی۔ جن کی تعداد دس ہزار سے زائد تھی۔ اب مجھے اور بھی تسلی حاصل ہو گئی اور جو لوگ مجھ سے اختلاف رکھتے تھے انھوں نے سپاہ کی آمد کو دیکھ کر صلح کرنی شروع کر دی اور انھوں نے میری بات کاٹنے پر کان دھرنے شروع کر دیے۔ اس وقت پر چھوٹے سے بڑے تک کو یہی خیال تھا کہ:

''واپس چلیں۔ منعم خاں کے مرنے کی بنگالہ کی بغاوت کی۔ شہاب الدین احمد خاں سے گجرات سے نکل جانے کی اور اس ملک کے فتنہ و فساد کی باتیں رنگ الگ الگ سے سنا ئیں۔''

مگر میری مرضی خاص درگاہ الٰہی میں یہ تھی کہ:

اقبال بادشاہ کے نور سے آنکھ روشن تھی اس لیے جو جہاں کو پسند تھی وہ مجھے بری لگتی تھی۔ بہت سے بدنیت مجھ سے جدا ہو گئے۔ میں نے کارساز حقیقی کی طرف دل کا رخ کیا اور آگے ہی بڑھتے رہا۔ فتح دکن کے لیے اپنا مقصد قائم کیا۔ اس بڑھنے سے دلوں میں اور ہی زور آ گئے سرود کے لوگوں کو شکر گزاری رکھا تھا۔ انھیں اور اس ملک کے اکثر نگاہبانوں کو فہمائش کے خطوط لکھے۔ تخت دستوں کے ہاتھ روکے۔ شاہزادہ کے خزانوں میں سے جو کچھ حضور میں بھیجنے کے قابل نہ تھا اور جو کچھ اپنے ساتھ بھی تھا اور جو قرض بھی مل سکتا تھا وہ سب ان پر قربان کر دیا۔ تھوڑے سے عرصے میں جو لوگ چلے گئے تھے وہ واپس آ گئے اور پھر کاروبار شروع ہو گیا۔ شاہزادے کے کل علاقے کا انتظام بہتر ہونے لگا البتہ سمک کا رستہ خراب اور عرصہ دور کا تھا۔ وہاں کی خبر کے لیے کافی وقت درکار ہوتا تھا صرف وہ رہ گیا تھا کیونکہ جب شاہزادہ کے فوت ہونے کی خبر پہنچی تو وہی ملک کا منتظم اعلیٰ تھا اس لیے فوج میں ناامیدی کی لہر دوڑ گئی اور فوج منتشر ہو گئی۔ اور جو لوگ میں نے روانہ کیے تھے انھوں نے بھی کم ہمتی کا ثبوت دیا جو ملک نکل گیا تھا وہ تو واپس نہ مل سکا البتہ اور مضافات علاقے میں شامل کر لیے گئے۔ اکبر نے پہلے سے شیخ کو بھیج دیا تھا اگر اس کو نہ بھیجا جاتا اور شاہزادہ بھی فوت ہو جاتا تب ہماری فوج کا ستیاناس ہو جاتی جس سے عالم میں رسوائی ہوتی اور ایسی مشکلات درپیش ہوتیں کہ جن کو گمان بھی کسی کو نہ ہوتا اور ہر سوال ملک سنبھلنے کا نام نہ لیتا۔ درگاہ والد کے دم سازوں نے میرے عرائض نہ سنائے اور ایسی سرگزشت کو بد خیال سے چھپایا۔ بادشاہ کو اگر صحیح صورت حال سے آگاہ کرتے اور فوج اور خزانہ ضرور روانہ کرتا تھا۔ میں تو درگاہ الٰہی میں عرض کر رہا تھا اور گیتی خداوند (اکبر بادشاہ) کی فوج روز افزوں تھی سپاہ کا انجام ایسا ہوا کہ اہل زمانہ کا خیال سنبھال بھی نہ سکے۔ دور نزدیک کے لوگ حیران رہ گئے کہ خدا کی قدرت امکان کی طاقت سے باہر سمجھتا تو انسان سے کیا ہو سکتا ہے؟

شہ سخن مائدہ ام خیرہ درکار او
کہ گفت آفریدے سزا وار او

دربار کے تعریف کرنے والوں کے منہ بند ہو گئے اور وہ سب خاموش ہو گئے اور جو میرے بدخواہ حضرات تھے وہ اس بات پر خوش تھے کہ:

"بادشاہ نے آپ شیخ ابوالفضل کو دربار سے دور پھینکا ہے۔"

مگر کارساز حقیقی نے اس کو میرے لیے بلند نامی کا سرمایہ بنایا اور ان کو ندامت اٹھانی پڑی۔ غرض میں مہمات کے انتظام میں مصروف ہو گیا سب سے پہلے سندرداس کو فوج دے کر تلتم کے قلعے کی طرف روانہ کر دیا۔ اس نے کارآگہی سے بعض ملک نشینوں کو بلایا۔ انھیں میں سے ایک جا کر قلعدار کو ساتھ لے آیا اور معمولی بات چیت کے بعد قلعہ پر قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد سوئید بیگ اور میرا بیٹا دب خانہ زندان میں تھے۔ چند روز بعد اسے بھی دکن کی مہم پہ نامزد کر دیا گیا اور دولت آباد روانہ کر دیا تو وہاں قلعہ نشینوں نے لکھا کہ:

"اگر عہد و پیمان سے یہ خاطر جمع ہو جائے کہ ہمارے مال و اسباب سے تعرض نہ ہوگا۔ تو ہم قلعہ حوالے کر دیتے ہیں۔
اس کا سرانجام ہو گیا۔"

کچھ حبشی اور دکنی مفسد ادھر کے علاقے میں تھے۔ عبدالرحمٰن فرزند کو پندرہ سو سوار اپنے اور اتنی ہی شاہی فوج دے کر ان کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا گیا۔ جب شاہزادے کے مرنے سے شورش گرم ہوئی تو میں نے مرزا شاہ رخ کو بہت جلایا کہ لوگ ایسے ہنگاموں پر ہزاروں ہوائیاں اڑاتے ہیں مگر نا معلوم کن وجوہات کی بنا پر وہ نہ آئے۔ جس کی مجھے امید نہ تھی بلکہ مجھے ان سے یہ امید بھی کہ اگر فرمان نہ بھی پہنچا تو بھی ضرورت پڑنے پر وہ بے قرار ہو کر یہاں پہنچ جاتا تھا مگر وہ کہنے والوں کے کہنے میں آ گئے اور اپنے خیالات سے بھٹک گئے۔ جب فرمان عتاب آمیز پہنچا اور آخر کار بادشاہ نے حسین ہراول کو روانہ فرمایا وہ بھی بادل نخواستہ ہی روانہ ہوا۔ بہر حال وہ لشکر فیروزی میں آ کر شامل ہو گئے تو میں اس کے استقبال کے لیے ڈیوڑھی سے آیا۔ ایسے مردانہ پارسا گوہر کے آنے سے دل کھل گیا۔ شیر خواجہ عمل سردار مراد سلطان کی ہمراہی میں ایک فوج کا افسر ہو کر گیا تھا اور سرحد میں ہر گنہ بیر کی حفاظت کر رہا تھا۔ تو جب برسات کا موسم آیا تو معلوم ہوا کہ:

"دکنیوں نے فوجیں جمع کرنی شروع کر دی ہیں اور عنبر و فرہاد کی ہزار سوار حبشی دکنی اور ۶۰ مست ہاتھی ایک آنے والے ہیں۔ شیر خواجہ کے پاس فقط ۳ ہزار فوج تھی اور خود پیش دستی کر کے اور شہر سے کئی کوس آگے بڑھ کر غنیم پر جا حملہ کیا لیکن فوج کی کمی کی وجہ سے لڑتا بھڑتا ہٹا اور قصبہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ شیر خواجہ زخمی ہو گیا تھا مگر اس کے شکست دینے کی خبر مشہور ہو گئی اور اس نے ادھر بھی خط بھیج دیا جس کی وجہ سے میں نے مزید کمک کے طور پر فوج روانہ کر دی تو جب یہ خبر پہنچی تو مصلحت کی انجمن جمائی۔ کسی کو صلاح نہ تھی۔ اس وقت بارش موسلا دھار ہی ہو رہی تھی اس حالت میں میں نے جریدہ روانہ کیا کہ لشکر کے کاروبار مرزا شاہ رخ کے حوالے کر گیا اور شیخ عبدالرحمٰن کو دولت آباد سے بلایا اور ان کو کنارہ گنگ روانہ کر دیا گیا بکھری فوج کو سمیٹنے کا حکم دیا۔ سرداران شاہی میں سے کوئی بھی باصلاحیت نظر نہیں آتا تھا اور مرزا یوسف خاں مجھ سے ۲۰ کوس کے فاصلے پر تھے۔ میں جریدہ ادھر روانہ ہوا اور رات کو وہاں پہنچا اور اسے بھی مدد کے لیے آمادہ کر لیا۔ وہ ادھر ادھر کی افواج کو اکٹھا کر کے ساتھ لے آیا اور لشکر کی حالت سنبھال کر آگے بڑھا۔ گنگ کو وہ اور بھی چڑھائی تھا۔ قسمت سے دفعتاً اتر گیا اور فوج پایاب گزر گئی جو غنیم کی فوج دریا کے کنارے پڑی تھی۔ وہ ہراول کی جھپٹ میں اڑ گئی تو دوسرے دن لشکر قلعہ بیر کے گرد سے بھی اکھڑ گیا۔ درگاہ الٰہی میں شکرانے بجالایا اور شادیانوں کے جلسے کیے۔ دریائے گنگ کے کنارے چھاؤنی ڈالی اور اس ملک میں رعب بیٹھ گیا تو جب اکبر بادشاہ نے دیکھا کہ:

''امرائے موجودہ سے مہم دکن جیسی متعلق تو شاہزادہ دانیال کو فوج دے کر روانہ کیا اور خان خاناں کو اتالیق کا منصب دیا۔''

ابوالفضل مزید رقمطراز ہے کہ:

اسی دن بڑے شہزادے (سلیم یعنی جہانگیر) کو صوبہ اجمیر دے کر رانا کی مہم کے لیے روانہ کیا۔ شہریار کو اس سے بڑی محبت تھی۔ مگر اس کو نیک و بد کا علم نہیں تھا۔ چند روز سلام کی اجازت نہ دی۔ بارے مریم مکانی کی سفارش سے کورنش (سلام) کی دولت پائی اور یہ کہا کہ:

''آئندہ ایسا نہیں کروں گا اور صحیح عمل کروں گا اور خدمت کروں گا۔''

بادشاہ تو دمالوہ میں جا کر شکار کرتے گئے تاکہ ان کی ہر طرف نگاہ رہے اور خانخاناں کو دانیال کی رفاقت کے لیے روانہ کر دیا گیا اور ان کو حکم دیا گیا کہ:

''جب خانخاناں وہاں پہنچے تو اسی وقت ابوالفضل روانہ درگاہ ہو۔ اس سے میں نے بڑی خوشیاں منائیں اور اسی موقع پر قلعہ تبالہ فتح کر لیا۔''

ابوالفضل کی احمد نگر روانگی

اکبر بادشاہ کو یہ اطلاع ملی کہ بڑا شاہزادہ رستے میں دیر کرتا ہے تو اس نے میر عبدالحئی سے عدل کو ہدایات دے کر روانہ کر دیا اور شیخ ابوالفضل کو احمد نگر کی طرف کا حکم ہوا۔ چاند بی بی برہان الملک کی بہن اب اس کے پوتے (بہادر) کو دادا کا جانشین بنا کر مقابلہ کو تیار ہوئی تو کچھ فوج نے اس کی اطاعت بھی کر لی۔ آ بھنگ خاں بہت سے فتنہ انگیزوں کو ساتھ لے کر جو کہ حبشی تھے بچے کو بادشاہ مانتا تھا مگر چاند بی بی کی جان کی فکر میں تھا وہ بیگم امرائے بادشاہی کو خوشامد کرتے پیغام بھیجتی تھی اور دشمنوں کو بھی دوستی کی کہانیاں سناتی تھی تو اس نے مجھ سے بھی وہ طریقہ اختیار کیا تو میں نے جواب دیا کہ:

اگر پیش بینی اور روشن اختری سے درگاہ والٰہی کے ساتھ وابستہ ہو جاؤ تو اس سے بہتر کیا ہے؟ اور جو بھی عہد و پیمان ہیں ان کو میں نے اپنے ذمے لیا ورنہ باتوں سے کیا فائدہ؟

چاند بی بی کے ساتھ معاہدہ

تو چاند بی بی نے مجھے ہمدرد اور ہوا خواہ سمجھ کر دوستی کے معاہدے کو مضبوط کیا اور پکی قسموں کے ساتھ اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا عہد نامہ پیش کیا کہ:

''جب تم آ بھنگ خاں کو زیر کر لو گے تو میں قلعہ کی چابیاں تمہارے حوالے کر دوں گی۔ مگر اتنا ہے کہ دولت آباد میری جاگیر میں رہے اور یہ بھی اجازت ہو کہ چند روز وہاں جا کر قیام کر لوں اور جب چاہوں حاضر درگاہ ہوں۔ بہادر کو روانہ دربار کر دوں گی۔''

افسوس کا مقام تو یہ تھا کہ میرے ساتھیوں کے دل نہ ہونے سے کام میں دیر ہو گئی شاہ گڑھ میں لشکر دیر تک مقام پذیر رہا۔ اور شاہزادے کی آمد آمد بجھ گئی اور آ بھنگ خاں کی بد اندیشی بھڑک اٹھی۔ شمشیر الملک کو (حکومت پہ اراس کے خاندان میں تھی) قید خانے سے نکال کر فوج لے کر

دولت آباد سے ہوتا ہوا برار کو چلا تو وہاں فوج شاہی کا مال سپاہ اور اہل و عیال تھے تو وہ لوگ پریشان ہو جائیں گے اور لشکر میں تفرقہ پڑ جائے گا۔ مجھے اس امر کی پہلے خبر تھی۔ مرزا یوسف خاں وغیرہ کو فوج دے کر ادھر روانہ کر چکا تھا مگر وہ اپنی بے پروائی کی نیند میں سوتے رہے تو وہ ولایت برار میں داخل ہو گیا اور وہاں اس نے کھلبلی مچا دی۔ وہاں بہت سے پاسبانوں کے پاؤں اکھڑے حوصلے پست ہو گئے ہمتیں ہار گئیں اور ان میں سے اکثر اپنے اہل و عیال کی محبت میں اٹھ دوڑے تو مجھے علم ہوا تو میں نے ان کی طرف فوج روانہ کر دی اور میں خود احمد نگر کی طرف روانہ ہو گیا تھا تا کہ باہر کے بدخواہوں کا قلع قمع کروں اور چاند بی بی کی بات کا کھوٹا کھرا دیکھوں۔ ابھی ایک منزل ہی طے ہوئی تھی کہ مخالفوں نے سب طرف سے سمٹ کر احمد نگر کا رخ کیا کہ اسے بچائیں مگر اقبال اکبری نے خبر اڑا دی کہ:

''شمشیر الملک مر گیا ہے۔'' تو یوسف خاں بھی چونک کر دوڑے اور انھوں نے کئی سرداروں کو آگے بڑھایا انھوں نے بھی جلدی سے آگے بڑھنا شروع کیا اور وہ ہمت کے ساتھ چلتے بنے تو رات کو وہاں جا پہنچے ان کی پہنچ سے عجب قسم کی ہلچل مچ گئی۔ تو اس حالت میں شمشیر الملک مارا گیا اور قلعہ فتح ہو گیا اور فتح کا شادیانہ سب نے خوشی سے بجا دیا۔ جس سے دم میں دم آیا۔

آبھنگ خاں کی عاجزی

یہ مہم کامیابی کے راستے پر تھی اور ان کا لشکر دریائے گنگ کے کنارے مُنگی پٹن پر تھا جو شاہزادے کے احکام متواتر پہنچے کہ تمہاری عرق ریزی نزدیک و دور کے دلوں پر نقش ہو گئی۔ ہم چاہتے ہیں کہ:

ہمارے سامنے احمد نگر فتح ہو۔ تم ارادے سے باز رہو اب آنے میں راہ نوردی میں دیر نہ ہو گی۔ یہاں لشکر میں ایک نئی شورش اٹھی۔ تو شاہزادہ جب برہان پور پہنچا تو بہادر خاں قلعہ آسیر سے نہ اترا تو شاہزادے نے چاہا کہ:

''اس بدراہ کی گردن مسل دی جائے۔''

مرزا یوسف خاں احمد نگر کی فوج کشی میں تھا اور وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ اسے بھی بلا لیا گیا۔ یہ دیکھ کر دوسروں نے بھی ادھر کا رخ کر لیا۔ بہت سے سردار بغیر اجازت کے ہی روانہ ہو گئے۔ دشمن جو کہ دل چھوڑ چکا تھا یہ حالت دیکھ کر وہ دلیر ہو گیا اور دشمن نے کئی دفعہ شبخوں مارا اور ان کو خوب نقصان پہنچایا بہادر سپاہ نے مقابلہ تو خوب کیا اور مدد الہی کی برکت سے اور متواتر شبخونوں سے دشمن تتر بتر ہو گیا اور آبھنگ خاں نے خوشامدی انداز میں اپنی عاجزی اور انکساری کا اظہار کیا۔

ابوالفضل کو چار ہزاری کا منصب

اکبر کو دانیال اور بہادر خاں کے معاملات کی اطلاع ملی تو شاہزادے کے نام فرمان جاری ہوا کہ احمد نگر کی طرف بڑھے اور بہادر خاں کا حاضر نہ ہونا شرارت نہیں ہے یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دو ہم اس کو خود حل کر لیں گے۔ شہزادہ احمد نگر کی طرف روانہ ہو گیا۔ بہادر خاں نے اپنے بیٹے کبیر خاں کو چند خواصوں کے ساتھ اکبر بادشاہ کے حضور میں بھیج کر عمدہ پیشکش کیں لیکن وہ خود حاضر نہ ہوا آخر کار مجبوری کے عالم میں لشکر کشی کا حکم دیا گیا

اور ابوالفضل کو فرمان پہنچا کہ: انتظام سپاہ مرزا شاہ رخ کے سپرد کر کے برہان پور میں چلے جاؤ اگر بہادر خاں نصیحت کو سمجھ کر تمہارے ساتھ ہوئے تو سابقہ گناہ معاف کر کے اس کو ساتھ لے جاؤ ورنہ جلد حاضر حضور ہو کر مشورہ کریں۔

ابوالفضل برہان پور کے قریب پہنچا تو بہادر خاں بھی آ کر اس سے آ ملا۔ ابوالفضل نے اس کو چند نصائح سے نوازا جس کا اس پر موثر اثر ہوا۔ اور وہ ابوالفضل کے ساتھ ہو لیا۔ مگر گھر جا کر پھر بدک گیا اور بیہودہ سا جواب دے دیا جب یہ فرمان آگے بڑھا تو وہاں جشن نوروزی کی دھوم دھام ہو رہی تھی۔ رات کا وقت تھا پریاں ناچ رہی تھیں۔ نغمہ پرداز جادوگری کر رہے تھے۔ تاروں بھرا آسمان چاندنی رات کی بہار تھی۔ پھولوں بھرا چمن دونوں کے مقابلے ہو رہے تھے۔ مبارک ساعت میں درگاہ پر آ کر پیشانی رکھ دی۔ اکبر کے دل کی محبت اس سے قیاس کرنی چاہیے تو اس وقت یہ شعر پڑھا کہ:

فرخندہ شبے باید و خوش مہتاب تابا تو حکایت ہی کنم از ہر باب۔

ترجمہ: بلکی کو خوشی کی رات چاند کی طرح خوش ہو۔ تاکہ ہر شخص تجھ سے بات کر سکے۔ شیخ شکریہ کے طور پر بڑی دیر تک چپکے رہے۔ خان اعظم شیخ فرید بخشی بیگی اور ان کا حکم ہوا کہ:

جاگیر امیر کو گھیر و اور مورچے لگا دو۔ جلد ہی تعمیل ہو گئی شیخ فرید والی فوج اپنی کی اور غنیم کی زیادتی سے دور بینی کر کے تین کوس پر تھم گئے مگر کیا نظر (غالباً خان اعظم مراد ہیں) اشخاص نے رنج دیا اور حضور کو مکدر (ناراض) ہو گئے۔ جب شیخ ابوالفضل آئے اور انھوں نے حقیقت حال بیان کیا تو ان کی ناراضی یا خفگی دور ہو گئی اور ابوالفضل کو اسی دن چار ہزاری کا منصب اور صوبہ خاندیس کا انتظام سپرد ہوا جو کہ ان کے لیے ایک انعام و عنایت تھی تو شیخ ابوالفضل نے جگہ جگہ آدمی مقرر کر دیے۔ جن میں سے ایک طرف بھائی شیخ ابوالبرکات کو بہت سے داناؤں کے ساتھ روانہ کیا تو دوسری طرف شیخ عبدالرحمٰن کو اپنے فرزند کے ساتھ بھیج دیا تو ان مجاہدوں کی اللہ تعالیٰ کی ہمت و توفیق اور فضل و کرم سے تھوڑے سے عرصے میں سرکشوں کی گردنیں مار دیں۔ تو ان میں سے اکثر نے اطاعت قبول کر لی۔ زمینداروں کی خاطر جمع ہو گئی اور انھوں نے اپنے کھیت سنبھال لیے۔

ابوالفضل کی عنایات اور مہمات

ابوالفضل پر ایک بادشاہ کی اس قدر عنایات و اعتبار اور اپنی لیاقت اور حسن تدبر سے ایسی مقبولیت حاصل کر لی تھی کہ اس کی تدابیر اور تحریروں کی چالوں کی وجہ سے حاکموں کو بلا کر دربار میں حاضر کر دیا۔ ان کا بھائی فیضی اور بیٹا عبدالرحمٰن خاندیس کے علاقے میں جانفشانی سے لڑ رہے تھے تو ان خدمات کے صلے میں اکبر شہنشاہ نے ابوالفضل کو چار ہزاری منصب سے نوازا اور صفدر خاں کو کہ راجی علی خاں کا پوتا اور شیخ ابوالفضل کا بھانجا تھا۔ وہ حسب الطلب آگرہ سے اکبر بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا اور اس کو بھی خدمات کے صلے میں اکبر ہزاری منصب عنایت کیا گیا کیونکہ وہ خاندانی سردارزادہ تھا۔ اس کی نیک نیتی کے ملک میں اچھے اثرات مرتب ہوئے۔ ابوالفضل کے انجام کو جہانگیر کے ساتھ بڑا تعلق تھا۔ شیخ ابوالفضل جو مہم میں واقعات پیش آئے ان کا حال ذیل کے الفاظ میں یوں بیان کرتا ہے کہ:

اس سال کے واقعات سلطنت میں بڑے شاہزادے کی ناتجربہ کاری ہے (کم عقلی) اس نونہال دولت کو رانا کے اودے پور کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا تھا مگر اس لیے بڑی آرام طلبی اور بادہ خواری اور بدصحبتی کے ساتھ کچھ عرصہ تک اجمیر میں ٹھہرا رہا۔ اور اس کے بعد اودے پور کی طرف روانہ ہوا تو دوسری طرف سے رانا نے بھی شورش برپا کر دیا اور کئی آباد مقامات کو لوٹ لیا تو اس نے مادھو سنگھ کو فوج دے کر ادھر روانہ کر دیا۔ مگر رانا پھر پہاڑوں میں روپوش ہو گیا اور اس نے بکھری ہوئی فوج پر شبخون سے حملے کرتا رہا۔ بادشاہی سرداروں سے مقابلہ تو کیا اگر اس وقت اس حالت میں وہ کچھ بھی مقابلہ حسب ضرورت نہ کر سکتے تھے تو وہ شاہی سردار ناکام واپس آئے اور کام ان سے خوش اسلوبی سے سرانجام پاتا نظر نہ آیا تھا جس کی وجہ سے انھوں نے واپسی کا خیال کر لیا تو دوسرے ساتھیوں کے کہنے کے مطابق انھوں نے پنجاب کا ارادہ کر لیا تاکہ وہاں جا کر دل کے ارمان پورے کر لیے جائیں مگر اچانک بنگالہ کے افغانوں نے بغاوت کر دی تو راجہ مان سنگھ نے ادھر کا رستہ ان کو دکھایا تو یہ اس مہم و تابع چھوڑ کر ادھر بھاگ کھڑے ہوئے آگرہ سے چار کوس اوپر جا کر جمنا پر اترے۔ مریم معانی کے سلام کو بھی نہ گئے جبکہ وہ ان حرکات سے کافی آزردہ ہوئیں۔ پھر بھی وہ محبت کے مارے ان کے پیچھے گئیں کہ شائد سعادت کی راہ پر آجائے ان کے آنے کی خبر سن کر شکارگاہ سے کشتی پر بیٹھ گیا اور فوری طور پر دریائی راستے سے آگے نکل گیا وہ مایوس ہو کر چلی آئیں اور اس نے الہ آباد پہنچ کر لوگوں کی جاگیریں ضبط کر لیں۔ بہار کا خزانہ ۳۰ لاکھ سے زیادہ تھا وہ حاصل کر لیا اور بادشاہ بن بیٹھا۔ بادشاہ کو محبت بے حد تھی۔ مگر کہنے والوں نے حقیقت سے ہٹ کر باتیں کرنی شروع کیں۔ اور لکھنے والوں نے بھی عرضیاں بھیج کر سمجھائیں۔ مگر باپ کو ایک بات کا یقین نہ آیا تو باپ نے بھی فرمان بھیج کر صورت حال سے آگاہی حاصل کی تو ایک طولانی افسانہ بنا کر بتا دیا گیا کہ:

"میں بے گناہ ہوں اور حاضر ہو کر قدم بوسی حاصل کر لوں گا۔"

اسی دوران ابوالفضل کی کارگزاریاں بھی جاری تھیں بہادر خان اور اس کے سرداری کو خطوط لکھتے تھے ان کے خطوط کے اثرات کہیں کم کہیں زیادہ ہوتے تھے وہ اپنے پیارے شہریار کے ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ:

"دولت برج میں آ کر آرام کیا۔ اس گلشن کی چمن پیرائی راقم کے سپرد تھی۔ میں دیر تک عجز و نیاز سے شکرانے کرتا رہا۔ سعادتوں کے دروازے کھلے۔

تیرا گھر میرا منزل گاہ ہو ایسے کہاں طالع
خدا جانے کدھر کا چاند آج اے ماہر و نکلا

آسیر کی فتح

آسیر پہاڑ کے اوپر ایک عمدہ اور مستحکم قلعہ تھا جو کہ مضبوطی اور بلندی میں بے مثال تھا۔ اس کا فتح کرنا آسان کام نہ تھا اس کے پاس کی پہاڑی سا پن کہلاتی ہے۔ سرکشوں نے ہر جگہ توپوں اور سپاہیوں سے مضبوط کر رکھا تھا کو اندیش جانتے تھے کہ لوٹ نہ سکے گا۔ یہاں سے منڈیاں بھی دور تھیں قحط سے سب بے دل ہو رہے تھے اور قلعہ والوں کی زرفشانی نے اس پاس کے بہت سے لوگوں کو پھسلا لیا تھا۔

بادشاہی سردار اپنے اپنے مورچوں سے حملے کرتے تھے مگر غنیم پر ان حملوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ مگر شیخ نے ایک پہاڑ کی گھاٹی سے ایک چور

رستہ تلاش کیا کہ جہاں سے دفعتاً مالی کی دیوار کے نیچے جا کھڑے ہوں۔ بادشاہ سے عرض کر کے اجازت لی کہ جو امرا محاصرہ میں بہادری کا مظاہرہ کر رہے تھے ان سب سے مل کر قرار پایا کہ فلاں سمت میں حملہ کروں گا۔ جب نقارہ اور کرنا کی آواز بلند ہو تم بھی نقارہ بجاتے نکل پڑو کام نا کام مگر سب نے اتفاق کر لیا مگر انھوں نے اس کام کو ایک کہانی ہی تصور کیا۔

ایک رات بہت اندھیری تھی بلکہ بارش بھی سخت ہو رہی تھی۔ ابوالفضل نے خاصی سپاہ کی ٹولیاں باندھ کر پایہ بپایہ سانپ پہاڑی پر چڑھتے رہے۔ رات کا آخری حصہ تھا کہ پہلی فوج نے اسی چور رستہ سے ہو کر مالی کا دروازہ توڑ ڈالا اور بہت سے دلاور قلعے کے اندر گھس گئے اور نقارے کرنا بجانے شروع کر دیے۔ یہ سنتے ہی خود دوڑا۔ ابھی پھر پو پھٹنے والی تھی کہ تمام وہاں پہنچ گئے اور دوسری طرف سے دیوار پر ملنائیں ڈال کر سب سے پہلے آپ قلعہ پر کود پڑا۔ ان کے بعد دوسرے دلاور اور بڑے سپاہی چیونٹیوں کی طرح قطار باندھ کر دیوار پر چڑھ گئے تو تھوڑی دیر میں غنیم کا حال بدل گیا تو انھوں نے قلعہ آسیر کی راہ لی اور مالی قبضہ میں آ گیا۔ اس ناکامی کی وجہ سے بہادر خاں کی ہمت ٹوٹ گئی تو ادھر سے خبر آئی کہ:

''دانیال اور خانخاناں نے احمد نگر فتح کر لیا ہے۔''

سب سے زیادہ یہ کہ قلعہ میں بیماری پھیل گئی اور مُردوں کے ڈھیرے سڑ گئے کہ ان کو انسان و حیوان نہ کھاتے تھے۔ رعایا اور سردار سب کے جی چھوٹ گئے اور چند روزوں تک قیل و قال (بحث) ہوتی رہی تو آخر کار گھبرا کر قلعہ آسیر بھی ان کے حوالہ کر دیا گیا۔ ۱۰۰۹ھ بمطابق ۱۶۰۰ء کو یہ واقعہ رونما ہوا تھا۔

غیرت مردانہ مسلمان بہادر گجراتی کے غلاموں میں سے ایک پرانا مدّتم پڑا تھا کہ سلطان کی تباہی کے بعد ہمایوں کے آغاز سلطنت میں یہاں آن بیٹھا تھا اور قلعے کی کنجیاں اس کے سپرد تھیں مگر اب وہ نابینا ہو چکا تھا اور اس کی آنکھوں کی بینائی بالکل ختم ہو چکی تھی۔ اس کے بہت سے جوان بیٹے تھے یا سپاہی کے برج ایک ایک کے حوالے تھے اس نے سپردگی قلعہ کی خبر سنتے ہی جان خدا کے سپرد کر دی اس کے بیٹوں کی ہمت دیکھیں کہ وہ من کر روئے کہ:

''اب اس دولت کو اقبال نے جواب دیا۔ زندگی بے حیائی ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے افیون کھائی۔''

ناسک والوں نے پناہ مانگی تھی مگر امراء کی بے پروائیوں سے زور پکڑتے ہوئے بگڑ گئے اور مقدمہ ایک مہم بن گیا۔ خانخاناں کو احمد نگر اور انھیں عمدہ خلعت اور خاصے کے گھوڑے اور علم و نقارہ سے سر بلند کر کے ادھر روانہ کیا۔

ادھر تو اقبال اکبری ملک گیری اور کشور کشائی میں طلسم کاری کر رہا تھا۔ ادھر خیر اندیش لوگوں کی عرضیاں مریم مکانی کا مراسلہ آیا کہ:

''جہانگیر کھلم کھلا باغی ہو گیا ہے۔''

تو بادشاہ نے سب کام اس طرح ادھورے چھوڑے اور امرا کو خدمتیں سپرد کر کے ادھر روانہ ہو گیا۔ تا کہ اس کی سرکوبی کر سکے۔

ناسک کی مہم کی ابتداء

ناسک کی مہم شروع ہوئی تھی۔ جو انھیں حکم ملا تھا کہ احمد نگر کی طرف جا کر خاں خانخاناں کے ساتھ خدمت بجا لاؤ وہ حیران رہ گئے کہ یہاں سے دلاوروں کو سمیٹا تھا۔ ناسک کا قلعہ اور سرکشوں کی گردن توڑنا باقی تھی۔ خدا جانے جو حیلہ پرداز خدمت پر مامور تھے انھوں نے بادشاہ کی رائے کو بدل

دیا تھا یا ان کو اصل صورت حال کا علم نہ ہو سکا۔ خانخاناں کی طرفداری حد سے گزر گئی تھی کہ مجھے یہاں سے بلا لیا۔ عبدالرحمن کو مہم سپرد کر کے تعمیل حکم بجا لایا۔ یہاں پہنچے تو خان خاناں انھیں کبھی صلاح و مشورے سے رکھتے تھے کبھی کسی کی سرکوبی کو۔ کبھی کسی دوسرے کی سرکوبی کو۔ کبھی کسی دکھنی سردار کی نمائش کے لیے بھیج دیتے تھے۔ یہ دل میں تنگ تھے۔ مگر ان کی طبیعت میں یہ بات داخل تھی کہ احکام بادشاہی کو اس طرح بجا لاتے تھے گویا کہ ان کی اصل رائے یہی ہے ان کا دل عقل کا پیرو تھا اور حوصلے دریا کے ذخائر تھے تو انھوں نے یہاں بھی حکم کی تعمیل کو اپنا فرض سمجھ کر وقت کے منتظر تھے۔

مجھ راقم شکر گزار نہ کو ناسک پر بھیجا۔ رستہ میں شاہزادہ کی ملازمت حاصل کی تو انھوں نے کہا کہ:

"ہمارے حضور میں آ جاؤ۔"

تو میں نے اس کو قبول کر لیا۔ وہی راجو کی مہم تھی جس کا وبال میرے سر پر رکھنا چاہتے تھے تو میں نے جواب دیا کہ:

"حضور کے فرمانے سے انکار نہیں کرتا ہوں لیکن آپ کام پر توجہ نہیں فرماتے۔"

ایسا امر عظیم چند لالچی تنگ چشموں پر چھوڑ رکھا ہے بے پرواہی زور دتا تو ان کمتی سے ہنگامہ میں کیونکر کام ہو سکے گا؟

کارسازی کا آپ نے ذمہ لیا گھوڑا اور خلعت دے کر ادھر روانہ کیا۔ پہلی منزل میں اپنے قدم مبارک سے اعزاز بڑھایا یعنی میرے خیمہ میں آئے۔ خاص کمر کا جمدھر نامور ہاتھی بھی عنایت فرمایا۔

شیخ ابوالفضل پر عنایات کی بارش

معتمد خاں نے اقبال نامہ میں لکھا ہے کہ:

۱۰۰۹ھ بمطابق ۱۶۰۱ء میں اکبر بادشاہ نے ابوالفضل کو ۲۰ ہاتھی معہ ہتھناں اور دس گھوڑے عمدہ نسل کے بطور انعام کے عنایت فرمائے۔ ۱۰۱۰ھ میں ایک خاصہ کا گھوڑا اس کے ساتھ ایک گھوڑے عبدالرحمن جو کہ شیخ ابوالفضل کا فرزند ارجمند تھا اس کو بھی بطور انعام عطا فرمایا۔ اس کے بعد ۲۰ گھوڑے بعد میں بھی دیے ایک گھوڑے شیخ ابوالخیر کو عنایت فرمایا اور اس کے ساتھ یہ فرمایا کہ:

"شیخ کو بھیج دو۔"

اور ۱۰۱۰ھ میں بھی ان کو (شیخ ابوالفضل کو) پچاس ہزار روپے بطور انعام کے عنایت فرمایا گیا۔ ایسے انعامات تو بے شمار تھے جو کہ ان کو بروقت ملتے رہتے تھے۔ ۱۰۰۷ھ میں ہی شیخ صاحب کی پانچ ہزاری منصب بھی عنایت کیا گیا۔

شیخ ابوالفضل تین برس تک دکن میں رہے اور وہاں ان کی یہ کیفیت تھی کہ ایک ہاتھ میں شمشیر و علم تھا تو دوسرے ہاتھ میں کاغذ و قلم ہوا۔

رمضان المبارک ۱۰۱۰ھ میں وہیں اکبر نامہ کی جلد سوم بھی مکمل ہوئی اور اس کا خاتمہ تصنیفات عمل میں آیا

شیخ ابوالفضل اکبر اعظم کے سامنے ایک ارسطو کی حیثیت رکھتے تھے اس نے اپنے سکندر (اکبر) کے دل پر یہ نقش کر رکھا تھا کہ:

"فدوی حضور کی ذات قدسی سے غرض رکھتا ہے اور یہ امر واقعی تھا کیونکہ وہ کہا کرتا تھا کہ:

آپ کی تیز طبعی اور ہوا خواہی اور جاں نثاری میرا دین و ایمان ہے۔ جس کی بات ہوگی بے رو رعایت عرض کر دوں گا۔ امرا بلکہ شاہزادوں سے بھی کوئی غرض نہیں رکھتا ہوں، اور چونکہ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا۔ اس لیے اکبر کے دل پر یہ نقش ہو چکا تھا۔

شہزادہ سلیم ابوالفضل کو چغل خور سمجھتا تھا اور اس وجہ سے ہمیشہ اس سے ناراض رہتا تھا۔ اکبر نے مہم دکن سے واپسی پر سلیم (جہانگیر) کے ساتھ ظاہری صورت حال کو درست کر لیا تھا۔ ۱۰۱۱ھ بمطابق ۱۶۰۲ء کو سلیم نے پھر سلامت روی راستے ترک کر دیا اور وہ ایسا بگڑا کہ:

"بادشاہ اکبر بہت گھبرا گیا کیونکہ یہ بھی خیال تھا کہ ہونہار شہزادہ کو ولی عہد سلطنت خیال کر کے امرا ضرور سازش کرتے ہوں گے۔"

مان سنگھ کی ہمشیرہ اس کے عقد میں تھی جس کے بطن سے خسرو شاہزادہ پیدا ہوا تھا اور خان اعظم کی بیٹی خسرو سے بیاہی ہوئی تھی۔ غرض بادشاہ نے ابوالفضل کو لکھا تھا کہ:

"مہم کے کاروبار عبدالرحمٰن فرزند کے حوالے کر کے آپ فوری طور پر یہاں آجاؤ۔"

ابوالفضل نے اس کے جواب میں نہایت اطمینان اور تسلی کے ساتھ عرضی بھیجی اور لکھا کہ:

"فضل الٰہی اور اقبال اکبرشاہی کارسازی کرے گا۔ کوئی فکر کا مقام نہیں ہے فدوی حاضر خدمت ہو رہا ہے۔"

چنانچہ ابوالفضل نے احمد نگر میں عبدالرحمٰن کو مہم کا تمام کاروبار سمجھا کر لشکر اور سامان وہیں چھوڑا اور خود فقط ان آدمیوں کے ساتھ لے کر اکبر بادشاہ کی طرف روانہ ہوا چونکہ سلیم شہزادہ (جہانگیر) شیخ ابوالفضل سے بہت خفا تھا وہ یہ بھی جانتا تھا کہ:

"اگر یہ اکبر کے حضور میں پہنچ تو باپ کی آزردگی میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔"

تو اس نے ادھر ادھر کے سرداروں اور راجاؤں سے ساز باز کر کے ایسی تدابیر کرے گا کہ:

"میرا کام خراب ہو جائے گا۔"

چنانچہ جب اس کو اس کی روانگی کا علم ہوا تو اس نے۔

شیخ ابوالفضل کی ہلاکت بے موقع

چونکہ شیخ ابوالفضل اپنے شہنشاہ اکبر سے ہی غرض رکھتا تھا اور کسی دوسرے کی پرواہ نہ کرتا تھا۔ اسی طرح اکبر بادشاہ بھی شیخ ابوالفضل کا بہت ہی خیال رکھتا تھا۔ دونوں میں خلوص، محبت اور ادب و احترام کا دور دورہ تھا۔ مگر اکبر کا شہزادہ سلیم کردار کے لحاظ سے تسلی بخش نہ تھا تو ابوالفضل جو کچھ بھی دیکھتا یا سنتا تھا۔ وہ بادشاہ اکبر کے نوٹس میں لے آتا تھا۔ جس کا علم شہزادہ سلیم کو بھی ہو جاتا تھا۔ کیونکہ شہزادے کی دوستی کے لیے اس سے باز پرس کرتا ہوگا تو سلیم شہزادہ باپ کو تو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس کا غصہ اور ناراضگی شیخ ابوالفضل کے لیے جمع ہوتی رہتی تھی۔ تو آخر جب بادشاہ اکبر نے احمد نگر سے شیخ ابوالفضل کو اپنے پاس بلایا تو شہزادہ سلیم کے دل میں اس کے بارے میں کدورت ضرور تھی اور اس کدورت کو نکالنے کا منتظر تھا آخر کار اس کو جب اس کی واپسی کا علم ہوا تو اس نے (سلیم شہزادہ) تو راجہ مدھکر کا بیٹا راجہ نرسنگھ دیو جو کہ اوڑچہ کا بندیلہ سردار تھا۔ وہ ان دنوں میں ڈاکے اور رہزنی

کیا کرتا تھا اور اس طرح اپنے دل کا قاتھ تھا اور اس بغاوت میں وہ شہزادے کے ہمراہ تھا۔ اسے شہزادے سلیم نے خفیہ طور پر خط لکھا کہ:

''کسی طرح راستہ میں شیخ ابوالفضل کا کام تمام کر دو۔ اگر خدا تعالیٰ میرے نصیب میں تخت کر دیا تو خاطر خواہ رتبہ اور انعام سے سرفراز کروں گا۔ اس نے دربار شاہی میں بہت بے عزتی اٹھائی تھی۔''

اس لیے اس نے بخوشی اس کام کو قبول کر لیا اور جلدی سے وہ اپنے علاقے میں چلا گیا تو جب شیخ اجین مقام پر پہنچا تو خبر اڑادی کہ راجہ مدھکر اس مقصد کے لیے ادھر آیا ہوا ہے۔ رفیقان جاں نثار نے شیخ ابوالفضل سے کہا کہ:

''ہماری جمعیت کم ہے اگر یہ خبر سچی ہے تو ہمارا مقابلہ کرنا مشکل ہو جائے۔ بہتر یہ ہے کہ اس راستہ کو چھوڑ کر چاندہ کی گھاٹی سے چلیں۔ یعنی راستے بدل دیں تو بہتر ہے۔''

مگر اس کی تقدیر پہنچ چکی تھی تو شیخ ابوالفضل نے بڑی بے پرواہی سے کہا کہ:

''لوگ صرف بکتے ہیں۔ چور کا کیا حوصلہ ہے کہ وہ بندگان شاہی کا راستہ روکے۔''

اصل میں شیخ ابوالفضل اندرونی خفیہ سازشوں سے ناواقف تھا۔ اس کو قدرت کی مدد کا تو علم تھا مگر شہزادے سلیم کی کارستانیوں کا علم نہ تھا کہ اس کا ہاتھ کارفرما ہے۔ لہٰذا شیخ ابوالفضل نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے رفقاء کی بات پر کان نہ دھرا اور اسی راستے پر رواں دواں رہے۔

ربیع الاول کی پہلی تاریخ ۱۰۱۱ھ جمعہ کا دن کا وقت تھا کہ شیخ منزل سے اٹھا صرف دو تین آدمی ہمراہ تھے۔ باگ ڈھیلے اور جنگل کا لطف اٹھاتے ہوئے صبح کی ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہوتا ہوا گفتگو میں مصروف آگے بڑھتا جا رہا تھا کہ وہ ابھی ''سرائے برا'' سے آدھ کوس دور رہا تھا اور قصبہ انتری ۳ کوس کے فاصلے پر تھا اور سوار نے دوڑ کر عرض کی کہ:

''وہ گرد و غبار اٹھا ہے اور اس کا رخ بھی ہماری طرف ہی ہے۔''

یہ سن کر شیخ ابوالفضل نے گھوڑے کی باگ روکی اور غور سے گرد کی طرف دیکھا گدائی خان افغان قدیمی جاں نثار پر یہ تھا۔ اس نے عرض کی کہ:

''ٹھہرنے کا وقت نہیں ہے دشمن بڑے زور سے آتا معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے پاس جمعیت بھی کم ہے۔ مقابلہ مشکل ہوگا اس وقت صلاح یہی ہے کہ تم آہستہ آہستہ چلے جاؤ میں ان چند بھائیوں کے ہمراہیوں سے جانفشانی کر کے روکتا ہوں۔ ہمارے مارتے مرتے تک فرصت بہت ہے اور یہاں سے قصبہ انتری دو تین کوس ہوگا آپ بخوبی پہنچ جائیں گے وہاں کوئی خطرہ نہیں ہوگا اور رائے رایاں اور راجہ راج سنگھ وہاں دو تین ہزار جمعیت کے ساتھ ٹھہرے ہوئے ہیں تو شیخ نے کہا کہ:

''گدائی خاں تجھ جیسے شخص سے تعجب ہے کہ ایسے وقت پر یہ صلاح دیتے ہو۔ جلال الدین اکبر بادشاہ نے مجھ فقیر زادے کو گوشہ مسجد سے نکال کر صدر مسند پر بٹھایا۔ میں آج اس کی شناخت کو خاک میں ملا دوں اور اس چور کے آگے سے بھاگ جاؤں کس منہ سے؟ اور کس عزت سے ہم چشموں میں بیٹھوں گا؟ اگر زندگی ہو چکی ہے تو قسمت میں مرنا ہی لکھا ہے تو پھر کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا؟

یہ کہہ کر شیخ ابوالفضل نے نہایت دلاوری اور بے باکی سے گھوڑا لیا مگر گدائی خاں پھر گھوڑا مار کر آگے آیا اور کہا کہ:

"سپاہیوں کو ایسے معرکے بہت آتے ہیں اڑنے کا وقت نہیں ہے ابتری میں جانا اور ان لوگوں کے ساتھ لے کر پھر ان پر آنا اور اپنا انتقام لینا تو سپاہیانہ پیچ ہے۔"

شیخ ابوالفضل کی تقدیر پیچ پیچ تھی مگر وہ کسی بھی بات پر راضی نہ ہوا۔ ابھی یہ باتیں کر رہے تھے کہ غنیم پہنچ گیا اور اس نے آتے ہی حملہ کر دیا۔ شیخ ابوالفضل بڑی بہادری اور دلیری سے مقابلہ کرتا رہا۔ اس کے ساتھ چند افغان جو تھے انھوں نے اپنی جانیں قربان کر دیں مگر شیخ نے بھی کئی زخم کھائے۔ مگر ایک آخری زخم بڑا گہرا لگا تو وہ زخم کھا کر گھوڑے سے نیچے گرا۔ جب لڑائی ختم ہوئی تو لاشوں کی تلاش ہوئی تو دیکھا کہ:

دلاور جو کبھی اکبری تخت کا پایہ پکڑ کر عرض و معروض کرتا تھا اور کبھی سمندر فکر پر چڑھ کر عالم خیال کو تسخیر کرتا تھا وہ ایک درخت کے نیچے خاک بے کسی میں پڑا ہوا ہے۔ زخموں سے خون بہہ رہا ہے اور ادھر ادھر لاشے بکھرے پڑے ہیں۔ اس وقت اس کا سر کاٹ لیا اور شاہزادے سلیم کے پاس بھجوا دیا۔ شاہزادے نے پاخانہ میں رکھوا دیا۔ کئی دنوں تک وہیں سڑتا رہا۔ شاید اس کی قسمت میں ایسا نوشتہ تھا۔ ورنہ شہزادے کی ناراضگی کیسی ہی سخت ہو کہہ دیتا تھا۔

"خبردار شیخ کا بال بیگانہ ہو اور شرط یہ ہے کہ اس کو زندہ ہمارے سامنے نہیں ہو۔" مگر شرابی اور کبابی نا تجربہ کار لڑکے کو اتنا ہوش و حواس کہاں ہے؟ کہ جو وہ سمجھتا کہ جتنے ہر وقت اختیار ہوتا ہے میری گیا تو کیا ہو سکتا تھا؟ مگر امرائے اکبری کے خلوص کا حال اس قصے سے کھلتا ہے اور کشتاش خاں نے تاریخ وفات لکھی تھی اور اس نے یہ مصرعہ پڑھا کہ:

"شیخ اعجاز نبی اللہ سر باغی برید"

شہزادہ سلیم نے خود بھی خواب دیکھا اور اس نے کہا کہ:

"میری تاریخ تو شیخ ابوالفضل کے اعداد سے نکلتی ہے۔"

افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ اس وقت ملا ئے بدایونی اس وقت زندہ نہ تھے ورنہ وہ خوشیوں کے نقارے بجاتے تھے اور مٹھائیاں تقسیم کرتے اور طرح طرح کے مضامین لکھ کر دل کی بھڑاس نکالتے۔ جہانگیر جس طرح ہر بات لاپرواہی سے کرتا تھا ایسے لاپرواہی سے اپنی تزک میں لکھ بھی لیتا تھا۔

شاہزادے سلیم نے شیخ ابوالفضل کو ہلاک کروا کر ایک بہت بڑا انسانی ظلم کیا اور اپنے والد کے اہم درباری سے محروم کر دیا۔ وہ بہت ہی سمجھدار، دانشمند اور مخلص درباری تھا۔ بادشاہ نے اس کے لیے کام سے خوش ہو کر کئی مرتبہ عنایات و انعامات عطا فرمائے۔ وہ اپنے آقا سے بہت ہی مخلص اور وفادار آدمی تھا۔ گویا کہ در پردہ سلیم شہزادے نے اپنے آپ کا بھی نقصان کیا کیونکہ جب وہ مسند حکومت پر براجمان ہوا تو شیخ ابوالفضل زندہ ہوتا تو وہ بھی اس کے تجربے، علم و فنون سے فائدہ حاصل کرتا۔ بہر حال ہر انسان نے ایک دن اس دار فانی سے رخصت ہونا ہے۔ اب گھر آ کر شیخ ابوالفضل کا شہزادہ سلیم کو قتل کا ذمہ دار قرار دیا گیا تھا۔

شیخ ابوالفضل کی ہلاکت پر اکبر بادشاہ کا سوگ

جب اکبر بادشاہ کے پاس شیخ ابوالفضل کے ہلاک ہونے کی خبر بے موقع پر پہنچی تو اس پر سناٹا چھا گیا اور تمام درباری بھی حیران و پریشان

رہ گئے مگر کوئی کو بھی بادشاہ کو یہ عرض کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی کیونکہ اکبر خود جانتا تھا کہ:

''وہی میرا ایک ذاتی خیر اندیش تھا اور ان میں کوئی امیر دل سے ان کا خیر خواہ نہیں۔ خدا جانے اکبر بادشاہ کے دل میں میں کیا گزرے؟ اور کس پر اپنا غصہ نکالے۔''

یہاں پر وضاحت طلب بات یہ ہے کہ تیمور خاندان میں یہ دستور قدیمی چلا آ رہا تھا کہ:

جب کوئی شہزادہ فوت ہو جاتا تھا تو اس کی خبر بادشاہ کے سامنے صاف بے دھڑک انداز میں نہ بتائی جاتی تھی بلکہ اس کا وکیل (بادشاہ کا) سیاہ رومال اپنے ہاتھ پر باندھ کر بادشاہ کے سامنے آ جاتا تھا اور خاموش کھڑا رہتا تھا۔ جس کے معنی یہی ہوتے تھے کہ:

''اس کے آقا نے انتقال کیا ہے۔''

اور اکبر بادشاہ خود بخود دیکھ جاتا تھا۔

مگر یہاں معاملہ تو اولاد یا شہزادے کا نہ تھا ایک درباری کا معاملہ تھا مگر درباری بھی بڑی اہمیت کا حامل فرد تھا۔ وہ درباری اکبر بادشاہ کو اپنی اولاد سے بھی زیادہ عزیز اور پیارا تھا کیونکہ وہ ملکی اور سلطنت کے معاملات میں بڑا ہی مددگار اور دانشور تھا۔ اس لیے بادشاہ کا وکیل شیخ ابوالفضل کی ہلاکت کی خبر دینے کے لیے اپنے ہاتھ پر سیاہ رومال باندھے آہستہ آہستہ ڈرتے ڈرتے تخت کی طرف آیا۔ جس کو دیکھ کر اکبر بادشاہ پر اپنی حیرانی ظاہر ہوگئی تو اکبر نے سیاہ رومال دیکھ کر کہا کہ:

''خیر باشد کیا ہوا؟''

تو بادشاہ کے وکیل نے وضاحت کی تو اکبر بادشاہ بڑا ہی غمگین اور افسردہ ہو گیا۔ اس پر اس قدر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا کہ کبھی بھی اپنے شہزادے کی موت پر بھی اس قدر غم نہ ہوا ہوگا۔ اکبر کے افسوس یا سوگ کا یہ حال تھا کہ:

اکبر بادشاہ نے شیخ ابوالفضل کے سوگ میں کئی دنوں تک دربار نہ کیا۔ اور اس نے کسی امیر سے بات نہ کی۔ صرف افسوس کرتا تھا۔ اور ظاہری طور پر اور دلی طور پر آنسوؤں سے گھونٹ بھرتا تھا۔ بار بار اپنی چھاتی پر ہاتھ مارتا اور پیٹتا تھا اور اکبر بادشاہ یہ کہتا تھا کہ:

''ہائے شیخو جی! بادشاہت لینی تھی تو مجھے مارنا تھا مگر شیخ ابوالفضل کو کیا مارنا تھا۔''

اس کی سر کٹی لاش آئی تو اکبر بادشاہ نے یہ شعر پڑھا کہ:

شیخ ما از شوق بے حد چوں سوئے ما آمدہ
ز اشتیاق پائے بوسی بے سر و پا آمدہ

ترجمہ: ''اے شیخ تم کس طرح شوق و محبت سے میری طرف آئے تھے اور اب بغیر سر کے میری قدم بوسی کے لیے آئے ہو۔''

شیخ ابوالفضل کی عمر ۵۲ سال کی تھی جو کہ بڑھاپا شمار نہیں ہوتا تھا۔ صحت مند انسان تھے اور بڑے عالم و فاضل تھے مگر یہ حقیقت سب پر عیاں ہے کہ موت اور قضا یہ کچھ بھی نہیں دیکھتی اور نہ کسی کا انتظار ہی کرتی ہے۔ جب بھی وقت مقررہ آ جائے وہی اس کا حکم اٹل ہے۔ شیخ ابوالفضل تو اشتری

کے مقام پر دفن کیا گیا تھا جو کہ گوالیار کے قریب پانچ چھ کوس کے فاصلے پر واقع ایک گاؤں تھا چونکہ مہاراجہ سیندھیا کا علاقہ تھا۔اس پر ایک غریبانہ طرف کی عمارت بنائی گئی ہے۔ابوالفضل نے اپنے باپ اور ماں کی ہڈیاں لاہور سے آگرہ پہنچائی تھیں اور اس نے اپنے والدین کی وصیت کو پورا کر دیا مگر افسوس کا مقام ہے کہ اپنی لاش کو سنبھالنے اور دفن کرنے والا کوئی نہ تھا۔کیونکہ اس کا یہ موت کا سانحہ ایسی حالت میں ہوا کہ نہ تو اس کو خود ہی اس کا علم ہو سکا اور اس کے کسی حواری یا ساتھی دوست کو ہی اس کے بارے میں کوئی علم ہوا۔یہ ناگہانی تقدیری موت تھی جس نے اس کو اچانک ہی ویرانے میں آگھیرا اور اس کا کام تمام ہو گیا۔جس کی وجہ سے اس کا سر بھی کاٹ گیا اور اس قدر اس کو ذلت کی موت نصیب ہوئی۔مصنف کا خیال ہے کہ ہمارے بادشاہوں اور شہنشاہوں کے لیے یا ان کے شاہزادوں کے لیے ایسے افراد کا بے جا قتل کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔تخت کے حصول کے لیے وہ اپنے خونی بھائیوں کے سامنے سینہ سپر ہو گئے تھے اور اپنے تیغ کو فارغ نہ کرتے تھے۔جب ان کا جی بغاوت پر اتر آتا تھا تو ان کے جذبات اور تخت نشینی کی ہوس کو کوئی بھی قابو نہیں کر سکتا تھا اور اس وقت شہزادہ اپنی جان کی پرواہ کرتے تھے اور نہ دوسروں کا ہی کوئی خیال واحساس ہوتا تھا۔تو شیخ ابوالفضل تو محض ایک درباری ہی تھا اگرچہ اکبر بادشاہ کے لیے بڑا ہی عزیز اور مددگار تھا۔ساری حکومت کے امور کو سنبھالے ہوئے تھا اور بڑا ہی عالم و فاضل شخص تھا۔اس کا قتل شہزادہ سلیم کے لیے ایک چیونٹی کے مارنے کے برابر بھی نہ تھا۔اس کے پاس جب سر لایا گیا تو اس نے اس سر کو نفرت کے ساتھ اپنے غسل خانہ میں پھینکوا دیا تا کہ وہاں کئی دنوں تک سڑتا رہے اور نہ معلوم کتنے دنوں کے بعد کس حالت میں وہاں سے اٹھایا گیا ہوگا۔

شیخ ابوالفضل کے دل کی روشنی اور نیک نیتی کی برکت کا یہ حال ہے کہ آج تک لوگ انتری میں ہر جمعرات کو وہاں ہزاروں کی تعداد میں چراغ روشن کرتے ہیں اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں یعنی منتیں مانگتے ہیں۔بس اب ایک اہم منظر غیب ہو گیا۔شیخ مبارک کا فرزند دار البقا میں چلا گیا مگر اکبر بادشاہ نے اس کے بیٹے کو ابھی کچھ نہ کیا۔بیٹے سے پوچھنے کی بھی جرأت نہ ہوئی ہوگی۔

اکبر بادشاہ کا ردعمل

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مسلمانوں کی سلطنت کی تبدیلی کا نظام کامل ستائش نہیں رہا ہے جس کی وجہ سے ان میں باپ کے مرجانے کے بعد جنگ و جدل کا نظام جاری رہتا تھا جس میں بھاری نقصان فریقین کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔گو یا بادشاہ وقت اپنے بیٹوں میں سے جس کسی کو وہ اس قابل سمجھتا تھا وہ جانشین مقرر کرنے کے اہل نہ ہوتے ہوں گے۔اس کی ایک وجہ تو یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مسلمان بادشاہوں کی بے شمار بیویاں ہوتی تھیں اور ہر ایک کی محبت اور چاہت میں بھی فرق ہوگا۔بادشاہ کے بشری تقاضوں کے پیش نظر اس عالم سب کو اپنی جگہ پر خوش اور مطمئن رکھنا ضروری ہوتا تھا۔تو ہر ایک بیگم کی اپنی خواہش اور تمنا ہوتی ہوگی کہ میرا بیٹا بادشاہ اپنا جانشین بنائے تو دوسری کا بھی یہی مطالبہ ہوتا ہوگا جس کی وجہ سے بادشاہ کسی بھی فیصلے پر نہ پہنچ سکتا ہوگا۔

دوسرے چونکہ بادشاہوں کی بیویاں زیادہ ہونے کی وجہ سے اولاد بھی افراد سے ہوتی تھی اور ان کی ماضی میں سلطنت بھی ایسی طرح وسیع اور عریض ہوتی تھی جس کی وجہ سے سلطنت کا نظام سنبھالنے کے لیے بادشاہ وقت کی بڑی ہی قلت ہوتی تھی اور اولاد پر کوئی خاص توجہ نہ دے پاتے ہوں گے۔تا کہ ان پر مناسب توجہ دے کر اپنے سب سے بڑے بیٹے یا کسی دوسرے لائق و فائق کو وارث یا جانشین قرار دیں اور اس کے بیٹے کوئی

واضح اصول وقانون وضع کریں۔

جس کی وجہ سے ان میں اکثر لڑائیوں پر فیصلہ خاص طور پر ہندوستان اور عربوں میں بھی خاندان امیہ اور عباسیہ میں ایسا ہی ہوتا نظر آتا ہے جو کہ افسوس ناک بات ہے۔

تو شیخ ابوالفضل کا بھی یہ موت کا سانحہ بھی ایسا ہی واقعات کا شاخسانہ ہے۔ جس پر جتنا بھی تاسف کیا جائے کم ہے۔ کیونکہ ایک تو بادشاہ کا بہت ہی مخلص اور نیک نیت اور وفادار مددگار درباری تھا۔ وہ بہت ہی مخلص اور عمدہ مشورے دیتا تھا جس کی وجہ سے حکومت کا انتظام بخیر وخوبی جاری و ساری تھا۔ دوسرے وہ اس حالت میں بے گناہ تھا۔ شہزادے کا محض اس وجہ سے اس کا قتل کرنا کہ وہ اس کی باپ کے سامنے چغلیاں لگاتا ہے۔ اس کی بری حرکات کا انکشاف کرتا ہے۔ اس کے جرم میں قتل کرنا کوئی بات نہیں ہے۔ شہزادے باپ کی پرستش پر اس سے معافی بھی مانگ سکتا تھا اور اپنی اصلاح بھی کر سکتا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی مستقبل کی زندگی بہتر ہو سکتی تھی۔ مگر اس نے تو جوانی میں یہ برا عمل کر دکھایا جو کہ اس کی زندگی میں اس کی شخصیت پر ایک دھبا ہمیشہ کے لیے قائم رہے گا۔

اب اکبر بادشاہ کا اس قتل کے بدلے میں کیا رد عمل ہوا۔ وہ تو بڑا ہی بے بس نظر آتا ہے۔ واضح ہوتا ہے کہ اتنی وسیع سلطنت کا مالک اپنی اولاد کے ہاتھوں مجبور تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اس ہمدرد اور مخلص درباری کے قتل کے قصاص کے لیے بھی کچھ نہ کر سکا۔ تو اکبر بادشاہ نے صرف رائے رایاں کو فوج دے کر نرسنگھ دیو کو اس کی بداعمالی کی سزا دینے کے لیے بھیجا اور شیخ ابوالفضل کے بیٹے شیخ عبدالرحمن کو فرمان لکھا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ:

> ''تم اس کے ساتھ شامل خدمت رہو اور باپ کی کینہ خواہی اور انتقام سے اپنی حلال زادگی اہل علم پر آشکارہ کرو اور یہ دونوں مدت تک پہاڑوں میں مارے مارے پھرتے رہے مگر نرسنگھ دیو ان کو کہیں نظر نہ آیا۔ وہ اپنے مشاغل میں مصروف ان سے دور رہا۔''

اور یہ بےچارے بادشاہ کے حکم کی تعمیل میں جنگل کی خاک چھانتے پھرتے وقت گزارتے رہے۔ بادشاہ کو حقیقت حال کا بھی علم ہو گیا تھا کہ نرسنگھ دیو نے اپنی کسی غرض سے شیخ ابوالفضل کو قتل نہیں کیا تھا کہ اس کا اصل محرک تو بادشاہ کا شہزادہ سلیم (جہانگیر) تھا۔ جس نے خاص وجہ سے شیخ ابوالفضل کو قتل کروایا تھا۔ تو بادشاہ کا فرض تو یہ تھا کہ شہزادے کو طلب کرتا اور بے شک بڑی محبت اور نرمی سے ہی اس سے باز پرس کرتے اور اس سے مطالبہ کرتے کہ وہ نرسنگھ دیو کو بادشاہ کے سامنے انصاف کے لیے پیش کرے تو شاید نتائج مختلف ہوتے۔ مگر ایسا تو بادشاہ نے سوچا بھی نہیں تھا کیونکہ بادشاہ کے پاس بھی صرف ایک ہی بہرہ شہزادہ سلیم (جہانگیر) ہی تھا جس کو اس نے جانشین مقرر کرانا تھا۔

دوسرے ممکن ہے کہ بادشاہ بھی بیٹے سے خائف ہو کر شاید مجھے بھی کہیں قتل نہ کروا دے۔ لہٰذا ایسے خیالوں میں ہاتھ ہی نہ ڈالو وغیرہ وغیرہ۔

رائے رایاں اور عبدالرحمن جنگلوں میں گھومتے پھرتے رہے اور نرسنگھ دیو کو بھی ان کی آمد کا علم ہو چکا تھا تو وہ ان سے روپوش رہا۔ شیخ ابوالفضل نے یہ درست کہا تھا کہ:

"تر شدہ یہ تو بڑی بات ہے وہ کسی طرح جرم کر نہیں لڑتا۔"

آخر یہ دونوں گھوم پھر کر جنگلوں سے واپس اکبر بادشاہ کے پاس واپس آگئے اور انھوں نے ایلچی نائک کا قصہ اس کو بیان کر دیا ہوگا۔ اب مورخین نے بڑے افسوس کے ساتھ لکھا ہے کہ:

جو فضل و کمال مغلیہ خاندان کے دربار میں فضل اور فیضی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوا۔ اتنے بھائی اور عبدالرحمٰن اکلوتا بیٹا تھا سب خالی رہ گئے۔ اب اکبر بادشاہ کا دربار ایک مخلص اور وفادار درباری سے خالی ہو گیا اور اکبر بھی بیربل کے بعد شیخ ابوالفضل کی نیک تمناؤں اور مشاورت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا۔ جس کی وجہ سے اس کی حکومت میں دھیرے دھیرے زوال پذیری نے اپنے قدم جما لیے اور مغلیہ سلطنت کا ایسٹ انڈیا کمپنی نے آ کر خاتمہ کر دیا تھا تو یہ اس زمانے کے بادشاہوں کی غلط پالیسیوں کے نتائج کی وجہ سے ہوا کرتا تھا۔ جس کے نتائج بھی انہی لوگوں کے ذمہ میں آئے تھے۔

شیخ ابوالفضل کا مذہب

مورخین نے شیخ ابوالفضل کے مذہب کا پتہ لگانے کے لیے اس کے باپ شیخ مبارک سے تعلق قائم کیا ہے کہ اس کے باپ کا مذہب کیا تھا؟ کیونکہ ابوالفضل شیخ مبارک کا فرزند تھا...... تھا تو یہ عام لوگوں کی قیاس آرائی یہ بنی ہے کہ باپ کے نقش قدم پر ہی بیٹا بھی گامزن ہوگا اور باپ کے مذہب کو بھی وہ بھی اختیار کرے گا مگر یہ بھی ضروری امر نہیں ہو سکتا۔ یہی ہوا کہ زمانہ کی آب و ہوا سے ذرا ان کے مذہب اور باپ کے مذہب میں قدرے فرق نظر آتا ہے کیونکہ شیخ مبارک ایک فاضل ہمہ دان تھا۔ اور اس کا دماغ بھی روشن تھا۔ جس سے ہزاروں چراغ روشن ہوئے۔ دنیا میں مدارس کے ذریعے روشنی پھیلی۔ ان سے کامل اساتذہ سے علم کے سرمایہ کو ذہن میں محفوظ کیا تھا۔ خود بھی اس نے علم محنت سے حاصل کیا اور دوسروں کو بھی محنت سے علم دیا۔ اس کی نظر تمام علوم عقلی و نقلی پر برابر چھائی ہوتی تھی۔ باوجود اس کے جو کچھ دل کو حاصل ہو گیا تھا۔

وہ کتابوں کے الفاظ و عبارت میں محدود نہ تھا۔ اور بات وہی تھی جو اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

اکبر کے عہد حکومت میں بے شمار عالم تھے وہ کتابی علوم میں ماہر تھے یا ماہر نہ تھے یہ ایک دیگر بحث کا حصہ ہے۔ مگر ان کے مقدر بڑے اعلیٰ پایہ کے ہوتے تھے جس کی بدولت وہ دربار شاہی میں شیخ مرشاہی بلکہ خدائی (نعوذ باللہ) اختیار کر لیتے تھے۔ ان کے ہاتھ کی مٹھی میں تر اور انگلیاں رزق کی کنجیاں دیکھ کر بہت سے علمائے مسند نشین اور مشائخ اور آئمہ مساجد ان کے اردگرد بیٹھے ان کی ستائش ہی کرتے رہتے تھے اور ہر دم ان کی ہی توصیف و تعریف ان کا کام تھا۔ یہ کام تو اب بھی جاری ہے مگر اس وقت زیادہ ہوگا۔ مگر شیخ مبارک دربار شاہی کا ہو سا ک تو نہ تھا کیونکہ جب وہ اپنی مسجد کے چبوترے بیٹھتا تھا تو اس کے سامنے طالب علم پڑھنے کے لیے آتے تو اس کا دل ایسا باغ باغ ہو جاتا تھا کہ جس طرح بلبل پھولوں کو دیکھ کر خوش ہو جاتی ہے۔

مورخین نے یہ بھی اس کے دل کی تصویر کھینچی ہے کہ شیخ مبارک کا دل بادشاہوں کے دربار و امراؤ سرکار کی طرف اس کا شوق کا قدم اٹھتا ہی نہ تھا۔ یعنی وہ اس قسم کا آدمی ہی نہ تھا۔ البتہ جب کسی تقریب پر علمائے مذکور اختیار جابرانہ اور فتووں کے زور سے ظلم کرتے تھے تو وہ التجا اس کے

پاس لاتے تو اسے آیات اور روایات سے سپرد و تیار کر دیتے تھے جس کی اس کی جان جاتی اور وہ وہاں پاتا تھا۔ وہ اس بات میں کسی کی پرواہ بھی نہ کرتا تھا۔ مگران لوگوں کو بھی خبر ہو جاتی تھی کہ یہ کس شخص نے یہ سپرد (پناہ) کا کام کر کے دیا ہے اور یہ شخص ظلم سے رہائی پا گیا ہے؟ تو وہ شاہی علماء اپنے جلسوں اور مجالس میں اس کا ذرا چرچا کھلم کھلا کرتے تھے اور کبھی شیخ مبارک کو رافضی یا مہدوی ٹھہرا دیتے تھے اور اس جرم کی سزا اس دور میں قتل ہی ہوتی تھی۔ لیکن اس کی فضیلت اور حقیقت کا تقاضا تھا کہ وہ ہنس کر ٹال دیتا تھا اور وہ کہتا تھا کہ:

"یہ ہیں کون اور کیا ہیں اور اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں؟ کبھی گفتگو کا وقت آیا تو اس کو اچھی طرح سمجھائیں گے۔"

شیخ مبارک کو اس انداز زندگی نے کئی مرتبہ سخت خطرات اور مشکلات میں بھی مبتلا کیا مگر وہ ان مصائب کو بڑے تحمل اور بردباری سے ہنسی سے گزارتا رہا۔ ایشیا کے مروجہ مذاہب خصوصی طور پر فرقہ ہائے اسلام کی کتابوں پر اس کی معلومات بڑی روشن تھیں اور دشمنوں کی ایذا اور آزار عام دیکھ کر کتب متفرقہ کو اور نظر سے دیکھنے لگا۔ اب کوئی مسئلہ اختلافی آتا فوری طور پر کتابی حوالوں سے حریفوں کی حرفت کو بند کر دیتا یا اختلافی مسئلہ دکھا کر ایسا شبہ پیدا کر دیتا کہ وہ تنگ ہو کر رہ جاتے اور وہ منہ سے کچھ نہ بولتے بلکہ شرمندہ بھی ہو جاتے تھے۔ مگر جو کچھ وہ کہتا تھا وہ سوچ سمجھ کر کہتا تھا اور حق بات کہتا تھا اور اصلیت کی بنیاد پر کہتا تھا کیونکہ رقیبوں کے فتوؤں میں شاہ نہ دور ہوتا تھا۔ اگر یہ شخص حق پر نہ ہوتا تو اس کی جان کو خطرہ لاحق ہو جاتا تھا۔

ہمایوں، شیر شاہ اور سلیم شاہ کے دور اقتدار میں ان لوگوں کی خدائی (نعوذ باللہ) قائم تھی بلکہ اکبر کے دور حکومت میں بھی کچھ عرصہ تک ان کا یہی حال رہا۔ مگر اکبر بادشاہ نوجوان اور سمجھدار بادشاہ تھا اس نے اپنی سلطنت کو وسیع کرنے کا خیال ذہن میں سمویا اور خیال کیا کہ اس کی حکومت پورے ہندوستان پر چھائی جانی چاہیے اور چونکہ ہندوستان میں مختلف مختلف قسم کے لوگ اور ان کی مختلف اقوام اور مذاہب تھے۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ پہلے ان کے ساتھ محبت اور حسن سلوک کا مظاہرہ کرے وہ اپنے ان مقاصد میں کامیاب بھی ہو گیا مگر علماء ہند اس کے اس رویے کو پسند نہ کرتے تھے۔ اور وہ اس رستہ پر چلنے کو کفر تصور کرتے تھے لہٰذا اس نے خیال کیا کہ اپنے طریقے کے مطابق علماء کو حاصل کیا جائے تاکہ وہ اس میں اس کی مدد اور رہنمائی کریں تو اس کا مشن آگے بڑھے تو اس وقت شیخ مبارک کے بیٹے فیضی اور ابوالفضل بڑے عالم تھے اور تمام نوجوان بھی تھے اور وہ ہمہ رنگ طبیعت کے مالک بھی تھے تو اس نے ان دوستوں کو اپنے دربار میں خدمات سے انجام دینے کی دعوت دی تو انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے اکبر کی توقعات سے بڑھ کر خدمات سرانجام دیں۔ انھوں نے سلطنت کا دستور العمل مرتب کیا اور اس انداز اور طریقے کا دستور العمل مرتب کیا کہ خدا رب العالمین اور فلاح کا آسودہ و آبادکرنے والا ہے۔ ہندو، مسلم، گبر و ترسا اس کے نزدیک سب برابر قرار پائے۔ بادشاہ سایہ خدا ہے۔ اسے بھی یہی بات مدنظر رکھنی واجب ہے۔ اس چھوٹے سے نکتے سے کئی باتیں ظاہر ہوئیں اور سلطنت کی بنیاد مستحکم ہو گئی۔ اور ان لوگوں کو بادشاہ سلامت (اکبر) کی قربت حاصل ہوئی اور اس نے بھی ان کو دربار میں اعلیٰ مقام عطا فرمایا۔ جن لوگوں سے شیخ مبارک کو اس کے بیٹوں کو خطرات لاحق تھے ان کا زور ٹوٹ گیا۔ البتہ وہ اور ان کی کتب جو سلطنت اور دولت کو فقط اسلام ہی کا حق سمجھتے تھے اس کے کاروبار کو بڑا دھچکا لگا۔ تو انھوں نے ان سے حسد کرنا شروع کر دیا اور مختلف اندازوں اور طرائق سے ان کو بدنام کرنا شروع کیا۔ ان کی اصل خوبی یہ تھی کہ:

"وہ بادشاہ کی فرمائش اور حکم کو اس کی مرضی سے بھی کئی گنا بہتر انداز سے سرانجام دیتے تھے۔"

اگر انھوں نے بادشاہ کی خوشی دیکھی تو انھوں نے عمامہ بڑھا کر کلڑی کی دور پگڑی باندھ لی۔ آور جبا اتار کر جامہ پہن لیا۔ وغیرہ وغیرہ

فیضی اور شیخ ابوالفضل اکبر بادشاہ کے دربار کے بڑے اہم درباری تصور کیے جانے لگے مختلف علاقوں سے لوگ آتے تو وہ ان کے ساتھ مناظرہ اور بحث میں شرکت کرتے تھے اور ان کو ہر لحاظ سے مطمئن کرتے تھے۔ ان وفود میں سے چند ایک کا ذکر قارئین کی دلچسپی کے لیے ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

ایک دفعہ گجرات سے بہت سے آتش پرست آئے تو انھوں نے اپنے مذہب زرتشت کی حقیقت کو ظاہر کرنا شروع کیا اور انھوں نے آگ کی تعظیم کو عبادت عظیم قرار دیا اور ان کے ساتھ چلنے کی تلقین کی۔ کہانیوں کی راہ روش اور ان کے مذہب کی اصلاحیں بتائیں تو حکم ہوا کہ:

"شیخ ابوالفضل کو بلایا جائے۔" اور جس طرح ملک عجم میں آتشکدے روشن ہر دم رہتے ہیں اسی طرح یہاں بھی روشن رہنے چاہیے۔ آتشکدوں کے لیے وقت کا کوئی تعین نہ تھا بلکہ رات دن ان کو روشن رہنا ضروری ہے کیونکہ آیت الٰہی میں سے ایک آیت اور اس کے نوروں میں ایک نور آگ بھی ہے۔"

سلطنت کی مصلحت کے لیے الگ مذہب ہے ان میں اکبر پر بھی کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ تمام تو اس کے خادم اور نوکر تصور ہوتے تھے جو وہ حکم دیتا اس پر عمل کرنا ان کے لیے ضروری اور واجب ہو جاتا ہے۔ البتہ مشکل بات یہ تھی کہ:

جب شیخ مبارک دارفانی سے دارالبقا کی طرف چل بسے تو شیخ ابوالفضل نے اپنے بھائیوں کے ساتھ بھدرا کیا۔ اصل بات اتنی تھی کہ اکبر بادشاہ ہندوستان کے تمام افراد پر حکومت کرنا پسند کرتا تھا اور ان سب کو خوش رکھ کے ان سے خدمت لینا چاہتا تھا اور یہ اسی وقت ممکن تھا کہ جب وہ ان لوگوں کے مذہب کو تسلیم کرے اور ان سے محبت و رغبت کا اظہار کرے ورنہ یہ ممکن نہ تھا۔ چونکہ اس نے ہندوؤں کے ساتھ اس نے رشتے ناطے بھی جوڑ رکھے تھے اس لیے وہ ہندوؤں کی طرف زیادہ جھکاؤ رکھتا تھا۔

چنانچہ جب ان کو فوت ہوگئی اور مریم مکانی کا انتقال ہوگیا تو دونوں دفعہ اکبر نے خود بھدرا کیا اور اس کی یہ حجت پیش کی کہ:

"عہد قدیم میں سلاطین ترک بھی ایسے موقع پر بھدرا کیا کرتے تھے۔ بادشاہ کی خوشی انھوں نے اسی میں پائی تھی انھوں نے بھی بھدرا کیا۔ یہ تمام باتیں بادشاہ کی دلجوئی اور اس کی رضاجوئی کے لیے تھیں ورنہ فیضی اور ابوالفضل جو کہ خود بڑے عالم دین تھے وہ ایسی باتوں کو کب تسلیم کرتے تھے۔ یا ان کو اسلام کا جز تصور کرتے تھے۔ یہ باتیں غلط ہیں۔"

فیضی اور شیخ ابوالفضل ایسی تمام حرکات کرتے تھے اور تنہائی میں آکر افسوس بھی اور توبہ بھی کرتے ہوں گے اور شاید یہ بھی کہتے ہوں گے کہ:

"آج کیسی کیسی حماقتیں ہم نے کیں؟"

ان دونوں بھائیوں نے اپنے حریفوں کو شکست دی تھی اور اس کا صرف یہی حل تھا کہ بادشاہ کی ہر جائز ناجائز خواہش کا احترام کیا جائے اور اس کے ہاں مقبولیت حاصل کی جائے۔ تاکہ ان کے دشمنوں کا منہ کالا ہو۔ انھوں نے کہا کہ:

"ہم بادشاہ کے نوکر ہیں بینگنوں کے نوکر نہیں۔"

شیخ ابوالفضل کی تصنیفات کا تجزیہ کیا جائے تو وہ جہاں ضروری موقع پاتا ہے وہ خلوص عقیدت سے مضامین عبودیت اور حق بندگی ادا کرتا ہے اور انھیں فلسفہ الٰہی کے مسائل میں اس طرح تضمین کرتا ہے کہ اگر افلاطون بھی ہوتا تو اس کے ہاتھ چوم لیتا تھا۔

شاہ ابوالمعالی لاہوری نے اپنے ایک رسالے میں یوں لکھا ہے کہ:

میں شیخ ابوالفضل کو اچھا طرح جانتا تھا مگر ایک رات میں نے دیکھا کہ اس کو نوکر بٹھایا ہے۔ اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دامن پکڑے ہوئے دریافت کیا گیا تو معلوم ہوا کہ:

اس کی بخشش کا وسیلہ ایک مناجات ہوتی ہے جس کا پہلا فقرہ یہ ہے کہ:

الٰہی نیکاں را بوسیلہ نیکی سرفرازی بخش
وبداں را بمقتضائے کرم دلنوازی کن

ترجمہ: الٰہی! نیک لوگوں کو تو ان کی نیکی کی وجہ سے بخش دے اور برے یا بدوں کو اپنی رحمت اور کرم کے طفیل بخش۔ ذخیرۃ الخوانین میں لکھا ہے کہ:

وہ رات کو فقراء کی خدمت میں جاتا تھا اور ان کو اشرفیاں نذر دیتا تھا۔ اور وہ کہتا تھا کہ:

”ابوالفضل کی سلامتی ایمان کی دعا کرو“

اور یہ فقرہ اس کا تکیہ کلام تھا کہ:

”آہ کیا کروں؟“

بار بار کہتا تھا کہ وہ ٹھنڈے سانس بھرتا رہتا تھا۔ اکبر اعظم نے کشمیر میں ایک عالیشان عمارت تعمیر کروائی تھی۔ جس کا مقصد یہ تھا ہندو مسلم یہاں اکٹھے ہو کر جس کا دل چاہے آ کر اکٹھے بیٹھیں اور معبود حقیقی کی یاد اور عبادت کریں۔ اس پر عبارت ذیل لکھی گئی تھی جس کو ابوالفضل نے مرتب کیا تھا۔

وہ عبارت ملاحظہ ہو:

الٰہی بہر خانہ کہ مے نگرم جویائے تو اند
و بہر زبان کہ مے شنوم گویائے تو

ترجمہ: الٰہی ہر گھر جس کو میں دیکھتا ہوں وہاں تجھے تلاش کیا جاتا ہے اور ہر زبان کہ جس کو میں سنتا ہوں وہ بھی تیری ہی تعریف کرتی ہے۔

ملا صاحب کا شیخ ابوالفضل سے حسد

ملا صاحب شیخ مبارک کا طالب علم رہا تھا اور اس لیے اس نے تعلیم حاصل کی تو بجائے اس کے استاد محترم کی تعظیم اور احترام کرتا اس نے الٹا اس کی تذلیل کا راستہ اختیار کر لیا۔ اور ملا صاحب نے شیخ مبارک کے مذہب پر مرتے دم تک مٹی ڈالنی شروع کر دی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ملا صاحب

بھی شیخ مبارک کے شاگرد تھے اور شیخ ابوالفضل بھی باپ کا عزیز بیٹا اور شاگرد بھی تھا۔ مگر ملا اور شیخ ابوالفضل کی صلاحیتوں میں بڑا فرق تھا۔ اور دونوں شاگردوں کے درمیان اس قسم کے اختلافات لازمی تھے کیونکہ یہ دونوں نوجوان فیضی اور ابوالفضل آگے پیچھے کر کے درباریوں میں شامل ہوتے اور انھوں نے بادشاہ کے مزاج کے مطابق اور اپنی مصلحت حال کی خاطر اکثر باتیں ایسی کہیں کہ ملا صاحب کا فتویٰ ان کے خلاف ہو گیا۔ لیکن حق یہ ہے کہ ان کی روز افزوں ترقی، دم بدم کی قربت ملا صاحب سے دیکھی نہ جاتی تھی اور وہ ان دونوں بھائیوں سے بڑا حسد کرتا تھا۔ اس لیے ان کے خلاف اپنا غبار اور غصہ نکالنے کے لیے جواز تلاش کرتا رہتا تھا۔ یعنی اسے دل کے بخارات نکالنے دیتا تھا مگر ان کی صلاحیتوں کا اندازہ لگائیں کہ:

ملا صاحب شیخ ابوالفضل کی تصنیفات میں کسی قسم کا کوئی سقم یا خامی ہی نہیں نکال سکے مگر صرف حسد کی بنا پر انھوں نے حسد کے طور پر لکھا ہے کہ:

"تفسیر اکبری کے بارے میں لکھا ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے باپ کی تصنیف ہے۔ خود شیخ ابوالفضل نے نہیں لکھی ہے۔"

مگر ملا صاحب کو یہ بتایا بھی گیا تھا کہ یہ تفسیر شیخ ابوالفضل کے باپ کی ہے۔ آپ کے باپ کی تو نہیں ہے؟ اگر یہ تصنیف ابوالفضل کی تھی تو بڑی خوشی کی بات ہے اور اگر اس کے باپ کی تصنیف ہے تو تب بھی ٹھیک ہے۔ باپ بھی تو اس کا ہی ہے شیخ ابوالفضل کی عمر اس وقت صرف بیس برس کی تھی۔ اتنی کم عمری میں تفسیر کا لکھنا کوئی آسان کام نہیں تھا تو ملا صاحب کے حسد کی یہ انتہا تھی کہ انھوں نے دوسروں میں صرف کیڑے نکالنے کا ٹھیکہ گویا لے رکھا تھا۔ اور حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا تھا محض اپنے ذہن کا خراب اخراج لوگوں پر ظاہر کرتے رہتے تھے۔

ملا صاحب فیضی کے بارے میں حسد کرتے رہتے تھے اور اس کو بھی مختلف انداز سے تشتر زنی کرتے رہتے تھے اور اسی طرح شیخ ابوالفضل کے ساتھ بھی ان کا ایسا رویہ اور سلوک جاری رہتا تھا مگر ان بھائیوں نے کبھی بھی ایسا کام نہ کیا۔ بلکہ ان دونوں نے اپنے آقا اکبر کی خوشنودی اور رائے کو ہر ایک پر مقدم رکھا تو اس کی ہاں میں ہاں جائز اور مثبت انداز میں ملاتے رہے تاکہ ملکی اور سلطنت کی بہتری کے لیے کام ہو جس کی وجہ سے اکبر بھی ان دونوں کا بہت احترام کرتا تھا۔ اور ان کو ہر وقت اپنی عنایات سے نوازتا رہتا تھا۔ جس کو دیکھ کر ملا صاحب اور زیادہ حسد کرتے اور جلتے تھے مگر کچھ کر نہ سکتے تھے کیونکہ ان کا وقار ان دونوں بھائیوں نے اکبر کے سامنے ختم کر دیا تھا جو کہ ان کی لیاقت اور صلاحیتوں کا ثمرہ تھا۔

گویا کہ کمال زوال است ملا صاحب حد سے تجاوز کر چکے تھے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کو زوال دیا۔

شیخ کی انشا پردازی

شیخ ابوالفضل کی انشا پردازی اور مطلب نگاری کی تعریف نہیں کی جا سکتی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو یہ صلاحیت واضح طور پر عطا فرما رکھی تھی کیونکہ وہ ہر ایک مطلب کو اپنے خوبصورت انداز سے ادا کرتا تھا کہ سمجھنے والا دیکھتا رہ جاتا تھا اور اس کی صلاحیت اور عقل پر حیران رہ جاتا تھا۔ بڑے بڑے انشا پردازوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ جہاں عبارت میں لطف اور زور پیدا کرنا چاہتے ہیں تو استعارے رنگ لاتے ہیں۔ اور حسن و جمال سے خوبی مانگ کر کلام کو رنگین و تحسین کرتے ہیں۔ مگر یہ قادر الکلام اپنے پاک خیالات اور سادہ الفاظ میں اصلی مطلب کو اس طرح ادا کرتا ہے کہ ہزار رنگینیاں ان پر قربان ہوتی ہیں۔ اس کے سادگی کے باغ میں رنگ آمیزی کا مصور آکر قلم لگائے تو ہاتھ قلم ہو جائیں۔ حقیقت میں وہ انشا پردازی کا سحر تھا۔ اپنے طرف خیالات سے جس مخلوق کو چاہتا ہے الفاظ کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ جس عالم میں لکھتا ہے نیا ڈھنگ ہے اور جتنا لکھا جاتا ہے عبارت کا زور بڑھتا اور چڑھتا چلا جاتا ہے۔ ممکن نہیں کہ طبیعت میں ذرا بھی تھکن محسوس ہو وہ بڑا با کمال انشا پرداز تھا۔ اس نے پایۂ تخت ہندوستان میں ولایتوں کے علما اور ارباب کمال کا جمگھٹا تھا مگر اس نے سب کے چیر کر آگے نکل گیا اس کے دست قلم میں طاقت اور زور تھا۔ ملکوں کے اہل کمال کھڑے دیکھا کرتے تھے اور یہ آگے بڑھتا تھا اور آگے نکل جاتا تھا اور نہ کوئی کسی کو آگے بڑھنے دیتا ہے اور وہ مر گیا ہے اور آج تک اس کی تحریر سب سے اونچی نظر آتی ہے۔

شیخ ابوالفضل کی تصنیفات

شیخ ابوالفضل بڑا عالم و فاضل شخصیت کا مالک تھا اس نے اکبر کے دربار میں اپنی صلاحیتوں کی بنا پر اکبر کے دل و ذہن پر پوری طرح حاوی ہو چکا تھا۔ اکبر ابوالفضل کا گرویدہ تھا۔ بہرحال شیخ ابوالفضل کی درج ذیل تصنیفات زیادہ مشہور ہیں۔ جن کے بارے میں اختصار کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔

i- اکبر نامہ دفتر اول

اس میں سلسلہ تیمور کا حال ہے مگر بڑے اختصار کے ساتھ بیان ہے بابر کا کچھ زیادہ پھر اس میں ۷ اسال کا حال اس میں درج تھا۔

ii- دیباچہ

اس میں چند عذر بھی لکھے گئے ہیں جیسا کہ باکمال مصنفوں کا انکسار ہوتا ہے یہ منصفانہ تحریر قابل تعریف ہے کہ میں ہندی ہوں فارسی میں لکھنا میرا کام نہیں تھا مگر بڑے فیضی کے ایما پر یہ کام شروع کر لیا۔

iii- دفتر دوئم

۱۸ جلوس یعنی قرن ثانی سے شروع کیا ہے اور جلوس ۱۰۱۱ھ میں ختم کیا۔ باقی آخری عہد اکبر کا حال عنایت اللہ محب نے تکملہ کر کے تاریخ اکبری مکمل کی۔

iv- جلد اول

اس میں ہمایوں کا حال لکھا گیا ہے مگر اس کی عبارت بڑی سلیس بلکہ شاعرانہ ہے اور متانت سے درست و مگر بیان ہے۔

v- جلد دوئم

اکبر بادشاہ کی ۷ اسالہ سلطنت کا حال ہے۔ اس میں مضامین کا جوش و خروش، الفاظ کی شان و شکوہ، عبارت زور و شور پر ہے اور بہار کے رنگ اڑائے ہیں۔ اس کا انداز عام آراستہ صیاحی اور انشائے ظاہر وحید سے ملتا ہے۔

vi- جلد سوئم

اس جلد میں شیخ ابوالفضل نے رنگ بدلنا شروع کیا ہے عبارت بہت ہی متین اور سنجیدہ ہے اور مختصر ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے وہ

سالانہ آخر دیکھیں تو آئین اکبری کے قریب قریب جا پہنچتی ہے۔ لیکن جس جس رنگ میں جسے پڑھ کر دل کہتا ہے کہ کیا ہی خوب ہے۔ یہ جشن جلوس پر بلکہ بعض بعض معرکوں کی ابتدا میں ایک ایک تمہید چند سطریں آدھے صفحے کی شامل ہے۔

vii- آغاز سال ہژدہم الٰہی جلوس مقدس شہنشاہی۔

viii- آغاز سال بست و دوم الٰہی جلوس اقدس شہنشاہی۔

ix- آغاز سال بست و ششم الٰہی از جلوس شہنشاہی۔

x- آغاز سال بست و نہم از مبدائے جلوس۔

دفتر سوئم آئین اکبری

آئین اکبری ۱۰۰۶ء میں مکمل کی گئی۔ اس کی تعریف حد بیان سے باہر ہے کیونکہ ہر ایک کارنامہ کا اور ہر ایک معاملہ کا حال اس کے جمع و خرچ کا حال، ہر ایک کام کے ضوابط و قانون لکھے گئے ہیں۔ سلطنت کے صوبے صوبے کا حال بیان کیا گیا ہے صوبوں کا حدود اربعہ، ان کی مساحت، وہاں کی آمدنی اور خرچ، پیداوار قدرتی و صنعتی وغیرہ وغیرہ۔ مشہور مقامات، مشہور دریا، نہریں، نالے، ندیاں، سرچشمے، فوج اور اس کے انتظامات، امراء کی فہرست اور ان کے طریقے وغیرہ۔

اقسام لازمین، علماء، اہل کمال، اہل موسیقی، اہل صفت، فقرائے صاحب دل، عام اہل ریاضت مزاروں اور مندروں کی تفصیل، حالات، عقائد اہل ہند، علوم اہل ہند وغیرہ۔

یہ شیخ ابوالفضل کی نادر تصنیف ہے کیونکہ اس قدر باریک مواد کو یکجا کرنا کسی بھی مصنف کے لیے ممکن نہیں پھر اس کے ساتھ ان کے پاس اس قدر اہم درباری ذمہ داریاں بھی تھیں۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ ملا صاحب نے اس کتاب پر اپنا غصہ جھاڑ رہے اور اس پر بھی خاک پھینکی۔ وہ مصنف کی کاوشوں کو برداشت نہ کر سکا تھا تو اس نے اپنے حسد کو جلا بخشنے کے لیے یہ کام بھی کر لیا۔

اس کتاب میں چھوٹے چھوٹے فقرات معقول ترکیبیں انکی تراشیں جملے سنجیدہ اور برگزیدہ صفحوں کا عطر اور ورقوں کی روح ہیں۔ فضول اور زائد الفاظ اس میں بالکل شامل نہیں کیے گئے۔ پاک صاف سلیس اور اس پر برجستہ اور متین ہے۔ تکلف عبارت آرائی مبالغے اور بلند پروازیوں کا نام تک نہیں ہے۔

یہ انداز اس نے اس وقت اختیار کیا کہ جب کہ آتش پرستوں کا مجمع خاندیس نے علاقہ سے ژندو پہلوی کی کتب لے کر آیا ہوگا۔ اس نے انداز عبارت دساتیر وغیرہ پارس کی بہت سے قدیم سے لیے ہیں اور یہ اصلاح اس کی بالکل درست اور قرین مصلحت تھی۔ اب ان کو ہر شخص پڑھ سکتا ہے۔ وہ اپنی طرز کا خود ہی بانی تھا اور وہ اپنے طریقوں واسلوب تحریر اپنے ساتھ ہی لے گیا۔

مکاتبات علامی

انشائے ابوالفضل کو مدرسوں اور مکتبوں میں عام مقام ہے اس کے تین وفاتر تھے ان دفاتر کو اس کے بھانجے نے ترتیب دیا تھا جو کہ نسبت فرزندی رکھتے تھے۔ وہ تین دفاتر یہ تھے:

i- دفتر مراسلہ جات

اس دفتر میں مراسلات تھے جو بادشاہ کی طرف سے مختلف سلاطین یعنی ایران وتوران کو جاری ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ فرمان یعنی احکامات ہوتے تھے جو کہ امرائے دو مختلف کے لیے جاری ہوئے تھے۔ اس کی حالت یہ ہوتی تھی کہ بادشاہ کے سامنے سر جھکائے کھڑا بیٹھا تھا وہ مطالب اور الفاظ کو جس پہلو سے جس جگہ چاہتا تھا۔ سمولیتا تھا۔ دلی عبداللہ ازبک کا قول یاد آتا ہے کہ:

''اکبر کی تلوار تو نہیں دیکھی البتہ شیخ ابوالفضل کا قلم ڈرا دیتا تھا۔''

ii- دفتر دوئم

اس دفتر میں خطوط اور مراسلات تھے جو کہ امرا احباب اور اقربا کو لکھے جاتے تھے ان کے مطالب دفتر اول کا مختلف ہوتے تھے۔ اس لیے بعض مراسلات جو خانخاناں یا کوکلتاش خاں وغیرہ کے نام ہیں وہ دفتر اول کی مدد میں پرداز ہے ہیں سوم کے خیالات میں مسلسل ہیں باقی دفتر پہلے دونوں دفتروں کے بارے میں اتنی بات ضرور ہے کہ انھیں سب پڑھتے ہیں اور پڑھتے اور پڑھانے والے پڑھاتے ہیں بلکہ علماء و فضلاء شرحیں اور حاشیے لکھتے ہیں لیکن کچھ زندہ نہیں۔ مزا اس کا جعہ کو پڑھنے یا پڑھانے والے پہلے بابر مولوی اکبر کی تاریخ ادھر سلاطین صفویہ کی تاریخ ایران اور عبداللہ کی تاریخ توران کا بھی مطالعہ کریں۔ آکنا مے راجگان ہند کے سلسلوں اور ان کے رسم و رواج کا علم ہو۔ دربار اور دلی دربار کے حالات سے اور ان کے آپس کے جزوی جزوی معاملات سے واقفیت ہو۔ یہ نہ ہو کہ پڑھنے تو ساری کتاب پڑھ لے گا مگر اسے کچھ علم نہ ہو جس طرح کہ وہ ایک عجائب خانہ سے پھر آیا مگر اسے کسی قسم کی خبر نہیں ہوئی۔

iii- دفتر سوئم

شیخ ابوالفضل کے تیسرے دفتر کا تعلق اپنی کتابوں کے بعض منطقی سلف کی کتابوں میں سے کسی کتاب کو دیکھا ہوگا۔ اسے دیکھ کر جو خیال ذہن میں آتا ہے کہ انھیں کی تصویر ایک نثر کی صورت میں پیش کردی ہے پرانے زمانے یا خصوصی طور پر اس زمانے تک...... کوئی...... بھی ایشیا میں نہ جانتا تھا مگر اسنے اس کو اپنایا۔ اکثر جگہ نقش ناطقہ کے مراتب عالی طبیعت کی وابستگی دل کی آزادی، جس میں وسیع دین و دنیا سے بیزاری، ان کے باوجود اس کے خیالات بلند پروازی کا ایک عالم آیا ہے مگر ناواقف اور جاہل افراد کے لیے ہیں کہ:

دونوں بھائی دہریے تھے۔ بدمذہب تھے مگر وہاں آکر مشاہدہ کریں سبحان اللہ یہ حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ:

یا شیخ شبلی اور حقیقت میں خدا جانے کیا کیا فرماتے ہیں؟

اس دفتر کے شائقین کو چاہیے کہ فلسفہ حکمت کے ساتھ تصوف اور حکمت اشراق سے بہرہ کافی حاصل ہو۔ تب مزہ آئے گا۔ ورنہ کھانا کھاتے چاؤ نوالے سیا کیے جو پیٹ بھر جائے گا مگر جب کھانے والے سے مزے کا پوچھے تو کچھ بھی نہیں بتائے گا۔

اس میں بعض سفید بیاضوں پر دیباچے لکھے ہیں مگر کسی میں چیدہ اور برگزیدہ اپنی پسند کے اشعار شعرا کے با کمال سے نوشتہ ہیں۔ کسی میں بعض کتب کی کوئی عبارت یا تاریخ روایت پسند آتی تھی وہ بھی لکھلیتے تھے اور بعض کتب میں چند ہوئی نظم یا نثر ہوا اپنی طبیعت سے ٹپکتے تھے وہ بھی محفوظ کر لیتے تھے۔ کسی میں حساب کتاب کی یادداشت لکھتے تھے۔ انھوں نے کتابوں پر خاتمہ لکھے ہیں۔

یا ان کتابوں پر اپنی رائے لکھی ہے ان کے آخیر میں یہ بھی لکھا ہے کہ یہ فلاں تاریخ فلاں مقام پر لکھا گیا ہے۔ لکھی گئی ہے۔ کیونکہ بعض تحریر میں اس نے وقت لاہور میں بیٹھ کر لکھی تھی تو اس کی تحریر سے اس وقت کے لاہور کے بارے میں اندازہ ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض ان کی تحریر میں کشمیر کی وادی، کانگریس اور احمد نگر وغیرہ سے متعلق تحیں۔ تو ان کا مطالعہ کر کے وہاں کے اس وقت کے حالات سے واقفیت حاصل ہوتی ہے اور ان کا آج کے حالات سے موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت کے لوگوں کی زندگی کی مشکلات کا بھی اب تصور کر سکتے ہیں۔ پڑھنے والوں کو تحریر کرنے والوں کے بارے میں ضرور خیال آتا ہوگا کہ انھوں نے یہ مورد کن حالات میں جمع کیا ہوگا؟

iv- عیار دانش

یہ کتاب کلیلہ و دمنہ ہے۔ یہ سنسکرت کی زبان میں تحریر کی گئی تھی۔ یہاں سے نوشیرواں نے منگوائی تھی اور وہاں مدت تک اس عہد کی ادبی زبان میں جاری رہی۔ عباسیہ کے زمانے میں ابن المقفع کو عربی میں اس کا ترجمہ ہوا۔ سامانیوں کے عہد میں رودکی نے نظم کی۔ اس کے بعد ملا حسین واعظ نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا پھر ہندوستان میں آئی تو جب اکبر نے اسے دیکھا تو اسے بھی خیال آیا کہ جب اصل سنسکرت ہمارے پاس موجود ہے تو اس کے مطابق کیوں نہ ہو؟ دوسرے یہ کہ یہ کتاب پند و نصائح کے لحاظ سے خاص و عام کے لیے کارآمد تھی۔ اس کو آسان اور سادہ زبان میں لکھا جانا چاہیے کہ اس کو ہر آدمی پڑھے اور سمجھے تو اکبر بادشاہ نے شیخ ابوالفضل کو حکم دیا کہ:

"اصل سنسکرت کو سامنے رکھ کر ترجمہ کرو۔"

چنانچہ چند روز شیخ ابوالفضل نے سنسکرت میں ترجمہ کر کے کتاب لکھ کر دی۔ یہ سنسکرت میں ترجمہ شیخ ابوالفضل نے ۹۹۶ھ میں مکمل کرایا تھا مگر ملا صاحب نے بھی اس پر بھی اپنا غصہ جھاڑ دیا تو وہ اکبر کے احکام جدیدہ کی شکایت کرتے کرتے فرماتے ہیں کہ:

"اسلام کی ہر بات سے نفرت ہے علوم سے بھی بیزاری ہے۔ زبان بھی پسند نہیں۔ حروف بھی نامرغوب ہیں۔"

ابوالفضل اکبر نے حکم دیا کہ:

"ملا حسین واعظ نے کلیلہ دمنہ کا ترجمہ انوار سہیلی عمدہ انداز میں لکھی ہے تو تم اسے صاف عام فارسی میں لکھو۔ جس میں اشعار و تشبیہ بھی نہ ہو اور اس کے اندر عربی کے الفاظ بھی نہ ہوں۔ ملا صاحب نے ہر جگہ پر شیخ ابوالفضل پر طعن و تشنیع کو وطیرہ بنایا ہے جو کہ اس کا یہ انداز کسی نے بھی پسند نہیں کیا کیونکہ بیان کا عمل ان کی ذاتیات کا عکس تھا اور بے جا طور کا نظر آتا تھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ شیخ کا اور اس کے بزرگوں کا جو کچھ سرمایہ فخر و کمال تھا

یہی عربی کے علوم اور عربی زبان تھی اسے ان چیزوں سے نفرت و بیزاری ہوتی ممکن نہیں ہاں اکبر بادشاہ کا فرمان برداروں کرتے اور وہ اپنی مصلحت کو سمجھتا تھا آقا اور غلام کے مراتب کو جانتا تھا مگر وہ اس کے احکام کی تعمیل صدق دل سے نہ کرتا تھا تو کیا کرتا۔ اسی کو نمک حرام کا خطاب دیا جاتا تھا اور وہ بادشاہ کے علاوہ جہاں کے خالق و مالک کو کیا منہ دکھاتا تھا اور جواب دیتا؟

آخر میں یہی کہنا پڑتا ہے کہ ملا صاحب کے ہاتھ میں بھی قلم ہے وہ جو بھی لکھنا چاہیں لکھ دیں جو کچھ کہنا چاہیں کہیں اور جو اچھا یا برا محسوس کریں۔ اس میں ضبط تحریر میں لے آئیں۔ ان کو منع کرنے والا کوئی نہیں ہے مگر انداز ہر ایک کا اپنا اپنا ہے۔

vii- رقعات ابوالفضل

رقعات میں شیخ ابوالفضل نے وہ نجی خطوط تحریر ہیں یا ان کو شامل کیا ہے ان میں ایک ایک لفظ یا فقرہ یا جملہ پڑھنے اور دیکھنے کے لائق ہے۔ ان سے اس کے طبعی حالات، دلی خیالات و جذبات و احساسات اور اس کے نجی گھریلو حالات کا بھی اندازہ ہوتا ہے مگر ان کے مطالعہ کرنے کا لطف بھی آئے گا کہ جب اس عہد کی تاریخ اور اس زمانہ کے امورات کا بھی بغور مطالعہ کیا جائے اور ان سے واقفیت حاصل ہو۔

سبحان اللہ جس شیخ ابوالفضل کے لیے ابھی لکھ چکا ہوں کہ:

"وہ کبھی شیخ شبلی ہیں اور کبھی حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ۔"

انہی نے خان خاناں کے باب میں جو کچھ لکھا ہے میں اسے پڑھ کر شرماتا ہوں اور خان خاناں بھی وہ کہ جب پہلے دفتر میں اسے اکبر کی طرف سے فرمان لکھتے ہیں تو ان کی محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ بھی اس انداز میں کہ دل و جان اور دم و ہوش فدا ہوتے جاتے ہیں۔ دوسرے دفتر میں اپنی طرف سے خط لکھتے ہیں تو ان کی محبت پر عالم ہوتا ہے۔ دل و جان سے قربان ہوتے جاتے ہیں۔

بیرم خاں تو کیا؟ معلوم ہوتا ہے کہ ماں کے پیار بھرے سینہ سے دودھ بہا ہے باوجود اس کے جب کہ خاندیس میں خانخاناں شہزادہ دانیال کے ساتھ ملک گیری کر رہا ہے تو بعض اطراف میں یہ خود لشکر لیے حملہ آور ہیں تو کبھی یہ دونوں یکجا ہو جاتے ہیں تو کبھی دور دور چلے جاتے ہیں مگر کام دونوں کا ایک ہی ہے باہم دست و گریباں وہاں سے بعض عرضداشتوں میں اکبر بادشاہ کو اور ان کی والدہ محترمہ اور ان کے بیٹے اور شہزادہ سلیم یعنی جہانگیر کو عرضیاں لکھی ہیں۔ ان میں خانخاناں کی بابت وہ جو کچھ تحریر کرتے ہیں اور ایسے ایسے خیالات میں اول مضمونوں کو ادا کرتے ہیں کہ ہر انسان کی عقل دنگ ہو کر کہتی ہے کہ:

"یا حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ آپ ﷺ خیالات یا حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ آپ ﷺ تاکالات۔"

ix- کشکول

یہ جو ایک طرف مجموعہ تحریر تھا جیسا کہ اس کا نام ہے ویسا ہی اس کا کام بھی ہے۔ کشکول فقیر یا گداگر کے اس برتن کا نام ہے جس میں ہر ایک سے ہر ایک چیز مانگتا ہے تو وہ ہر ایک چیز یا خوراک اس کے اندر ہی ڈلواتا ہے۔ خواہ وہ چیز روٹی ہو سالن ہو، دودھ ہو، خشک ہو یا تر ہو تازہ ہو یا باسی

ہو۔ گرم ہو یا ٹھنڈی ہو، گندم کی ہو یا جو کی، باجرے کی ہو یا مکئی کی، چاول ہوں یا دال مصالحہ، غرضیکہ فقیر کا یہ برتن ہر ایک چیز کو سما جانے والا برتن ہوتا ہے اور اس کا کام بھی یہی ہے تو اسی طرح شیخ ابوالفضل جیسا صاحب ذوق و شوق کو جو کچھ پسند آتا تھا وہ ایک سادی کتاب اپنے پاس رکھتا تھا۔ جو مطلب پسند آتا تھا کسی بھی زبان میں یا کسی بھی علم ہو۔ کسی فن کا ہو، نظم کا ہو یا نثر کا اس میں درج کر لیتا تھا۔ اسے وہ کشکول کا نام دیتا تھا۔

x- جامع اللغات

ایک مختصر سی کتاب لغت میں ہے۔ علم طالب علمی میں الفاظ جمع کیے ہوں گے اسے ابوالفضل جیسے محقق کی تصنیف کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔

رزمنامہ (ترجمہ مہابھارت) پر دو جزو کا خطبہ ہے۔

شیخ ابوالفضل کی تصنیفات پر نکتہ چینی

شیخ ابوالفضل کی تحریروں اور تصانیف پر کچھ اور نہیں تو ہر ذی شعور خواندہ فرد نے تعریف و توصیف کی ہے مگر معاشرے میں دوسرے قسم کے بھی لوگ ضرور ہوتے ہیں جو کہ معاشرے کا اہم حصہ ہیں، جنھیں حاسد یا متکبر قسم کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ:

شیخ ابوالفضل اکبر بادشاہ کی بہت خوشامد کرتے تھے۔ مگر کون مورخ ہے؟ کہ جو بادشاہ اور قوم کی حمایت حاصل کرنے کے لیے خوشامد نہ کرتا ہو۔ وہ اپنے آقا کا نمک حلال وفادار نوکر تھا۔ اس کے انصاف سے اس کے خاندان کی عزت و آبرو تھی۔ اس کی حفاظت سے سب کی جانیں محفوظ ہوئیں۔ اس کی بدولت اس کے فضل و کمال نے قدر و قیمت پائی۔ اس کی قدردانی سے رکن سلطنت ہو گیا۔ اس کی پرورش سے تصنیفات ہوئیں۔ اور انھوں نے بلکہ خود اس نے صدہا سال کی عمر پائی۔

خوشامد کیا چیز ہے؟ اس کا دل تو عبادت کرتا ہوگا۔ اس نے بہت سا ادب ظاہر کیا۔ شکریہ ادا کیا۔ مگر ناسمجھ لوگوں نے اسے خوشامد کا نام دے دیا۔ اگر اس نے خوشامد ہی کی تو تعجب کیا اور گناہ کیا کیا؟ آج کے لوگ اس کی جگہ پر ہوتے تو اس سے ہزار درجہ زیادہ بکواسیں کرتے مگر وہ ایسا نہ کر سکتے تھے۔ مگر ان کی قسمت کہاں؟ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ شیخ ابوالفضل نے ہندوستان میں بیٹھ کر ایشیائی علوم اور زبان عربی و فارسی میں یہ کمال پیدا کیا کہ اکبر کو دربار وزیر کے رتبے کو حاصل کر لیا جو کہ بڑے کمال کی بات تھی۔

میرے دوستو! شیخ ابوالفضل اکبر بادشاہ کی سلطنت کا ایک جزو تھے۔ آج ارکان سلطنت نظام ملکی کے لیے ہزار طرف سے حکمت عملی اور مصلحتیں کھیلتے ہیں۔ اگر ہر بات میں حقیقت اور سچ ہو واقعیت اور اصلیت پر چلیں اور لکھیں تو ابھی سلطنت کا شیرازہ بکھر جائے اور حالات درہم برہم ہو جائیں۔ اب لوگوں کو حروف شناسی آ گئی ہے ان کی زبان چلنے لگ گئی ہے یعنی وہ تاڑ تاڑ بولنے لگ گئے ہیں مگر اب بھی دوسروں کی بات کو سمجھ نہیں سکتے۔ صرف ان کے منہ میں جو آتا ہے اسی کو اپنی زبان سے بلا سوچے سمجھے ادا کر دیتے ہیں جو کہ اچھا طریقہ اور سمجھداری نہیں ہے۔

الغرض تنقید کرنا تو ایک آسان سا عمل ہے مگر دنیا میں کوئی کام کر کے جانا جس کو ہر انسان اس کے اس دارفانی سے چلے جانے کے بعد یاد کرے اور اس کے اس کام سے فائدہ بھی اٹھائے تو یہ ایک انسانیت کی خدمت ہے۔ شخص کی دوسرے پر اپنے ذاتی عناد کی اور وجہ سے اس پر تنقید

کر کے اپنے آپ کو عالم، بہادر یا سیاسی لیڈر ظاہر کرنا غلطی اور بحث ہے۔ تو ظاہر ہوتا ہے کہ ملا صاحب کا بھی یہی وطیرہ ناقص تھا جس کو استعمال کرتے ہوئے وہ شیخ ابوالفضل پر تنقید کا کام کرتے رہتے تھے۔ اگر وہ انصاف پسند عالم ہوتا تو وہ قطعاً ایسا نہ کرتا اور اس قدر بدنام نہ ہوتا شائد اس میں حسد سے عقل کم ہوگی کیونکہ تو انسانی عقل کو گھن وحسد کی طرح کھا جاتا ہے۔ اس لیے سب مسلمانوں کو حسد کی بجائے رشک کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے نعمتوں کے حصول کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ حسد بہت بڑا گناہ ہے۔ اس سے اللہ پاک سب کو محفوظ رکھے۔ البتہ شیخ ابوالفضل بہت بڑے عالم و فاضل شخصیت کے مالک تھے اور ان میں بے شمار صلاحیتیں تھیں۔ ان کی تصانیف قابل تعریف اور توصیف ہیں جن سے آج بھی لوگ فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔

شیخ ابوالفضل کی تصانیف کی خوبیاں

شیخ ابوالفضل کو اللہ تعالیٰ نے بڑی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ ایک وقت میں عالم بھی تھے۔ مشیر بھی، درباری بھی اور سپہ سالار بھی۔ انھوں نے اکبر بادشاہ کے دربار میں شیخ کریعنی خداداد صلاحیتوں کا اس انداز سے مظاہرہ کیا جو کہ حالات حاضرہ کی متقضی تھیں۔ اگر چہ اس پر حاسد لوگ کیچڑ اچھالتے رہے۔ مگر انھوں نے کسی کو جواب تلخی سے نہیں دیا بلکہ ہر بڑے کا احترام اور چھوٹے سے پیار کا ہی مظاہرہ کیا جو کہ علوم کا عکس تھا۔ بہر حال شیخ ابوالفضل ایشیائی انشا پردازوں میں سب سے بڑا مبالغہ پرداز مصنف تھا۔ اس سے اکبر نامہ اور آئین اکبری کے لکھنے میں فارسی کی پرانی لیاقت کو تازہ کیا ہے۔ اس نے خوش بیانی اور یاوہ سرائی کے پردہ میں اکبر کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور اپنے آقا کے عیوب کو اس طرح پردہ دیا ہے کہ جس کے پڑھنے سے ممدوح اور مداح دونوں سے نفرت ہوتی تھی اور دونوں کی ذات وصفات پر بٹا لگتا تھا۔ البتہ شیخ ابوالفضل بڑا علامہ، عاقل، دانا اور مدبر شخصیت کا مالک تھا، دنیا کے اہم کاموں کے لیے جیسی عقل کی ضرورت تھی وہ اس کو اللہ تعالیٰ نے ودیعت کر رکھی تھی اور خرابیوں پر اس کا قابو تھا ان کو ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔ باوجود اس کے جو زبان کے ماہر ہیں اور رموز وسخن کے تاڑنے والے ہیں اور کلام کے انداز اور اداؤں کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ کہا اور جس پیرائے میں کہا۔ کوئی بات اٹھا نہیں رکھی انھوں نے اصل حقیقت کو لکھ دیا ہے اور اپنی انشا پردازی کا آئینہ اوپر رکھ دیا ہے۔ یہ اسی کا کام تھا کہ اس نے ہر وقت ہر قسم کا کام کر دیا اور جن سے کچھ نہ کہنا تھا ان کی طرف رخ بھی نہیں کیا۔ ماثر الامراء معلوم ہوتا ہے کہ:

کبھی حرف ناشائستہ اس کی زبان سے ادا نہیں ہوئے۔ فحش یا گالی سے زبان آلودہ نہ کرتے تھے۔ غیر تو در کنار اپنے نوکر تک پر بھی ناراض نہ ہوتے تھے اور انھوں نے کبھی بھی اپنے ادنیٰ نوکر کو بھی نہ کبھی جھڑکا اور نہ سختی سے ڈانٹا تھا بلکہ بڑی محبت اور نرمی سے ان کے ساتھ سلوک روا رکھتے تھے۔ نوکروں کی غیر حاضری کی تنخواہ ان کی سرکار میں مجرا نہ لیتے تھے۔ جس کسی کو وہ نوکر رکھتے تھے۔ اسے پھر موقوف نہ کرتے تھے۔ اگر وہ نوکر نکما یا نالائق ہوتا۔ وہ کام کرنے کے اہل نہ ہوتا تو اس کی خدمات کو دوسرے نوکروں کے ساتھ ادل بدل کر دیتے تھے تا کہ اس کی حوصلہ شکنی نہ ہو اور جب تک اس نوکر کو رکھ سکتے تھے رکھتے ہی رہتے۔ وہ کہتے تھے کہ:

"اگر موقوف ہو کر نکلے گا تو نالائق سمجھ کر تجھے کوئی نوکری نہیں دے گا۔"

گویا کہ شیخ ابوالفضل تصانیف کی مہارت رکھنے کے علاوہ انسانی ہمدردی اور شفقت کے جذبے سے بھی سرشار تھے۔ انھوں نے اپنے سرمائے میں انسانی ہمدردی کا بھی باب اخذ کر رکھا تھا۔ اور ہر بڑے کا احترام کرنے کا علم تو انھوں نے موروثی طور پر سیکھ رکھا تھا اور ہر چھوٹے سے پیار اور محبت وشفقت سے پیش آنا بھی ان کی فطرت کا لازمی حصہ اور جزو بن چکا تھا۔ جو کہ ان کی شخصیت کو چار چاند لگاتے تھے۔

شیخ ابوالفضل کی شکل وشباہت

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اپنے انداز میں بہتر بنایا ہے اور اس کے بنانے کی مصلحت اس کا صانع خالق ہی جانتا ہے مگر دنیا میں آ کر لوگ اس انسان کے رنگ اور خط وخال کی تعریف یا برائی بھی کرنے لگتے ہیں جو کہ غلط بات ہے۔ انسان کا صرف اللہ تعالیٰ کے ہاں کردار کی اہمیت ہے اور حسب ونسب اور رنگ وغیرہ کی کوئی اہمیت نہیں مگر یہ انسان ہے کہ جو دنیا میں خوبصورتی اور بدصورتی کو بھی اہمیت دیتا ہے بے شک کردار اس کا جو بھی ہے شاید یہ اس انسان کی غلطی اور حماقت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اصول درست اور صحیح ہے۔ اس پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے کیونکہ انسان کو مر کر اس کے سامنے اپنے اعمال کا جواب دہ ہونا ہے شکل وصورت کا کوئی جواب نہیں ہوگا کیونکہ وہ تو اللہ تعالیٰ احسن التقویم کے اصول کے تحت بنائی گئی ہے ہر انسان کی اس لیے کسی انسان کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ دوسرے انسان کی شکل وصورت پر اعتراض نہ کرے۔

۱۔ شیخ ابوالفضل رنگ کے کالے تھے۔

۲۔ وہ ہاتھ پاؤں ڈیل ڈول میں معتدل تھے۔

۳۔ اعضا میں تناسب اور اعتدال تھا۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو زندگی میں صحت وتندرستی سے نواز رکھا تھا۔ انھوں نے خود اپنی تحریروں میں تسلیم ہے کہ:

وہ رنگ کا جتنا گورا ہے اتنا ہی دل کا سیاہ ہے۔"

اہل نظر نے شیخ ابوالفضل کی تصنیفات کا مطالعہ کیا ہوگا تو ان کو معلوم ہوا ہوگا کہ وہ ایک متین یا سنجیدہ، کم سخن، متحمل مزاج شخص تھے۔ ان کے چہرے سے ہر وقت یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہے ہیں۔ وہ ہر کام میں ہر بات میں چلنے پھرنے میں آہستگی کے قائل تھے۔ وہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں کے شکر گزار تھے جن کا انھوں نے اپنی تصنیفات میں بھی بار بار ذکر کیا ہے۔

شیخ ابوالفضل کے خصائص حمیدہ

شیخ ابوالفضل شیخ مبارک کا فرزند ارجمند تھا۔ جس نے زندگی میں بہت سی ٹھوکریں کھائیں مصائب اور تکالیف برداشت کیں۔ اور آخر کار اللہ تعالیٰ نے اپنی یاوری کا ہاتھ دراز فرمایا تو ان کی آخری زندگی سکون اور اطمینان سے گزری تھی۔ اگر شیخ مبارک عالم دین شخصیت کے مالک تھے اور انھوں نے اپنی اولاد کو بھی دین کے علم سے روشناس ہی نہیں کرایا تھا بلکہ انھوں نے عروج کمال تک پہنچایا۔ جس کی وجہ سے ان کے بیٹوں کو شاہی دربار اکبری میں اتنا بلند مقام نصیب ہوا۔ شیخ مبارک کے بڑے بیٹے فیضی اور شیخ ابوالفضل نے اکبر کے دربار میں داخل ہو کر اپنے تمام حاسد اور عناد پرست

لوگوں کو پچھاڑ باہر کیا۔ اور ان کے چہرے سیاہ ہو گئے اور وہ شرم کے مارے دربار سے مایوس ہو گئے تھے۔ اور انھوں نے صرف یہی راستہ اختیار کیا کہ ہر ممکن انداز سے شیخ ابوالفضل پر حسد کی آگ کے گولے پھینکتے رہیں جن سے کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ اور شیخ ابوالفضل اپنی زندگی میں اکبر کی قربت میں پرخلوص انداز میں عزت کے ساتھ دربار کا کام کرتے رہے۔ بہر حال شیخ ابوالفضل کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار خصائص حمیدہ سے نواز رکھا تھا جن کو مختصراً طور پر ذیل میں حیطہ تحریر میں قارئین کی دلچسپی اور معلومات کے لایا جاتا ہے۔

۱۔ شیخ ابوالفضل میں یہ بہت بڑی خوبی تھی کہ انھوں نے کبھی بھی کسی کے بارے میں نہ تو اپنی تصنیفات میں اور نہ ویسے ہی باتوں اور گفتگو میں کبھی کوئی ناشائستہ، غیر مہذب اور ناگوار لفظ غصے کی حالت میں منہ سے نکالا تھا۔ یہ ان کی بہت بڑی خوبی تھی کہ انھوں نے کبھی کسی کی برائی زبان پر لانے کی کوشش نہیں کی۔ اگرچہ لوگ اس کی برائی کرتے رہے۔

۲۔ شیخ ابوالفضل بڑا انسان ہمدرد شخص تھا۔ وہ اپنے سے ادنیٰ ملازمین کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اس نے کبھی بھی اپنے کسی نوکر (ملازم) کو پریشان کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہر وقت اور ہر معاملے میں ان کی جائز اور ضروری مدد کرنے میں پیش پیش رہے۔ انھوں نے کبھی کسی نوکر کو نوکری سے برخاست نہیں کیا۔ جب تک نوکر نوکری کر سکتا تھا اس کو رکھتے۔

۳۔ جب آفتاب حمل میں آتا تھا تو نیا سال شروع ہونے پر ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ گھر اور کارخانوں کا مشاہدہ کرتے ان کا حساب و کتاب کی پڑتال کرتے۔ گوشواروں کی فہرست لکھوا کر دفتر میں جمع کرواتے اور تمام کتابوں کو جلا دیتے تھے۔

۴۔ وہ اپنے نوکروں سے اس قدر مشفق تھے کہ وہ تمام کپڑے نوکروں میں تقسیم کر دیتے تھے تا کہ وہ اپنے استعمال میں لائیں۔ مگر پائجامہ اپنے سامنے آگ لگوا کر جلوا دیتے تھے۔

۵۔ شیخ ابوالفضل بڑے ہی سنجیدہ، فاضل اور منصفانہ خیالات کے مالک انسان تھے۔ وہ بڑی سادہ زندگی بسر کرنے کے قائل تھے اور وہ سادگی کو ہی پسند کرتے تھے۔

۶۔ وہ اس قدر علمیت کے مالک تھے کہ انھیں اپنی تحریروں میں جانکاہی اور عرق ریزی پر زور نہ ڈالنا پڑتا تھا۔ ان کے پاس دو جوہر خداداد تھے اول مضامین و مطلب کی بہتات اور دوسرے قدرت کلام اور الفاظ کی مساعدت۔ کیونکہ اگر یہ نہ ہوتے تو کلام میں ایسی صفائی اور روانی پیدا نہ کر سکتے تھے جو کہ ان کی تحریروں کی خوبی شمار کی جاتی ہے۔

۷۔ شیخ ابوالفضل کی یہ بڑی اہم خوبی تھی کہ وہ ضرورت کا بندہ اور وقت کا پابند تھا۔ بے ضرورت کوئی کام نہ کرتا تھا بلکہ اس کے قانون میں ہی یہ بات جائز نہ تھی۔

۸۔ ان کی طبیعت حاضر تھی اور عین موقع پر مدد دیتی تھی۔ وہ اپنی تصنیفات میں جو بھی مضمون لکھنا چاہتا تھا وہ نہایت سنجیدہ اور برجستہ الفاظ اور چست تراکیب کے ساتھ موزوں انداز سے لکھتا تھا۔ مگر ضرورت کے مطابق ہی بلکہ اس کی یہ سنجیدگی اور برجستگی بڑے بھائی فیضی کو حاصل تھی۔

۹۔ تواریخ سے ظاہر ہوتا ہے اور بزرگوں سے بھی لوگوں سے سنا ہے کہ یہ دونوں بھائی پہلو بجز تھے۔ اہل علم، اہل کمال، علماء، شرفاء، مشائخ اور اہل طریقت جو بھی دربار میں حاضر ہوتے تھے ان سے عزت سے ہی پیش آتے تھے ان کے درجات کے مطابق ان کی عزت و احترام کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ اس میں کسی کو شکایت کا کوئی موقع نہ دیتے تھے۔

۱۰۔ شیخ ابوالفضل بڑے مہمان نواز شخص تھے وہ مہمانی کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے تھے۔ مہمانوں کو دربار شاہی میں لیجاتے تھے اور اپنے پاس سے بھی خرچ کرتے تھے۔

۱۱۔ شیخ ابوالفضل کو ان کی والدہ نے ایک خط لکھا اور مطالب متفرقہ میں یہ بھی لکھا کہ:

"غربا اور اہل حاجت کی خبر گیری ضرور کیا کرو۔"

اس کے جواب میں انھوں نے اپنے فلسفی اور علمی خیالات کو بڑے اچھے اور پیار کے انداز میں ادا کیا ہے کہ:

اول تو بادشاہ کی عنایتوں اور نعمتوں کے شکریے ہیں۔ کہیں اپنے محاسن، اخلاق اور نیک نیتی کے دعوے ہیں۔ اس میں یہ کہ بادشاہ عنایتوں کو بھی خلق خدا کی ضروریات اور آسائش کے کام میں لاتا ہوں۔"

اس میں قبلہ ابوالفضل فرماتے ہیں کہ:

"جس شخص نے بے نماز کی دستگیری کی اس کے لیے فرشتے دوزخ میں کوٹھڑی بنائیں گے اور جس نے اہل عبادت اور نماز گزار کی دستگیری کی اس کے لیے بہشت میں ایوان بنائیں گے آستاد صدقنا۔ اور جو اس پر ایمان نہ لائے وہ کافر ہے لیکن ابوالفضل کی عاجز شریعت کا فتویٰ تیار یہ ہے کہ:

خیرات عام کرنی چاہیے۔ نمازیوں کو بھی دو اور بے نمازیوں کو بھی۔ کیونکہ بہشت میں گیا تو ایوان تیار ہے وہاں عیش کرے گا اور اگر دوزخ میں گیا اور بے نمازیوں کو کچھ دیا نہیں ہوگا تو ظاہر ہے کہ وہاں اس کے لیے گھر نہ ہوگا اور لوگوں کے گھروں میں گھستا پھرے گا۔ اس لیے ایک پرانا جھونپڑا وہاں بھی ضرور ہونا چاہیے۔ دور اندیشی کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اس راہ میں اپنے محبوں کو توفیق علی التحقیق عنایت کرے اور پھر ابوالفضل بے نوا کو مطالب اصلی اور مقاصد حقیقی تک پہنچائے۔ اپنے احسان سے اور اپنے کمال کرم سے۔

غرض شیخ ابوالفضل علوم و فنون میں باکمال اور تحریر میں حسن و جمال کے مالک ہونے کے علاوہ ایک اچھے انسان، پرخلوص اور وفادار درباری، اپنے آقا سے وفاداری کرنے والے اور ان کے نیک نیت اور بہی خواہ مشیر تھے۔ انھوں نے اپنی ساری عمر دربار اکبری میں بڑے حوصلے، تحمل اور عقلمندی کے ساتھ گزاری۔ مگر ان کا انجام جہانگیر کے اشاروں کے بل بوتے پر عمدہ نہ ہوا۔ شائد تقدیر میں ہی ایسا نوشتہ ہوگا۔ جس کا اکبر بادشاہ نے بہت بڑا افسوس کیا مگر وہ کر بھی کچھ نہ سکا۔ شائد اس نے اپنی اس میں مصلحت سمجھی ہوگی۔ بہرحال وہ بڑے اچھے انسان لوگوں کے ہمدرد، خیر خواہ اور غربا و مساکین کی امداد کرنے والے تھے۔

شیخ ابوالفضل کا دستر خوان

جو انسان کی زندگی میں دستر خوان بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ بھی انسان کی زندگی کا ایک لازمی جزو اور حصہ ہے اس کے بغیر ہر انسان

کی زندگی ادھوری اور تشنہ رہنے والی ہے تو آیئے شیخ ابوالفضل کے دسترخوان کا حال کا بھی مطالعہ کریں اور قارئین کو بھی تحریر میں لا کر مطلع کریں تاکہ ان کی معلومات میں بھی اضافہ ہو۔

مصنفین نے لکھا ہے کہ شیخ ابوالفضل کے دسترخوان کا حال سن کر بڑا تعجب ہوتا ہے۔ جس کی چند وجوہات ہوں گی۔

اجناس کا وزن ۲۲ سیر ہوتا تھا۔ یعنی جو کھانا باورچی خانہ میں تیار ہوتا ہے اس کا وزن ۲۲ سیر ہوتا ہے اور مختلف قسم کی اشیاء مختلف رنگوں میں پک کر دسترخوان پر آراستہ ہوتی تھیں۔ تو ان کے کھانے کی یہ تصویر ہوتی تھی کہ:

ان کا بیٹا عبدالرحمٰن ان کے پاس بیٹھتا تھا اور وہ خانساماں کی طرح دیکھتا رہتا تھا۔ مگر خانساماں بھی سامنے حاضر رہتا تھا۔ دونوں ہی شیخ صاحب کا بڑا خیال رکھتے تھے کہ کس رکابی میں سے دو تین یا زیادہ نوالے کھاتے وہ جس کھانے کو ایک دفعہ کھا لیتے تھے اس کو دوبارہ نہیں کھاتے تھے اور وہ دوسرے وقت پر دسترخوان پر نہیں آتا تھا۔ اگر کسی کھانے میں آب و نمک کا فرق ہوتا تو آپ صرف اشارہ فرماتے جس کا مطلب ہوتا تھا کہ "اسے چکھو" تو عبدالرحمٰن چکھ کر خانساماں کو دیتا تھا مگر منہ سے کچھ نہ کہتا تھا تو خانساماں اس وقت حکم کی تعمیل کرتا۔ تو یہ تو ان کے گھر کے معمول کے دسترخوان کی داستان ہوئی۔ اب وہ گھر کے علاوہ کئی مرتبہ جنگی مہمات پر گئے تھے تو اب یہ معلوم کرتے ہیں کہ وہاں ان کے دسترخوان کی کیا کیفیت تھی؟ اور وہاں ان کا دسترخوان کس طرح لگتا تھا اور اس دسترخوان میں کتنی قسم کے کھانے ہوتے تھے اور کھانے والے کی کیا کیفیات ہوتی تھیں؟ جب دکن کی مہم پر گئے تھے تو وہاں دسترخوان بڑا وسیع اور کھانے بڑے ہی پرتکلف اور عمدہ قسم کے تیار ہو کر دسترخوان پر آراستہ کیے جاتے تھے جن کے بارے میں شاید آج کل کے لوگ تصور بھی نہ کر سکیں۔ دسترخوان کی یہ کیفیت ہوتی تھی۔

شیخ ابوالفضل کا ایک بڑے خیمے میں دسترخوان لگایا جاتا تھا۔ ہزاروں عمدہ رکابیں جن میں بے شمار لوازمات ہوتے تھے اور وہ تمام رکابیاں /پلیٹیں مختلف امراء میں تقسیم ہو جاتی تھیں اس بڑے کے ساتھ ہی ایک دوسرا خیمہ بھی ہوتا تھا جو کہ بہت بڑا ہوتا تھا۔ اس خیمے میں کم درجے کے لوگ جمع ہو کر کھانا کھاتے تھے۔ مگر شیخ صاحب کا باورچی خانہ تو ہر گرم تیار رہتا تھا۔ ہر وقت کھانے تیار ہوتے رہتے تھے جس کا جی چاہے کھانا کھائے اور جب مرضی کھائے جتنا مرضی ہو کھائے کوئی کھانے کی پابندی نہ تھی۔ حتیٰ کہ سادہ خوراک کھچڑی کی دیگیں تو ہر وقت پکنے کے لیے رکھی رہتی تھیں۔ جو بھی غریب و مساکین میں سے بھوکا آتا تھا اس کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ یعنی شیخ صاحب کا دسترخوان ایک عام لنگر خانہ تھا۔ صرف ان کے لیے ہی دسترخوان نہ تھا بلکہ جو بھی آتا اس کو کھانا با افراط کھلایا جاتا تھا جو کہ ان کی فراخ دلی کا عکس یا نمونہ تھا۔

شیخ ابوالفضل کی ازدواج

شادی بھی ہر انسان کی ایک بشری ضروریات میں سے ہے۔ اس کے بغیر بھی خواہ کوئی عالم ہو یا جاہل۔ بادشاہ ہو یا گدا، امیر ہو یا غریب، وزیر ہو یا کبیر اس کا زندگی گزارنا مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان کے یہ بشری تقاضوں میں شامل ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی ہر مرد کے لیے عورت اس کی ضرورت کے تحت ہی تخلیق فرمائی ہے۔ تو اس ضرورت کے تحت شیخ ابوالفضل نے بھی اپنی زندگی میں تین شادیاں کیے بعد دیگرے رچائیں۔ جن کی مختصر تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے۔

۱۔ ہندوستانی بیوی

شیخ ابوالفضل کی یہ پہلی شادی ہوگی جو کہ اس کے ماں باپ نے اپنے بیٹے کے لیے سب سے پہلے پسند کر کے اس کو دی ہوگی۔ وہ ہندوستانی عورت تھی۔ ان کے ساتھ شیخ ابوالفضل کے بہت اچھے ازدواجی تعلقات تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی عزت اور احترام کرتے تھے۔

۲۔ کشمیرن بیوی

ہندوستانی بیوی کے بعد انھوں نے ایک دوسری شادی کشمیری خاندان میں بھی رچائی کیونکہ جب وہ جنگی مہمات میں نکلے تو ان علاقوں میں آفریح طبع کا کوئی اور تو سامان نہ تھا تو انھوں نے کسی مناسب خاندان میں ایک شادی ہی کر لی ہوگی۔ اگرچہ اس متین فاضل اور منصفانہ خیالات کے آدمی سے یہ بات بعید ہے مگر آخر وہ بھی انسان کے بچے تھے اور خود بھی انسان ہی تھے ان کا بھی کسی وقت دل شگفتہ ہوتا ہے۔

دوسری شادی کرنے میں کوئی قباحت اور برائی بھی نہیں ہے چہ جائیکہ انسان زنا کی برائی میں ملوث رہے تو اس کے لیے یہ شرعی طریقہ بہت بہتر ہے۔ انسان بے شمار برائیوں سے محفوظ رہتا ہے۔

۳۔ ایرانی بیوی

شیخ ابوالفضل نے تیسری شادی ایک ایرانی عورت سے کی۔ اس کے بارے میں یہ انکشاف کیا جاتا ہے کہ انھوں نے یہ شادی محض زبان کی درستی اور خاص خاص محاورات رواں کرنے کی غرض سے کی ہوگی کیونکہ شیخ صاحب فارسی انشا پردازی کا کام تو کرتے تھے اور زبان کا بھی جو یا تھا۔ ہزارہا محاورے ایسے ہوتے تھے کہ وہ اپنے مقام پر خود بخود ہی ادا ہو جاتے تھے نہ پوچھنے والا پوچھ سکتا تھا اور نہ بتانے والا بتا ہی سکتا تھا۔ صاحب زبان سیاق و سباق میں بول جاتا تھا۔ اور طالب زبان وہیں گرہ لگا کر باندھ لیتا تھا۔ یہ بھی ان کے حالات سے واضح ہوتا ہے کہ دونوں بھائیوں کی صحبت میں ہر وقت کئی ایرانی موجود اور حاضر رہتے تھے اور تمام وہ خدمت گار اور کسب و کار کے لوگ ایرانی ہی ہوتے تھے۔ مگر گھریلو باتیں تو گھر میں ہی ہوتی ہیں۔ اصل محاورات اس ترتیب کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے تھے تو یہ بات اخذ کی جا سکتی ہے کہ انھوں نے ایک بیوی تو ماں باپ کی مرضی سے حاصل کی اور دوسری کشمیر اور پنجاب کے علاقوں میں تنہائی کاٹنے کے لیے اور تیسری ایرانی بیوی فارسی زبان کی درستی کے لیے حاصل کی گئی تھی۔ تینوں بیویوں کے ساتھ ان کے تعلقات بہت اچھے تھے۔

☆ ☆ ☆

باب ۵

موتمن الدولہ عمدۃ الملک راجہ ٹوڈرمل

۱۔ ٹوڈرمل دھرم کرم اور پوجا پاٹ کی پابندی سے پورا بندو تھا۔

۲۔ بیوہ ماں کی دعاؤں کی برکت سے اکبر بادشاہ کے دربار میں اعلیٰ رتبے پائے۔

۳۔ ٹوڈرمل ذات کا کھتری اور گوت کا ٹنن تھا۔

۴۔ ٹوڈرمل متصدی گری کے علاوہ سپاہ گری و سرداری کے جوہر سے بھی مزین تھا۔

۵۔ ٹوڈرمل شاہی امور میں بڑے سخت مزاج کا وزیر اکبری دربار تھا۔

۶۔ ٹوڈرمل پابندی آئین احکام اور محاسبات عمل ودرآمد میں کسی سے بال بھر بھی رعایت نہ کرتا تھا۔

۷۔ اپنے درباری عمل وکارروائی کے لحاظ سے سخت مزاجی کا الزام لیتا تھا۔

۸۔ ٹوڈرمل کے بارے میں بعض کا خیال تھا کہ وہ لاہوری تھا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ وہ چونیاں ضلع لاہور کا تھا۔

۹۔ اصل میں وہ موضع لاہرپور علاقہ اودھ کا رہنے والا تھا۔

۱۰۔ اکبر کے دربار میں ۲۲ صوبوں کا دیوان کل اور وزیر با تدبیر تھا۔

۱۱۔ اس قدر اہم شخصیت پر کسی نے قلم نہ اٹھایا اور اس کے حالات زندگی نہ لکھے۔

۱۲۔ اس میں ہر بات کے حاصل کرنے کا شوق تھا اور کوشش کرتا تھا۔

راجہ ٹوڈرمل پر ایک طائرانہ نگاہ

پیدائش : اختلاف ہے بعض کا خیال ہے کہ لاہور کا تھا، مقام چونیاں ضلع لاہور مگر بعض نے موضع لاہر پور علاقہ اودھ کا رہنے والا لکھا ہے۔ (واللہ اعلم) (ایشیاٹک سوسائٹی)

نام : ٹوڈرمل

خطاب : کتاب خازن اسرار

ذات : کھتری (ہندو)

دربار اکبری میں مقام : ۲۲ صوبوں کا دیوان کل اور وزیر با تدبیر

وفات : ۹۹۷ھ

خاندان اگوت : ٹنڈن

پس منظری حالات

مورخین نے بڑے افسوس کا اظہار کیا ہے کہ اکبر بادشاہ کا ایک اہم درباری وزیر جو کہ کل کشور ہند کا دیوان تھا ان کے بارے میں کسی بھی مصنف نے قلم کو جنبش نہیں دی جس کی وجہ سے اس کے حالات زندگی معلوم کرنے کے لیے مشکلات کا سامنا ہے۔ اس سلسلے میں تحقیق کرنے کے لیے کئی پنڈتوں اور خاندانی بھائیوں سے رابطہ کیا گیا تو انھوں نے بتایا کہ:

وہ ذات کا کھتری اور گوت کا ٹھن تھا۔ اور پنجاب کے لوگ اس کو ہم وطنی پر فخر کرتے ہیں اور بعض لوگوں نے قدیم بھی بتایا کہ:

''وہ لاہوری تھا۔''

اور بعض کا یہ بھی کہنا ہے کہ:

''وہ چونیاں ضلع لاہور کا رہنے والا تھا اور وہاں اس کے بڑے بڑے عالیشان مکانات بھی موجود ہیں۔''

ٹمرایشیا ٹک سوسائٹی سے بھی اس کے وطن کی تحقیق کی تو انھوں نے بتایا کہ:

''راجہ ٹوڈرمل ضلع لاہر پور علاقہ اودھ کا رہنے والا تھا۔''

بہر حال وہ لاہور کا باشندہ ہو یا اودھ کا۔ اس کے والد بچپن میں ہی فوت ہو چکے تھے اور اس کی بیوہ ماں نے اس کی بڑی تنگ دستی اور غربت کی حالت میں پرورش کی۔ اور راجہ ٹوڈرمل اپنی ماں کی صدق دل کی دعاؤں کا نتیجہ تھا کہ وہ اکبر بادشاہ کے دربار میں پہنچ کر اس کے دل و دماغ پر چھا گیا تھا۔ راجہ ٹوڈرمل اکبر بادشاہ کے دربار میں ہندوستان کے ۲۲ صوبوں کا دیوان کل اور وزیر یا مدبر بن گیا تھا۔ وہ اس حیثیت میں واحد وزیر تھا۔ اس نے قبل وہ عام منشیوں کی طرح کم علم نوکری پیشہ فرد تھا اور مظفر خاں کے پاس کام کرتا تھا اور اس کے بعد بادشاہی منصبوں میں داخل ہو گیا راجہ ٹوڈرمل کی طبیعت میں غور و فکر، قواعد کی پابندی اور کام کو صفائی کے ساتھ کرنے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ وہ اپنی علم و لیاقت اور ساتھ اس کے کاروبار میں دلچسپی رکھنے کی وجہ سے ترقی کرتا چلا گیا۔ ہر کام کرنے کا سلیقہ ہوتا ہے کہ جو کام کو سنبھالتا ہے مثلاً اس کو ہر طرف سے سمیٹا چلا جاتا ہے اور کام سلیقے اور طریقے سے ختم کر کے جاتا ہے تو کام اس شخص کو ہی دیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہونے لگا تھا۔

جس کی وجہ سے اس کے پاس بھی بہت سی خدمتیں اور وزارتیں جمع ہو گئیں راجہ ٹوڈرمل ہر کام کو بڑے اچھے انداز اور صفائی و ستھرائی سے سرانجام دیتا تھا۔ اس کی معلومات، امور دفتر اور حالات و معاملات میں ایسی حالت ہو گئی تھی کہ امراء اور درباری لوگ ہر بات کا پتہ اس سے معلوم کرتے تھے۔ اس نے کاغذات دفتر اور مسلہائے مقدمات اور کھنڈ سے ہوتے کاموں کو بھی اصول و قواعد کے مطابق تیار کیے تھے اور رفتہ رفتہ بادشاہ کے سامنے حاضر ہو کر کاغذات پیش کرنے لگا تھا اور ہر کام میں اسی کا نام ہر ایک کی زبان پر آنے لگا۔ ان وجوہات کی وجہ سے سفر میں بھی بادشاہ کو اس کے ساتھ لینا واجب ہوتا تھا اور تقریباً ہر سفر میں بادشاہ سلامت کے ہمرکاب ہی ہوتا تھا۔

راجہ ٹوڈرمل کا مذہب

راجہ ٹوڈرمل دھوم دھرم اور پوجا پاٹ کی پابندی سے پورا ہندو تھا۔ مگر وہ وقت کو خوب سمجھتا اور جانتا تھا۔ حالات کی نزاکت کا پرستار تھا۔ اور وہ ضروریات وخصوصیات میں نظر وتمیز سے امتیاز کر سکتا تھا۔ ایسے مواقع پر اس نے دھوتی اتار کر زرہ پہن لیا تھا اور جامہ تار کر چغے پر ہر کمر کس لی تھی اور موزے چڑھا لیے۔ ترکوں میں گھوڑے دوڑائے پھرنے لگا اس وقت بادشاہی لشکر کوسوں کے میدان میں قیام پذیر تھا اگر کوئی ایک آدمی کو تلاش کرنا چاہتا تھا تو اس کو کئی دنوں کا عرصہ کی ضرورت ہوتی تھی تو اس نے پیادہ، سوار، توپ خانہ، بہیر، رسد اور بازو لشکر کے اتارنے کے لیے بھی پہلے اصولوں میں اصطلاحیں وضع کیں اور ہر ایک کو مناسب مقام پر لگا دیا۔ یہ بھی واضح رہے کہ اکبر بادشاہ بھی مردم شناس اور آدمیت کا جوہری اور خدمت کا صراف کہلاتا تھا۔ جب اکبر بادشاہ نے ٹوڈرمل کی بے پناہ صلاحیتوں اور پھرتی کا مشاہدہ ومعائنہ کیا تو وہ سمجھ گیا کہ یہ شخص متصدی گری کے علاوہ سپہ گری اور سرداری کا بھی جوہر باکمال رکھتا ہے۔ اس کی اس وقت ضرورت ہے۔

راجہ ٹوڈرمل کا فوج میں کردار

راجہ ٹوڈرمل آئین واحکام کی تعمیل اور محاسبات کے عمل درآمد کرنے میں کسی کے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہ کرتا تھا جس کی وجہ سے لوگ اس کی اس قدر سخت مزاجی اور ترشی کی وجہ سے اسے اس کا الزام بھی بے جا لگاتے تھے۔ ۱۷۹ھ دمعف مذکور کے ساتھ بھی اس طرح بھی سلوک کے کیا۔ جس کی وجہ سے اس کو نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ تو جب بادشاہ سلامت نے خان زماں خان کی مہم میں منعم خاں وغیرہ کو ''گڑھ مانک پور'' کی طرف روانہ کیا تو میر معز الملک کو بہادر خاں وغیرہ کے مقابلہ پر قنوج کی طرف روانہ کیا اور راجہ ٹوڈرمل کو کہا کہ:

''تم بھی جاؤ اور میر معز الملک کے ساتھ شامل ہو کر سرشور نمک خواروں کو سمجھاؤ تا کہ وہ راہ راست پر آ جائیں۔ تو بہتر ہے ورنہ وہ اپنی سزا پائیں گے۔''

تو جب راجہ ٹوڈرمل وہاں پہنچے تو ان کے درمیان گفت وشنید کا مرحلہ شروع ہوا تو بہادر خاں لڑنا پسند نہ کرتا تھا۔ مگر اس کے مقابلے میں میر معز الملک کا مزاج گرم تھا۔ تو عین صف موقع پر راجہ بارود بھی پہنچے تو معاملہ ایسا ٹھہرا کہ ان میں جنگ ہو گئی اور انھوں نے بڑا دیدہ ذلت اٹھائی۔ مگر راجہ کو شاباش ہے کہ میدان سے نہ ہٹا۔ مگر راجہ کو یہ نصیحت کی گئی تھی کہ:

''پیارے راجہ! گھر کے ملازموں کے ساتھ حساب وکتاب میں اپنے قواعد وضوابط کو جس طرح چاہو لاگو کرو لیکن سلطنت کی مہمات میں بگڑی بات کا بنانا کچھ اور ضوابط وآئین چاہتا ہے۔ وہاں کے اصول قوانین درگزر کے کاغذوں پر چشم پوشی کے حروف میں لکھے جاتے ہیں۔ جن کی تحریر سے آزاد کے دست قلم کوتاہی کرتے ہیں۔''

راجہ ٹوڈرمل کی جنگی خدمات

اکبر بادشاہ ملک گیری کا شکار تھا۔ اس کی یہ خواہش تھی کہ سارے ہندوستان میں اس کی طوطی بولے اور وہ سارے ہندوستان کا مالک

بنے تو اس نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ بروقت ہر موزوں آدمی کو اس اپنے تنظیم سپاہ گری کے مقصد کے لیے آزماتا رہتا تھا۔ تو چتوڑ، رن تھمبور اور سورت کی فتوحات میں راجہ ٹوڈرمل کی عرق ریز کوششوں نے مورخوں سے اقرار کرائے لیے کہ:

"قلعہ گیری کی تدبیریں اور اس کے سامان ولوازمات میں جو راجہ کی عقل رسا کام کرتی ہے وہ اسی کا کام تھا کسی دوسرے کو نصیب نہیں تھا۔"

۹۸۰ھ میں راجہ ٹوڈرمل کو حکم ہوا کہ وہ:

"گجرات جائے اور وہاں کے آئین مال اور جمع خرچ کے دفتر کا بندوبست کرے اور چند روز میں کاغذات مکمل کر کے لائے۔"

تو ۹۸۱ھ میں جبکہ منعم خاں بہار کی مہم پر سپہ سالاری کر رہے تھے تو وہاں لڑائی نے طول کھینچا۔ جس کا تجزیہ کرنے سے ذیل کے نتائج سامنے آئے کہ:

i- امرائے لشکر اپنی آرام طلبی کی وجہ سے بہادری سے جنگ نہیں کر رہے۔

ii- ان میں آپس میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔

iii- وہ غنیم کے ساتھ سختی کی بجائے رعایت سے کام لے رہے ہیں۔

تو ان حالات کے پیش نظر اکبر بادشاہ نے راجہ ٹوڈرمل جو کہ بڑے ہی وفادار اور با اعتباری کا مقام حاصل کر چکے تھے۔ ان کو اس مہم کے لیے روانہ کیا۔ اس کو چند اہم امرائے نامی مشہور کے ساتھ فوجیں دے کر اور کمک دے کر روانہ کیا تا کہ وہاں جا کر اس مہم کو صحیح سمت میں سر کرے اور جو سپہ سالار سست یا فتنہ گری کا شکار ہے۔ انھیں جو سوں خدمت سمجھ کر اس طرح کام دیں کہ گویا حاضر حضور ہیں۔ اکبر بادشاہ نے راجہ ٹوڈرمل کے ساتھ شہباز خاں کمبوہ وغیرہ کو ہمراہ کیا اور لشکر کے انتظامات اور نگرانی کے لیے بھی خصوصی ہدایات دیں اور اچھی طرح رہنمائی دے کر روانہ کیا۔ راجہ ٹوڈرمل بڑی پھرتی کے ساتھ وہاں پہنچے اور خان خاناں کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ اس وقت دشمن مقابلہ پر کھڑا تھا۔ میدان جنگ کا جائزہ لیا گیا اور لڑنے کے لیے تیاری کی گئی۔ راجہ نے اپنے تمام لشکر کی حالت کا جائزہ لیا۔ اب راجہ ٹوڈرمل کی لیاقت اور صلاحیت کا اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ:

میدان جنگ میں بڑے پرانے کہنہ مشق اور تجربہ کار جنھوں نے ساری عمر میدان جنگوں میں تلواریں ماریں اور اس قدر شہرت اور بہادری کے تمغے حاصل کیے اور فتوحات کا چارٹ دراز کیا۔ مملکت کو وسیع کیا اور اپنے نام کو دنیا میں چار چاند لگائے۔ ان میں بڑے بڑے بہادر، چغتائی، ترک، ہمایوں، بابر کے معرکے قابل ذکر ہیں۔ وہ تمام اپنے اپنے کندھوں پر بھاری پھلدار تمغے سجائے کھڑے تھے اور یہ قلم کا شاہکار متصدی گمنام کھتری ان کی جگہ چھینے لگا۔ ایسا کیوں نہ کرتا؟ جبکہ وہ اس منصب کے لائق تھا تو وہ اپنا مرتبہ کیوں حاصل نہ کرے اور اکبر جیسا منصف بادشاہ اس کو اس اعزاز سے کیوں نہ نوازے؟

بنگالہ کی فتح

جب پٹنہ فتح ہوا تو اس مہم میں بھی اس کا کردار بڑا ہی نمایاں اور اہم تھا۔ اس نے اس قدر مردانہ وار سفارشیں کیں کہ علم اور نقارہ دلوایا۔ منعم

خاں کو رخصت سے جدا شہ ہونے دیا اور بنگال کی مہم کے لیے جو امرا کا انتخاب کیا گیا۔ ان میں اس کا نام شامل تھا کیونکہ وہ اس مہم کا روح رواں ثابت ہوا۔ چنانچہ ہر معرکہ میں مستعد اور کمربستہ ہو کر کام کیا۔ مگر راجہ ٹوڈرمل بڑا ہی مستعد اور چست و چالاک شخص تھا کہ اس نے تانڈہ کی مہم میں بھی بڑا اہم کردار ادا کیا اور اس نے ایسی ہمت اور دلیری کا مظاہرہ کیا کہ اس کا نام منعم خاں سپہ سالار کے ساتھ سنہری حروف سے لکھا گیا اور قوم نے اس کی تعریف و توصیف سے یاد کیا۔ اور مبارک باد دی۔ بادشاہ اکبر نے ان سب کو انعامات سے نوازا تھا۔

جنید کراری کی بغاوت

راجہ ٹوڈرمل نے جنید کراری کی بغاوت کو دبا دیا تو دشمن سر پہ خاک ڈال کے بھاگ نکلا۔ مگر وہ پھر اپنی خفت مٹانے اور ان سے انتقام لینے کے لیے دوبارہ تیار ہو کر آیا۔ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب بھی ہوتے نظر آیا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ:

> اس موقع پر کوئی سردار منعم خاں سے اختلافات کی وجہ سے ناراض ہو گیا جس کی وجہ سے شاہی فوج میں قدرے ابتری پھیل گئی۔ تو اس موقع پر راجہ ٹوڈرمل نے بڑی دانائی اور دلیری سے اور اپنی ہمت و استقلال سے اس کی اصلاح کی اور اس نے مناسب انتظامات کر کے اس بغاوت کی سرکوبی کر لی۔

اس کے بعد عیسیٰ خاں نیازی فوج لے کر حملہ آور ہوا اور قیا خاں گنگ کے مورچہ پر سخت حملہ ہوا۔ جس کی وجہ سے حالات بڑے نازک ہوئے اس وقت امرا بھی آ گئے تھے مگر ٹوڈرمل بھی آ گئے اور انھوں نے اپنی دانائی اور ہمت سے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے کر ایسا سنبھالا کہ سب کی عقل دنگ رہ گئی اور دشمن کو زک اٹھانی پڑی۔ جس کی وجہ سے شاہی فوج سرخرو ہوئی۔

بدھوائی بنگالہ کی فتح

ہندوستان میں داؤد خاں سے ساز باز کر کے اپنے اہل و عیال کو رہتاس میں رہنے دیا اور خود فوج لے کر مقابلے کے لیے بڑھا تو جب اکبر بادشاہ کو اس کا علم ہوا تو اس نے اس مہم کے لیے بہادر راجہ ٹوڈرمل کا انتخاب کیا۔ امرائے شاہی ہر روز کی فوج کشی اور بدھوائی بنگالہ سے سخت بیزار ہو چکے تھے تو راجہ نے دیکھ کر:

یہاں میری بیم و امید کے منتظر کامیاب نہیں ہوں گے تو اس نے (راجہ ٹوڈرمل) منعم خاں جو کہ مشہور سپہ سالار بہادر تھا۔ اس کو لکھا مگر وہ بھی اس کے بارے میں فکر مند تھا۔ اور سخت تذبذب کا شکار تھا کہ اسی اثنا میں اکبری دربار سے سخت فرمان پہنچا تو اسے پڑھ کر خانخاناں بھی پا در رکاب ہو گئے اور وہ لشکر جرار لے کر دشمن کے مقابلے کے لیے تیار ہو کر چل پڑے تو طرفین کی افواج میدان میں آمنے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔

لشکر شاہی کا سپہ سالار منعم خاں تھا جو کہ بڑا ہی کہنہ مشق اور تجربہ کار سپہ سالار تھا وہ لشکر شاہی کے قلب میں سپہ سالاری کا نشان لیے ابھر رہا تھا اور دشمن کے لشکر کا گوجر خاں سپہ سالار تھا جو کہ بڑی بھاری جمعیت کے ساتھ اپنی پوری طاقت سے حملہ آور ہوا تھا۔ گوجر خاں بھی بڑا بہادر اور تجربہ کار سپہ سالار تھا۔ اور وہ بہت سی جنگوں میں شمولیت کر چکا تھا اور فتح یاب بھی ہو چکا تھا۔ پھر اس کے ساتھ داؤد خاں افغان کی بھی مدد شامل تھی تو اس نے

اس زور سے شاہی فوج پر یک بارگی سے حملہ کیا کہ شاہی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور شاہی فوج کے ہراول دستے کو قلب میں دھکیلتا لے گیا۔ منعم خاں جو کہ شاہی فوج کا نامور سپہ سالار تھا۔ تو وہ تین کوس تک بھاگا۔ گویا کہ شاہی فوج شکست پا کر بھاگ نکلی اور دشمن گوجر خاں نے تین کوس تک ان کا تعاقب کیا مگر آخرین اس راجہ ٹوڈرمل ہندو کھتری پر کہ جس کے پاس لشکر کا داہنا بازو تھا۔ وہ نہ صرف مقابلہ استقلال کے ساتھ جما رہا بلکہ وہ دوسرے سرداروں کے لیے حوصلہ کے الفاظ بھی دہراتا رہا۔ اور ان کو تسلی وتشفی دیتا رہا ان کے حوصلے بھی بلند کرتا رہا۔ تاکہ وہ بھی میدان جنگ سے بھاگ نہ جائیں اور بار بار ان کو یوں کہتا رہا کہ:

”بالکل نہ گھبراؤ اب دیکھو فتح کی ہوا چلتی ہے۔“

اسی اثنا میں دشمن نے خاں عالم کے ساتھ خانخاناں کے مرنے کی خبر اڑا دی جس سے فوج کے حوصلے پست ہونے لگے مگر یہ خبر غلط تھی کیونکہ وہ تو اپنی فوج کے ساتھ کھڑے تھے تو رفیقوں نے جب یہ خبر ٹوڈرمل کو سنائی تو راجہ ٹوڈرمل نے کہا کہ:

”اگر خانخاناں نہ رہا تو کیا ہوا؟ ہم اکبری اقبال کی سپہ سالاری پر لڑتے ہیں۔ وہ سلامت رہے دیکھو اب انھیں فنا کیے دیتے ہیں۔ تم بالکل نہ گھبراؤ۔“

اس کے بعد موقع پا کر اس نے دائیں سے یہ اور بائیں طرف سے شاہم خاں جلائر اس زور وشور سے حملہ آور ہوا کہ دشمن کے حواس باختہ ہو گئے اور انھوں نے دشمن کے لشکر کا تہ وبالا کر دیا۔ اتنے میں گوجر خاں کے مرنے کی خبر پہنچی۔ اس وقت افغان بدحواس ہو کر بھاگے اور لشکر شاہی کو فتح حاصل ہوئی تو اس فتح کا سہرا بھی راجہ ٹوڈرمل کے سر پر ہی رکھا گیا تھا۔ ورنہ شاہی فوج کا سپہ سالار منعم خاں تو تین کوس تک بھاگ چکا تھا۔

داؤد کی بدحالی کا منظر

۹۸۳ھ میں داؤد کا ایسا دائرہ تنگ ہوا کہ وہ صلح پر مجبور ہو گیا۔ اگرچہ شاہی لشکر بھی اپنی مشکلات کی وجہ سے پریشان ضرور تھا مگر داؤد کی طرف سے بوڑھے بوڑھے افغان اور امرائے لشکر کے خیموں میں آ پہنچے اور انھوں نے صلح کا پیغام دیا۔ خانخاناں کا آئین سپہ سالاری ہمیشہ سے صلح پر موقوف تھا۔ لہٰذا ان کے صلاح وسلام کے پیام سے وہ راضی ہو گیا کیونکہ اس کے اپنے امرا پہلے ہی تنگ ہو رہے تھے۔ اسی وجہ سے بھی اس نے اس موقع کو غنیمت جانا تو سب سے مشورہ لیا گیا تو سب نے صلح کرنے پر اتفاق کیا۔ ان میں صرف ایک ٹوڈرمل ہی تھا جو کہ ہمیشہ اپنے آرام وسکون کو آقا کے نام پر قربان کرتا رہتا تھا۔ وہ اکیلا داؤد خاں کی طرف سے صلح وسلام کے پیام پر راضی نہ ہوا اور ٹوڈرمل نے کہا کہ:

”اب دشمن کی جڑ اکھڑ چکی ہے اور تھوڑی سی ہمت اور کوشش سے افغان فنا ہو جائیں گے۔ ان کی التجائیں اور اپنے آرام وسکون کی پرواہ نہ کرو۔ ان پر حملے جاری رکھو اور ان کا تعاقب کرو۔“

امرائے لشکر نے ٹوڈرمل کو ہر لحاظ سے قائل کرنے کی کوشش کی مگر وہ اس کی ایک نہ مانا۔ اگرچہ صلح ہوئی اور اس کا دربار بڑے شان وشکوہ کے ساتھ آراستہ کیا گیا اور تمام لشکر نے عید منائی مگر وہ بات کا پکا تھا وہ دربار میں بھی حاضر نہ ہوا۔ خانخاناں نے بڑے جتن کیے مگر اس نے کسی کی بھی نہ سنی۔ حتیٰ کہ صلح کی شرائط پر بھی اس نے اپنی مہر ثبت نہ کی جو کہ اس کی مستقل مزاجی اور ذہن کے پکے ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

داؤد کی بنگالہ میں دوبارہ بغاوت

اس صلح نامہ کے بعد راجہ ٹوڈرمل کو اکبر نے دربار میں بلایا تو راجہ ٹوڈرمل اکبر کے حضور میں پہنچ کر ساری داستان بیان کر دی جس سے اکبر بڑا خوش ہوا اور ٹوڈرمل نے اپنے مالک کو خوش کرنے کے لیے ۵۰ اعلیٰ نسل کے ہاتھی بھی لے جا کر پیش کیے کیونکہ اکبر کو ہاتھی بہت پسند تھے اور یہ ہاتھی بنگالہ میں مشہور تھے۔ اکبر نے خوش ہو کر ٹوڈرمل کو عالی منصب دیوانی عطا فرمایا اور چند دنوں میں تمام ملکی اور مالی خدمتیں اس کی راستی روشن کے حوالے کر دیں اور اس کو وزارت کل اور وکالت کل کی مسند پر جگہ دی۔

مگر افسوس کی بات یہ تھی کہ اسی سال فوج شاہی کا نامور سپہ سالار منعم خاں بھی فوت ہو گیا۔ مگر فساد تو ہر جگہ قائم ہوتا ہی رہتا تھا۔ لہٰذا داؤد نے اپنی پوزیشن کو مضبوط کر کے دوبارہ بغاوت کا علم بلند کر دیا اور افغان اپنی اصلیت کو دوبارہ ظاہر کرنے لگے۔ غرضیکہ سارے بنگالہ میں دوبارہ باغی دندنانے لگے اور ملک میں بغاوت پھیل گئی۔

تو جب بادشاہ کو اس بغاوت کا علم ہوا تو اس نے خان جہاں کے ذمہ یہ کام سپرد کر دیا اور اس کے ساتھ ٹوڈرمل کو بھی کر دیا تو جب وہ بہار میں پہنچے تو چاروں طرف تدبیروں اور تجربوں کے ہراول دوڑا دیے۔ جاری اور وہ لشکری امراء گھروں کے پھرنے کو تیار تھے اسے دیکھ کر حیران ہو گئے کیونکہ زبردست اور کاروان افسر کے پیچھے کام دینا کچھ آسان نہیں تو بعض نے خرابی موسم کا بہانہ کیا تو بعض نے کہا کہ:

''یہ قزلباش ہے ہم اس کے ماتحت نہیں رہ سکتے۔ خاندانی تجربہ کار کو اس علم میں دستگاہ تھی''

اس نے خاموشی اختیار کی اور سخاوت اور علو حوصلہ کے ساتھ فراخ دلی دکھاتا رہا۔ اسمٰعیل علی خاں اس کا بھائی پیش دستی کی تلوار ہاتھ میں لیے اور پیش قدمی کی فوجیں ساتھ لیے ہیروں طرف ترکستان کرنے لگا۔

راجہ ٹوڈرمل اپنے آقا کا بڑا ہی وفادار اور مخلص شخص تھا اس نے اپنی حکمت عملی سے سب کو قابو کر لیا اور اپنے زرغے میں پھنسا لیا۔ لشکر بنے کا ہنار ہا اور کام بھی جاری رہا۔ وہ دونوں باوقائل جل کر کام کرتے رہے۔ سپاہی کے دل اور سپہ کی قوت بڑھاتے رہے لیکن جا بجا لڑائیاں اور صف آرائیاں جاری تھیں اور وہ کامیابی پر ختم ہوتی تھیں۔ راجہ ٹوڈرمل کبھی دائیں طرف تو کبھی بائیں طرف ہو کر اس دلاوری کے ساتھ عین موقع پر کام کرتا تھا کہ وہ سارے لشکر کو سنبھال لیتا تھا۔ غرض کہ بنگالہ کا بگڑا ہوا انتظام پھر سے اس نے سیدھا کر لیا اور اپنے مقاصد میں راجہ کامیاب ہو گیا۔

معرکہ کا میدان آخری حملہ داؤد کا تھا۔ شیر شاہی اور سلیم شاہی عہد کی کھرچن اور پرانے پرانے پٹھانوں کو اکٹھا کر کے لایا اور عین برسات کے موسم میں گنگا کی طرح پہاڑ سے اٹھا اور یہ حملہ کا تھا کہ اکبر نے خود آگرہ سے سواری کا سامان کیا۔ جنگ کا آغاز ہوا اور دونوں لشکر قلعہ باندھ کر سامنے آئے تو شاہی لشکر کی یوں صف آرائی ہوئی کہ:

''خان جہاں فوج کے قلب میں تھا اور ٹوڈرمل بائیں طرف تھے۔''

دونوں بہادر سردار اس بہادری اور دلیری کے ساتھ لڑے کہ ان کے دل کے ارمان پورے ہو گئے۔ اکبر اور اکبر کے امراء کی نیت صاف تھی جو کہ کام آ گئی تو اس شدید لڑائی میں باغی فوج کا سپہ سالار داؤد قتل ہو گیا تو اس کے خاتمے سے جنگ بھی ختم ہو گئی اور قوم افغان کی بنگالہ اور بہار

سے جز کٹ گئی تو ٹوڈرمل نے دربار میں حاضر ہو کر ۳۰۴ ہاتھی نذر گزارے کیونکہ اکبر بادشاہ کے لیے یہی اس ملک کا بڑا تحفہ سمجھا جاتا تھا اور مہم کے فتح نامے پر خان جہاں اور ٹوڈرمل کے نام سنہری حروف میں لکھے گئے تھے۔

گجرات اور سرحد دکن کی بغاوت کی سرکوبی

ابھی راجہ ٹوڈرمل بنگالہ سے فارغ ہو کر آیا ہی تھا اور اس نے سکون کا سانس بھی نہ لیا تھا اس کی تھکن بھی دور نہ ہوئی تھی کہ وزیر خاں کی غلط حکمت عملی سے گجرات اور سرحد دکن میں بغاوت پھیل گئی۔ لوگوں نے تباہ حالی کا شعور بلند کیا تو جب ان حالات کا علم اکبر بادشاہ کو ہوا تو اس نے نامور راجہ ٹوڈرمل کو اس مہم کے لیے انتخاب کیا اور راجہ معتمد الدولہ راجہ ٹوڈرمل کو وہاں فوری طور پر جا کر حالات کو درست کرنے کا حکم دیا۔ تو راجہ ٹوڈرمل سلطان پور ملک نذر بار سے ہوتا ہوا بندر سورت گیا اور وہاں سے بھڑوچ، بڑودہ، چانپا نیر سے ہوتا ہوا گجرات سے ہو کر پٹن کے دفتر مالیات کو دیکھنے کے لیے گیا۔ گجرات کے علاقہ میں فساد برپا کیا اور اس کے ساتھ اور باغی بھی مل گئے اور ملک میں ہی الاعلان غدر مچ گیا تو وزیر خاں نے سامان جنگ اور قلعہ در چیل کے ٹوٹے پھوٹے کا بندوبست کیا اور بسم اللہ کے گنبد میں بند ہو کر بیٹھ گیا اور اس کے ساتھ ہی اس ٹوڈرمل کو اطلاع کرنے کے لیے اپنے شاہی قاصدوں کو بھی دوڑایا۔ ٹوڈرمل تو قلم چلانے والا انسان تھا۔ تلوار کا دھنی تو سپہ سالاروں کی طرح نہ تھا۔ مگر اس شخص نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ صرف میں قلم کا ہی چلانے والا نہیں ہوں موقع آنے پر اپنی جان بھی آقا کی خاطر ہتھیلی پر رکھ کر پیش کر سکتا ہوں۔ اگرچہ ہندو دال خور ہی ہوں مگر آقا کا وفادار اور مخلص ہوں۔

ٹوڈرمل گجرات پہنچا تو وزیر خاں کو مردہ بنا کر شہر سے باہر نکالا اور فسادی بڑودہ پر قابض تھے تو وہاں پہنچے چار کوس کے فاصلے پر بڑودہ واقع تھا۔ تو جب انھوں نے (باغیوں نے) ان کو آتے دیکھا تو وہ قبضہ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ ان کا تعاقب کیا گیا کہ ایت سے جونا گڑھ سے ہوتے ہوئے دولقہ کے تنگ میدان میں جا کر رکے۔

راجہ ٹوڈرمل کی فوجوں سے مقابلہ

باغی دولقہ کے تنگ میدان میں جا کر رک گئے اور وہ جا رمقابلے کے لیے بھی تیار ہو گئے۔ دونوں افواج کا دولقہ کے میدان میں مقابلہ ہوا۔ تو وزیر خاں فوج کے قلب میں تھا اور راجہ ٹوڈرمل چاروں طرف آراستہ فوج کو سنبھالے پھرتا تھا مگر زیادہ حصہ راجہ کا بائیں طرف کا تھا۔ اس سے قبل دشمن نے آپس میں یہ صلاح مشورہ کیا ہوا تھا کہ:

> "صفیں باندھتے ہی زوردار حملہ کرو کچھ سامنے رہو اور باقی دفعتہً بھاگ نکلو۔ اکبری بہادر ضرور تعاقب کریں گے۔ راجہ ہی آگے ہوتا تو موقع پا کر پلٹ پڑو۔ پھر دونوں یعنی وزیر خاں اور راجہ ٹوڈرمل کو گھیر لو اور دونوں کو قتل کر دو تو کام تمام ہو جائے گا۔"

اصل میں ان کو زیادہ خوف ڈر راجہ ٹوڈرمل کا ہی تھا۔ غرض جب لڑائی شروع ہوئی تو مرزا امریل چال سے وزیر خاں پر آئے اور مہر علی کولابی جو کہ اصل فساد کا بانی تھا۔ راجہ پر حملہ آور ہوا مگر راجہ سد سکندر تھا۔ وہ اس سے ٹکر کھا کر پیچھے پلٹ گیا۔ بادشاہی لشکر کا داہنا ہاتھ بھاگا اور قلب والوں نے

بھی کمزوری کا مظاہرہ کیا مگر وزیر خاں اپنے بہادروں کے ساتھ خوب مقابلہ کرتا رہا۔ اور قریب تھا کہ وہ اپنے ننگ وناموس پر جان بھی قربان کر دیتا کہ راجہ ٹوڈرمل نے اسے دیکھا اور اس بیٹے کے جوش سے جس میں ہزاروں دل کا جوش بھرا تھا۔ گھوڑے کو دوڑایا اور دشمن کی فوج کو الٹتا پلٹتا پہنچا اور اس زور سے آ کر گرا کہ حریف کے بندوبست کا سب تانابانا ختم ہو گیا۔

کامران کے بیٹے نے عورتوں کو مردانہ لباس پہنا کر گھوڑوں پر سوار کر دیا تھا۔ وہ عورتیں خوب تیراندازی اور نیزہ بازی کرتی رہیں۔ غرض بہت سے کشت وخون کے بعد دشمن بھاگ نکلا اور مال غنیمت بہت سا چھوڑ گیا۔ بہت سے باغی ہلاک ہوئے اور با تعداد گرفتار بھی ہو گئے تو ٹوڈرمل نے لوٹ کے سامان اور ہاتھی اور قیدیوں کو جوں کا توں اسی لباس میں اور وہی تیر وکمان میں لیس ہاتھ میں دے کر ان کو اکبر بادشاہ کے دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا کہ زنانی مردانگی کا نمونہ بھی حضور دیکھ لیں۔ دعا داس کے رشید بیٹے نے انہیں دربار میں لا کر پیش کیا۔

راجہ ٹوڈرمل کی جنگی چالوں اور اس کی حکمت عملی سے یہ بھی اخذ کیا جاتا ہے کہ وہ عقل کی جنگ لڑنے کا ماہر تھا اگرچہ وہ جنگ لڑنے کا عملی طور پر اتنا بہادر اور دلیر شاید نہ ہو گا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اس کی صلاحیتوں کے مطابق عقل و دانائی دے رکھی ہے۔ یہی حکمت و دانائی انسانی کیا حیوانی طاقت سے بھی زیادہ زور رکھتی ہے۔ کیونکہ عام مشاہدہ ہے کہ انسان نے صرف اسی عقل کے ذریعے دنیا کے قوی ہیکل جانوروں اور دیگر اشیاء کو قابو میں کر رکھا ہے۔ اگرچہ طاقت میں زیادہ اور جسیم جانور ہیں جو کہ انسان کو اٹھائے پھرتے ہیں۔ مگر انسان نے ان کو کان سے پکڑ رکھا ہے اور وہ جسیم جانور یعنی ہاتھی اونٹ گھوڑا وغیرہ انسان کے آگے مجبور و معذور ہیں۔ تو یہ ماننا پڑے گا کہ عقل سے راجہ ٹوڈرمل جنگ جیتتا تھا نہ کہ جسمانی بہادری اور دلاوری سے۔ مصنف کا یہ بھی خیال ہے کہ ممکن ہے کہ وہ بہادر اور دلیر بھی ہو کیونکہ بزدل نے میدان میں کیا آنا ہوتا ہے مگر چونکہ وہ ہندو تھا۔ اس لیے قیاس آرائی ہے کہ میدان جنگ کا آدمی نہیں ہو گا۔

بنگالہ میں دوبارہ بغاوت

۹۸۷ھ میں بنگالہ میں دوبارہ بغاوت کی وبا پھوٹ پڑی مگر اس دفعہ اس بغاوت کا رنگ ہی مختلف تھا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ امرائے شاہی میں بھی اختلاف پایا جاتا تھا۔ جو کہ سخت خطرناک حالت میں تھا۔ بلکہ اس کے نتائج بھی بڑے بھیانک نظر آ سکتے تھے۔ یہ امراء اور سرداران سپاہ سپہ سالار سے باغی ہو گئے ہیں اور تعجب یہ ہے کہ سب کے سب ترک اور مغل تھے۔ تو جب اکبر کو اس بغاوت کا علم ہوا تو اکبر نے ٹوڈرمل کو اس بغاوت کو سر کرنے کے لیے روانہ کیا اور اس کے ساتھ جو سردار دیئے تھے ان کا تعلق بھی ہندوستان سے ہی تھا اور وہ ان سب کو اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اس کے بھائی بندھی ہیں مگر ان کے مقابلے پر تمام باغی لوگ تھے مگر وہ قدیم چغتائی خاندان کے سردار تھے اور وہ نمک خوار بھی تھے تو اس طرح دونوں اطراف اپنی ہی تلواروں سے اپنوں کے ہی ہاتھ پاؤں کٹ سکتے تھے۔ اس پر مشکل یہ تھی کہ شاہی فوج مسلمان تھی اور باغی ہندو تھے مگر ٹوڈرمل بڑے ہی قابل اور لائق تھے انھوں نے بڑی سمجھداری اور ہوشمندی سے اس کام کو سرانجام دیا تھا اور ٹوڈرمل نے تدبیر کے ساتھ شمشیر کے بھی اعلیٰ جوہر دکھائے جو تدبیر سے قابو میں آ سکتے تھے ان کو تدبیر میں قابو کر لیا گیا اور جو تدبیر سے قابو میں نہ آیا تو ان کو شمشیر سے علاج کیا گیا۔ نمک حلال لوگوں نے۔ مگر دونوں طرف خلق خدا کی ہی تباہی تھی اور بندگان بادشاہی تباہ ہوتے تھے۔

اس مہم میں بعض منافق بداندیشوں نے سازش کی تھی کہ لشکر کے موجودات کے وقت راجہ ٹوڈرمل کو قتل کر دیں کیونکہ یہ بلوہ کا خون ہوگا جس کا کسی پر بھی اثر نہیں پڑے گا۔ مگر راجہ ٹوڈرمل بھی بڑا ذمہ دار اور سمجھدار دانشمند شخص تھا۔ اس نے بھی اپنے آپ کو اس انداز سے محفوظ کر رکھا ہے ان کے بس میں نہ آسکا۔ اور وہ اپنے مقصد کامیاب نہ ہو پائے اور بداندیشوں کا بھی پردہ رہ گیا۔

اس مہم میں اس نے منگیر کے گرد فصیل اور دمدمہ بنا رکھا تھا جس سے اس کے گرد ایک مضبوط قلعہ بن گیا تھا۔

راجہ ٹوڈرمل ۹۷۷ھ کو تمام جھگڑے ختم کر کے واپس دربار میں آیا اور اپنے عہدہ وزارت کی مستقل مسند پر براجمان ہوا دیوان کل ہو گیا اور ۲۲ صوبوں کا ہندوستان پر اس کا قلم چلنے لگا۔

۹۹۰ھ اس نے بادشاہ کا جشن ضیافت اپنے گھر میں سرانجام دیا اکبر بادشاہ بندہ نواز وفاداروں کا کارساز تھا اس کے گھر تشریف لے گئے جس سے ٹوڈرمل کی عزت افزائی ہوئی مگر باقی ہزاروں حاسدوں کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ اس قدر ٹوڈرمل کی عزت افزائی کو دیکھ کر حسد کی آگ میں جلنے لگے تو اکبر بادشاہ نے ٹوڈرمل کو ۹۹۳ھ میں چار ہزاری منصب عطا کیا جو کہ بہت زیادہ اور اعلیٰ درجے کا منصب تھا۔ اس اعلان سے اس کے حاسدوں کی اور آگ بھڑکی مگر وہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ سوائے اس کے کہ وہ اپنے حسد کی آگ میں جلتے رہیں مگر اکبر نے بھی اپنے وفا اور لوگوں کی صحیح حوصلہ افزائی کی اور اس کا حق ادا کیا۔

کوہستانی یوسف زئی سواد کی مہم

۹۹۳ھ میں ہی تقریباً کوہستانی یوسف زئی سواد کی مہم چھوٹی جس میں راجہ بیربر ہلاک ہوا۔ جس کا بادشاہ کو بڑا رنج ہوا۔ مگر دوسرے دن ان کو اس مہم کے لیے روانہ کیا گیا تھا اور راجہ مان سنگھ جمرود کے مقام پر تھا۔ وہ تاریکیوں کے ہجوم میں تلوار سے روشنی کر رہا تھا ان کو حکم دیا گیا کہ:

”وہ راجہ سے جا کر مل جائیں۔ اور اس کے مشورے کے تحت کام کرو۔“

تو راجہ نے کوہ لنگ کے قریب سواد کے پہلو میں چھاؤنی ڈال دی۔ اور فوجوں کو پھیلا دیا۔ رہزنوں کی حقیقت کو سمجھا۔ انھوں نے رہزنوں کو قتل کیا اور جو باقی بچ گئے ان کو بھگا دیا گیا۔ انھوں نے سرکشوں اور باغیوں کی گردنیں خوب ماریں۔ اور سرخرو ہو کر واپس دربار میں بڑی شان کے ساتھ آئے اور باقی سرحد کا معاملہ کنور مان سنگھ کے ذمہ لگا دیا گیا۔ مان سنگھ بھی بڑا ذمہ دار اور بہادر سپہ سالار تھا۔ اس نے بعد میں بڑے اچھے انداز سے وہاں کا انتظام سنبھالا اور لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے اقدامات کیے۔ جس سے لوگوں میں امن و امان کی فضا لوٹ آئی۔

راجہ ٹوڈرمل کی بیماری

۹۹۷ھ کو اکبر بادشاہ نے کشمیر جانے کا ارادہ کیا۔ ان کا یہ پروگرام ہوتا تھا کہ پورش کے لیے موقع پر دو جلیل القدر شخص دارالسلطنت میں رہا کرتے تھے تاکہ وہ سلطنت کے کام کی بھی نگرانی کرتے رہیں اور سلطنت کا کام ذمہ داری سے آسانی سے چلتا رہے تو اس آئین کے تحت ذیل کے دو اشخاص کو سلطنت کی امور کے لیے چھوڑ آیا تھا۔

i- راجہ ٹوڈرمل ii- لاہور کا انتظام راجہ بھگوان داس کے سپرد ہوا تھا۔

راجہ ٹوڈرمل عمر کے لحاظ سے ضعیف ہو چکے تھے۔ جس کی وجہ سے ان پر اکثر بیماریوں کا حملہ ہوتا رہتا تھا۔ تو اس وقت بھی ان پر بیماری کا حملہ ہوا تو انھوں نے اکبر بادشاہ کو یہ درخواست لکھی کہ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ:

''بیماری نے بڑھاپے سے سازش کر کے زندگی پر حملہ کیا ہے اور بیماری غالب آ چکی ہے۔ اور موت کا زمانہ قریب نظر آتا ہے۔ لہٰذا اگر اجازت ہو تو سب سے ہاتھ اٹھا کر گنگا کے قریب جا کر ڈیرے لگالوں اور خدا کی یاد میں آخری سانس نکالوں۔''

بادشاہ نے اول تو اس کی خوشی کو مدنظر رکھتے ہوئے فرمان اجازت جاری کر دیا تھا کہ وہاں افسردہ طبیعت شگفتگی پر آ جائے گی مگر اس کے بادشاہ نے دوسرا فرمان یوں جاری فرمایا کہ:

''کوئی خدا پرستی حاجتمندوں اور غمخواری کو نہیں پہنچتی۔ بہت بہتر ہے کہ اس ارادے سے باز ہو جاؤ اور آخیر دم تک انھیں کے کام میں لگے رہو۔''

اور اسے آخرت کا سفر سمجھو۔ مگر ٹوڈرمل اکبر بادشاہ کی طرف سے پہلی اجازت کے مطابق بیمار جسم اور صحت مند جان لے کر ہردوار چلنے کے لیے تیار تھے کہ لاہور کے قریب اپنے ہی تعمیر کردہ تالاب کے قریب ڈیرا تھا تو جب آقا کا دوسرا حکم موصول ہوا تو ملتوی کر دیا۔

شیخ ابوالفضل نے اس تحریر پر کیسا لطف اندوز سرٹیفکیٹ دیا ہے کہ راجہ ٹوڈرمل نے بادشاہ کی نافرمانی کو خدا کی نافرمانی سمجھ لیا ہے۔ اس لیے جب فرمان وہاں پہنچا اور فرمانبرداری کی اور گیارھویں دن یہاں کے پالے ہوئے جسم کو وہیں رخصت کر گئے۔

راجہ ٹوڈرمل بے شک روشن، صدق، مراتب، مردم شناسی اور معاملہ شناسی، ہندوستان کی سربراہی میں بے مثال شخص تھا مگر بڑا ہی متعصب، غالبانہ حیثیت کا مالک، کینہ پرور وغیرہ شخص تھا جو کہ اس کی تمام خوبیوں اور اوصاف کے لیے ایک بدلہ تھا اور ان برائیوں کا وزن اس کی اچھائیوں سے زیادہ نظر آتا ہے۔ اس لیے علماء کا خیال ہے کہ جتنا وہ قابل اور معاملہ فہم اور دانشمند آدمی تھا۔ اگر اس کے اندر یہ برائیاں ظاہری نہ ہوتیں تو وہ یقیناً بزرگان معنوی میں سے ہوتا۔

اس کی موت سے معاملات کی حق گزاری کے بازار میں وہ گرمی رہی۔ ایسے انسانوں کا ملنا بھی تو ناممکن نہیں تو مشکل ضرور نظر آتا ہے۔

ٹوڈرمل کی عمر کے بارے میں کسی نے بھی کہیں ذکر نہیں کیا۔ صرف ملا صاحب کی تحریر سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے عمر کی بھی برکت پائی تھی۔ حضرت تو سب پر ناراض ہی رہتے تھے۔ وہ شاہ فتح اللہ اور حکیم ابوالفتح پر خفا ہوئے تھے اور ٹوڈرمل تو ہندو مذہب کا شخص تھا۔ اس پر تو جتنا بھی غصہ جھاڑ لیا جائے کم ہے کیونکہ وہ تو بعد ازقسم کے ہوتے ہیں۔

راجہ ٹوڈرمل کی دیانت اور امانت

راجہ ٹوڈرمل اس دار فانی سے رخصت ہو گیا۔ اب اس کی کارگزاری کی باتیں اکبر بادشاہ اور اس کے درباریوں کی زبانوں پر رہ گئیں تو سب سے پہلے ٹوڈرمل کا مہربان، مشفق اور قدردان آقا ٹوڈرمل کی امانت اور دیانت کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: اکبر کو ٹوڈرمل کی عقل و

تدبیر پر جتنا یقین اور اعتماد تھا۔ اس سے زیادہ وہ اس کی امانت اور دیانت، نمک حلالی اور وفاشعاری پر بھی اعتماد رکھتا تھا۔ کیونکہ جب وہ پٹنہ کی مہم پر اپنی جان پر کھیل رہا تھا تو اس وقت اس نے اپنے دفتری کام کو رائے رام داس کے حوالے کر رکھا تھا کیونکہ وہ بھی ان کی نگاہ میں اور نیک نیتی سے کام کرنے والا نوکر تھا اور اسے دیوانی کا خلعت بھی عطا کیا گیا تھا مگر حکم ہوا کہ:

”طلب تنخواہ کے کاغذات راجہ ٹوڈرمل کے محرر و منشی اپنے ہی پاس رکھیں۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ مالیات میں وہ کسی پر اعتبار نہ کرتا تھا۔“

راجہ ٹوڈرمل کے اچھے اثر و رسوخ اور امانت و دیانت کے اثرات کی وجہ سے اس کے رشتہ داروں پر بھی بہت اچھا اثر پڑتا تھا اور ان پر اعتبار کیا جاتا تھا۔ چنانچہ جنگ بہار کی مہم میں نواڑوں اور کشتیوں کا انتظام پرمانند کے حوالے کیا گیا تھا جو کہ راجہ ٹوڈرمل کے اپنے لوگوں میں سے تھا۔ یہ ایک بڑی اہم بات ہے مگر راجہ ٹوڈرمل کی سیرت کا ایک تعریفی پہلو تھا کہ وہ خود ستائش شخص نہ تھا اور کوئی بھی عمدہ کام کر کے اپنے آپ کو لوگوں میں نمایاں کرنا پسند نہ کرتا تھا۔ جس کی مثالیں اس کے مختلف مقامات پر اس کے کردار سے واضح ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ فرمائیں کہ:

راجہ ٹوڈرمل نے اکبر بادشاہ کے حکم پر کئی اہم لڑائیوں میں بھرپور حصہ لیا اور اپنی جانفشانی اور بہادری سے ان جنگوں میں فتح بھی حاصل کی۔ لڑائیوں میں وہ سپہ سالار بھی مقرر ہوا مگر اس نے کبھی اپنے دل میں اس بات کا احساس کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ فوج کا سپہ سالار ہے۔ بلکہ اس نے اپنے آپ کو کسی سے بلند نہ ہونے دیا وہ شخص تو محض اپنے آقا کی خوشنودی کے تحت اور اس کے حکم پر محو ہو کر بلکہ اپنے حال اور خیال سے بے خبر ہو کر کام کو سرانجام دیتا تھا۔ آپ نے یہ بھی مشاہدہ کیا ہوگا کہ:

”وہ ہر مہم میں کیسے بروقت پہنچتا تھا اور ہر معرکہ میں جان تو اس کے فتح کے لیے فوج کو نوید سناتا تھا۔ بنگالہ کی مہم میں بعض سردار سے سپاہی تک بے دل ہو کر بھاگنے کو تیار تھے۔ مگر اس آقا کے وفادار اور نیک نیت شخص نے کہیں دمداری سے اور کہیں غمخواری سے، کہیں بیم و امید سے مقدمہ مطلب منقوش خاطر کر کے سب کو میدان جنگ میں ہی بھاگنے سے باز رکھا۔ اور جنگ میں برابر شرکت کرتے رہے۔ جس کی جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور شاہی فوج کو فتح حاصل ہوئی۔ تو ایسے کئی واقعات دربار اکبری کتاب میں منقوش ہیں جن کا مطالعہ ہر ایک شخص کے لیے اس کی دیانت و امانت پر ایک سرٹیفکیٹ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ وہ ہندو اہلکار تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس ہندو میں بھی قابل تعریف اقدار ڈال رکھی تھیں کیونکہ وہ تو بے نیاز ہے ہندو بھی اس کی ہی مخلوق ہے اور مسلمان بھی۔ مگر دونوں میں پہچان اور کردار کا ہی فرق ہے۔ جس پر اس کی عاقبت کا نتیجہ انحصار کرتا ہے۔ اگر ایسا ہندو مسلمان ہو جائے تو یقیناً ولایت کا اہل ہوتا مگر اس کا اپنا مقدر کہ جس کے سبب وہ پیدا ہوا تھا اس پر ختم ہوا۔ یہ بھی اس کی دیانت کی نشانی ہے کہ وہ آخری دم تک اکبر کا وفاشعار اور تابع فرمان ہی رہا۔

راجہ ٹوڈرمل کی ہوشیاری

راجہ ٹوڈرمل بڑا دانا، دوراندیش اور ہوشیار درباری تھا۔ وہ ہر وقت اپنے مالک کی خوشی کے لیے کام کرتا تھا۔ اس نے کبھی بھی اپنی ذات یا اپنے مالک سے ہٹ کر کسی دوسرے شخص کی مرضی یا امن کو مدنظر نہیں رکھا۔ جس کی مثال حسن قلی خاں کی سپہ سالاری کے واقعے سے عیاں ہوتی ہے کہ:

اکبر بادشاہ نے جنید کراری کی بغاوت کو فرو کرنے کے لیے حسن قلی خاں کو فوج کا سپہ سالار مقرر کر دیا۔ جس سے ترک سوار بگڑ گئے۔ جس

کی وجہ سے فوج میں ابتری اور بدامنی پھیل گئی جو کہ جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے مضر تھی اور ان کی ناانصافی اور اندرونی چپقلش سے دشمن ان پر غالب آرہا تھا اور شاہی فوج شکست کی صورت میں پسپا ہوتی نظر آ رہی تھی۔ جو کہ سب کے لیے شرم کی بات تھی۔ یہاں غیرت کا سوال تھا تو راجہ ٹوڈرمل نے بڑی ہوشیاری اور دانائی سے اپنے آقا کی خوشنودی اور خوشی کی خاطر اس وقت ایسا جنگی ماحول پیدا کر دیا اور اس طرح اس نے ترک سپاہیوں کے ساتھ نرمی سے سلوک روا رکھا کہ سب سردار خانجہاں کی اطاعت پر راضی ہو گئے اور لڑائی میں خوب جان توڑ کر انھوں نے مقابلہ کیا۔ اور اس بغاوت کو انھوں نے فرو کر لیا۔ جہاں سے بعض بہت سا مال غنیمت حاصل ہوا جو کہ اکبر بادشاہ کے دربار میں لے جا کر پیش کیا گیا اور ہر ایک نے داد دلیری حاصل کی تو گویا کہ راجہ ٹوڈرمل بڑا ہی سمجھدار اور ہوشیار شخص تھا۔ موقع شناس اور مردم شناس تھا ہر شخص کی دکھتی نبض پر ہاتھ رکھنا اس کا کام تھا۔ تا کہ مناسب علاج ہو۔

راجہ ٹوڈرمل کی علمی صلاحیتیں

راجہ ٹوڈرمل کی علمی صلاحیتوں کا اندازہ اس کی بہتر درباری کارکردگی پر لگایا جاسکتا ہے۔ اس نے کس خوش اسلوبی پر ہندوستان کے ۲۲ صدیوں کے قلمدان کو سنبھال رکھا تھا۔ علمی صلاحیتوں کا مشاہدہ کریں۔

۱۔ راجہ ٹوڈرمل اپنے دفتری تحریروں کو بخوبی آسانی سے پڑھ سکتا تھا۔ مگر اس کی طبیعت ایسی قواعد وضوابط پسند تھی کہ جس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔

۲۔ سلطنت کے مالیات کے معاملات ایسے اچھے انداز سے جانچتا تھا اور اس کے صحیح نتائج ایسے آسانی سے اخذ کرتا تھا کہ دیکھنے والا بڑا حیران رہ جاتا تھا۔ یعنی وہ بڑا ہی ماہر مالیات تصور کیا جاتا تھا۔

۳۔ اس سے پہلے سلطنت کے حساب کا دفتر بالکل ہی درہم برہم تھا۔ فائلوں میں بڑی بدنظمی اور بے ترتیبی تھی کیونکہ ہندو ملازم کام کرتے تھے تو ہندوستانیوں کی قومی زبان ہندی تھی اور وہ اس زبان میں سرکاری کام بھی کرتے تھے اور یہی زبان جانتے بھی تھے تو ان ملازموں نے ہندی کاغذوں میں کام کرنا شروع کر رکھا تھا اور اس کے برعکس جہاں ولایتی لوگ ملازم تھے یعنی جو لوگ اصل ہندوستان کے باشندے نہ تھے کسی غیر علاقے سے یہاں آکر ملازمت کر رہے تھے یا آکر آباد ہو گئے تھے وغیرہ وغیرہ تو وہ چونکہ ہندوستان کی مقامی زبان کو نہ جانتے تھے اور نہ ہندوستان کی قومی زبان میں سرکاری کام ہی کر سکتے تھے تو وہ فارسی زبان میں سرکاری امور انجام دیتے تھے تو گویا ہندوستان میں دو طرح کی زبانوں میں کام جاری تھا تو اس سے یہ مسائل پیدا ہو رہے کہ اگر کوئی ولایتی ملازم کو ہندی فائل ریکارڈ پڑھنا پڑھتے تو وہ نہیں پڑھ سکتا تھا اور اس طرح ہندی ملازم کو فارسی پڑھنی نہیں آتی تو اس طرح سلطنت یا حکومت کے کام میں رخنے پڑتے تھے تو اس اہم مسئلے کو حل کرنے کے لیے راجہ ٹوڈرمل نے اپنے دوسرے رفقائے کار سے مل کر جن میں فیضی، میر فتح اللہ شیرازی، حکیم ابوالفتح، حکیم ہمام اور نظام الدین بخشی وغیرہ شامل تھے۔ ان سب کو اکٹھا کر ان کی مشاورت حاصل کرتے ہوئے دفتری قواعد وضوابط مرتب کیے جن کی بدولت مستقبل میں ماضی کے مسائل خود بخود حل ہو گئے اور ملازمین ہندی اور ولایتی کو سرکاری امور کے سلسلے میں بڑی آسانی پیدا ہو گئی اور فائلوں کی ترتیب اور ریکارڈ میں بھی بڑی سہولت حاصل ہوئی تو یہ راجہ ٹوڈرمل کا ایک علمی نقطہ نگاہ سے علمی صلاحیتوں کا ایک

اجاگر ثبوت ہے۔ جس کو آج بھی دربار اکبری کی کتابوں میں نمایاں مقام پر جگہ دی گئی ہے۔ یہ بھی واضح ہوا کہ راجہ ٹوڈرمل کی اس علمی صلاحیت کی وجہ سے روز مرہ کے کام میں تیزی اور بہتری پیدا ہوئی۔ سابقہ پیچیدگیاں ختم ہو گئیں۔

راجہ ٹوڈرمل اپنی اس علمی صلاحیت کے باعث کافی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ دفتری امور کے بارے میں بہت سی اصطلاحیں اور الفاظ ایسے موجود ہیں جو کہ صرف دفتری زبان کے ہی الفاظ تصور ہوتے ہیں اور ان کا رواج آج تک محکمہ مال اور مالیات کے ریکارڈ میں رائج ہے۔ جس سے دفتری امور کو سمجھنے اور نمٹانے میں اہلکاروں کو بڑی سہولت حاصل ہوتی ہے۔ تو یہ ایسے ہی علمی صلاحیتوں کے پیکر ماہرین کی بدولت ماضی میں گوہر نایاب حاصل ہوئے تھے۔ جن کی تعریف و توصیف ہر ایک شخص سے بعید ہے۔

ہندوستان میں فارسی کی ترویج

یہ تاریخ ہند سے واضح ہوتا ہے کہ ہندوستان میں باہر سے جتنے بھی حملہ آور آئے اور انھوں نے ہندوستان پر حملہ کر کے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کی ان سب کا تعلق ترک، مغلیہ اور فارس کے علاقے سے تھا اور تقریباً تمام کی زبان فارسی تھی یا پھر وہ عربی جانتے تھے مگر ہندوستان کی قومی زبان تو ہندی تھی اور اس کے علاوہ علاقائی زبانیں بے شمار تھیں۔ تو ہر حکمران نے یہ کوشش کی ہے کہ ان کے زیر سایہ علاقے میں اس کی اپنی زبان رائج ہو تاکہ اس کی زبان کو بھی فروغ ہو اور لوگوں کو جاننے اور سمجھنے میں اس کو مدد مل سکے اور اس طریقے سے اس کا ملکی انتظام اور انصرام بھی بڑی عمدگی سے جاری رہ سکے گا۔ لوگوں کے خیالات جذبات اور مذہب کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ مگر ہندوستان کی حالت بڑی مختلف تھی۔

تو سکندر لودھی کی حکومت تک دھرم وان ہندو فارسی یا عربی شناسا تھے۔ ان کو ان دونوں زبانوں کے بارے میں کوئی علمی واقفیت نہ تھی۔ انھوں نے ان زبانوں کا نام ملکش بدھیار رکھا ہوا تھا ''یعنی غیر ملکی زبانیں'' مگر حکومت اس کی ضرورت کو شدت سے محسوس کر چکی تھی مگر عملی قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔ جس کی ترویج کے لیے راجہ ٹوڈرمل نے تجویز دی کہ

''کل قلمرو ہندوستان میں یک قلم دفتر فارسی ہو جائیں۔''

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جو ہندو اہل قلم، اہل تجارت، صاحب زراعت ہوں انھیں ضرور فارسی خود بھی پڑھنی چاہیے اور آگے اس کو رائج کیا جائے۔ اس سے ہندوستان میں بے چینی اور اضطراب سا پیدا ہو گیا اور چند روز تک حکومت کے لیے بھی مشکلات پیش آئیں۔ مگر راجہ ٹوڈرمل نے اس کے ساتھ یہ بھی خیال ان کے اذہان میں ڈال دیا کہ

''بادشاہ وقت کی زبان رزق کی کنجی اور دربار شاہی کی دلیل ہے۔''

جس کا یہ مطلب ہے کہ جو کوئی بادشاہ کی زبان فارسی سیکھے گا تو اس کو سرکار ملازمت اور اعلیٰ منصب عطا کرے گی جس سے اس کو بھاری تنخواہ اور دیگر سرکاری سہولیات میسر ہوں گی اور اس زبان دانی کی وجہ سے وہ دربار میں بھی آنے کے اہل ہو گا۔ وہاں بحث و تمحیص میں حصہ لے گا جس سے اس کی شان و شوکت میں اضافہ ہو گا اور اس کی انسانی حیثیت میں معاشرے میں اضافہ ہو گا۔ تو یہ بات لوگوں کی سمجھ میں آ گئی۔

اس کے علاوہ بادشاہ اکبر بھی بڑا ہی ملنسار شخص تھا۔ اس نے بھی سارے ہندوستان پر حکومت کرنے کا عہد کر رکھا تھا تو اس نے بھی لوگوں

سے محبت اور پیار سے راہ و رسم پیدا کر کے ان کے دلوں کی مچھلیوں کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ جس کی وجہ سے تمام عوام کے رہنماؤں اور عوام کے ذہنوں نے اس ٹوڈرمل کی تجویز کو قبول کر لیا اور چند سال کے عرصہ میں ہی بہت سے ہندو فارسی خواں اور فارسی دان پیدا ہو گئے اور ہندوستان میں فارسی زبان کا رواج پڑ گیا جو کہ راجہ ٹوڈرمل اور اکبر شہنشاہ کا بہت بڑا کارنامہ شمار ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے دفتروں میں اہل ولایت کے پہلو بہ پہلو ہندی اہلکار بیٹھنے لگے تاکہ ان سے فارسی کی اصطلاحیں سیکھ سکیں۔ ان کا بھی احترام بڑھ گیا۔ یہ ٹوڈرمل کی حکمت عملی کا ایک ثبوت تھا کہ اس نے کس طرح قوم کے مالی اور ملکی منصوبوں کے لیے شاہراہ کھولی ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ راجہ ٹوڈرمل کی بدولت ہندوستان میں فارسی زبان کو یہ مقام نصیب ہوا۔ ورنہ اکبر اعظم کے بعد تو مغلیہ حکومت نے کمزوری کی طرف رخ کر لیا تھا تو اس زبان کا ہندوستان میں رائج ہونا بڑا ہی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ اس ٹوڈرمل کے قدم سے فارسی زبان ہندوؤں کے گھر کی مالکہ بن گئی اور اس کے بعد اردو زبان کی بنیاد بھی استوار ہونے لگی اور آج ہم اردو زبان میں بے شمار الفاظ فارسی کے بھی پاتے ہیں۔

۹۹۰ھ میں سونے سے تانبے تک کل سکوں میں اصطلاحیں ہوئیں تو ان میں بھی راجہ ٹوڈرمل کی تجاویز شامل ہیں جو کہ آج تک ترویج کل ہیں۔ گویا راجہ ٹوڈرمل بڑا ہی منصوبے ساز اور مختلف منصوبوں پر بڑی دانائی اور عقل سے کام کرنے والا شخص تھا۔ وہ اکبر کا بہت ہی مخلص، وفادار اور اطاعت شعار درباری تھا۔ اس نے اپنی شخصیت کو اپنے آقا کی اطاعت اور خوشنودی کے وقف کر رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے آقا بھی اس پر جان نچھاور کرتے تھے اور اس کی عزت و احترام کا ہر وقت احساس و خیال اس کو رہتا تھا۔ آقا اور غلام دونوں ہی ایک دوسرے سے مخلص اور مشفق بھی تھے جو کہ ہر آقا اور غلام کی پہلی کامیابی کے لیے اولین شرط ہوتی ہے۔

راجہ ٹوڈرمل کی مذہبی خدمات

راجہ ٹوڈرمل کی ایک اہم تصنیف لاہور اور کشمیر کے لوگوں میں ملتی ہے جس کا نام "خازن اسرار" پایا گیا ہے مگر یہ کتاب نایاب نظر آتی ہے۔ اس کو بڑی مشکل سے کشمیر سے تلاش کی گئی تو اس کا دیباچہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ ۱۰۰۵ھ کی تصنیف ہے جبکہ خود راجہ ٹوڈرمل ۹۹۷ھ میں مر گیا تھا۔ اس میں یہ بھی مبالغہ ہو سکتا ہے کہ اس نے لکھ کر رکھ چھوڑی ہو اور اس کے مرنے کے بعد اس کو چھپوانے کے انتظامات کیے گئے ہوں اس کو موت نے مہلت نہ دی ہو۔

اس کتاب کے دو حصے بنائے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک حصہ میں دھرم، گیان، اشنان اور ہندو طریقے کے مطابق پوجا پاٹ وغیرہ کے طریقے شامل ہیں۔

جبکہ دوسرے حصہ میں کاروبار دنیاوی پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ مگر دونوں میں چھوٹے چھوٹے بہت سے باب ہیں اور ان میں ہر ایک چیز کا ذکر کیا گیا ہے مگر ہے سب یکجا۔ اور اس کے دوسرے حصہ میں علم الاخلاق، تدبیر المنزل کے علاوہ اختیار، ساعات، موسیقی، سرود، شگون آواز طیور، پرواز طیور، وغیرہ تک کے بارے میں روشنی ڈالی گئی ہے کتاب مذکور سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ کس قدر اپنے مذہب کا پکا پیروکار تھا وہ ہمیشہ گیان اور دھیان میں رہتا تھا اور پوجا پاٹ، مذہبی لوازمات حرف بحرف ادا کرتا تھا۔ چونکہ وہ اس زمانے میں قیدی اور آزادی کی فصل بہ در پہ تھی۔ اس لیے

ان خصائل کے ساتھ انگشت نما تھا۔ بلکہ وہ کہتا تھا کہ کہاں ہیں وہ لوگ؟ جو کہتے ہیں کہ:

نوکر وفادار جبھی ہوتا ہے جب اس کے خیالات اور حالات بلکہ مذہب اور اعتقاد بھی اس کے آقا کے ساتھ ایک جیسے ہوں۔ وہ آ کر اس کا بغور مشاہدہ و معائنہ کریں اور راجہ ٹوڈرمل کے حالات سے سبق حاصل کریں کہ:

"سچے مذہب والے وہی لوگ ہیں جو اپنے آقا کی خدمت صدق یقین سے کرتے ہیں بلکہ جتنا صدق و یقین مذہب میں زیادہ ہوگا۔ اتنی ہی وفاداری اور جانثاری زیادہ صدق و یقین کے ساتھ ہوگی۔"

راجہ ٹوڈرمل کی نیت کتنی اچھی تھی کہ اس کا پھل دیکھیں کہ اس کا اس کو اجر کس طرح ملتا رہا کہ:

اکبری دربار میں کوئی بھی اس رتبہ میں اس سے زیادہ نہ تھا بلکہ راجہ ٹوڈرمل سب درباریوں سے زیادہ باعزت اور قابل احترام درباری تھا۔ اس کے ذمہ ہندوستان کے بائیس صوبوں کا انتظام تھا جو کہ بہت زیادہ بادشاہ کے اعتماد کا ثبوت تھا۔ اس کے علاوہ اور کسی بھی درباری کے پاس اس قدر کام کا بوجھ اور ذمہ داری نہ تھی تو یہ راجہ کی اپنی نیت کا پھل تھا۔ چونکہ وہ صاف نیت تھا اور اپنے آقا کے ساتھ وفادار اور مخلص تھا۔ حالانکہ آقا مسلمان تھا اور راجہ ہندو مذہب کا پرستار تھا مگر دونوں میں کوئی فرق محسوس نہیں کر سکتا تھا۔

راجہ ٹوڈرمل جب تک پوجا نہ کرتے تھے کھانا تک نہ کھاتے تھے؟

کسی بھی مذہبی آدمی کو بعض اوقات مذہب کی ضروریات بھی بہت تنگ کرتی ہیں تو ایسا ہی واقعہ راجہ ٹوڈرمل کے ساتھ بھی اس وقت پیش آیا جبکہ بادشاہ اکبر اجمیر سے پنجاب آ رہے تھے تو وہ سفر کی حالت میں تھے کہ ایک دن کوچ کی گھبراہٹ میں ٹھاکروں کا آسن کہیں گم ہو گیا۔ یا وزیر سلطنت کا تھیلہ سمجھ کر کسی نے چرا لیا ہو مگر راجہ کا قاعدہ تھا کہ:

جب تک وہ بھگوان کی عبادت نہ کر لیتے تھے کوئی بھی کام نہ کرتے تھے اور کھانا بھی نہ کھاتے تھے۔ راجہ ٹوڈرمل کو اس مذہبی جذبات کی وجہ سے کئی دن کا فاقہ برداشت کرنا پڑا۔ اس کا اکبری لشکر میں بھی چرچا ہو گیا کہ:

"راجہ کی ٹھاکر چوری ہو گیا ہے۔"

تو لشکر میں بہت سے مسخرے اور میراثی، فاضل شہدے اور بیربر جیسے کئی چنڈت اور بدھیان موجود تھے۔ تو انھوں نے اپنے منہ کی بات کر کے بھڑاس نکالی تو بادشاہ نے بلا کر کہا کہ:

"ٹھاکر چوری ہو گیا۔ ان داتا تمہارا ایشور ہے وہ تو چوری نہیں ہوا۔ اشنان کر کے اسے یاد کرو اور کھانا کھاؤ۔ خودکشی کسی مذہب میں جائز نہیں ہے۔"

تو راجہ نے بھی اس خیال سے رجوع کیا۔ اکبری دربار کے مصنف کا خیال ہے کہ کہنے والے تو اپنی مرضی سے کہتے ہی ہیں مگر راجہ ٹوڈرمل کا اب تک مثالی استقلال ہزار تعریفوں کے لائق ہے۔ اس نے بھی بیربر کی طرح درباری ہوا میں آ کر اپنا دین تو نہیں چھوڑا۔ نہ دین الٰہی اکبر شاہی کے خلیفہ ہوئے۔ بہرحال صرف خلافت ہی ان کے لیے مبارک رہی تھی۔

عادات واخلاق

شیخ ابوالفضل نے راجہ ٹوڈرمل کے اخلاق وعادات کے بارے میں یوں لکھا ہے کہ:

اگر وہ تعصب کا پرستار، تقلید کی محبت اور کینہ کشی نہ ہوتی اور وہ اپنی بات پر مغرور ہو کر نہ اڑتا تو وہ بزرگان معنوی میں سے شمار ہوتا۔

عوام الناس کا خیال ہے کہ شیخ ابوالفضل مذہبی شخص تھے جس کسی کو پابند مذہب دیکھتے تھے اور بزرگوں کی تقلید کرتے دیکھتے تھے اس کی ضرور برائی کرتے تھے مگر دربار اکبری کے مصنف آزاد کا کہنا ہے کہ:

''یہ سب درست ہے لیکن ابوالفضل بھی تو ایک انسان ہی تھے۔ اس جگہ نہیں بلکہ انھوں نے کئی دوسری جگہوں پر بھی ایسے فقرات تراشے ہیں۔ جس سے ظاہر ہے کہ کسی نہ کسی جگہ پر تو ضرور لوگوں کو اس سے نقصان پہنچا ہوگا۔ جن کی بنا پر اس کو یہ فقرات کہنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔''

جب وہ بنگالہ کی مہم سے فتح کر کے آئے تھے تو ۵۴ بنگالہ کے نامور ہاتھی اکبر بادشاہ کے لیے مال غنیمت سے بطور تحفے لائے تھے تاکہ اکبر بادشاہ خوش ہو تو بادشاہ نے مقدمات مالی ملکی اس کے فہم درست پر حوالہ کر کے دیوان کل ہندوستان کا مقرر فرمایا تھا جو کہ خوشامد کا نتیجہ تھا۔

راجہ ٹوڈرمل بڑا راستی اور کم طمعی میں عمدہ خدمت گزار تھا۔ وہ بے لالچ کام کرتا تھا۔ البتہ اگر وہ کینہ کش نہ ہوتا تو طبیعت کے کھیت میں ذرا ملامت پھوٹ نکلتی۔ اس میں تعصب کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس لیے اس کی زیادہ ملامت کی جاتی تھی۔ اس کے باوجود عام اہل زمانہ کو دیکھ کر کہنا چاہیے کہ راجہ ٹوڈرمل سیر دل انسان تھا اور وہ کسی قسم کا کسی سے لالچ نہ رکھتا تھا اور عرق ریزی کے ساتھ محنت اور کام کرتا تھا۔ وہ قدر دان خدمت گزار تھا اور بے نظیر قسم کا شخص تھا اگر ٹوڈرمل کی شخصیت کا تجزیہ کیا جائے تو ایک تجزیہ نگار یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ:

راجہ ٹوڈرمل بھی ایک انسان ہی تھا اور انسانوں والی تمام خوبیاں اور خامیاں اس سے متوقع تھیں۔ ان وجوہات کی بنا پر اگر وہ اس میں کینہ کشی کا مادہ نہ ہوتا تو اتنے بڑے اور اہم عہدے پر کام کرتے ہوئے وہ دن میں کئی ملازمین اور دیگر افراد سے گھبراتا ہوگا اور ان کا اس سے بار بار رابطہ ہوتا ہوگا۔ تو اگر اس نے ایک مرتبہ کسی سے رعایت کر لی ہوں تو دوسری مرتبہ سختی بھی کر دی ہوگی تو اس سختی کو کینہ کشی شمار نہ کرنا مناسب ہوگا۔

چونکہ ضابطہ اور اصول بھی اپنی جگہ پر اہمیت کے حامل ہوتے ہیں جن کی وجہ سے سلطنت اور حکومت کے کام چلتے ہیں۔ مگر ہر جگہ ہر آدمی کے لیے اصول وضوابط کو ترک کر دیا جائے تو عین ممکن ہے کہ حکومت کا کام درہم برہم ہو جائے اور سلطنت عام ٹھپ ہو کر رہ جائے۔

اس لیے یہ ضروریات تھی کہ دنیا بھی ایک نازک مقام ہے۔ اگر یہاں دشمنی سے بچاؤ نہ کیا جائے تو زندگی گزارنی دوبھر ہو جائے اور انسان کا گزارہ کہاں تک ہو۔

اس طرح اس کے مغرور ہونے پر بحث کرنا مناسب ہوگا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دیوان تھا اور امرائے عالیشان سے لے کر غریب سپاہی تک اور صاحبان ملک سے لے کر ادنیٰ معافی دار تک سب کا حساب وکتاب اس کے ذمہ تھا اور واجب میں کسی کی رعایت کرنے والا نہ تھا اور چونکہ وہ ہوشیار اہلکار تھا ہر ایک نقطے کی اسے خبر تھی اور دنیا میں ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک اپنی کفایت اور اپنا فائدہ چاہتے تھے تو ان حالات میں اپنی حیثیت کو

درست رکھنے اور محفوظ عزت کی خاطر ایک ایک پائی کا خیال رکھنا ہوگا۔ مگر لوگ اس کے خلاف تجتیں کرتے ہوں گے۔ چونکہ لین دین کا کام تھا لوگ کچھ اس کو کہہ بھی نہ سکتے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ان معاملات میں لوگ سفارشیں بھی کرتے۔ اور دوسروں سے بھی کرواتے ہوں گے۔ اگر کوئی جائز سفارش ہوتی تو وہ مان بھی جاتا ہوگا اور ناجائز کو مسترد بھی کر دیتا ہوگا۔ تو جس کی سفارش مسترد کی جاتی ہوگی وہ ضرور مغرور کے الفاظ سے یاد کرتا ہوگا جو کہ حقیقت سے بالاتر بات تھی اور یہ بھی ممکن ہے کہ لوگ دربار تک بھی پہنچ جاتے ہوں تو اس مقام پر بھی راجہ اپنا دفاع کر لیتا ہوگا۔ مگر یہ بات بھی مسلمہ تھی کہ اکبر بادشاہ بڑا ہی نرم طبع اور سمجھدار آدمی تھا۔ وہ ہر ایک کے ساتھ نرم خوئی کے ساتھ پیش آتا تھا مگر اس کے ساتھ ہی اس کو حکومت کے کام کو بھی تو آگے بڑھانا تھا تو اس صورت میں وہ اصول وضوابط کو بھی تو کرنا مناسب نہ سمجھتا تھا۔ تو ممکن ہے کہ بعض واقعات وہ بھی ان سے تنگ آ جاتا ہے اور جب بادشاہ تنگ آ جائے گا اور لوگوں کے کام نہیں ہوں گے تو لوگ اس سے بھی ناراض ہو جائیں گے۔ تو یہ کوئی بعید معاملہ نہیں ہے تو اسی وجہ سے ملا صاحب نے یہ اشعار کہے تھے اور انہی باتوں سے چل کر موزوں طبعوں نے اس کا مسخ کیا تھا۔

تحمل	ازو	کارہشد	شد	آنکہ
ٹوڈرمل		جہاست	را	راجہ

ان تمام حالات واقعات کے وہ جو کچھ بھی کرتا تھا وہ اپنے آقا اور مالک کی خیر خواہی اور خوشنودی کے لیے کرتا تھا۔ خزانہ شاہی میں داخل کرتا تھا اگر خود بیچ میں کتر لیتا تھا تو گنہگار اور وہ کترتا تو لوگ کب چھوڑتے تھے۔ اسی بے چارے کو کتر ڈالتے۔ یہی وجوہات تھیں کہ جن کی وجہ سے عوام الناس اس کی راستی اور درستی کو ہر شخص برابر تسلیم کرتا ہے اور راجہ ٹوڈرمل کے عادات واخلاق کی تعریف کیے بغیر کوئی بھی نہیں رہتا۔

بٹالوی صاحب خلاصۃ التواریخ رقمطراز ہے کہ:

اس نے عالمگیر جہانگیر کے زمانے میں پنجاب میں بیٹھ کر یہ کتاب تحریر میں لایا۔ اگر چہ اس نے راجہ ٹوڈرمل کی اصل نسل عمر اور سن ولادت ووفات کے بارے میں تو خاموش رہا۔ مگر اس کے اوصاف کے بارے میں لمبی وضاحت تحریر کی ہے جو کہ اس کی تقریباً اس کی راستی اور اصلیت کے الفاظ سے مرصع ہے۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ:

۱۔ راجہ ٹوڈرمل اکبر بادشاہ کا راز دان سلطنت تھا۔

۲۔ دقائق سیاق ودقائق حساب میں بے نظیر تھا۔ محاسبوں کے کاروبار میں باریکیاں اور غلطیاں ڈھونڈتا تھا۔

۳۔ ضوابط وقوانین وزارت، آئین سلطنت، ملک کی معموری رعیت کی آبادی، دفتر دیوان کے دستور العمل حقوق بادشاہی کے اصول، افزونی خزانہ، رستوں کی امنیت، مواجب سپاہ، شرح دامی پرگنات تنخواہ جاگیر، مناصب امرا کے قواعد، سب کچھ اس کی یادگار ہیں اور سب کچھ انھیں قواعد ضوابط پر عمل درآمد ہے۔

جمع دہ بدبھی پرستہ داراس نے باندھی۔

طنابی جریب خشکی اور تری میں گھٹ بڑھ جاتی ہے اور دو دو گز تھی۔ اس نے ۶۰ گز کی جریب بانس یا نرسل کی قرار دی اور لوہے کی کڑیاں بیچ

میں ڈالیں تاکہ کبھی بھی ان میں کمی و بیشی واقع نہ ہو اور ناپ صحیح ثابت ہو۔

اس کی تجویز سے ۹۸۲ھ میں کل ممالک محروسہ بارہ صوبوں میں تقسیم ہوئے اور دہ سالہ بندوبست ہو گیا اور گاؤں کے پرگنوں کی سرکار کے سلسلے میں انھوں نے چند سرکار کا ایک صوبہ قرار دیا اور ایک روپے کے چالیس دام مقرر ہوئے۔

ہر گنہ کی شرح دامی دفتر میں مندرجہ ہوئی۔

کرور دام پر ایک عامل مقرر کر کے کروری اس کا نام رکھا گیا۔

امرا کے ماتحت نوکر ہوئے تھے۔ ان کے گھوڑوں کے لیے داغ کا آئین مقرر ہوا کہ ایک جگہ کا گھوڑا دو دو تین تین جگہ دکھا دیتے تھے اور عین موقع پر کمی واقع ہو جاتی تھی جس سے نقصان ہوتا تھا۔ اس میں کبھی تو سواروں کی دغابازی ہوتی تھی کبھی امرا خود بھی دغا دے دیتے تھے۔ جب موجودات ہوتی تو فوراً سوار سپاہی نوکر رکھ لیتے اور لفافہ چڑھا کر موجودات دلوائی۔ ادھر سے رخصت ہوئے ادھر جا کر موقوف ہو جاتے شاہی کی سات ٹولیاں مقرر کی گئیں ہفتہ کے سات ایام ہوتے تھے تو سات دن کی وجہ سے ہر ٹولی میں سے باری باری آدمی لیتے جاتے تھے۔ جو کہ چوکی میں حاضر ہو کر کام کرتے تھے۔ ہر روز کے لیے چوکی پر روزانہ کام کرنے کے لیے ایک آدمی مقرر کیا گیا۔ جس کو چوکی نویس کا نام دیا گیا تا کہ ہر اہلکار خدمت کی حاضری بھی لے اور جو عرض و معروض حکم احکام ہوں جاری بھی کرے اور جا بجا پہنچائے تا کہ اس کا انتظام درست رہے۔

ہفتہ کے سات واقعہ نویس مقرر ہوئے اور تمام دن کا حال ڈیوڑھی پر بیٹھے لکھا جایا کریں۔

امرا سدوخوانین کے علاوہ چار ہزار یکہ سوار خاص رکاب شاہی کے لیے قرار دیے۔ انھیں کو احدی کہا جاتا تھا۔ کہ یکہ کا ترجمہ ہے اور چیز۔ اس کا خطاب ہوا کیونکہ خدا کے بندے آزاد ہیں۔ انھیں غلام یا بندہ کہنا درست نہیں۔ غرض راجہ ٹوڈرمل نے سینکڑوں جزئیات آئین قواعد کے ایسے بند باندھے کہ بعض امرا اور وزرا نے کوششیں کیں اور کرتے رہے مگر آگے نہیں نکل سکے۔ اس کے بعد منصب وکالت مرزا عبدالرحیم خانخاناں کے سپرد ہوا۔ اس نے بھی منصب مذکور اور امورات وزارت کو بااحسن وجوہ رونق دی جو کہ قابل تحسین حد تک تھا۔

ہندوستان میں خرید و فروخت، دیہات کی جمع بندی، تحصیل مال، نوکروں کی تنخواہ کا حساب کیا۔ راجاؤں کیا بادشاہوں میں تنکوں پر تھا مگر پیسے دیا کرتے تھے۔ چاندی پر ضرب لگتی تھی تو چاندی کے تنکے کہلاتے تھے اور رنڈیوں اور ڈوموں کو انعام میں دیا کرتے تھے۔ عام رواج نہ تھا۔ چاندی کے مول بازار میں بک جاتے تھے۔ ٹوڈرمل نے منصبداروں اور ملازموں کی تنخواہوں میں انھی کو جاری کیا اور آئین مقرر کیا۔ اور تنکہ کی جگہ دیہات سے روپیہ وصول ہوا کرے۔ اس کا اللہ شہ وزن رکھا۔ روپیہ کے چالیس دام قرار پائے۔

اس کا آئین یہ تھا نیز پر ٹکسال کا خرچ لگائیں۔ تو روپیہ کے پورے ۴۰ دام پڑتے۔ وہی نوکروں کو تنخواہ میں ملتے ہیں۔ اس کے بموجب جمع کل دیہات قصبات پرگنات کی دفتر میں لکھی تھی۔ اس کا نام عمل نقد جمع بندی رکھا۔

محصول کا آئین یہ باندھا کہ غلہ گرمین بارانی میں۔

نصف کا شتکار نصف بادشاہ کا، بارانی میں ہر قطعہ پر ۲/۱ اخراجات اور اس کا خرید و فروخت کی لاگت لگا کر غلہ میں ۳/۱ بادشاہی۔

نیشکر و غیرہ کہ جنس اعلیٰ کہلاتے ہیں اور پانی اور نگہبانی اور کٹائی وغیرہ کی محنت غلہ سے زیادہ کھاتی ہے۔ ۴/۱، ۵/۱، ۶/۱، ۷/۱ حسب مراتب حق بادشاہی۔ باقی کاشتکار۔

اگر محصول لیں تو پھر جنس میں دیکھو مرنج پر زر نقدی لیں۔ اس کا دستور العمل بھی جنس وار لکھا ہے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قواعد وضوابط کے بہت سے جزویات راجہ ٹوڈرمل کے علاوہ مظفر خاں، میر فتح اللہ شیرازی، وغیرہ نے بھی اپنی عرق ریزی سے مرتب کیے تھے اور انھوں نے...... کاغذات کی چھان بین اور انتظام دفتر میں بڑی محنت اور کوشش کی ہوگی مگر اتفاق تقدیری ہے کہ ان قواعد وضوابط کے جزویت کو فائلوں سے نکال کے منظر عام پر لانے کے لیے راجہ ٹوڈرمل کا نام لیا جانے لگا ہے اور ان کا کوئی نام نہ لیا جاتا جو کہ زیادتی کے بھی مترادف ہے۔

طالع شہرت رسوائی مجنون پیش است
ورنہ طشت من داد ہر دو زیک بام افتاد

ان تمام باتوں کے باوجود اکبری کتاب اوصاف میں سنہری حرفوں سے لکھا جانا چاہیے کہ امراء نے راجہ کے اختیارات اور ترقیات متواتر دیکھ کر بعض اموارات میں شکایت کی اور یہ بھی کہا کہ:

حضور نے ایک ہندو کو مسلمانوں پر اس قدر اختیارات اور اقتدار دے دیا ہے۔ ایسا مناسب نہیں ہے۔ سینہ صاف اور بے تکلف بادشاہ نے کہا کہ:

”ترجمہ: تم سب کی سرکاروں میں کوئی نہ کوئی ہندو ہے۔ ہم نے ایک ہندو رکھا تو تم کیوں برا مانتے ہو۔“

باب ۶

مرزا عبدالرحیم خاں خاناں

۱۔ مرزا عبدالرحیم ۹۶۴ھ میں لاہور میں پیدا ہوئے۔

۲۔ اکبر بادشاہ مرزا عبدالرحیم کا رشتہ میں خالو تھا۔

۳۔ ۹۶۹ھ میں مرزا عبدالرحیم دربار اکبری میں پہنچے یعنی پانچ سال کی عمر میں۔

۴۔ اکبر اسے مرزا خان کا نام دیا کرتا تھا۔

۵۔ مرزا عبدالرحیم خود شاعر تھا۔ عربی زبان کا ماہر تھا۔ ترکی زبان اور فارسی زبان بھی اس کی میراث تھی۔

۶۔ سنسکرت میں بھی بے نظیر مہارت رکھتا تھا۔

۷۔ مرزا خاں نہایت حسین تھا۔ مصور اس کی تصاویر اتارنے کے لیے مشتاق ہوتے تھے۔

۸۔ باپ کا سایہ بچپن سے ہی سر سے اٹھ گیا تھا۔

۹۔ دلی میں ۱۰۳۶ھ میں وفات پائی۔

۱۰۔ مرزا عبدالرحیم خان خانخاناں متعدد زبانوں کا ماہر تھا۔

مرزا عبدالرحیم خاں خاناں پر طائرانہ نگاہ

۱۔ پیدائش : لاہور میں ۹۶۴ھ میں

۲۔ نام : عبدالرحیم

۳۔ والد : بیرم خان

۴۔ خوبی : بڑا حسین تھا

۵۔ شادی : ماہ بانو بیگم (خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کی بہن)

۶۔ دربار میں رسائی: ۹۸۰ھ میں تقریباً بعمر ۱۶، ۱۳ برس تقریباً

۷۔ وفات : دلی میں ۱۰۳۶ھ میں

۸۔ خطاب : منعم خاں (خلعت و منصب عطا کرکے) خان خاناں

۹۔ عمر : ۷۲ سال

۱۰۔ اولاد : ۴ بیٹے، ایک بیٹی جنا بیگم (شاہنواز، مرزا ایرج، رحمٰن داد، نوادیار، داراب، حیدر قلی، امراللہ لونڈی کا بیٹا)

۱۱۔ عہدہ جات: سپہ سالار، احمد آباد کی حکومت بعمر ۱۹ برس، اتالیق جہانگیر بعمر ۲۸ برس

۱۲۔ نانا کا نام : جمال خاں میواتی

۱۳۔ بھتیجی : حسن خاں میواتی

۱۴۔ بیوی ماہ بانو بیگم کا انتقال ۱۰۰۶ھ میں انبالہ میں

۱۵۔ باپ کی وفات: حج پر گئے ہوئے تھے

۱۶۔ دفن : ہمایوں کے مقبرے کے قریب

ابتدائی حالات زندگی

پیدائش

مرزا عبدالرحیم ۹۶۴ھ کو بمقام لاہور میں پیدا ہوئے۔ان کا والد کا نام بیرم خاں تھا جو کہ اس وقت بڑھاپے کی عمر میں تھے۔مگر اللہ تعالیٰ نے ایسا ہونہار بیٹا بڑھاپے میں عطا فرمایا۔ان دنوں اکبر بادشاہ بھی شکار کی غرض سے لاہور آئے ہوئے تھے تو لوگوں نے آگے بڑھ کر اکبر اعظم کو مبارک دی اور کہا کہ:

''بڑھاپے کے باغ میں رنگین پھول مبارک ہو۔فتح کی خوشی میں یہ خوشخبری نیک شگون معلوم ہوئی۔''

تو بادشاہ نے اس خوشی میں جشن منایا۔وزراء نے خوب خزانے لٹائے۔ان کا والد تو بہت ہی مشہور و معروف شخص تھا۔

مرزا عبدالرحیم کی ماں کا خاندان کچھ یوں بیان کیا گیا ہے کہ ان کی والدہ جمال خاں میواتی کی بیٹی تھی اور حسن خاں میواتی کی بھتیجی تھی۔ بڑی بہن بادشاہ کے محل میں تھی اور چھوٹی بہن وزیر کے حرم سرا میں۔خود بادشاہ اکبر اعظم نے خود ان کا نام عبدالرحیم رکھا۔مبارک اولادی ولادت خاص اسی لاہور شہر میں ہوئی۔یہ پھول تقریباً تین سال کے ناز و نعمت کی ہوا میں اقبال کے شبنم سے شاداب تھا۔اچانک خزاں کی نحوست ایسی بگولا بن کر چڑھی کہ اس کے گلبن کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا۔کسی کو بھی ان کی منزل کا علم نہ رہا۔سب ان پر رحم کھانے والے تھے کہ ان کے ساتھ کیا حالات نے پلٹا کھایا اور کیوں ایسا ہوا؟ مگر یہ بھی ایک قدرت کا ملہ کا اصول اٹل ہے کہ ہر کمال زوال است جو بھی کوئی اپنی آخری اقبال کی آخری حد کو چھو لیتا ہے تو پھر وہ زوال کی طرف لازمی طور پر آتا ہے۔تو یہی طریقہ زندگی بیرم خاں کے ساتھ ہی استعمال ہوا تھا۔تو جب بیرم خاں اتنی بلندی سے نیچے آیا تو دیکھنے والے تو تعجب کرنے لگے اور انھوں نے برملا کہہ کہ:

''یہ تارا کہاں سے آیا۔''

جب بیرم خاں کے اقبال نے منہ پھیر لیا تو اکبر نے اپنے رقیبوں کی باتوں میں آکر دہلی کا رخ کر لیا اور وہاں اپنے ڈیرے جما لیے۔اب بیرم خاں کا ٹھکانا آگرہ تھا۔اس کا یہ حال تھا کہ تمام ساتھی اس کا ساتھ چھوڑ آئے تھے کیونکہ اکثریت ساتھیوں کی طوطا چشم ہوتی ہے اور وقت کو سلام کرتی ہے۔مخلص تو نہ ماضی میں انسان تھے نہ اب ہیں۔شاید مثال دینے کے لیے اس وقت بھی ہوتے ہوں جیسا کہ اب بھی ہیں تو یہ دوسری بات ہے مگر ان کی مقدار آٹے میں نمک کے برابر ہوتی ہے۔مگر ان کی حقیقت ضرور مسلمہ ہوتی ہے۔ان حالات میں اگر بیرم خاں اپنی کوئی درخواست گزارتا ہے تو اس کا بھی الٹا رد عمل ہوتا تھا جو کہ مزید مایوسی کا منظر پیش کرتی تھی اور اگر کسی وکیل کو روانہ کرتا ہے تو پھر اس سے پڑھ کر اس کی خبر دی جاتی ہے مگر اگر کوئی خبر آتی ہے تو وہ ڈراونی اور خوفناک وغیرہ۔یہ معصوم بچہ جس کا نام مرزا عبدالرحیم تو ان حالات کو سمجھنے کے اہل نہ تھا مگر اتنا ضرور دیکھنا ہوگا کہ

باپ کی مجلس میں رونق نہیں ہے جو ماضی میں امرا اور درباریوں کا ہجوم ادھر آنا جانا ہوتا تھا وہ اب نہیں رہا۔ اب اس کی کیا وجوہات ہیں اور باپ بھی میری طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔

مگر اب بیرم خاں بھی مجبور تھا کہ وہ کدھر کا رخ کرے۔ ان حالات میں کبھی وہ بنگالہ جانے کا ارادہ کرتا ہے تو کبھی حج کے ارادے کے لیے گجرات جانے کے لیے کمربستہ ہوتا ہے۔ اگر راجپوتانہ کا رخ کرتا ہے تو وہاں بھی اس کا جی اچاٹ ہوتا ہے۔ آخر کار مجھے ہی لوٹ آتا ہے۔ اس کے لیے عیال و اطفال کے بھی بے شمار مسائل تھے جن کا حل کرنا ضروری تھا۔ مگر اس نے سب کو پس پشت ڈال کر پنجاب کا رخ کر لیا تو بٹھنڈہ کا حاکم جو کہ اس کا پناہی پروردہ اور نمک خواری تھی اور اس لیے بھی اس کو اس مسند پر بٹھایا تو اس نے مال و عیال کو ضبط کر کے دربار روانہ کر دیا تو دربار کا سلوک بھی بڑا عبرت ناک ثابت ہوا کہ:

"دہلی میں آکر انھوں نے قید کر دیا۔ مال و اسباب سب خزانہ میں جمع کر دیا گیا۔ تو اس وقت اس تین چار برس کے بچے کے ذہن سے کیا اثرات نقش ہوئے ہوں گے کہ ہر روز ایک نئی صورت اس کو دیکھنے کے لیے ملتی ہے جو کہ سابقہ سے زیادہ پریشان کن اور تکلیف دہ ہے۔ اس کے ذہن میں یہ آتا ہوگا کہ میری ہوا خوری کی سواریوں اور سب کی دلداریوں میں اس قدر کیوں فرق پڑا اور جو لوگ مجھے ہاتھوں کی جگہ آنکھوں میں جگہ دیتے تھے وہ اب کہاں چلے گئے اور انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ اگرچہ وہ بچہ اظہار خیال سے اس حالت میں مجبور تھا اگر اس کے ذہن میں یہ خیالات ضرور آتے ہوں گے۔"

مگر وہ اس حالت میں کچھ بھی نہ کر سکتا ہوگا کیونکہ عمر بھی بچگانہ اور حالات کی نامساعدت اور باپ کی مجبوریاں وغیرہ لہٰذا یہ بچہ بھی حالات کا خاموش تماشائی ہی بنا نظر آیا۔

بیرم خاں کی وفات اور حالات

اب بیرم خاں پر ایسے بدترین حالات تھے کہ جن کو پڑھ کر یا سن کر عام آدمی کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ پریشان ہونے کے علاوہ کچھ بھی نہ کر سکتا۔ بیرم خاں دربار سے رخصت ہو کر حج کی غرض سے مکہ معظمہ عازم ہوا۔ اور ان کے ڈیرے گجرات سٹیشن پر تھے اب شام کا وقت تھا کہ سب یہ سوچ رہے کہ:

"اب خاں خاناں پہنچ رہے ہیں مگر اس وقت ایسی ہولناک خبر آئی کہ اس نے سب کی امیدوں پر اوس پھینک دی اور وہ ہولناک خبر یہ تھی کہ بیرم خاں تو مارا گیا ہے۔"

اس کے مرنے کی خبر آتے ہی فوج میں طلاطم مچ گیا۔ اور ابتری پھیل گئی۔ آنا فانا میں افغانوں نے ان کا گھر لوٹ لیا جس کے ہاتھ میں جو بھی چیز آئی وہ اٹھا کر لے جا رہا ہے کیوں ان کو روکنے اور پوچھنے والا فرد نہیں تھا۔ حتیٰ کہ اس مردے کے کپڑے بھی اتار لیے گئے۔ اب اس بے جان لاش کو کفن دینے کا بھی مسئلہ درپیش ہوا۔ ان میں کوئی بھی بڑا باشعور انسان نہ تھا سوائے اس چند سالوں کے بچے کے۔ وہ بھی ان حالات سے سہما ہوا اور ڈرا ہوا صرف آنکھوں سے منظر کو دیکھتا ہی ہے کہ وہ بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کبھی ڈر کے مارے ماں کی گود میں یا اناؤ کے پاس جاتا۔ ان کے پاس بھی

تو چھپانے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ سوائے ان کے کہ صبر و تحمل کے گھونٹ پی رہی تھیں۔ بڑی مشکل کی رات جس کو شام غریباں کا نام دیا جاتا ہے۔ سر پہ آئی۔ رات گزاری تو دن ہوا۔ خیر کا تو روز محشر تھا۔ کیونکہ محمد امین دیوانہ اور زنبور وغیرہ لشکروں کو لڑانے والے تھے اس وقت کچھ نہ بن آتی تھی۔ پھر بھی ہزار رحمت ہے کہ لٹے قافلہ کو سمیٹا ہے اور احمد آباد کو اڑے جاتے ہیں۔ موقع کے تلاش میں ہیں تو ایک ہاتھ مار جاتے ہیں۔

احمد آباد کو روانگی

یہ بھی قانون قدرت ہے کہ:

ہر	کمال	را	زوال	است
اور	صابر	را	اجر	است

یعنی جو بھی کوئی اقتدار کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو اس کے بعد اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ نمرود اور فرعون کی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں کہ دونوں اپنے اقتدار کے نشے میں خدائی کا دعویٰ کر چکے تھے اور یہی ان کی انتہائی گمراہی تھی تو اس کے بعد ان دونوں کا حشر تاریخ میں محفوظ ہے مگر اس کے مقابلے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے صبر و تحمل سے کام لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو ان انتہا پسند گمراہوں پر کامیابی عطا فرمائی اور ان کے صبر کا اجر نیک نصیب فرمایا۔

تو ایسے ہی حالات مرزا عبدالرحیم کے خاندان کے ساتھ بھی نظر آتے ہیں کہ ان کے خاندان کا کاروان اس لٹی پٹی حالت میں احمد آباد کی طرف روانہ ہوا۔ مگر اب سب کچھ قزاق تو لوٹ چکے تھے مگر ان کی نظریں پھر بھی ان پر ہی جمی ہوئی تھیں کہ یہ اپنے گوشت پوست بھی کیوں لے کر جا رہے ہیں وہ بھی ہم کو ہی دے جائیں۔ تو بہتر ہے۔ جب زمانے کے بدترین روز آتے ہیں تو سب اپنے اور غیر بیگانے اور دشمن کہلاتے ہیں۔ وہ ہڈیاں توڑنے سے بھی گریز نہیں کرتے اور ہائے بھی نہیں کرنے دیتے۔ تو اللہ تعالیٰ ہر ایک کو ایسے حالات سے اپنی امان میں رکھے۔ (آمین)

تو ان مصیبت زدہ خاندان کے افراد نے بڑی مشکل سے سفر کرتے ہوئے اور ڈاکوؤں اور دشمنوں سے لڑتے ہوئے احمد آباد میں جا قدم جمائے۔ انھوں نے کئی دن توقف کیا جس کی وجہ سے ان کو تھکاوٹ نے چور کر دیا تھا اور ان کے حواس بھی باختہ ہو چکے تھے۔ جب چند دن انھوں نے وہاں آرام سے گزارے تو انھوں نے صلاح و مشورہ کر کے یہ طے پایا کہ:

"دربار کے سوا ہماری کوئی پناہ کی جگہ نہیں ہے۔ لہٰذا دربار میں ہی چھپنا چاہیے۔"

تو آخر کار دربار میں پہنچ ہی گئے تو ان کو ان کی آمد کی خبر ہو چکی تھی۔ کیونکہ رشتے ناطے تو تھے ہی۔ اگر ناراضگیاں یا کوئی جھگڑے وغیرہ ہی تھے۔ جن کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے دور ہوئے۔ تو اس حالت میں چغتائی درباری اور اکبر عظم کرم کے دربار میں لہر آچکی تھی تو انھوں نے ان کے لیے فرمان روانہ کیا کہ جس میں انھوں نے خان خاناں کے مرنے کا بڑا رنج کیا اور ان کے حالات کا بھی افسوس کیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی بڑی ہمدردی اور شفقت کا بھی اظہار ضروری اور مزید لکھا کہ:

"عبدالرحیم کو تسلی دو اور بڑی خبرداری اور ہوشیاری سے لے کر دربار میں حاضر ہو۔"

یہ محبت اور شفقت بجرا خدا / فرمان ان کو جالو کے مقام پر ملا تھا۔ جس نے ان کے حوصلے بلند کر دیے اور ان کو زندگی کی دھارس بندھ گئی تو رواں دواں جلو رے دربار میں پہنچ گئے اور سکون کا سانس آیا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

اکبر اعظم کی ہمدردی اور تسلی

مصنفین نے لکھا ہے کہ ان مصیبت زدگان کے لیے وہ گھڑی بڑی ہی عجیب اور مایوسی کی ہوگی جب ان کو بابا زنبور سب تباہ حال لوگوں کو لے کر آگرہ پہنچے ہوں گے۔ عورتوں کو محل میں اتارا ہوگا۔ اور اس یتیم بچے کو جس کا باپ ایک دن اس دربار کا مالک تھا۔ بادشاہ کے سامنے لا کر چھوڑ دیا ہوگا تو اس وقت محل کے اندر عورتوں کے دل دھک دھک کر رہے ہوں گے اور ان کے رنگ فق ہو چکے ہوں گے۔ مگر خاموشی سے اپنی ہونٹوں پر بار بار زبان پھیرتی ہوں گی۔ اس کے سوا ان کے ہاتھ میں کچھ بھی تو نہ تھا۔

مگر ان کے علاوہ ان کے نمک خوار ان کے لیے صرف ہاتھ اٹھا کر سوالی کریم سے ان کی خیریت و عافیت کے لیے دعا گو ہی ہوں گے۔ کہ الٰہی ان بے سہارا لوگوں کی مدد کرنا۔ یتیم بچے پر رحم فرمانا وغیرہ کیونکہ یہی بچہ مستقبل کا سہارا ہے۔

مگر خدا کا خوف بہرحال لوگوں کے دلوں میں ضرور موجود تھا تو چغتائی سلسلہ کے بادشاہوں نے ہمدردی کا مظاہرہ کیا۔ یہ تو معصوم بیرم کا یتیم بچہ تھا۔ اس کو جب اکبر اعظم کے سامنے لایا گیا تو اکبر کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ بچے کو اکبر نے پیار سے گود میں اٹھا لیا اس کے نوکروں کے لیے وظیفے اور تنخواہیں مقرر کر دیں اور اکبر اعظم نے سختی سے کہا کہ:

"اس کے سامنے اس کے باپ خان بابا (بیرم خاں) کا قطعاً ذکر نہ کرنا۔ یہ معصوم بچہ ہے اس کا دل کڑھے گا۔"

مگر بابا زنبور نے کہا کہ:

"حضور! یہ تو بار بار پوچھتے ہیں۔ راتوں کو چونک کر اٹھ جاتا ہے اور پوچھتے ہیں کہ بابا کہاں ہیں؟ اب تک کیوں نہیں آئے؟"

تو اکبر نے کہا کہ:

"تم کہہ دیا کرو کہ وہ حج کرنے کے لیے مکہ معظمہ گئے ہیں۔ وہ خانہ خدا میں پہنچ چکے ہیں۔ بچہ ہے۔ باتوں میں آ جائے گا اور اس طرح اس کو بہلا لیا کرو۔ اور دیکھو اس طرح خوش و خرم رکھو اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس کا باپ خان بابا فوت ہو چکا ہے اور وہ سر پر نہیں ہے بابا زنبور! یہ ہمارا بیٹا ہے۔ اسے ہمارے پیش نظر رکھا کرو۔"

اللہ تعالیٰ کا دست شفقت سب سے زیادہ یتیم بچوں کے سر پر ہوتا ہے کیونکہ وہ خود ان کو یتیم کرنے والا ہوتا ہے اور وہی اس کی پرورش اور نگہبانی کا ذمہ دار بھی ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے ایک جابر حاکم کے ہاتھوں ایک یتیم بچے کی پرورش کا کام لے رہا ہے۔ اکبر کے دل کو اللہ تعالیٰ نے مرزا عبدالرحیم کے لیے موم کر دیا۔ اور اس نے نہایت ہی شفقت اور محبت بھرے الفاظ میں بابا زنبور کو کہہ دیا کہ:

"یہ ہمارا بیٹا ہے اس کو ہمارے سامنے رکھو۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اکبر اس کی پرورش کا بوجھ برداشت کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ جس سے مرزا عبدالرحیم کے خاندان کے تمام مخدوش حالات ختم ہو گئے اور انھوں نے گویا کہ دربار میں پہنچ کر سکون کا سانس لیا اور آرام کی زندگی گزارنی شروع کی۔ اگرچہ وہاں بہت سے حاسد اور مفاد پرست دشمن بھی موجود تھے۔ "جسے خدا رکھے اسے کون چکھے؟"

مرزا عبدالرحیم کی پرورش

۹۶۹ھ کو یہ یتیم بچہ جس کا باپ اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ اکبر اعظم کے دربار میں پہنچا۔ یہ بھی انکشاف کرنے کی ضرورت ہے کہ اکبر اعظم مرزا عبدالرحیم کا خالو بھی تھا اور ہندوستان کا بادشاہ بھی۔ مگر درمیان میں تھوڑے سے خاندانی اختلاف تھے جن کی وجہ سے مرزا عبدالرحیم خاندان کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر اب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم ان کے وہ کڑے دن گزار دیے اور اب دربار میں پہنچ کر اکبر اعظم نے ان پر شفقت کا سایہ کر دیا تھا۔

اب اکبر کے دربار کی یہ حالت تھی کہ اس کے دربار میں مرزا عبدالرحیم کے باپ کے جانی دشمن لوگ تو موجود تھے تو وہ یا تو ان کی خوشامد کرتے یا الٹی تلخ باتیں بیرم خاں کی اکبر کے گوش گزار کرتے رہتے تھے جن سے اکبر کو ناراضگی پیدا ہو۔ مگر اکبر اعظم کو اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی ہندوستان کی سلطنت عطا کرنے کے ساتھ اتنا ہی بڑا حوصلہ اور دل و دماغ بھی عطا فرمایا تھا وہ بڑا ہی نیک نیت بادشاہ تھا۔ وہ سب کی باتیں سن لیتا تھا مگر وہی کچھ کرتا تھا جس میں رعایا کی بہتری اور بھلائی ہو۔ اکبر مرزا عبدالرحیم سے بہت پیار کرتا تھا اور پیار و محبت سے اسے مرزا خاں کہہ کر پکارتا تھا اور تاریخ دانوں نے بھی اس بچے کو مرزا خاں ہی تاریخ نویسی کے دوران لکھا ہے۔

تو یہ یتیم مگر ہونہار بچہ اکبری سایہ میں پرورش پانے لگا۔ اور وہ بڑا ہو کر ایسا نکلا کہ تمام مورخ اس کی لیاقت، اہلیت اور صلاحیتوں کی داد دیتے تھے بلکہ وہ عش عش کرتے تھے۔ اس کے حافظہ اور علمیت کی تمام آ تعریف و توصیف کرتے تھے۔

مرزا عبدالرحیم کو اللہ تعالیٰ نے وافر ذہنی صلاحیتوں سے نوازا تھا اس نے اپنی ابتدائی عمر میں تحصیل علم میں امیرزادوں کی طرح کھیل کود میں حصہ نہیں لیا کیونکہ جب وہ بڑا ہوا تو:

اوصاف مرزا عبدالرحیم

> "وہ علماء کا قدردان تھا۔ اہل تصنیف اور شعراء کو عزیز رکھتا تھا۔ خود بھی بڑا پایہ کا شاعر تھا۔ عربی زبان سے واقف تھا اور بے تکلف بولتا تھا۔ ترکی زبان اور فارسی اس کے باپ دادا کی میراث زبان تھی اس میں بھی ماہر تھا۔ مرزا عبدالرحیم بڑا حاضر جواب لطیفہ گو، بذلہ سنج، بلبل ہزار داستان تھا۔ سنسکرت میں بھی اچھی لیاقت کا مالک تھا اور فنون جنگ میں بھی اعلیٰ درجہ کی صلاحیتیں اور لیاقت رکھتا تھا۔"

اللہ تعالیٰ نے اس یتیم اور بن باپ کے بچے کو اس قدر صلاحیتیں ودیعت کر رکھی تھیں جو کہ اکبر کے شہزادوں کے نصیب میں بھی نہ تھیں۔ مگر اس کے باوجود اس کے باپ کے جانثار اور بہی خواہ لوگ حالات سے مایوس ہر وقت اس بچے کی زندگی کے لیے اور اس کے بہتر مستقبل کے لیے دعا گو

تھے کہ شاید اس بچے کی زندگی میں ہماری بھی یہ بدحالی کے ایام پھر جائیں اور خوشحالی سے سیرابی ہوں۔ وہ ہمدرد لوگوں کی دعاؤں کی برکت پر سعادت رات دن میں پروان چڑھ کر اپنی منزل کو جا پہنچا اور اس دعا گوؤں کے حالات بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے بدل ڈالے۔

مرزا خاں کی شادی

مرزا خاں بڑا ہی حسین اور خوبصورت لڑکا تھا۔ لوگ اس کو بڑے شوق اور دلچسپی سے دیکھتے تھے۔ مگر رشک بھی کرتے تھے لوگ اس کی تصاویر بھی اپنے ریکارڈ کے لیے لیتے تھے۔ اس کے باپ بیرم خاں کے بھی کئی نمک خوار لوگ تھے ان میں خصوصی طور پر کوئی شاعر، کوئی عالم اور کوئی اہل کمال شخص ہوتا۔ چونکہ ان کے حق میں ہزار دعائیں کرتا تھا۔ ان کو دیکھ کر باپ کی نیکیاں اور اچھائیوں کو دہراتے تھے۔ مگر موجودہ حالت کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو بھی ضرور آ جاتے تھے۔

جیسے بادشاہ کے ساتھ دہلی آگرہ اور لاہور وغیرہ میں اس کا گزر رہتا تھا تو اس وقت موسم کی کیفیات پیدا ہوتی تھیں۔

ایک تو یہ کہ مایوسی اور تاسف کہ ہائے کیا لیں؟

اور کبھی ان کا لانا ایک مبارک شگون کا رنگ دکھاتا تھا۔

خیال آتا تھا کہ اس تحفے کی آب و تاب سے معلوم ہوتا ہے کہ:

"اس سے ہمارا بھی رنگ پلٹے گا اور دن بدلیں گے اور دلوں کی افسردگی پر شادابی شبنم چھڑکے گی۔"

اکبر بڑا سمجھدار شخص تھا وہ بڑی اچھی طرح جانتا اور سمجھتا تھا کہ ماہم انگل والے امراء اور دربار کے کون کون سے سردار ہیں جو کہ ان کے باپ سے دشمنی اور عناد رکھتے ہیں۔ اس لیے اس نے ماہ بانو بیگم خاں اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کی بہن سے مرزا عبدالرحیم خاں خاناں کی شادی کر دی تا کہ اس کی حمایت کے لیے بھی دربار میں تاثیر پھیلے اور اس کی دشمنی اور عناد باقی نہ رہے بلکہ ان میں محبت پیدا ہو کیونکہ رشتے کرنے سے ان میں خاندانی حمیت پیدا ہوتی تھی۔ بہر حال اس شادی کرنے کے بھی بڑے اچھے اثرات مرتب ہوئے اور اس کی زندگی بدل گئی۔

مرزا عبدالرحیم کی خوش نصیبی

۹۷۳ھ میں اللہ تعالیٰ نے ایک نیک شگون اور مبارک موقع فراہم کیا کہ اکبر خاں زماں کی مہم پر تھا۔ اس نے عفو تقصیر کے لیے التجا کی اور پنجاب سے اطلاع آئی تھی کہ:

"محمد حکیم مرزا کابل سے فوج لے کر آیا ہے اور وہ لاہور تک پہنچ چکا ہے۔"

اکبر نے خاں زمان کی تقصیر معاف کر کے ملک اس کا برقرار رکھا اور پنجاب کے بندوبست کے لیے روانہ ہو گیا۔ مرزا خاں کو حکومت و منصب عطا کر کے منعم خاں کا خطاب دیا، جبکہ منعم خاں خود بھی زندہ تھا اور چند امراء صاحب تدابیر کے ساتھ آگرہ کی طرف رخصت کیا تا کہ دارالسلطنت کے انتظام اور حفاظت کا خیال کریں۔ یہ مرزا عبدالرحیم خاں خاناں کی ابتدائی زندگی میں پہلا خوش نصیب موقع تھا کہ اس کو منعم خاں کا

خطاب دے کر آگرہ کی سلطنت کی حفاظت کے لیے مامور کیا گیا۔ اس موقع پر اس کو خداداد صلاحیتیں ظاہر کرنے کا ایک سنہری موقع بھی حاصل ہوا اور اس کو اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ایک راستہ بھی نظر آیا۔ خاں مرزا کا خوش نصیبی کا ستارہ طلوع ہوا کہ جوہر مردانگی کی چمک تیرھویں صدی میں ہر خاص و عام کو نظر آنے لگی تھی۔

مرزا عبدالرحیم عمدہ سپہ سالار کی جگہ پر

۹۸۰ھ میں خان اعظم مرزا عزیز کو احمد آباد گجرات میں محصور ہو گیا اور اکبر کو اطلاع ملی تو وہ دو ماہ سفر، سات دن میں طے کر کے گجرات جا پہنچا تھا اور اس وقت بڑے بڑے جہد مشق اکمل سردار حیران رہ گئے کہ صرف ۱۲ سال کا لڑکا اکبر کے ساتھ قدم بقدم ملائے ہمرکاب ہے اس کے دل کا جوش اور بہادری کی امنگ دیکھ کر اکبر نے اسے قلب لشکر میں قائم کیا جو کہ ایک عمدہ سپہ سالاروں کی جگہ تھی اب وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ:

"ہر وقت دربار میں آنا جاتا اور بحث و تمحیص میں بھی حصہ لیتا تھا، اور کاروبار حضور کا سرانجام دینے لگا اور اکثر کاموں کے لیے اکبر کی زبان پر اس کا نام رہتا تھا"

مرزا عبدالرحیم کی یہ خوش نصیبی کا موقع تھا کہ اس کے باپ کی نیک نیتی تھی کہ یہی مواقع اس کے لیے آغاز ترقی کا باعث ثابت ہوئے۔

مصنف نے بزرگوں سے سنا ہے کہ:

"باپ کا کیا بیٹے کے آگے آتا ہے اور اس کی نیک نیتی کا پھل اسے ضرور ملتا ہے۔"

چنانچہ جو روپیہ مرزا خاں کے ہاتھ آتا تھا۔ وہ اس سے دسترخوان کو وسعت اور فراخی دیتا تھا۔ وہ اپنی شان سواری اور رونق درباری میں اضافہ کرتا تھا۔ اہل علم اور اہل کمال آتے تھے۔ بیرم خاں انہیں انعامات تو نہ دے سکتے تھے مگر جو کچھ بھی دیتا تھا وہ بڑی خوبصورتی سے دیتے تھے۔ اس سے اس کے نمک خواروں اور خیر خواہوں میں اضافہ آئے دن ہوتا جاتا تھا۔ بے شک یہ موقع اس کے امتحان کا تھا جس میں وہ کامیاب و کامران ثابت ہوا۔ کیونکہ ایشیائی حکومتوں کا یہ قدیم پرانا طریقہ تھا کہ:

جس شخص کا سامان پرانا اور دسترخوان وسیع دیکھا جاتا تھا اس کو زیادہ تر ترقی دی جاتی تھی اور لوگ اس کی طرف داری بھی کرتے تھے۔ یہ تمام اوصاف مرزا عبدالرحیم میں پائے جاتے تھے۔ جس کی وجہ سے مرزا عبدالرحیم خاں خاناں ہر اہر دلعزیز عقیدہ ہوا اور درباریوں میں ہر وقت اس بات کا چرچا ہونے لگا۔

احمد آباد کی حکومت کا ملنا

۹۸۲ھ میں اکبر نے احمد آباد کی حکومت مرزا کوکہ کو دینی چاہی مگر مرزا کوکہ بڑا ہی ضدی امیر زادہ تھا وہ اس معاملے میں اکبر سے اڑ گیا اور اس نے احمد آباد کی حکومت حاصل کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ:

"مجھے یہ حکومت ہرگز منظور نہیں ہے کیونکہ مقام مذکور سرحد کا مقام ہے اور یہاں ہمیشہ بغاوتیں پھوٹتی رہتی ہیں۔"

تو اکبر نے یہ خدمت اس خوش نصیب نوجوان مرزا عبدالرحیم خاں خاناں کو عطا کر دی جس نے بصد شکریہ کے ساتھ اس کو قبول کر لیا۔

اس وقت اس کی عمر صرف ۱۹ برس کی تھی تو بادشاہ سلامت اکبر اعظم نے چار امیر تجربہ کار جو کہ دولت اکبری کے بڑے پرانے نمک خوار اور ہمدرد تھے اس کے ہمراہ کر کے احمد آباد کی طرف روانہ کر دیے اور ان کو ہر قسم کی بات سمجھا دی کہ:

''اس کی جوانی کا عالم ہے اور پہلی ذمہ داری اور خدمت ہے جو بھی کام کرنا ہوگا پہلے وزیر خاں سے ضرور مشورت کر لینا تاکہ بعد میں کوئی پریشانی نہ ہو۔ کیونکہ وزیر خاں ہمارا پرانا نمک خوار ہے۔ ان چاروں امراء کو یوں وزارتیں تقسیم کر دی گئیں۔

- i- میر علاؤالدولہ قزوینی کو آئینی مشیر مقرر کیا گیا۔
- ii- پیر کراس کو حساب دانی میں ماہر تھا۔
- iii- دیوانی سید مظفر بارہا کو بخشی گری فوج پر معزز کیا گیا۔
- iv- وزیر خاں کو مشاورت کا کام سونپا گیا تھا۔

مرزا عبدالرحیم خاں خاناں کی فوجی خدمات

۹۸۶ھ میں شہباز خاں کو ملک میر علاقہ رانا پر فوج کشی کرنی پڑی۔ مرزا خاں بموجب اس کی درخواست پر اس کی امداد کے لیے روانہ ہوا۔ چنانچہ قلعہ مذکور اور قلعہ کوکندہ اور اودے پور افواج شاہی کے قبضے میں آئے۔ رانا پہاڑوں میں جا کر روپوش ہو گیا اور شہباز خاں باز کی طرح بھاگ گیا۔ اس کا تعاقب کیا گیا مگر وہ ہاتھ نہ آیا۔ البتہ دودا سپہ سالار اس کا حاضر دربار ہو کر گرفتار ہوا مگر اس کی خطا معاف کر دی گئی۔

تو اس حالت میں خاں خاناں کبھی اپنے علاقہ میں اور کبھی دربار میں خدمت سرانجام دیتا تھا۔ جس سے اس کی طبیعت کے جوہر لوگوں پر خاص طور پر عیاں ہونے لگے تو ۹۸۸ھ میں اس کی سیرچشمی اور خدا ترسی اور اعتبار اور علو حوصلہ پر نظر کر کے عرض بیگی کی خدمت اس کے سپرد کی گئی تاکہ حاجت مندوں کی عرض معروض حضور اور حضور کے احکام ان تک پہنچائے۔

صوبہ اجمیر میں بغاوت وفساد

۹۸۸ھ میں صوبہ اجمیر میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ رستم خاں صوبہ دار اجمیر مارا گیا تھا اور اس بغاوت میں راجگان کچھواہہ کی سرشوری بھی شامل تھی کہ راجہ مان سنگھ کے بھائی بند تھے مگر اکبر کو ان تمام حالات کا بخوبی علم تھا۔ چنانچہ نتیجہ وہ خاں خاناں کی جاگیر میں دے کر حکم دیا کہ:

''مرزا عبدالرحیم! اس بغاوت کا خاتمہ کرو اور مفسدوں کو فساد کی سزا بھی دو۔''

لہٰذا صوبہ اجمیر کی طرف مرزا عبدالرحیم روانہ ہو پڑا اور وہاں جا کر اس قدر بہادری اور دانائی سے اس بغاوت کو فرو کر کے سرخرو حالت میں وہاں لوٹا جس سے اکبر بادشاہ بہت خوش ہوا اور اس کے بارے میں بہت اچھے تاثرات پیدا ہوئے۔

۹۹۰ھ میں مرزا عبدالرحیم کو جہانگیر کا اتالیق مقرر کیا گیا۔ اس وقت جہانگیر کی عمر ۱۰ برس کی تھی اور مرزا عبدالرحیم کی ۲۸ برس تھی۔ جہانگیر کا مرزا عبدالرحیم کا اتالیق مقرر ہونا اس کی تمام تر اہلیت صلاحیت اور علم و دانش کی صفات کو تسلیم کر لینے کے مترادف تھا اور بادشاہ اکبر نے مرزا عبدالرحیم

کو جہانگیر جس کو مستقبل میں بادشاہ کی ذمہ داریوں کو سنبھالنا تھا۔ اس کے اہل بنانے کے اہل مرزا رحیم کی اہلیت کو دیکھ لیا تھا۔ یہ کوئی معمولی قابلیت ذمہ داری نہ تھی جو کہ اس کو سونپی گئی تھی۔

مرزا خاں کی لیاقت کا چشمہ پھوٹا

مرزا خاں اس سے قبل جہانگیر کا اتالیق مقرر ہوا تھا جبکہ بڑے بڑے کہن سالہ کارگزار امیر موجود تھے اس کے ہوتے ہوئے ولی عہد کی اتالیقی کے لیے ان کو مقرر کیا۔ یہ کوئی معمولی اعتماد اور یقین کی بات نہیں تھی۔ غرض جب منصب جلیل عطا ہوا تو اس نے یہ شکرانہ جشن شاہانہ کا سامان کیا۔

مرزا خاں کی جوہر لیاقت کا چشمہ جو کہ مدت سے بند پڑا تھا اب ۹۹۱ھ میں وہ بہہ نکلا اس کی صورت حال یوں بیان کی گئی ہے کہ:

اکبر کی خواہش تھی کہ قلمرو ہندوستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سکہ اکبر کا ہی چلے۔ یعنی اس کی حکومت ہو۔ تو فتح گجرات کے بعد اعتماد خاں جو کہ ایک پرانا سردار سلطان محمود گجراتی کا نمک خوار اس سے الگ ہو کر اکبری امرا میں شامل ہو گیا تھا اور وہ ہمیشہ بادشاہ کے خیالات کو اس طرف منتقل کرتا رہا تھا تو ان دنوں میں موقع پر کر بعض امرا کو اپنے ساتھ ہمداستان کیا اور اس کو بہت سی صورتیں بنا کر اس مقصد کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی تو ۹۹۱ھ میں اس نے دوبارہ عرض کی اور بعض امرا کو اپنے ساتھ ہمدستان کیا تو اکبر نے جو کہ مذکور کا واقف حال دیکھ کر مناسب سمجھا کہ

''شہاب الدین احمد خاں کو گجرات سے بلا لے اور اسے صوبہ کر کے بھیجے۔''

مگر گجرات پر اکبر کی یلغار ابراہیم حسین مرزا وغیرہ تیموری شاہزادوں کی جڑ اکھیڑ چکی تھی۔ جب اکبری انتظاموں کا استقلال دیکھا اور تلواریں جنگلوں میں چھپا کر بیٹھ گئے اور جو سردار بھی ادھر ادھر سے گزرتا تھا تو ہیر پھیر وے کر اس کے واسطوں کے ساتھ نوکری کر لیتے تھے مگر تشویش کی خبریں پھیلاتے رہتے تھے اور دل سے دعائیں مانگتے رہتے تھے۔

جب تو شہاب الدین احمد خاں پہنچا تو اسے معلوم ہو گیا کہ یہ مفسد حاکم سابق اوزیر خاں کے انتظام کو بھی بگاڑ چاہتے تھے اور اب بھی وہی ارادے رکھتے ہیں۔ وہ سردار پرانا تجربہ کار سپاہی تھا تو اس نے ان کے سرگروہوں کو تلاش کیا اور ان کو فوج تھانے تحصیل میں بھر کر کام میں لگا دیا۔ غرضیکہ اس اپنی حکمت عملی سے ان کے زور کو توڑ دیا تو جب بادشاہ کو اس کی خبر ملی تو اس نے حکم بھیجا کہ:

''ان لوگوں کو ہر گز چھٹے نہ دو اور اپنے متحد اور وفادار آدمیوں سے کام لو۔''

مگر یہ بڈھا سردار وقت ہی گزارتا رہا۔ منصب اور علاقے بڑھا کر دلاسے اور تسلیاں دے کر کام چلاتا رہا تھا۔ اعتماد خاں پہنچا تو اکبری ارادوں کو نئے انتظاموں کے سپرد ان کے کانوں میں پہنچ گئے تو فتنہ گروہوں نے ارادہ کیا کہ:

''شہاب الدین احمد خاں کا کام تمام کر دیا جائے اعتماد خاں تازہ دم ہوگا۔ مظفر گجراتی سلطان محمود کا بیٹا جو گمنامی کے ویرانوں میں بیٹھا ہے اسے بادشاہ بنا ئیں گے۔''

ابھی مفسدوں میں سے ایک نے آکر یہاں بھی خبر دی تو شہاب الدین احمد خاں کا رنگ اتر گیا مگر حکم بادشاہ ہی سے وہ بھی دل شکستہ ہو رہا

تھا۔ اس سے اس نے فوری طور پر بغیر کسی قسم کی تحقیق کے لوگوں کی یوں سے نکل جانے کا حکم دیا تو انھوں نے وہاں سے نکل اپنے پرانے پرگنوں میں پہنچ کر اور مفسدوں کو جمع کرنا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ ہی منظفر کو بھی چٹھیاں لکھ دیں اور بعض مفسد شہاب الدین احمد خان کے ساتھ بھی مل گئے اور اس سے قسمیں لے کر کہا کہ:

''جب دربار کو جائے تو ہمیں بھی ساتھ لیتا جائے اور اندر اندر دوسروں کو ورغلاتے اور بہکاتے رہے تھے اپنے رقیبوں کو خبریں پہنچاتے رہے۔ ان کا بڑا سردار میر عابد تھا۔''

اب بیرم خاں کی نیک نیتی کھو یہ خواہ مرزا خاں کا زور اقبال اب شہاب الدین احمد خاں کی دانائی اسے لوگوں کے سامنے بیوقوف یوں بتاتی ہے کہ:

''اعتماد خاں اور خواجہ نظام الدین جو دربار سے گئے تھے وہ پٹن میں پہنچے تو شہاب کا وکیل آیا ہوا تھا۔ انھوں نے اپنا وکیل ساتھ کیا اور دربار سے اسپ و خلعت دے کر اور فرمان وغیرہ سے رخصت کیا۔''

شہاب خاں استقبال کے لیے کوسوں آگے آیا۔ فرمان کو قبول کیا اور آداب بجالاتے ہوئے چابیاں ان کے حوالے کر دیں۔ اپنے تھانے اٹھوا دیے۔ جن کی تعداد ۱۰ کے قریب بتائی جاتی ہے۔ اب ان کا فساد شروع ہوا کیونکہ تھانوں کے اٹھتے ہی تولی اور کروس ادھر کی وحشی اقوام اٹھ کھڑی ہوئیں اور اکثر قلعوں پر قبضہ کر کے ویران کر دیا اور ملک میں خوب لوٹ مار مچا دی۔ تو شہاب الدین احمد خان بیروان کے قلعے سے نکل کر عثمان پور اس میں آ گئے تو اعتماد خاں، شاہ ابوتراب، خواجہ ناظم الدین احمد خوشی خوشی قلعے میں داخل ہو گئے۔ یہ عابد ملک نمک حرام جو کہ شہاب کے پاس ملازم تھا۔ وہ پانسو کی فوج لے کر الگ ہو گیا۔ اور اعتماد خاں کو پیغام بھیجا کہ:

''ہم بے سامان ہیں۔ شہاب کے ساتھ نہیں جا سکتے۔ جو انھوں نے جاگیر دی تھی وہ بحال رکھتے تو خدمت کو حاضر ہوں ورنہ خلق خدا ملک خدا ہم است۔''

یہ پیغام پا کر اعتماد خاں کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ ہوشیار ہو گیا کہ مگر اعتماد خاں نے نہ سوچا نہ سمجھا۔ فوری طور پر یہ پیغام دیا کہ:

''بے غم وہ جاگیریں تنخواہ نہیں ہو سکتیں ہاں میں اپنی طرف سے امانت کروں گا۔''

اسے کو ایک بہانے کی ضرورت تھی وہ صاف اپنے یاروں سے جا ملے تو اس سے ہنگامہ اور بھی بڑا اور گرم ہو گیا۔

اعتماد خاں کو جو فوج شاہی دربار سے ملی تھی۔ وہ ابھی تک نہ پہنچی تھی تو اس نے سوچا کہ شہاب الدین کو ان فتنہ انگیزوں سے لڑا کر رنگ جماتے تو اعتماد خاں نے شاہ ابوتراب اور خواجہ نظام الدین احمد کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ:

''تمہارے نوکروں نے فتنہ برپا کر دیا ہے تم ابھی جانے میں توقف کرو۔ اور ان کا بندوبست کرو۔ حضور میں اس کا جواب لکھتا ہوں گا۔''

تو اس نے کہا کہ:

''یہ مفسد تو اس دن کی دعائیں کر رہے تھے اور میرے قتل کے درپے تھے۔ کام اصلاح سے گزر چکا ہے۔ اب مجھ سے کیا ہو

سکتا ہے؟ تم جانو تو تمہارا کام یہ مگر اس طرح ملک داری کے کام آگے نہیں بڑھتے ان لوگوں کو جاگیر دے خوش کرو۔ اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو ابھی مفسدوں کی جمعیت بہت تھوڑی ہے بلوا عام نہیں ہوا ملکی اور جنگلی لوگ ہیں۔ کوئی معتبر سردار شامل نہیں ہے۔ اپنے اور میرے آدمی بھیجو کہ جا کر ان پر حملہ آور ہو کر ان کو تتر بتر کریں۔"

تو اعتماد خاں نے کہا کہ:

"تم شہر میں آ جاؤ پھر مشورہ کر کے حتمی فیصلہ کریں گے اس کے مطابق عمل کریں گے۔"

وہ بھی تو کوئی احمق نہ تھے تجربہ کار انسان تھا۔ وہ نہ آیا بلکہ اس نے کہا کہ:

"میں نے خود قرض سے سامان سفر کیا ہے۔ فوج پر عمل ہے بڑی مشکل سے شہر سے نکلا ہوں۔ اب روپیہ دو آنا بہت ہی مشکل ہے۔"

غرض اس نے ہزار بہانے پیش کر دیئے۔

مگر اعتماد خاں نے کہا کہ:

"تم شہر میں چلے جاؤ۔ خزانہ سے مدد خرچ میں دوں گا۔"

اسی مکالمہ بازی میں ان کے کئی دن گزر گئے مگر شہاب سمجھ ضرور گیا کہ یہ دنی سردار پرانا سپاہی ہے۔ باتوں باتوں میں کام نکالتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جب تک اس کی فوج شاہی نہیں آتی مجھے اور میرے آدمیوں کو اپنی جمعیت پا کر ان شان بنا لے اور جب اس کی فوج آ جائے گی تو مجھے صحرا میں چھوڑ دے۔ یعنی دھوکا دے گا۔ اگر اس کی نیت صاف ہوتی تو روز اول ہی رقم کا انتظام کر دیتا تھا اور میرے لشکر کا سامان درست کر کے مہم کو سنبھال لیتا۔

چنانچہ شہاب الدین احمد خاں سے کوچ کرے کڑی میں جا کر ٹھہر گیا جو کہ یہاں سے تیس کوس کے فاصلے پر تھا اور مفسد حالت میں پڑے تھے۔ فوراً کاٹھیواڑہ میں پہنچے۔ سلطان محمود گجراتی کا بیٹا مظفر کاٹھیواڑ میں آ کر اپنے سسرال کے ہاں چھپا بیٹھا تھا اسے یہ پوری کہانی سنا کر سبز باغ دکھائے گئے۔ اس کے باپ دادا کا ملک تھا۔ اسے بھی موقع مل گیا۔ فوراً اٹھ کر تیار ہو گیا اور اس کے چند مفسدوں کو ساتھ لیا اور ۱۵۰۰ کے قریب کاٹھی لٹیرے ساتھ ہو گئے اور دو اس طرح آئے کہ انھوں نے دولقہ کے مقام پر آ کر دم لیا۔ وہ اس خیال میں تھے کہ شہاب الدین احمد خاں جو کہ دریا کو چلا ہے اس پر شبخون مارا جائے یا کئی اور شہر کو موت کا ذریعہ بنائیں۔ اعتماد خاں تو بوڑھا سپاہی تھا اور اسی ملک کا سردار تھا مگر اس کی عقل پر پردہ پڑ چکا تھا۔ اس نے جب یہ سنا تو مظفر دولقہ میں آن پہنچا ہے تو اس کے طوطے اڑ گئے اپنے بیٹے اور دو تین سرداروں کو احمد آباد میں چھوڑا۔

اور کہا کہ:

"میں خود جا کر شہاب الدین احمد خاں کو لاتا ہوں۔"

مگر بیچند اصلاح نے کہا کہ:

"دغنیم بارہ کوس پر بیٹھا ہے۔ اٹھارہ کوس جانا اور شہر کو اس طرح پر چھوڑنا عقلمندی کا تقاضا نہیں ہے۔"

مگر اس بوڑھے سپاہی نے ان کی ایک نہ سنی اور ان کے ساتھ اتفاق نہ کیا اور خواجہ نظام الدین کو ساتھ لے کر روانہ ہو گیا تو اس کے نکلنے

جانے کے فوراً بعد بدمعاشوں نے ادھر خبر پہنچائی کہ:

"غنیم جو کہ خود حیران تھا کہ کدھر جائے جھٹ اٹھ کھڑا ہوا اور سیدھا احمد آباد پر آ کر حملہ آور ہوا۔ قدم قدم پر سینکڑوں لٹیرے ساتھ ہوتے گئے۔ سرکنج شہر سے تین کوس کا فاصلہ ہے، جب وہ یہاں پہنچا تو چند مجاوروں نے سلاطین باطن کے دربار سے اٹھ کر ایک پھولوں کا چتر سجایا اور لے کر سامنے آئے وہ نیک شگون نیک فال سمجھا گیا۔ ادھر کولی کے اثر سے شہر میں داخل ہوا۔ پہلوان علی سیستانی کوتوال تھا۔ آتے ہی اسے پچھاڑ کر قربان کر دیا تو شہر کے اندر قیامت کا سماں برپا ہو گیا۔ بادشاہی سرداروں کی نیت تھی کہ وہ ان کا مقابلہ کرے۔ انھوں نے بھاگنے میں غنیمت جانی تو شہر لاوارث رہ گیا۔ اہل فساد نے لوٹ مار شروع کر دی۔ گھر اور بازار زر و جواہر اور مال و دولت سے بھرے ہوئے تھے انھوں نے فوراً لوٹ کر خالی کر دیے۔"

ادھر اعتماد خاں نے شہاب الدین احمد خاں کے پاس جا کر اس پر یہ عہد باندھا کہ:

"دو لاکھ روپیہ نقد مجھ سے لو اور جو پرگنے جاگیر میں تھے وہ جاگیر بھی اپنے پاس رکھو اور تم احمد آباد کی طرف چلو۔"

وہ قسمت کا مارا راضی ہو گیا اور وہ دونوں بوڑھے اکٹھے مل کر احمد آباد کی طرف روانہ ہو پڑے۔ مگر احمد آباد کی حالت ہی بدل چکی تھی جس کا انھیں کوئی علم نہ تھا۔

شہاب الدین احمد خاں کو اپنے نوکروں کے دل کا بھی حال معلوم تھا۔ اس نے اپنے دل کو تسلی دلانے اور اطمینان قلب کے لیے رات کو ان سے قرآن پاک پر حلف لیا اور ان کو سمجھایا بجھایا اور ان کے دل مضبوط کیے تو پھر وہ روانہ ہو پڑے۔ وہ تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ وہاں ان کو احمد آباد کے بھگوڑے بھی مل گئے جو خاک وہاں سے اڑا کر آئے تھے وہ ان کے چہروں سے ظاہر ہو رہی تھی انھوں نے احمد آباد کے حالات سے ان دونوں کو آگاہ کیا۔ جس سے ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور اس کے رنگ فق ہو گئے انھوں نے تمام سرداروں کو اکٹھا کیا تو خواجہ نظام الدین نے کہا کہ:

"گھوڑے اٹھاؤ اور شہر پر جا پڑو اور اب مزید وقت ضائع نہ کرو۔ اگر غنیم نکل کر مقابلہ کرے تو ان کے ساتھ خوب ڈٹ کر مقابلہ کرو جو کچھ نصیب و قسمت میں ہو گا مل جائے گا۔ اگر قلعہ بند ہو کر بیٹھا ہو تو محاصرے کر لو۔"

اعتماد خاں کی فوج بھی آ رہی تھی جو بھی حالات ہوں اس کا مقابلہ کیا جائے۔ مگر شہاب تو گھر کا پھرا تھا۔ اس کا دل اچاٹ ہو چکا تھا اور وہ اس لحاظ سے کافی پریشانی حال بھی تھا۔ اس کے لشکر کے ساتھ اس کے نوکروں کے اہل و مال بھی تھے یہ اس کی غلطی تھی کہ وہ احمد آباد کی طرف لوٹا مگر اہل و عیال کو نہ چھوڑ کر آیا۔ آخر کار بڑی مشکل سے شہر پہنچا اور اہل لشکر عثمان پور پر آ کر ڈیرے ڈالنے لگے تاکہ وہاں اہل و عیال کو وہاں ٹھہرائیں تو اس وقت بھی نظام الدین احمد وغیرہ ہمت والوں نے کہا کہ:

"باگیں اٹھائے شہر میں داخل ہو جاؤ۔ آسان کام کر واس کو دشوار مت کرو۔"

مگر ان دونوں بوڑھوں نے اب بھی اس کے ساتھ اتفاق نہ کیا اور اس کی اس تجویز پر کوئی توجہ نہ دی۔

اس اثنا میں دشمن کو ان کی آمد کی خبر ہو چکی تھی تو انھوں نے اپنے صلاح و مشورے سے سامان جنگ اکٹھا کر کے جنگ کی خوب تیاری کر لی تھی اور فوج کا قلعہ باندھ کر سید سکندر بن گئے فوج اور اہل و عیال اسباب و مال سنبھال رہی تھی کہ دونوں افواج میں گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی۔

شہاب الدین احمد خاں آٹھ سو سپاہی لے کر ایک بلندی پر جا بیٹھے اور فوج کو آگے دھکیل دیا مگر فوج نے خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر سردار جو کہ نمک حلال تھے انھوں نے نمک حرامی کا ثبوت دیا۔ وہ حلال گئے یعنی ہلاک ہو گئے اب شہاب الدین کی باری تھی۔ اس کے امراہی بھاگ گئے۔ ان کا گھوڑا گولی سے چھیدا۔ صرف بھوئی بندر رہ گیا تو دشمن کا ہجوم دیکھ کر ایک جاں نثار نے باگ پکڑ کر کھینچی انھوں نے بھی غنیمت سمجھا اور وہاں سے جان بچا کر بھاگے۔ ساتھ ہی توڑوں میں سے ایک نمک حرام نے پشت پر تلوار ماری الحمدللہ کہ ہاتھ الٹا لگا اور وہاں سے بچ کر ایسے بھاگے کہ پٹنی (ٹھہر والا) میں آ کر دم لیا جو کہ وہاں سے پچاس کوس کے فاصلے پر ایک مقام تھا۔ ایک دن میں وہاں پہنچ کر دم لیا کاٹھی اور کولی اور جنگلی لٹیرے لوٹ مار کے لیے تقسیم کے ساتھ مل گئے اور سارے لشکر کو ٹڈیوں کی طرح چاٹ کر ختم کر دیا اور جنس اور گھوڑے اتنے تھے کہ محاسب کے حساب سے باہر ہے۔ سپاہ کے اہل و عیال کی خریدی کا خود اندازہ لگائیں اور ان کا کیا حال ہوا ہوگا؟ ان کی بدحالی کو دیکھا نہ جاتا تھا۔

مظفر کی فتح

ظفریاب مظفر فتح حاصل کرنے کے بعد گھوڑے پر سوار ہو کر شہر میں گشت کرنے لگے اور شہاب الدین کے نمک حرام سرخرو ہو کر اب ان کے دربار میں حاضر ہو گئے۔ انھوں نے سامان سلطان موجود دیکھ کر دربار قائم کر دیا اور سب کو بادشاہی خطاب عنایت کیے جامعہ مسجد میں خطبہ پڑھا گیا اور پرانے سردار جو نحوست کے گوشوں میں بیٹھے تھے انھیں بلا بھیجا تو وہ فوری طور پر بھاگے آئے۔

غرض جنگلوں کے لٹیرے مفلس محتاج، ملک کے پرانے سپاہی بخاری و ماوراء النہری کہ تیموری شہزادوں کی کھرچن تھے وہ دو ہفتے کے اندر اندر ۱۴۰۰۰ چودہ ہزار فوج کی جمعیت تیار کر لی۔ مگر مظفر کو باوجود اس فتح کے قلب ایمان کا ڈر سوار تھا۔ اس لیے کچھ سرداروں کو یہاں چھوڑا اور آپ بڑودہ کی طرف فوج لے کر روانہ ہو گیا کہ وہ وہیں تھا کہ ادھر دربار سے اعتماد خاں کی فوج بھی آ گئی شہاب وغیرہ پٹن میں..... بچے کھچے پڑے تھے اب اور کیا ہو سکتا تھا۔ اس کو مضبوط کر کے وہیں بیٹھ گئے۔

جنگ بڑودہ

شہاب اور اعتماد قطب الدین کو برابر کہہ رہے تھے کہ یار بار لکھ رہے تھے کہ یہاں آ جاؤ۔ ہم ادھر سے چلتے ہیں۔ یہ ایک بغاوت کا مسئلہ ہے کہ ہم آسانی سے دبا لیں گے۔ فکر نہ کرو۔ مگر وہ بھی پنج ہزار سردار تھا اور بہت پرانا اور تجربہ کار انسان تھا۔ اس وجہ سے یہ دونوں بوڑھے بھی اس کا احترام کرتے تھے اور اس کی خدمات کے مداح خواں تھے مگر اس کی سمجھ میں اصل صورت حال نہیں آ رہی تھی اور وہ جوانوں کے ساتھ اتفاق نہ کر پاتا تھا اور ان کی ہیبت کو ٹالتا ہی جا رہا تھا۔

مگر جب اکبر بادشاہ کو اس خبر کا علم ہوا تو اس نے دربار سے فرمان روانہ کیا جس کے نتیجے میں قطب الدین وہاں سے روانہ ہوا اور اپنی سپاہ کو تنخواہ دے کر ان کی حوصلہ افزائی کرنے لگا مگر اس وقت گزر چکا تھا اور پانی بھی سر سے اونچا ہو چکا تھا تو وہ چھاؤنی سے بڑودہ پہنچا تھا کہ مظفر نے آن لیا اور دونوں میں لڑائی شروع ہو گئی۔ وہ نیم جان ہو کر ہاتھ پاؤں مار کر قلعہ بڑودہ کے کھنڈر میں دبک گیا۔ فوج اور سردار مظفر کے ساتھ مل گئے اور دولت و اموال کا تو کیا حشر ہوا؟ اب خدا تعالیٰ کی قدرت دیکھو:

"یہ وہی مظفر ہے کہ تیس روپے مہینہ پر آگرہ میں لڑا تھا۔ اور یہاں سے ایک ناک اور دو کان لے کر بھاگا تھا۔ مگر اب تیس ہزار کا لشکر لیے باپ کے ملک کا وارث بنا بیٹھا ہے۔"

مظفر نے فتح حاصل کر لی اور قطب الدین، اعتماد خاں اور شہاب کو شکست کا سامنا ہوا جو کہ اکبری فوج تھی۔

پٹن کی جنگ

مظفر نے تو بڑودہ فتح کر لیا اور باپ کی میراث کو اپنے قبضے میں کر لیا مگر شیر خاں فولادی اس کے سردار نے کہا کہ:

"مجھے بھی تو اپنا لوہا منوانا چاہیے۔"

تو اس ارادے کی تکمیل کے لیے وہ فوج لے کر پٹن کی طرف روانہ ہو گیا تا کہ امرائے شاہی کو اپنے جوہر دکھائے۔ جب وہ پٹن پر پہنچا اور اپنی کچھ فوج کڑی سے بھیج دی تو خواجہ نظام الدین نے دل مضبوط کر کے بادشاہی فوج کو مقابلے کے لیے تیار کر کے باہر نکالا اور جو شیر خاں کی فوج کڑی پر چڑھی بیٹھی تھی اس کو دے ۔ مارا اور ساری کو ختم کر دیا۔ اب شیر خاں کے مقابلے کا وقت آیا تو اس وقت ان بوڑھے سرداروں پر اس قدر مایوسی اور سردی چھا گئی تھی کہ وہ گھبرا کر بولے کہ:

"بہتر ہے کہ پٹن سے چلو اور کوٹ چھیں۔"

مگر خواجہ نظام الدین باوجود یکہ نوجوان سپاہی تھا اس نے مردہ بن کر ان کو منع کیا اور وہیں روکے رکھا۔ اور خود فوج لے کر مقابلے کے لیے نکلا۔ دونوں فوجیں جب صف آرا ہو کر آمنے سامنے ہوئیں تو دونوں میں گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ ان کے پاس صرف دو ہزار ہی لڑاکے سپاہی تھے مگر سب پرانے اور تجربہ کار کہنہ مشق تھے وہ پانچ ہزار کے مقابلہ پر بڑھ کر میدان پہنچا۔ نوجوان سپاہی زادہ نے بڑی بڑی دلیری اور بہادری سے مقابلہ کیا اور دشمن کی فوج کے کشت و پشت لگا دیے۔ کھیت کاٹ کر ڈال دیا اور لڑائی جیت لی تو اس وقت شیر خاں تو گرم گجرات کو بھاگا اور شاہی فوج سرخرو ہوئی۔ شاہی فوجوں نے خوب مال غنیمت حاصل کیا۔ اس فتح سے شاہی فوج کی عزت رہ گئی کیونکہ شاہی فوج بڑودہ کی جنگ ہار کر بڑی مایوس ہو چکی تھی اور اب وہ اس جنگ میں بھی حصہ لینا نہ چاہتی تھی مگر خواجہ نظام الدین کے حوصلہ دلانے پر جنگ میں شامل ہو گئی اور شیر خاں کے ساتھ مقابلہ کر کے جنگ جیت لی۔ شاہی فوج نے مال غنیمت اکٹھا کر کے پٹن میں جمع کرتے رہے مگر خواجہ نظام الدین اب بھی برابر ان کو سمجھاتا رہا کہ "اب موقع ہے اور گجرات خالی ہے۔ گھوڑے تیار کرو اور چلے چلو۔ میدان مار سکتے ہو۔"

مگر اس کی بات کسی نے نہ توجہ سے سنی اور نہ اس کے ساتھ کسی نے اتفاق ہی کیا تو وہ ۱۲ دن تک وہاں قیام کیا۔ اور ان کو وہیں علم ہو گیا کہ بڑودہ کو مظفر نے کلی طور پر فتح کر کے قبضہ کر لیا ہے۔

شاہی فوج اپنے حوصلہ ہار چکی تھی۔ یہ جنگ بھی شاہی فوج نے اس سے ماری کہ ان میں تمام کہنہ مشق جنگجو لڑاکے سپاہی تھے۔ اس کے برعکس شیر خاں کے پاس پانچ ہزار کی فوج تھی مگر وہ کہنہ مشق جنگی چالوں سے واقف نہ تھے۔ شاہی فوج میں خواجہ نظام الدین بڑا دلاور اور حوصلہ مند نوجوان سپاہی تھا جس کی ہمت اور حرکات سے پٹن کی لڑائی شاہی فوج کے حق میں رہی۔ ورنہ بوڑھے سردار گرچہ تجربہ کار تھے مگر حوصلے ہار چکے تھے۔

عثمان پور کی جنگ

اکبر بادشاہ مغلیہ خاندان کا بڑا صاحب اقبال بادشاہ تھا اس نے اکثر ایرانی ولاور اور سورما راجپوت، راجہ ٹھاکر کو اس مہم کے لیے نامزد کر کے لشکر جرار تیار کر کے مرزا خاں خاناں کو اس لشکر کا سپہ سالار مقرر کر کے روانہ کیا جو کہ با اقبال اور نوجوان تھا۔ آزمودہ اور کہنہ مشق سردار فوجیں دے کر روانہ کیے۔ قلیچ خاں کو فرمان ہو گیا کہ وہ مالوہ جائے اور وہ وہاں سے بھی امرا کو ساتھ لے کر اس مہم کے ساتھ شامل ہو جائے۔ دکن کے جو سردار تھے ان کو بھی بڑے زور و شور سے احکام ملے کہ:

''وہ بھی میدان جنگ میں حاضر ہوں۔''

مرزا عبدالرحیم اپنے رفقاء کو ساتھ لے کر مارا مار اچل پڑا۔ راستہ میں کوہ و بیابان، دریا، جنگل اور میدانوں کو عبور کرتا ہوتا ہوا چالو کے راستے پٹن کو گیا۔ مگر راستے میں جو بھی خبر ملتی وہ اس کو مزید پریشان کر دیتی تھی اور وہ پھر سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتا تھا۔ مرزا کو قطب الدین خاں کی خبر ملی مگر اس نے اس خبر کو اپنی فوج پر ظاہر نہ کیا۔ بہرحال وہ برق و باد کی طرح جلدی سے پٹن پر ڈیرے ڈال دیے۔ امرا فوجیں استقبال کر کے لائے۔ مبارک بادیں دیں۔ ان کی اور شہاب الدین کی موروثی محبتیں تھیں مگر اس وقت سب بھول گئے۔ معلوم ہوا کہ مظفر نے ظفریاب ہو کر اور بھی رنگ لگائے ہیں اور وہ اپنا انتظام مضبوط کر کے بیٹھا ہے اور خیمہ لگا کر لڑائی کے لیے تیار کھڑا ہے۔

نوجوان سپہ سالار مرزا عبدالرحیم نے سرداروں کو جمع کر کے جلسہ کیا۔ ان سے مشورہ لیا اور ان کو حکم دیا کہ:

''اقبال اکبری پر بھروسہ کر کے تیار ہو جاؤ۔ اپنی تلواریں سونت لو اور شہر پر حملہ کر دو۔''

بعض سرداروں نے یہ رائے دی کہ:

''قلیچ خاں مالوہ سے لشکر لے کر آ رہا ہے اور حضور کا فرمان بھی آ چکا ہے کہ جب تک وہ نہ آ جائے جنگ نہ کریں۔ اس کا انتظار ضروری ہے۔''

اور بعض نے یہ بھی صلاح دی کہ:

''موقع نازک ہے یہ وہ وقت ہے کہ حضور خود یلغار کر کے آئیں تو سب کی سپاہ گری کا پردہ رہتا ہے۔ ورنہ خدا جانے کیا انجام ہوگا؟''

دوست کان ایک بوڑھا سردار تھا اور وہ مرزا خاں کا سپہ سالار کہلاتا تھا اس نے کہا کہ:

''حضور کا بلانا بہت ہی نازیبا ہے اور قلیچ خاں کا انتظار تمہارے لیے مصلحت نہیں۔ وہ پرانا سپہ سالار ہے۔ اس کے سامنے فتح ہوئی تو تمہارے رفیق حصہ سے بھی محروم رہ جائیں گے۔ اگر چاہتے ہو کہ فتح کا ڈنکا تمہارے نام پر بجے تو یا قسمت یا نصیب لڑو اور یہ بھی سمجھ لو۔ بیرم خاں کے بیٹے ہو جب تک آپ تلوار نہ چلائیں گے۔ خان خاناں نہ ہو گے۔ اور اکیلے ہی فتح کرنی چاہیے اور گمنامی کے جینے سے ناموری کا مرنا ہزار درجے بہتر ہے۔ پرانے پرانے سپہ سالار آپ کے ساتھ ہیں اور اچھی سپاہ بھی تیار ہے۔ سامان جنگ بھی حاضر ہے اور کسی چیز کی ضرورت ہے جس کا انتظار کیا جائے مرزا عبدالرحیم خاں بھی بڑے دانا اور

سمجھدار دربار اکبری کے پردے تھے۔ انھوں نے بھی ایک جھوٹ موٹ کی ہوائی خبر اڑا دی کہ دربار سے فرمان آیا کہ:
اکبری آئین سے اس کا استقبال ہوا ہے جس کو جلسہ عام میں پڑھ سنایا گیا۔ جس کا مضمون یہ تھا کہ
"ہم فلاں تاریخ سے یہاں سے سوار ہوئے اور خود یلغار کر کے آئے ہیں جب تک ہم پہنچیں لڑائی شروع نہ ہو۔"

فرمان پڑھ کر مبارک باد کے شامیانے بجائے گئے اور تمام لشکر نے خوشیاں منائیں اور دو دن تک توقف رہا مگر دونوں طرف بہادر بڑھ بڑھ کر جوہر دکھاتے رہے۔ یہ دروغ مصلحت آمیز آ سر زبانی باتیں تھیں۔ مگر کم ہمتوں کی ڈھارس بندھ گئی اور ہمت والوں کے مزید حوصلے بلند ہو گئے اور دوسری طرف دشمن کے حوصلے پست ہو گئے تھے۔

مرزا خاں کے ڈیرے احمد آباد سے تین کوس کے فاصلے پر سرکھیج پر تھے۔ اور مظفر شاہ بھیکن کے مزار پر تھا۔ یعنی دو کوس کے فاصلے پر وہ قیام پذیر تھا۔ وہ فوج مالوہ کی آمد کی خبر سن کر چاہتا تھا کہ:
"پہلے ہی لڑائی شروع کر دی اس نے شبخون مارا مگر ناکام رہا۔"

مرزا خاں نے دوبارہ سرداروں سے صلاح مشورہ کرنے کے لیے ایک جلسہ کیا تو سب کی صلاح بھی طے پائی کہ:
"جس طرح بھی ممکن ہو لڑائی کی جائے۔"

چنانچہ رات کو چھنیوں تقسیم کر دی گئیں تاکہ ہر سردار پچھلے پہر سے اپنی اپنی فوج کو لے کر تیار ہو گیا اور اعتماد خاں کو پٹن کی حفاظت پر چھوڑا تھا اور عثمان پور کے دہانے پر میدان جنگ ہوا۔ اس وقت مرزا عبدالرحیم کی فوج کی تعداد دس ہزار تھی اور اس کے مقابل دشمن کی فوج کی تعداد چالیس ہزار تھی۔ دونوں لشکر صفیں باندھ کر آمنے سامنے آئے۔ مرزا خاں نے دائیں بائیں پس و پیش سے لشکر کی تقسیم کی وہ بچپن سے ہی اکبر کے ساتھ رہا تھا۔ اور اس کے لیے یہ میدان کوئی نئی جگہ نہ تھی۔ ایسے میدان اس نے بے شمار آنکھوں سے مارے تھے۔ انھوں نے ہاتھیوں کی صف سامنے باندھی اور فوج ناظم الدین کو دو سرداروں کے ساتھ فوج دے کر الگ کر دیا سرکھیج کو داہنے پر چھوڑ کر آگے بڑھ جاؤ۔ جب لڑائی شروع ہو تو دشمن کا پیچھا سے حملہ کر دو۔"

الغرض لڑائی شروع ہوئی اور مظفر نے پیش دستی کے قدم آگے بڑھائے۔ ادھر سے لڑائی کو ٹالتے رہے۔ حریف سر پر آ گیا تو قدم بڑھائے فوج ہراول نے خوب تیار ہو کر آگے بڑھا مگر راستے میں کٹ سا تار چڑھاؤ بہت تھے۔ آگے کی فوج جو ہراول پر کے پیچھے تھی وہ تیزی کے ساتھ پہنچی جو ترتیب باندھی تھی وہ ٹوٹ گئی اور لشکر میں گھبراہٹ پھیل گئی۔ ہراول کے سردار تلواریں پکڑ کر خود آگے بڑھ گئے تھے کئی پرانے نامور سردار مارے گئے اور فوج الٹ پلٹ ہو کر جدھر جس کا قدم اٹھا ادھر ہی جا پڑا جب میدان جنگ گرم ہوا۔ نیا سپہ سالار تین سو جوان اس کے گرد، سو ہاتھی کی صف سامنے باندھے کھڑا تھا اور نیرنگی تقدیر کا منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ دل میں کہتا تھا کہ:
"بیرم خاں کا بیٹا اجائے گا کہاں؟ مگر دیکھئے خدا اب کیا کرتا ہے؟ ایسے وقت میں حکم کیا چل سکے؟ کدھر سے روکے اور کدھر کو بڑھائے؟ یا قسمت یا نصیب مظفر بھی پانچ چھ ہزار کا پرا جمائے سامنے کھڑا تھا۔"
مرزا خاں نے دیکھ کر

''غنیم کے حملے کے آثار واضح ہو رہے ہیں۔''

تو ایک جانثار نے دوڑ کر اس کی باگ پر ہاتھ ڈالا کہ گھسیٹ کر لے جائے یہ بے ہمتی کا ارادہ دیکھ کر مرزا خاں سے نہ رہا گیا بے اختیار ہو کر گھوڑے کو ایڑھی لگائی اور قبل باتوں کو بھی للکار کر آواز دی۔ اس کا گھوڑا اٹھانا تھا کہ اقبال اکبری علامات دکھانے لگا۔ مرزا کی آمد نے شاہی فوج کے حوصلے بلند کر دیے اور جا بجا لشکر غنیم کو دھکیل کر آگے بڑھے۔ تقدیر کی مدد یہ ہوئی کہ:

''ادھر سے انھوں نے حملہ کیا ادھر خواجہ نظام الدین بھی ساتھ ہی مظفر کی پشت پر آن گرے۔''

شور مچ گیا کہ اکبر یلغار کر کے آ گیا ہے۔ بعض نے یہ سمجھا کہ قلیچ خاں مالوہ کی فوج لے کر آ گیا ہے۔

یہ شور سن کر مظفر ایسا گھبرایا کہ اس کے یک دم حواس باختہ ہو گئے۔ اس نے بھاگنے کا ارادہ کر لیا۔ اور اس کے بھاگنے کے ساتھ اس کے ساتھی بھی بھاگ گئے۔ دشمن کی فوجیں تتر بتر ہو گئیں اور بے شمار مارے گئے ان کا شمار اس وقت کون کرتا؟ شام ہو رہی تھی کسی نے بھی ان کا تعاقب نہ کیا۔ وہ محمود آباد کے راستے ندیا کے مہندری ریگستان میں نکل گیا۔ اور تیس ہزار کی فوج کی بھیڑ بھاڑ گھڑیوں میں پریشان ہو گئی۔ غنیمت بے شمار کہ وقت ماری تھی جن ہاتھوں کی تھی۔ انھیں ہاتھوں میں دے گیا۔ مرزا خاں نے مفصل عرضی کی اور بادشاہ سجدہ شکرانہ درگاہ الٰہی میں بجا لائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایسے موقعے پر شاہی فوج کو فتح نصیب فرمائی۔ دوسرے اکبر کے اپنے پالے ہوئے نوجوان عبدالرحیم خاں کے ہاتھوں وہ بھی اپنے خان بابا کا بیٹا۔

اس کے علاوہ مرزا خاں نے بھی یہ منت مان رکھی تھی کہ خدا فتح دے گا تو سارا نقد وجنس، مال ومتاع خیمہ، خرگاہ، اونٹ، گھوڑے، ہاتھی غریب سپاہیوں کو اور اہل لشکر کو بانٹ دوں گا کہ انھی کی بدولت خدا نے یہ دولت دی ہے چنانچہ اس نیک نیت سے ایسا ہی کیا۔

اس کی سخاوت کی ایک مثال یوں بیان کی گئی ہے کہ:

ایک سپاہی ایسے موقعے پر آیا کہ وہ کاغذوں پر اپنے دستخط کر رہا تھا۔ اس وقت اس کے پاس کچھ نہ بچا تھا فقط قلمدان اس کے سامنے تھا تو وہی اٹھا کر اس سپاہی کو دے دیا کہ:

''لے بھائی! یہ تیری قسمت۔ خدا جانے چاندی کا تھا یا سونے کا تھا سادہ تھا یا مرصع۔''

ملا صاحب پھر پھر خفا ہوئے تھے کہ اور فرماتے تھے کہ:

''اپنے عہد کے لیے چند ملازموں کو فرمایا کہ ان کی قیمت لگا دو۔ روپیہ بانٹ دیں گے۔''

دینا عجب مقام ہے۔ آخر ترک کا ہی تھا تقدیر نے حد سے بڑھ کر مدد کی۔ لاکھوں آدمیوں کی تعریفیں چاروں طرف سے واہ واہ۔ کیونکہ یہ موقع بھی ایسا ہی تھا۔ ان کا دماغ اور بلند ہو گیا۔

تھا تو یہ خاک مگر کان میں کچھ غفلت نے
ایسی پھونکی کہ ہوا میں یہ بشر آ ہی گیا

مرزا خاں کی فاتح کی حیثیت سے واپسی دربار

اگلے روز صبح کے آفتاب کے نشان سے قبل مرزا عبدالرحیم خاں خاناں فتح کا نشان اٹھائے اس احمد آباد میں داخل ہوا۔ جہاں وہ ماضی میں تین برس کی عمر میں ہمراہ اور تیرہ برس کی عمر میں اکبر بادشاہ کے ساتھ یلغار کر کے آیا تھا۔

اس نے شہر میں داخلے سے قبل امن وامان کی منادی کروا دی اور رعایا کو ہر لحاظ سے اعتماد میں لیا۔ کاروبار جاری رکھنے کے لیے بازار کھلوائے تو تیسرے دن قلیچ خاں وغیرہ اور دیگر امراء مالوہ بھی اپنی افواج لے کر آن پہنچے۔ تو انھوں نے آپس میں مجلس کر کے شہر کا بندوبست درست کیا اور تازہ دم فوجوں کو ساتھ لے کر مظفر کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔

ہر چند انھوں نے کہا کہ:

''اب سپہ سالار گجرات میں قیام کرے۔''

مگر کار طلبی اور فوج جوش میں تھا لہٰذا مرزا عبدالرحیم بھی مظفر کے تعاقب میں فوج کے ساتھ ہو لیا۔ مظفر کھمبائیت میں پہنچ چکا تھا اور لوگوں کو اس نے اپنے جال میں پھنسانا شروع کیا تھا تو لوگ بھی اس کو قدیمی شہزادہ سمجھ کر اس کی باتوں میں آنے لگے اور سوداگروں نے بھی اس کی مالی امداد کی اور دو ہزار کے قریب لڑائی کے لیے آدمی بھی بطور فوج کے جمع ہو گئے۔ مرزا خاں بھی بجلی کی رفتار سے اس کے پیچھے پیچھے صرف دس کوس کے فاصلے پر تھے۔ جب مظفر کو مرزا خاں کے تعاقب کی خبر ملی تو وہ وہاں سے نکل کر بڑودہ میں داخل ہو گیا۔ مرزا خاں نے قلیچ خاں اور دیگر سرداروں کو فوج دے کر آگے روانہ کیا جو کہ بڑے پرانے تجربہ کار سپاہی تھے ان کو اس کام کے لیے۔ موزوں کیونکہ وہ راستے کی خرابیوں کو بھی اچھی طرح سمجھتے اور جانتے تھے۔ مگر راستے خراب تھے اس لیے ان پرانے مرزا خاں کے سپاہیوں نے آگے بڑھنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ اور مظفر بڑودہ سے بھی نکل گیا۔ مگر شاہی فوج اس کے تعاقب میں چلی آ رہی تھی اور شاہی فوج کے امرا اور سپاہی جہاں ملک میں کسی مفسد کو پاتے اس کا بھی محاسبہ کرتے تھے۔ جب شاہی فوج اور مقام پر آئی تو خلف وہاں سے نکل کر پہاڑ میں کہیں روپوش ہو گیا اور اس نے وہاں چھپ کر اپنی قسمت کو دوبارہ آزمانے کا تہیہ کر لیا۔ مگر اس وقت اس کی فوج تقریباً تیس ہزار کے قریب ہو چکی تھی مگر مرزا عبدالرحیم خاں خاناں کے پاس صرف آٹھ ہزار کی نفری تھی۔

اس جنگ کی بھی بڑی اہمیت بیان کی گئی ہے اور اس جنگ کا ذکر بھی فتح نام میں رستم اور اسفندیار کے فتح ناموں سے کم نہیں سمجھا گیا۔ تو مرزا خاں نے مظفر کے ارادوں کو پامال کرنے کے لیے اپنے لشکر کی تقسیم کر دی اور ہراول اور دائیں بائیں بڑھایا۔ غرضیکہ اس نے لڑائی کے لیے اپنی فوجوں کی صف بندی کر کے جنگ کے لیے پوری تیاری کر لی تو مرزا خاں نے خواجہ نظام الدین کو آگے بھیج دیا کیونکہ وہ بھی پرانا سپاہی تھا۔ وہ پہاڑ کی لڑائی میں مشاہدہ کرے کہ آگے بڑھنے کے لیے رستے وغیرہ کی کیا حالت ہے؟ کیا راستہ آسان ہے یا مشکل؟ اور اس کے ساتھ دشمن کی فوج کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں کہ:

ا۔ دشمن کی فوج کی تعداد کتنی ہے؟

۲۔ دشمن کے پاس سامان حرب حسب ضرورت ہے یا کہ نہیں؟

۳۔ دشمن اس وقت کس قسم کا جذبہ جنگ رکھتا ہے؟

تا کہ دشمن کی نفسیات جنگ کو مدنظر رکھ کر تیاری کر کے آگے بڑھا جائے اور دشمن کے ساتھ مقابلہ کیا جائے۔ خواجہ نظام الدین دامن کوہ میں پہنچے تھے کہ مظفر کے پیادوں سے مقابلہ ہو گیا۔ مگر خواجہ نظام الدین نے مقابلے کا جواب اس قدر بہادری اور سختی سے دیا کہ وہ مظفر کے سپاہی سے پہاڑ کی طرف جا کر چھپنے پر مجبور ہو گئے مگر خواجہ نظام الدین نے بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور ان کے تعاقب میں آگے بڑھتا ہی گیا جب خواجہ نظام الدین آگے بڑھے تو انھوں نے دیکھا کہ:

"دشمن کا لشکر لبی قطار بنائے رستہ روک کر کھڑا ہے۔ ان کے پاس سامان جنگ بھی کافی تھا۔"

وہ فوری طور پر ان سے بھی لڑنے پر آمادہ ہو گئے اور دونوں فوجوں میں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ دور دور تک لڑائی کی نوبت تھی۔ مگر خواجہ نظام الدین بڑے ماہر جنگجو تھے۔ انھوں نے یہ کمال کیا کہ:

اس نے اپنے سواروں کو سواریوں سے اتار کر پیادہ کر دیا اور جھٹ پہلو پہاڑی پر چڑھ کر قبضہ کر لیا اور ان کے ساتھ ہی قلیچ خاں کو بھی اطلاع کر دی وہ بھی بائیں ہاتھ جلدی سے چلا آ رہا تھا۔ آ کر اس نے بھی دشمن کے ساتھ ٹکر لے لی۔ مگر دشمن نے اپنے زور سے اس کو پیچھے دھکیل کیا اور مسلسل اس کو پیچھے ہی دھکیلتا رہا۔

اس دھکا پیل میں خواجہ نظام الدین کے لیے آگے بڑھنے کے لیے راستہ کھل گیا جس پیادہ فوج نے پہاڑی پر چڑھ کر قبضہ کر لیا تھا وہ آگے اور آگے بڑھ کر پہاڑ پر چڑھ گئی۔ حریف جو قلیچ خاں پر گرے تھے۔ انھیں دیکھ کر مڑے اور ان میں دست بدست لڑائی ہوئی شروع ہو گئی۔ اس وقت عجیب کشت و خون کا منظر تھا۔ قلیچ خاں بستی میں جا پڑے تھے انھوں نے اوٹ کو غنیمت جانا اور وقت کا انتظار کرتے تھے۔

مگر چیل کی نظر والا سپہ سالار عقل کی دوربین سے جنگ کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔ وہ جنگ کے جس پہلو میں ذرا برابر بھی مدد کی ضرورت محسوس کرتا تھا وہاں ہی مدد کے لیے حکم دیتا تھا مرزا سپہ سالار نے فوری طور پر فیل توپ خانہ حسب ضرورت مقام پر پہنچایا اور حکم دیا کہ:

"جس پہاڑی پر قبضہ کیا تھا اس پر چڑھ جاؤ اور اس کے ساتھ ہی مزید کمک بھی بھجوا دی گئی۔"

تو اس کمک کی فوج نے دشمن کے بایاں پہلو کو ختم کر دیا۔ کئی محاذوں پر لڑائی جاری تھی اور یہ لڑائی اس قدر گھمسان کی ہوئی کہ وہ پہلی لڑائی کو بھی مات کر گئی۔ یہ اس سے بھی گھمسان کی شدید لڑائی ثابت ہوئی۔ مرزا کے ہتھنالوں کی گولی اسی مقام پر موقع پر لگی۔ وہ سیدھی مظفر جہاں کھڑا تھا وہاں ہی اس کو جا کر لگی تو اس کا دل ٹوٹ گیا تو اس نے شکست کی بدنامی کو غنیمت جانا اور شکست خوردہ ہو کر بھاگ نکلا۔ اس کی سپاہ کا بے شمار نقصان ہوا اور اس نے بہت سے مال غنیمت مرزا عبدالرحیم کی فوجوں کے لیے چھوڑا تو اس کے بعد مرزا خاں نے سپاہ کو حسب ضرورت انتظامات کے تحت جہاں ضرورت تھی اس طرف روانہ کر دی اور خود واپس احمد آباد میں آ کر رعایا کے بہتر انتظامات اور فلاح و بہبود میں مصروف ہوا۔

اس نے دربار میں جنگ کی روئیداد کو روانہ کر دیا تھا۔ تو جب دربار میں یہ عرض داشت پڑھی گئی جس نے فتح کا مژدہ سنایا تو اکبر بادشاہ بہت

خوش ہوا اور وہاں درباریوں نے بھی واہ واہ کے نعرے بلند کیے تو اکبر بادشاہ نے فرمان بھیج کر سب کو مبارک باد اور ان سب کو تسلیاں اور حوصلہ بلند کیے۔ مگر مرزا خاں کو خطاب "خاں خانی" خلعت با اسپ و کمر و خنجر مرصع تمن توغ اور ان کے علاوہ منصب پنج ہزاری جو کہ انتہائی معراج امرا کی بھی عنایت کیا اور ان کے علاوہ دوسرے سرداروں اور امراء کے بھی کے منصب بھی دس بیس اور اٹھارہ تیس کی نسبت سے یعنی جس طرح اس نے مناسب سمجھا اور انھوں نے بہادری کے جوہر دکھائے بڑھاتے تھے۔ یہ واقعہ اس کا ۹۹۱ھ کو وقوع پذیر ہوا۔

خان خاناں قادر الکلام کامل انشاپرداز تھا اور وہ اپنے مطلب کو پوری تاثیر کے ساتھ بیان کرنا جانتا تھا۔ اقبال کی بلندی، عہدے کی ترقی غرض اس وقت مرزا خاں کی عمر تقریباً تیس برس کی ہوگی کہ وہ دولت اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا کی کہ جو باپ کو بھی آخر عمر میں جا کر نصیب ہوئی تھی۔ وہ اس کو ابتدائی عمر میں ہی اللہ تعالیٰ نے اپنے لطف و کرم سے عطا فرمائی۔ جو کہ بڑی سعادت کی بات ہے۔

علماء نے تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

حکومت دفتر، فروائی، دولت و نعمت اور سامان امیری کا مزہ بھی اسی جوانی کی عمر میں آتا ہے کہ وہ بڑی دوست ہے اقبال مند لوگ ہیں جنھیں ساری نعمتیں اور دولتیں ان کی جوانی میں ہی اللہ تعالیٰ عطا فرمائے۔ امیری اور امیری کے لوازمات اچھے لباس، اچھی سواری، اچھے مکانات جوان کے لیے زیبا ہیں جوان کیسں ہی مل گئے کیونکہ تجربہ ہے کہ اچھا... کھانا بھی جوانی میں ہی مزا دیتا ہے اور رنگ لگاتا ہے۔ بڈھے بے چارے کے لیے جو بھی مزہ ہو بھی مزہ نہیں۔ بوڑھا اگر اچھا لباس پہنتا ہے ہتھیار لگا کر گھوڑے پر چڑھتا ہے تو لوگ مذاق اڑاتے ہیں کیونکہ اس کی کمر جھکی ہوتی ہے۔ شانے ڈھلکے ہوتے ہیں منہ پر جھریاں پڑی ہوتی ہیں۔ چہرے سے پژمردی ظاہر ہوتی ہے تو لوگ دیکھ کر ہنس دیتے ہیں بلکہ اپنے تئیں دیکھ کر آپ ہی شرم آتی ہے۔

"جوانی جائی کہ یادت بخیر"

مظفر کا تیسری بار بغاوت کرنا

مظفر نے بڑی حکمت عملی سے تیسری بار بھی فوج جمع کر کے اپنا بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ جس کی وجہ سے ملک میں بدامنی اور ابتری پھیل گئی تو جب مرزا عبدالرحیم کو اس کی ان حرکات کا علم ہوا تو اس نے اپنے امرا کو فوجیں دے کر اس کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا اور اب مرزا خاں خاناں نے افواج کو کئی طرف سے بھیجا تاکہ وہ بچ کر نہ جا سکے اور ہاتھ میں آ جائے اور اس کا خاتمہ ہو جائے کیونکہ وہ بار بار ملک میں بغاوت پھیلانے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔

مرزا عبدالرحیم خان خاناں نے مظفر کی سرکوبی کے لیے امرا کو افواج دے کر بھی روانہ کیا اور مگر خود بھی وہ جاں نثاروں کو ساتھ لے کر روانہ ہو گیا۔ تاکہ ایک تو وہ امراء کی کارکردگی پر نگاہ رکھے ان کی ضروری رہنمائی اور مدد بھی کرتا رہے۔ دوسرے یہ بھی اس کے علم میں رہے کہ کون سا امیر سپہ سالار بہتر فوجی جنگ میں بہتر رہا مناسب کارکردگی کا مظاہرہ کرتا ہے تاکہ اس کو اس کے مطابق حوصلہ افزائی کی جائے اور اس کو انعامات سے نوازا جائے۔ تو جب مظفر کو اس فوج کشی سے سرکوبی کا علم ہوا تو اس نے اپنی حالت سے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے مرزا کی شاہی فوجوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کی سکت نہ پائی تو وہ پھر اپنی جان بچانے کے لیے وہاں سے بھی بھاگ نکلا۔ راجگان ملک اور زمینداران اطراف کے پاس اپنے وکیل دوڑاتا تھا اور جا بجا مارا مارا پھرتا

تھا۔ اور اس کا کام صرف اب ملک میں لوٹ مار کر کے گزارہ کرتا تھا۔ اس نے اس طرح عمل سے تمام علاقے تباہ کر دیے تھے۔

یہ بھی ایک حکمران کا عجیب طریقہ روزگار ہے۔ اس طرح تو عوام تعاون چھوڑ دیتی ہے۔ یہ خراب انداز زندگی ہیں۔

جام کی چالبازی

مظفر خانخاناں کے ہاتھ نہ آیا اور بغاوت تو فرو ہو گئی لیکن وہ علاقہ چھوڑ کر بھاگ گیا تھا مگر وہ علاقہ میں جہاں موقع پاتا تھا۔ لوٹ مار کرتا رہتا تھا۔ جس سے عوام بڑے پریشان ہو رہے تھے اور وہ بار بار حکومت سے امن کی درخواستیں کرتے تھے تو مرزا عبدالرحیم اور اس کی حکومت اس کا خاتمہ کرنے کی درپے تھے تو ایک مرتبہ خانخاناں عبدالرحیم کو جام نے یہ اطلاع دی کہ:

''اس وقت مظفر فلاں مقام پر چھپا ہوا ہے اگر مستعد سپاہی اور چالاک گھوڑے ہوں تو اس کو ابھی اس حالت میں گرفتار کیا جا سکتا ہے۔''

تو مرزا عبدالرحیم خانخاناں نے اس اطلاع کو مصدقہ سمجھ کر خود اس کی گرفتاری کے گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا مگر وہ اب بھی ہاتھ نہ آ سکا۔ مرزا عبدالرحیم بڑا ہوشیار اور سمجھدار شخص تھا۔ اس نے فوری طور پر محسوس کر لیا کہ:

''جام دونوں طرف سے مفادات حاصل کرنے کی غرض سے کارسازی کر رہا ہے۔''

جو لوگ مظفر کی رفاقت کر رہے تھے وہ اپنی خوشامدوں کی سفارش سے کر رجوع ہو گئے۔ امین خاں غوری فرمانروائے جونا گڑھ نے اپنے بیٹے کو بے شمار گرانقدر اور قیمتی تحائف دے کر خانخاناں کی خدمت میں روانہ کیا اور ان سے بہتر تعلقات اور اعلیٰ راہ ورسم کی توقعات کا اظہار کیا۔

مظفر کا احمد آباد پر حملہ

مظفر مرزا عبدالرحیم خانخاناں کے لیے دردِ سر بنا ہوا تھا۔ اگرچہ وہ مقابلہ تو نہ کر سکتا تھا مگر اپنی بغاوتی شرارتوں اور مختلف قسم کی لوٹ مار سے حکومت شاہی کو بدنام کرتا تھا اور لوگوں کو پریشان کرتا رہتا تھا تو اب کی باری جب مرزا عبدالرحیم خانخاناں خود مظفر کی گرفتاری کی خاطر دارالسلطنت سے باہر نکلا ہوا تھا اور اس سے قبل اس نے مختلف امرا کو افواج دے کر مظفر کی بغاوت کو فرو کرنے کے لیے روانہ کیا تھا تو ابھی تک امرا اپنی افواج کے ساتھ اور خود مرزا عبدالرحیم واپس اپنے دارالخلافہ میں نہ پہنچ پاتے تھے کہ مظفر نے اس موقع کو غنیمت سمجھا تو اس نے یہ تخریبی منصوبہ بنایا ہے کہ:

''مرزا عبدالرحیم تو یہاں اور سپہ سالار اور تمام امرا ادھر ہیں۔''

لہٰذا اس نے جام کے پاس اسباب ضروری منگوا کر رکھوا دیا اور اپنے بیٹے کو اس کے دامن میں چھپایا اور خود گھوڑے سوار ہو کر احمد آباد پر حملہ کرنے کی غرض سے روانہ ہوا اور تھانہ تیغ پر خانخاناں کے معتبر وفادار موجود تھے۔ ان کے ساتھ مظفر کا بڑا سخت مقابلہ ہوا تو وہ مقابلہ کی تاب نہ لا سکا اور شرمندہ ہو کر واپس لوٹا تو جب خانخاناں کو اس سازش کا علم ہوا تو وہ بڑا خفا ہوئے اور کہا کہ:

''جام کو چھوڑ کر ختم کر دوں گا۔''

(یعنی جام کو مار کر تباہ کر دوں گا وہ دھوکا باز ہے) تو مرزا عبدالرحیم خود فوج لے کر آیا اور اچانک تو کراؤں سے چار کوس کے فاصلے آ کر

ڈیرے ڈال دیے۔ یہ علاقہ جام کا دارالخلافہ تھا جب جام کو اس کا علم ہوا تو وہ بھی بڑا پریشان ہوا اور بڑے کمال عجز و انکساری کے ساتھ ایک عرضی مرزا کی خدمت میں گزاری اور اس عرضی کے علاوہ شہزادہ ہاتھی جو کہ اعلیٰ نسل کے تھے اور عجائب و نفائس گراں بہار تھ لے کر بیٹے کے ہاتھ روانہ کیے اور پھر مرزا عبدالرحیم کے ساتھ صلح کی۔ چونکہ مرزا عبدالرحیم بھی اکبر کے شاگرد تھے اور ان کی پالیسی کے تحت حکومت کے پرزے تھے جس کی وجہ سے اکبر بادشاہ کی نرم پالیسی پر ہی وہ بھی گامزن تھے تو مرزا عبدالرحیم نے خفگی کے باوجود بڑی نرمی اور شفقت سے جام کے ساتھ صلح کر لی۔ اسی میں عوام اور حکام کی فلاح اور بہتری تصور کی جاتی تھی۔

حکام دکن اور خاندیس کے اختلافات

۹۹۳ھ میں خانخاناں احمد آباد میں بیٹھے اکبر اعظم کا سکہ چلا رہے تھے۔ ان کے پڑوس میں حاکم دکن اور حاکم خاندیش بھی واقع تھے مگر نا معلوم کن وجوہات کی بنا پر دونوں حکام میں اختلاف پیدا ہوئے اور وہ آپس میں لڑائی کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ راجی علی خاں نے ایلچی بھیج کر حالات کی اطلاع دی اور اس نے بتایا کہ چونکہ دونوں حکمرانوں میں اختلاف کی فضا قائم ہے اس لیے دکن کا راستہ کھلا ہوا ہے تو مرزا عبدالرحیم بھی بڑے دانا اور دور اندیش حکمران تھے۔ انھوں نے فوری طور پر اپنے امراء کو صلاح و مشورے کے لیے جمع کیا تو حضور نے خانخاناں کو حکم بھیجا کہ:

"وہ یلغار کر کے احمد آباد سے فتح پور میں پہنچیں اور ملک مذکور کو اپنے فیصلے میں کر لیا جائے۔"

آخر کار امرا اور سرداروں نے یہ فیصلہ کیا کہ ملک مذکور کو تسخیر کرنا آسان کام ہے۔ اس لیے مرزا عبدالرحیم دوبارہ واپس احمد آباد کی طرف روانہ ہو گئے اور خان اعظم عزیز کوکلتاش مہم دکن کے سپہ سالار ہو کر روانہ ہوئے۔

مظفر کا چوتھی بار بغاوت کا ارادہ

مرزا عبدالرحیم احمد آباد سے دکن کی مہم کے لیے روانہ ہو چکے تھے تو اس کی اطلاع مظفر کو بھی ملی تو اس نے اس خیال سے کہ احمد آباد اب خالی پڑا ہے اس پر حملہ کر دیا جائے تو فتح ممکن ہو گی۔ اس لیے مظفر نے اپنی طالع آزمائی کے لیے چوتھی بار بھی احمد آباد پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کیا۔ اس سلسلے میں جام کی کارستانی شامل حال تھی اور اس کی کارستانی نے اصل میں مظفر کی عقل پر پردہ ڈال دیا تھا اور جام نے اس کو یہ بھی سمجھایا کہ:

"پہلے تم مالوہ پر حملہ کر کے حاصل کر دو اور پھر اس کے بعد احمد آباد کا ارادہ کرو۔"

تو مظفر اس مشورے کو سن کے بڑا خوش ہی نہیں ہوا بلکہ مدہوش اور مست کی حد تک جا پہنچا اور جب اس کے ہوش ٹھکانے آئے اور امرائے بادشاہ کو بھی اس کی ان سازشوں کا علم ہوا تو وہ فوری طور پر اس کی سرکوبی کے لیے نکل کھڑے ہوئے مگر چونکہ مظفر کو شخص ایک سازشی اور لوٹ مار کر کے گزارہ کرنے والا حکمران سا لگتا تھا۔ اب اس کی کوئی حیثیت نہ رہی تھی اس لیے وہ مقابلہ تو نہ کر سکتا تھا تو وہ وہیں سے الٹے پاؤں بھاگا تو اس عرصے کے دوران مرزا عبدالرحیم بھی آن پہنچے۔ چونکہ مظفر تو نکل چکا تھا۔ اب اطراف و نواحی کے علاقے جو بچے تھے وہ بھی شاہی فوج کے بندوبست میں آ گئے میں سے سلطنت میں مزید توسیع ہوئی۔

خان اعظم کی خانخاناں کے ساتھ اتحادی لڑائیاں

خان اعظم مرزا عزیز کوکہ اکبر کا رضاعی بھائی اور وکیل مطلق مرزا عزیز کوکہ تھا تو اکبر بادشاہ نے دربار سے امرائے شاہی کے ساتھ خان اعظم کو اس مہم کے لیے روانہ کیا۔ اس کے علاوہ حضور نے مرزا خانخاناں کو بھی اس مہم میں شامل ہونے کا حکم دیا۔ لڑائیاں جو ہوئیں احمد آباد اور گجرات راستے میں پڑتے تھے اور دکن کی سرحد پر تھا۔ چنانچہ انشائے ابوالفضل نے جو مراسلہ مرزا خانخاناں کو تحریر کیا تھا۔ اس کے جواب میں خانخاناں نے تحریر کیا کہ:

"تسخیر دکن کی تجویز جو تم نے دی ہے پسندیدہ معلوم ہوتی ہے اور بکمال شجاعت سے امید ہے کہ اس کے مطابق ہی عمل ہوگا اور ملک بہت آسانی سے قبضہ میں آجائے گا۔"

مگر حالات کا مشاہدہ سے یہ ظاہر ہوا کہ خانخاناں نے خان اعظم پر عزیز کوکتاش کی دل کھول کر اور راضی ہو کر اس کی امداد کے لیے ہاتھ نہیں بڑھائے تھے مگر صرف حضور کے حکم کی اطاعت کی حد تک ان کے ساتھ رہے۔ اور یہ بھی حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ خان اعظم پر عزیز کوکتاش بھی تو ایسے اچھے آدمی نہ تھے کہ کوئی سیدھا صاف آدمی ان کی خاطر اپنی جان قربان کر دیتا اور معاوضہ اس کو کچھ بھی میسر ہوتا۔

اکبر بھی اپنی سلطنت کو چاروں آنکھوں سے دیکھتا تھا ان میں سے ایک نظر اس کی اپنے ملک موروثی پر بھی تھی تو چند دنوں کے بعد ادھر حکیم مرزا سوتیلا بھائی جن کے پاس ہمایوں کے وقت سے کابل کی حکومت تھی وہ فوت ہو گیا اور دوسری طرف سے یہ خبر آئی کہ:

"عبداللہ خاں ازبک حاکم ماوراء النہر نے دریائے جیحوں اتر کر بدخشاں پر بھی قبضہ کر لیا اور مرزا سلیمان کو اس نے نکال دیا ہے۔"

اس لیے اکبر اعظم کا بدخشاں پر لشکر کشی کرنے کا ارادہ عمل میں لایا گیا۔

یہی موقع تھا کہ جب خان اعظم دکن کو برباد کر کے خود سرگرداں ان کے پاس پہنچے تو خان خاناں نے بڑی ضیافت کر کے اس کو دربار کی طرف رخصت کیا اور خود فوج لے کر روانہ ہوا۔ جب خان خاناں بڑودہ سے بھڑوچ میں پہنچے تو خان خاناں کو خان اعظم عزیز کوکلتاش کا خط موصول ہوا کہ:

"اب تو برسات آگئی ہے تو اس سال لڑائی موقوف کر دی جائے۔ تو اگلے سال دونوں مل کر روانہ ہوں گے۔"

ان حالات کی وجہ سے خانخاناں واپس احمد آباد لوٹ آئے اور یہی وجہ ہے کہ میر فتح اللہ شیرازی بھی وہاں موجود ہیں تو اس معاملے کو بھی تقریباً پانچ ماہ ہی گزرے تھے کہ:

ان کے پرچہ نویس قیادت تھے انہیں بھی اس معاملے کا علم ہوا تو اس نوجوان صاحب ہمت نے خواہش کا اظہار کیا کہ:

"جن پہاڑوں میں میرے باپ نے شاہ جنت نشان سے (ہمایوں کی) خدمت میں جانثاریاں کی تھیں اور انھوں نے رات کو رات اور دن کو دن نہ جانا تو وہیں چل کر مجھے بھی تلوار آزمائی کرنی چاہیے۔ دکن سے عرضداشت لکھی کہ:

"حضور نے...... مہم بدخشاں کا ارادہ مصمم کر لیا ہے۔"

تو مجھے بھی شوق پابوس بے قرار کرتا ہے یعنی مجھے بھی ساتھ جانا ہے۔ ۹۹۵ھ میں یہ اور میر فتح اللہ شیرازی کی طلب کیے گئے تو انھوں نے اونٹوں اور گھوڑوں کی ڈاک اٹھائی اور یلغار کرتے ہوئے آئے تو بادشاہ نے ملک خاندیس کے احوال سنے۔ فتوحات دکن کے بارے میں بھی مشورے ہوئے اور کابل و بدخشاں کی مہم بھی تبادلہ خیالات ہوئے بہر حال اس بحث کے بعد مہم بدخشاں کی مہم کو کچھ عرصہ کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔

مظفر کی مستقل ہمت بغاوت

اگرچہ مظفر اپنی زندگی میں بار بار ناکامی کا منہ دیکھ چکا تھا مگر اس کو اس کے کیے کی واقعی سزا نہ ملی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ اس کا انتظار کر رہا تھا تو اس کے لیے اس نے اب پھر ہمت باندھ کر بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ وہ کبھی کھمبایت، کبھی نادوت، کبھی سورت اور کبھی پورپی اتھغر وغیرہ میں کہیں نہ کہیں ضرور بغاوت کرتا نظر آتا تھا۔ وہ جب ایک جگہ شکست کھاتا تو بھاگ کر دوسرے علاقے میں چلا جاتا اور وہاں بغاوت کر لیتا اور ادھر ادھر سے جنگلی لٹیروں کو جمع کرکے پھر فوج تیار کرکے لڑائی کے لیے تیار ہو جاتا تھا جو کہ شاہی فوج کے لیے وردِ سری بنا ہوا تھا تو کبھی احمد آباد کے حکمران خانخاناں اس کی بغاوت کو فرو کرکے اس کو دوسری طرف دھکیل دیتا تو کبھی اس کے ماتحت امراء اور سردار اس کی سرکوبی کر جاتے تھے۔ مگر اس کا مستقل طور پر خاتمہ کسی نے بھی ضروری نہ سمجھا۔ جس کی وجہ سے وہ بھی دلیر ہو گیا۔ ان میں سب سے پرانا قلیچ خاں پرانا امیر تھا اور بعضوں میں خواجہ نظام الدین نے ایسے جوہر جانفشانی کے دکھائے کہ دیکھنے والوں کی بڑی امیدیں وابستہ ہو گئیں۔

۹۹۷ھ کو خان اعظم عزیز کوکلتاش کو گجرات اور احمد آباد عنایت ہوا اور خان خاناں کو مع امرائے فتح یاب دربار میں بلائے گئے۔ مرزا عبدالرحیم کو دربار سے باہر کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ ٹوڈرمل کے مرنے پر ۹۹۸ھ میں پھر قبضہ میں آیا۔ احمد آباد اور گجرات کے عوض جونپور عنایت ہوا۔ خان خاناں ملکی مہمات کے ساتھ علمی خیالات سے بھی خالی نہ تھے اسی سنہ میں انھوں نے حسب الحکم واقعات بابری کا ترجمہ کرکے حضور کی خدمت میں پیش کیا جس کو بہت پسند کیا گیا اور مقبولیت کا شرف حاصل ہوا۔

۹۹۹ھ میں خان خاناں کو بادشاہ نے ملتان اور بھکر کا علاقہ جاگیر کیا اور ان کو بعض روایات کے مطابق قندھار کی مہم پر اور بعض کے بقول ٹھٹھ کی مہم پر روانہ کیا اور اس کے ساتھ امرائے شاہی بھی بہت سے کر دیے۔ جن میں بڑے پرانے اور کہنہ مشق سپاہی تھے۔ ابوالفضل نے اپنے رقعے میں لکھا کہ:

"قندھار کو اس وقت تک تو ایران اتنا حق سمجھتا تھا جس کا عیاں ان پر دعدہ بھی کراتے تھے۔"

مگر عبداللہ خاں کا کہنا تھا کہ:

"قندھار کے ساتھ ایران کو بھی ہڑپ کر لوں۔"

تو اکبر اعظم نے اس وقت دیکھا کہ:

"کہ شہزادگان صفوی جو سلطنت ایران کی طرف حاکم ہیں وہ شاہ سے آزردہ ہیں اور آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور رعایا ادھر رجوع رکھتی ہے۔"

دونوں بادشاہ اپنی اپنی مہمات میں برسرِ پیکار تھے مگر صلاح و مشورے تو بروز مدت سے جاری تھے۔ اب یہ تجویز آخری طور پر طے پائی کہ:

"بیرم خاں نے مدت تک وہاں حکومت کی تھی اور خانخاناں ملتان کے راستے فوج لے کر جائیں۔"

تو انھوں نے ذیل کے اسباب سے جانے سے گریز کیا کہ:

i- وہاں کے معاملات جیسے کہ اب نظر آتے ہیں اس وقت اس سے بھی زیادہ پیچیدہ اور خطرناک بھی تھے۔

ii- ہندوستانی لوگ برفانی ملکوں کے سفر سے بہت گھبرائے بلکہ ڈرتے تھے اور یہاں کی فوج زیادہ تر ہندوستانی ہے اور گرم علاقے کے لوگ سرد علاقوں میں گزارہ نہیں کر سکتے۔ یہ ایک طبعی عنصر کا خاصہ ہے۔

iii- وہاں کی مہمات میں روپے کا بڑا خرچ ہوتا ہے اور خانخاناں کے پاس اتنا پیسہ کہاں؟ تو جس طرح کہا جاتا ہے کہ:

"چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں؟"

تو آخر میں عرض کیا گیا کہ:

"پہلے ٹھٹھہ کا ملک میری جاگیر میں شامل کر دیا جائے تو پھر قندھار پر فوج کشی کروں گا۔"

یہ اصلاح بھی مصلحت پر مبنی تھی کیونکہ خانخاناں بھی بڑا دوربین اور باخبر ہوشیار شخص تھا۔ وہ ہزاروں تجربہ کار اور واقف حال خراسانی اور ایرانی اس کے زیر سایہ پل رہے تھے اور اس کے دسترخوان پر ہر روز آ کر کھاتے ہوئے تھے۔

وہ اچھی طرح جانتا اور سمجھتا تھا کہ:

"گجرات کے جنگل میں جا کر تارے بچائے پھرے۔ یہ ایک دوسری بات اور آسان بات ہے قندھار تو شہد کا چھتہ ہے۔ ایران توران پر ہر ایک کی اس پر آنکھ ہے۔ دو شیروں کے منہ میں جا کر شکار کرنا اور ان کے سامنے بیٹھ کر کھانا آسان کام نہیں ہو سکتا۔"

مگر حالات سے ظاہر ہوتا تھا کہ بادشاہی رضا یہی تھی کہ:

"سیدھے قندھار جا کر حملہ کرو۔"

مگر اس کے ساتھیوں اور دوستوں نے اس صلاح کو یوں تبدیل کر دیا کہ:

"ٹھٹھہ راستے میں پڑتا ہے تو پہلے ٹھٹھہ پر قبضہ کرو۔"

اگرچہ ابوالفضل کی بھی یہی رائے تھی کہ:

"ٹھٹھہ کا خیال نہ کرنا چاہیے۔"

آخرکار ۹۹۹ھ میں فوج تیار ہو کر روانہ ہوئی۔ کیونکہ ان کی منصوبہ بندی ۹۹۸ھ میں قندھار اور فتح ٹھٹھہ کے لیے ہو چکی تھی۔ ابوالفضل نے اپنے خطوط میں بار بار اس کی حوصلہ بندی کی۔ جس سے خانخاناں کا دل پھول کی طرح کھل گیا تھا۔ خاص کر اس وقت کہ ترکمان لوگ قندھار سے اس کے استقبال کو آئے۔ ایک اور خط میں لکھا کہ:

"سفر کا ارادہ، بادشاہی رخصت، فتح قندھار ٹھٹھہ وغیرہ کی طرح مبارک ہو۔"

ابوالفضل سے بڑے پیار و محبت کے پھول نچھاور کر کے اس کو قندھار کی دلی تسلیاں دے کر روانہ کر ہی دیا۔

بڑی ہوشیاری اور بردباری سے دائیں بائیں کا مصاحب رکھو۔ ابوالفضل اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں کہ:

بے شک مرزا جانی! حاکم ٹھٹھہ نے ہمایوں کے ساتھ عالم تباہی میں بڑی بے وفائی کی تھی اور اکبر کے دل میں یہ خطرہ تھا کہ پھر بھی اکبر کی اور ساتھ اس کے ابوالفضل اور امراء دربار کی یہ رائے تھی کہ:

"شاہان ایران و توران اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اور قندھار کے لیے ایسا موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ ٹھٹھہ کو تو جب چاہیں لے سکتے ہو۔"

محمد خان خاناں نے پھر جواب دیا کہ:

"قندھار صرف نام کا بیٹھا ہے مگر ملک بھوکا ہے حاصل خاک نہیں ہوگی بلکہ خرچ ہی خرچ ہوگا۔ جس کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور میرے پاس اس وقت کچھ بھی نہیں۔ میں بھوکا، سپاہ بھوکی، خالی جیب لے کر جاؤں گا تو وہاں کیا کروں گا؟ جب ملتان سے بھکر اور ٹھٹھہ تک تمام ملک سندھ میں اکبری نقارہ بجے گا تو سمندر کا کنارہ اکبری تصرف میں آ جائے گا تو قندھار خود بخود ہاتھ میں آ جائے گا اور قبضہ ہو جائے گا۔"

مگر کسی نے بھی اس کو جوان سپہ سالار کی رائے پر کان نہ دھرا اور وہ قندھار کو روانہ ہو گئے۔ مگر غزنی اور چنگش پاس کا راستہ چھوڑ کر ملتان اور بھکر ہو کر وہاں سے نکلے۔ ملتان تو ان کی جاگیر تھی تو وہاں انھوں نے چھ روپیہ حاصل کیا اور دیگر امور میں کچھ وقت گزار کر آگے بڑھ گئے۔ آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ ٹھٹھہ کا فیصلہ کر دو۔ کیونکہ مرزا جانی حاکم ٹھٹھہ کا بڑا ہی قصور تھا کہ:

"وہ ہمایوں کے ساتھ عالم تباہی میں اچھی طرح حسن سلوک سے پیش نہ آیا تھا اور اکبر کے دربار میں بھی تحائف وغیرہ بھی بھیجتا رہا مگر خود حاضر نہ ہوا تھا۔ اس لیے اس پر عدم اعتماد کا اظہار کیا جاتا تھا۔"

چنانچہ ان حالات کے پیش نظر پہلے ٹھٹھہ کی باری آ گئی تو فیض نے تاریخ مقرر کی کہ ملتان سے نکل کر بلوچوں کے سرداروں نے عہد و پیمان تازہ باندھے۔ مرزا جانی حاکم ٹھٹھہ کے ایلچی حاضر ہوئے اور انھوں نے عرض کیا کہ:

"حضور کا لشکر قندھار پر جا رہا ہے تو مناسب ہے کہ میں بھی اس مہم میں ساتھ چلوں اگر ملک میں مفسدوں نے سر اٹھایا ہے تو فوج خدمت گزاری کے لیے بھیجتا ہوں۔"

انھوں نے ایلچی کو الگ اتارا اور فوج کی رفتار تیز کی تو ان کو معلوم ہوا کہ:

"قلعہ سیوان کو آگ لگ گئی ہے اور مدتوں کا جمع کیا ہوا غلہ جل کر خاک ہو گیا ہے۔ اس کو مبارک شگون سمجھ کر اور بھی قدم بڑھائے۔"

فوج نے دریائی راستے قلعہ سیوان کے نیچے سے نکل کر لکی کو مار لیا۔ کسی کی تکبیر تک نہ پھوٹی اور کنجی سندھ کی ہاتھ آ گئی لکی سندھ کی بنگالہ

گڈھی کی سی اہمیت تھی کیا جیسے کے کشمیرہ کے لیے بارہ مولدی گویا کہ کی کی بڑی اہمیت تھی۔ تو سپہ سالار نے قلعہ سیوان کا محاصرہ کرلیا۔ اس وقت پر حاکم نشین قلعہ تھا۔ جو کہ پہاڑی کے اوپر تعمیر کیا گیا تھا اور ان کی رعایا کچھ جزیروں میں اور کچھ کشتیوں میں رہتی تھی ایک سردار اچانک چند کشتیاں لے کر جا پڑا اور بڑی دولت ہاتھ آئی اور رعایا نے اطاعت قبول کرلی۔

اس حالت میں مرزا جانی فوری طور پر فوج لے کر آ گیا۔ اور نصیر پور کے گھاٹ پر ڈیرے ڈال دیے۔ اس کے ایک اور بڑا دریا تھا۔ اور باقی اطراف میں نہریں اور نالے وغیرہ تھے۔ خان خاناں بھی اٹھ کر تیار ہو گیا تھا تو اکبر نے جسطیر اور امرکوٹ کے راستے اور بھی فوج بھیج دی تھی۔ وہ بھی آن پہنچی تھی۔ سپہ سالار نے ایک سردار کو اپنی جگہ پر مقرر کیا تاکہ وہ قلعہ والوں کو روکے رہے اور رسد کے یہ راستہ جاری رہے۔ دشمن نے چھ کوس پر جا کر چھاؤنی کے گرد اگرد دیوار تیار کر کے بڑے سکون سے وہاں بیٹھ گئے۔

دشمن کی فوج میں خسرو چرکس اس کا سپہ سالار تھا۔ اس نے جنگی دو سو کشتیاں تیار کی تھیں جن کو وہ لے کر چلا تھا۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی خبر آئی کہ:

"فرنگیوں نے بندر ہرمزے اس کی فوج کی مدد کو فوج بھیجی ہے۔"

یہ بھی ادھر سے بڑھے۔ حریف کشتیاں چڑھاؤ پر ہوتا ہے۔ مگر بہاؤ سے بھی تیز آتا ہے۔ شام کا وقت قریب تھا۔ لڑائی دوسرے دن کے لیے ملتوی کر دی گئی تھی اور یہ بھی خبر ملی کہ:

مرزا جانی بھی مشکل کے راستے سے آتا ہے اور کئی سردار اسی وقت فوج لے کر سوار ہوئے اور اندھیری رات میں پانی کی طرح گزر کر دریا کے پار جا پہنچے اور صبح ہوتے ہی لڑائی کی ابتدا ہوگئی۔

مگر یہ بڑی ہی عجیب و غریب لڑائی دیکھی گئی تھی کہ دشمن نے چاہا کہ:

"چڑھا آئے پانی کم تھا اور سامنے سے پانی کا توڑا اس لیے نہ بڑھ سکا کیونکہ جو بہادر رات کو اترے تھے وہ توپ کی آواز سنتے ہی سیل کی طرح دریا کی طرف دوڑ پڑے اور کناروں پر آ کر چھا گئے اور پانی پر آگ برسانے لگے۔"

خان خاناں کے پاس کل ۲۵ کشتیاں تھیں۔ انھیں کو چھوڑ دیا ادھر سے بہاؤ پر جاتا تھا۔ وہ موج کی طرح چلیں۔ اور پانی میں تیر کر کنارے پر جا لگیں۔ بہادروں کا یہ حال تھا کہ کھولتے ہوئے پانی کی طرح ابلے پڑتے تھے اور وہ کود کود کر دشمن کی کشتیوں میں جا پڑتے تھے۔ کشتیاں اور غریب مرغابیوں کی طرح تیرتی پھرتی تھیں۔ تو ایک امیر کشتی کو دوڑا کر خسرو خاں پر پہنچا تو اس کو اس نے زخمی کر دیا اور اس کو پکڑ ہی لیتا تھا مگر ایک توپ چھٹ گئی اور وہ کشتی ڈوب گئی۔ یہ وانہ حریف کا نامی سردار آگ کی جگہ پانی میں فنا ہو گیا۔ اب غنیم کے پاس فوج بھی زیادہ تھی اور سامان حرب بھی بہت زیادہ تھا۔ مگر انھوں نے شکست کھائی۔ ان کی چار کشتیاں سپاہ اور سامان جنگ سے بھری ہوئی قید ہوئیں انھیں میں قیطو حرمز بھی تھا۔ حاکم حرمز اپنا ایک معتبر شخص میں رکھتا تھا۔ وہاں کے تاجروں کے سب کاروبار میں اس کو ایجنٹ رکھتا تھا۔ جانی بیگ اسے ساتھ لے آیا تھا اور اپنے بہت سے آدمیوں کو فرنگی فوج کی وردی پہنا دی تھی۔ اگر اس وقت کھوڑا لے کر مرزا جانی پر حملہ کر دیا جاتا تو جنگ کا فیصلہ یقینی تھا مگر بے ہمتوں کی صلاح نے روک دیا

اور دشمن ڈوبتا ڈوبتا دوبارہ سنبھل گیا۔

بادشاہی فوج بہت تھی جس کو خشکی میں جگہ دی گئی تھی اور جا بجا معرکے کرتے ہوئے تھے اور ہر جگہ پر قبضہ جما لیتے تھے ہر جگہ پر رعایا نے اطاعت قبول کر لی۔ اور امرکوٹ کا راجہ اطاعت قبول کر کے مدد کو آیا تھا اور اس کی وجہ یا دھر کا راستہ صاف ہو گیا۔ اور ایک مقام کے لوگوں نے کنوؤں میں زہر ڈال دیا۔ تو ملک ریگستان میں آب نوشی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا اور جو شاہی فوج اس طرف گئی ان کو پانی کی بڑی مشکل پیش آئی۔ ان کی نگاہیں تو صرف خدا تعالیٰ کی طرف تھیں تو اقبال اکبری نے یاوری کی بادل آ گئے جو کہ خوب برسے۔ تالاب پانی سے بھر گئے تو اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی جانیں بچالیں۔

اب مرزا جانی حاکم ٹھٹھہ گھبرا گیا مگر فوج کی بہتات اور لڑائی کے سامان پر مطمئن تھا اور شاہی لشکر بھی گھبرا کر اٹھ چلا جائے گا۔ اگر نہ جائے گا تو گھیر جائے گا اور بھوکا مر جائے گا۔ ادھر شاہی فوج کو غلہ کی کمی نے بہت تنگ کیا تھا۔ سپہ سالار کبھی چھاؤنی کے مقام بدلتا تھا کبھی لشکر کو ادھر ادھر پھیلاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے دربار عرض کی کہ:

اکبر کا خیال دربار کے سہمات کی نگہبانی تھا۔ امرکوٹ کے راستے ادھر سے بہت کشتیوں میں غلہ اور جنگی سامان توپ، تفنگ، تلوار اور لاکھ روپیہ فوری طور پر روانہ ہوا۔ چونکہ بیچ میں ولایت کا بے خان خاناں خود یہاں چھاؤنی ڈال کر رہتا تھا اور امرا کو مختلف مقامات پر روانہ کیا اور ایک لشکر قلعہ سیوان پر دریا کے راستہ بھیجا۔ مرزا جانی کو خیال ہوا کہ:

"بادشاہی لشکر دریا کی لڑائی میں کمزور ہے اس لیے اس پر خود فوج لے کر نکلا اور راستہ میں ہاتھ مارے۔"

مگر سپہ سالار بے خبر نہ تھے، دولت خاں، خواجہ مقیم اور دھار الیسہ ٹوڈرمل وغیرہ کو فوجوں کے ساتھ کمک کے لیے بھیجا۔ کلی فوج گھبرا رہی تھی کہ یہ دو دن میں جائیں کوس رستہ لپیٹ کر جا پہنچے اور یہی معرکہ تھا کہ جس میں خود مرزا جانی سے لشکر بادشاہی کا مقابلہ ہوا۔ امرا نے مشاورت کا جلسہ کیا۔ پہلے یہ صلاح ہوئی کہ:

"خان خاناں سے اور فوج منگواؤ۔"

مگر دشمن کی فوج کا اندازہ کر کے غلبہ راستے کا اسی پر ہوا کہ:

"لڑ کر مرنا بہتر ہے۔"

یہ دشمن سے چھ کوس پر پڑے تھے۔ چار کوس بڑھ کر انھوں نے استقبال کیا اور بڑے استقلال اور سوچ سمجھ کے بعد لڑائی شروع ہوئی۔ فتح کی خوش خبری ہوا پڑائی کہ پہلے ادھر سے ادھر چل رہی تھی۔ لڑائی شروع ہوئی تو رخ بدل گیا۔ امراء نے فوج کے چار حصے کر کے قلعہ باندھا اور لڑائی شروع ہوئی غنیم کے ہراول اور دائیں کی فوج بڑے زور و شور سے لڑی امرائے شاہی نے جو کہ ان کے مد مقابل تھے خوب مقابلہ کیا۔ نامی سرداروں نے زخم کھائے مگر انھوں نے دشمنوں پر بھاری گھاؤ لگائے۔ بائیں طرف کی فوج نے بھی دشمن پر خوب وار کیے۔ غنیم کی فوج ہراول میں خسرو چرکس تھا اس نے ہراول کو دبا کر خوب جاودہ یاد کیا۔ شاہی ہراول شمشیر عرب تھا۔ خوب ڈٹا اور زخمی ہو کر گرا۔ رفیق میدان سے نکال لے گئے۔ ہوا نے بھی کچھ

مدد کی۔ آندھی اور ہوا سے دشمن کی آنکھ نہ کھلتی تھی۔ اس حالت میں کسی کو کسی کا حملہ نہ ہوتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور کون کیا کر رہا ہے؟

دولت خاں نے قلب سے نکل کر خوب ہاتھ مارے۔ ان کا رفیق بہادر خاں حیران کھڑا تھا۔ دونوں فوجوں کے انتظام درہم برہم تھے۔ اس حالت میں دو تین سردار اس کے پاس پہنچے۔ اس کے ساتھ ہی خبر ملی کہ مرزا جانی چار پانچ سو سواروں سے الگ کھڑا ہے۔ انھوں نے خدا بر طرف کے کر کے تیاری کی مگر اب اکبر کا مقدر دیکھیں کہ کل صرف سو آدمی تھے انہی سے دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے۔ میدان میں ایک بھی نہ ٹھہر سکا اور کسی نے مقابلہ نہ کیا اور بھاگ نکلے۔ اس وقت دشمن ایک ہاتھی نے دوستوں کی خوب مدد کی۔ مستی میں آ کر اٹھیاں کرنے لگا اور اپنی ہی فوج کو تباہ و برباد کرنے لگا۔

دھارا رائے راجہ ٹوڈرمل بیٹا اس جنگ میں خوب ڈٹ کر لڑا۔ وہ ہراول میں شامل تھا۔ مگر اس کی پیشانی پر تیز وکا زخم آیا تو گھوڑے سے گرا۔ خوش نصیب دنیا سے سرخرو گیا۔ پھر بھی کم بخت باپ کے حال پر افسوس کرنا چاہیے جوان بیٹے کا داغ بڑھاپے میں دیکھا۔ میدان جنگ میں فتح کی روشنی ہو چکی تھی۔ اندھیرا شکست کا چھٹ چکا تھا اتنے میں امرا کو اطلاع ملی کہ:

''دشمن کی فوج بادشاہی لشکر کے ڈیروں کو لوٹ رہی ہے۔''

تو سرداروں نے یہ خبر پاتے ہی گھوڑے دوڑائے اور باز کی طرح شکار پر لپکے۔ بھگوڑوں نے جان کو غنیمت جانا اور جو مال ان کے ہاتھ لگا تھا اس کو پھینک کر بھاگ گئے۔ دشمن کے تین سو خان خاناں کے سو آدمی ضائع ہوئے۔ مرزا کی جگہ پلٹ کر ٹھہرا مگر خدائی سے کون لڑ سکتا ہے؟ اس جنگ کا کسی کے ذہن میں کوئی خیال و وہم نہ تھا۔ چھاؤنی کہیں میدان جنگ کہاں سپہ سالار خود کہاں۔ سب کو تائید آسمانی کا یقین ہو گیا۔ پانچ سو ہزار کو بارہ سو بار سے دو چار کر کے بھگا دیا۔

یہاں یہ معرکہ ختم ہوا تو دوسری طرف جس قلعہ کو مرزا جانی اپنے لیے پناہ سمجھتا تھا۔ خان خاناں نے اس پر جا کر حملہ کر دیا اور حملہ ہائے مردانہ سے اس کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ مرزا جانی میدان جنگ سے بھاگ کر ادھر گیا تھا کہ گھر میں آرام سے بیٹھ کر کوئی منصوبہ بندی کرے تو راستہ میں خبر ملی کہ قلعہ میدان جنگ بن چکا ہے۔ اور وہاں خانخاناں کی خیمہ گاہ ہے بہت حیران و پریشان ہوا۔ غور و تامل کے بعد ہالہ کنڈی سے چار کوس سیوان سے چالیس کوس دریائے سندھ کے کنارے پر جا کر دم لیا اور ایک قلعہ بنا کر بیٹھ گیا۔ اس نے بڑی گہری خندق کھودی۔ خان خاناں بھی پیچھے پیچھے تعاقب کرتا ہوا پہنچا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔

دونوں میں لڑائی دن رات جاری رہی۔ ملک میں وبا پھیل پڑی۔ اتفاق کی یہ بات تھی کہ صرف سندھی ہی مرتے تھے فقرائے گوشہ نشین نے یہ خواب دیکھا تھا کہ:

''جب تک اکبری سکہ و خطبہ جاری نہ ہوگا یہ بیماری رفع نہ ہوگی۔''

یہ بیماری شکری کی سزا ہے سرکشی سے توبہ کرو تو رفع ہوگی۔ یہ خواب بھی جلد مشہور ہوا تو بندگان شاہی اور بھی قوی دل ہو گئے۔ محاصرہ اتنا تنگ ہوا کہ اہل قلعہ بھی پریشان اور تنگ ہو گئے۔ آخر کار انھوں نے صلح کی باتیں کرنی شروع کر دیں۔ بادشاہی لشکر بھی خوراک کے ہاتھوں تنگ تھا لہٰذا صلح کی رات پر اتفاق کر لیا گیا اور یہ معاہدہ ہوا کہ:

''سیوستان کا علاقہ قلعہ سیوان سمیت اور بیس جنگی کشتیاں نذر کرے۔ مرزا ایرج یعنی سپہ سالار کے بیٹے کو اپنی بیٹی کا رشتہ دے اور برسات کے بعد حاضر دربار ہو۔''

خاں خاناں نے جنگی مورچے اٹھائے اور لڑائی کے میدان میں شادی کے شامیانے لگائے گئے۔ مرزا نے برسات بسر کرنے کو قلعہ خالی کر دیا۔

مرزا عبدالرحیم خان خاناں پر اکبر کی عنایات

اکبر بادشاہ کو جب اس فتح کی خبر پہنچی تو وہ بہت خوش ہوا اور اس نے اس مہم میں لاکھ روپیہ ایک دفعہ، پچاس ہزار ایک دفعہ، پھر لاکھ روپیہ اور لاکھ من غلہ، سو بڑی بڑی توپیں اور توپچی دریا کے راستے بھیجے اور امرا بھی اپنی اپنی فوجیں لے کر پہنچے۔

۱۰۰۱ھ کے جشن نوروزی میں بمقام لاہور خاں خاناں نے اسے لے کر حاضر ہوئے۔ ملازمت کے لیے دربار خاص منعقد ہوا۔ بادشاہ مسند پر براجمان تھے وہ سلام و آداب بجا لا کر پیش ہوئے تین ہزار کی منصب اور ٹھٹھہ کی جاگیر عنایت ہوئی اور خانخاناں پر بادشاہ سلامت نے اس قدر عنایات کیں کہ:

اسے امید بھی نہ تھی۔ ہمارے مورخوں کو اس بات کا خیال نہیں ہوا کہ انسان کے کاروبار سے اس کے دلی ارادوں کے سراغ نکالتے ہیں اور پھر کہا جاتا ہے کہ:

''اکبر کو اپنی دریائی قوت بڑھانے کا بڑا خیال تھا۔''

چنانچہ اس موقع پر اس کو تمام علاقے دے دیا۔ مگر بندرگاہ خالصہ ہو گئے۔ اس کا بڑا مقصد اس کو خوش کرنے کے علاوہ اس علاقے کی فلاح و بہبود اور تعمیر کا بھی تھا۔ اکبر اپنے جانشینوں کا بڑا قدردان حکمران تھا۔ جس کی وجہ سے اس نے اپنی وسیع سلطنت کو مغلیہ خاندان کے تمام فرمانرواؤں کی نسبت بہتر اور اعلیٰ اختیاری اقتدار سے گزاری۔

دکن کا سفر

۱۰۰۳ھ کو مرزا عبدالرحیم خانخاناں کو دوبارہ دکن کا سفر درپیش ہوا۔ اس سفر میں اس نے کدورت اور نحوست بھی اٹھائی۔ اس سفر کی بنیاد یہ تھی۔ جبکہ ایک کو ملک دکن کا خیال آیا اور اس کے ساتھ خان اعظم عزیز کوکلتاش کی ناکامی کا بھی اس کے ذہن میں احساس تھا۔ جس کو ابھی تک اس نے اپنے ذہن سے فراموش نہ کیا تھا اور اس کے علاوہ جو سفارتیں ادھر کے حاکموں کے ساتھ ہوئی تھیں وہ بھی ابھی ناکام ہی رہیں کیونکہ فیضی بھی برہان الملک کے دربار سے ناکام ہی لوٹا اور وہ کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ برہان الملک فرمانروائے احمد نگر حضرت ہو گیا تھا اور اس کا ملک کو کافی عرصے سے پیٹ ڈالا تھا۔ جس کی وجہ سے عوام بھی مسائل سے دوچار تھی۔

مگر اب نئی اطلاع یہ آئی کہ انہوں نے صرف تیرہ سالہ بچے کو تخت نشین قرار دیا ہے اور تخت حیات اس کا بھی کنارہ عدم پر لگا چاہتا ہے تو اکبر

نے مراد کو (روم کی چوٹ) سلطان مراد بنا کر لشکر عظیم کے ساتھ دکن کی طرف روانہ کیا اور اکبر نے پنجاب میں آ کر قیام کیا تا کہ سرحدوں کا انتظام مضبوط ہے۔ تو مراد سلطان نے گجرات میں پہنچ کر چھاؤنی ڈالی اور مہم کا سامان کرنے لگا کہ اکبری امرائے اپنی عملداری جاری کی۔ امرائے عادل شاہ فوج لے کر آئے تا کہ ملک نظام کا انتظام کریں۔ ابراہیم لشکر لے کر اس کے مقابلے کو گیا۔ احمد نگر سے چالیس کوس پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ اور ابراہیم نے گلے پر تیر کھا کر جان دے دی۔

کل بھائی کو اندھا کر کے ہوش کی آنکھوں میں سرمہ دیا تھا۔ آج خود دنیا سے آنکھیں بند کر گیا۔ ملک میں طوائف الملوک کی عجب ال چل پڑ چکی تھی۔ میاں منجو نے مراد کو عرضی بھیجی کہ یہ ملک لاوارث ہو گیا ہے۔ مملکت برباد ہو رہی ہے۔ حضور تشریف لائیں تو خانہ زاد خدمت کو حاضر ہے۔

اکبر کو جب یہ خبر ملی تو اس نے خان زماں کو روانگی کا حکم دیا اور شہزادہ کو لکھا کہ:

”تیار رہو مگر حملہ میں تامل کرو۔“

جس وقت خان خاناں پہنچے تو اس وقت گھوڑے اٹھاؤ اور احمد نگر میں جا پڑو۔ شہزادہ کو جب یوں خطاب اور اختیارات ملے تھے تو صورت حال سے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ:

”تیز ہے اور عالی ہمت ہے۔ وہ خوب بادشاہت کرے گا۔“

مگر وہ تیزی محض کوتاہ اندیشی، خود پسندی اور سفلہ مزاجی ہی نکلی تھی۔ صادق محمد خان وغیرہ اس کے سرداروں کو مزاج میں بہت دخل تھا اور وہ سمجھے کہ:

”جب خانخاناں آ گیا تو بالائے طاق اور اس کی روشنی سے شاہزادہ کا چراغ بھی مدہم ہو جائے گا۔“

پہلے تو انھوں نے بھی پھونکی ہوگی کہ اس کے آنے سے حضور کے اختیارات میں فرق آ گیا اور اب جو فتح ہو گی اس کے نام ہو گی خانخاناں کے جاسوس بھی موکلوں اور جناتوں کی طرح جابجا چھپے رہتے تھے اور ہر وقت کی روز ہر جگہ کی بربادی کی خبر لاتے تھے۔ تو رستے میں خبر ملی کہ برہان الملک مر گیا ہے اور عادل شاہ نے احمد نگر پر حملہ کر دیا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی خبر آئی کہ:

”امرائے احمد نگر نے شاہزادہ مراد کو عرض کر بلا لیا ہے اور وہ احمد آباد سے روانہ ہوا چاہتا تھا۔“

وہ خوشی خوشی روانہ ہو گیا مگر تقدیر کو خوشی منظور نہ تھی اس کی یہ وجہ تھی کہ:

i- خانخاناں کا جانا کسی سردار سپاہی کا جانا نہ تھا۔ اسے تیاری سپاہ وغیرہ میں ضرور دیر لگی ہو گی۔

ii- دوسرے مالوہ کے راستے سفر کیا۔

iii- تیسرے بھیلسا اس کی جاگیر رستے میں ہے۔ وہاں خواہ مخواہ ٹھہرنا پڑا ہوگا۔ راستہ میں راجاؤں اور فرمان رواؤں سے ملاقاتیں بھی ہوئی ہوں گی اور ظاہر ہے کہ اس کی ملاقاتیں فائدہ سے خالی نہ ہوں گی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ برہان پور کے پاس پہنچ کر راجا علی خان حاکم خاندیس سے ملاقات ہو گی۔ اس نے اپنی حکمت عملی اور حسن تقریر اور گرم جوشیوں کے جادو سے رفاقت پر آمادہ کیا ہوگا۔ لیکن ان

جادوؤں کا اثر کچھ نہ کچھ وقت ضرور چاہتا ہے۔ اتنے میں شہزادہ کا فرمان آیا کہ:

''مہم خراب ہوتی ہے جلد حاضر ہو اور......

ہرکاروں نے خبر پہنچائی کہ:

''شہزادے نے لشکر آگے بڑھایا ہے۔

انھوں نے لکھا کہ:

''راجی علی خاں آنے کو حاضر ہے اور فدوی چلا آیا۔ تو اس مصلحت میں خلل آجائے گا۔ شہزادے کے دل میں کدورت تو ہوئی ہی تھی۔ اب بہت بڑھ گئی۔''

خانخاناں کو بھی اس کے دربار کی خبریں برابر پہنچتی رہتی تھیں۔ اس عرضی نے جو رنگ دکھایا۔ اس کا حال سن کر اپنا لشکر فیل خانہ توپ خانہ وغیرہ اور اکثر مرزبری کو پیچھے چھوڑا۔

آپ راجی علی خاں کو ساتھ لے کر دوڑے۔ شہزادے نے سن کر بیس ہزار لشکر رکاب میں لیا اور آگے بڑھا۔ انھوں نے مارا مار احمد نگر سے تیس کوس پر جالیا۔ خان خاناں حیران کہ ہزار کار سازیوں سے اس شخص کو ساتھ لایا۔ جس کی رفاقت فتح و اقبال کی فوج ہے۔ یہ حسن خدمت کا انعام ملا۔ دوسرے دن ملازمت ہوئی تو شہزادہ تیوری چڑھائے منہ بنائے یہ بھی خانخاناں تھے جو رخصت ہو کر اپنے خیموں میں آئے اور بڑے رنجیدہ ہوئے۔ خانخاناں اٹھے کہ اپنے لشکر میں چلا گیا۔ اس وقت سب کی آنکھیں کھلی رہ گئیں کہ با صلاحیت شخص کسی کی ماتحتی میں کام نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے لشکر میں ناراضیاں پیدا ہوئیں۔

دوسری طرف چاند بی بی برہان الملک کی حقیقی بہن جو کہ حسین نظام شاہ کی بیٹی اور علی عادل شاہ کی بی بی (بیوی) جو کہ بڑی دانا اور عقلمند تھی اور وہ نادرۃ الزمانی کہلاتی تھی۔ اور وہی ملک کی وارث بن گئی تھی جب اس نے دیکھا کہ:

ملک گیا اور خاندان کا نام مٹ گیا تو چہرہ کی نقاب سے ہمت کی کمر باندھ کر کھڑی ہوگئی اور امرا کو تسلی اور دلاسے سے سمجھایا کہ:

''وہ اکبر کے لشکر کو آتے دیکھ کر ضرور انجام کو سوچے اور اس نے جو عرضیاں شہزادہ مراد اور خانخاناں کو روانہ کی تھیں ان پر بہت پشیمان ہوئی۔''

تو سب نے مل کر مشورہ کیا کہ:

''چاند بی بی قلعہ احمد نگر میں سلطنت کی وارث بن کر تخت پر بیٹھے۔ ہم حق نمک ادا کریں گے اور جہاں تک ہو سکے احمد نگر کو بچائیں۔''

اس شاہ مزاج بیگم نے جنگ کا سامان اور غلے کا ذخیرہ جمع کر کے امیروں اور سرداروں کی دلجوئی شروع کر دی اور احمد نگر کو مضبوطی اور مورچہ بندی کر کے سرسکندر بنایا۔ بہادر شاہ بن ابراہیم شاہ کو برائے نام وارث ملک قرار دے کر تخت پر بٹھایا اور ایک سردار کو بیجاپور بھیج کر ابراہیم عادل شاہ سے صلح کر لی۔ جمعیت و لشکر کو لے کر اپنی جگہ قائم کر لی۔ اور اس استقلال و انتظام سے مقابلہ کیا کہ مردوں کے ہوش اڑ گئے اور خاص کر م

میں چاند بی بی سلطان کا نام پڑ گیا۔

یہاں شہزادہ مراد امرا کے ساتھ پہنچا اور فوج خراساں لے کر احمد نگر سے آ کر فوج میدان فرزند گاہ میں آ کر ٹھہری۔ چاند بی بی قلعہ سے دکھنی بہادروں کو نکالا۔ انھوں نے تیر وتفنگ کے وہاں زبان سے جواب سوال کیے۔ قلعہ کے مورچوں سے گولے برسے۔ اس شاہی فوج آگے نہ بڑھ سکی۔ شام قریب تھی تو تمام امیر برہان نظام کے ہاں اتر پڑے۔ دوسرے دن شہر کی حفاظت اور اہلِ شہر کی دلداری میں مصروف ہوئے گلی کوچوں میں امان کی منادی کرائی گئی اور دوسرے دن ذیل کے سپہ سالاروں میں مورچے تقسیم کیے گئے۔

i- شہزادہ مرزا شاہ رخ

ii- خانخاناں

iii- شہباز خاں کمبوہ

iv- محمد صادق خاں سید مرتضیٰ بدخشی

v- راجی علی خاں حاکم برہانپور، راجہ جگن ناتھ، مان سنگھ صاحب وغیرہ، امرا جمع ہوئے کمیٹی کر کے محاصرہ اسلام کی اور مورچے تقسیم ہو گئے۔

قلعہ گیری اور شہرداری کا کام بڑی اچھے طریقے سے چل رہا تھا کہ شہباز خاں نے جمعیت کو ساتھ لے کر بازار میں لوٹ مار مچا دی ایک مقام بارہ امام کا لنگر تھا۔ اس کے گرد شیعہ آباد تھے۔ اس نے سب کو قتل کر دیا۔ جس کو شہزادہ اور خانخاناں سن کر بڑے حیران ہوئے اسے بلا کر انھوں نے سخت ملامت کی مگر گیا وقت ہاتھ آتا نہیں۔

اس موقع پر میاں منجھو تو احمد شاہ کو بادشاہ بنائے عادل شاہ کے سر پر بیٹھے تھے۔ اخلاص حبشی موتی شاہ گمنام کو لیے موت آباد کے علاقے میں پڑے تھے۔

آہنگ خاں حبشی ستر برس کے بوڑھے شاہ علی ابن برہان شاہ اول کے سر پر چتر لگائے کھڑے تھے تو سب سے پہلے اخلاص خاں نے ہمت کی۔ اور دولت آباد کی طرف سے دس ہزار لشکر جمع کر کے احمد نگر کی طرف چل پڑا۔ جب لشکر شاہی میں یہ خبر پہنچی تو سپہ سالار نے پانچ چھ ہزار دلاوروں کا انتخاب کیا اور دولت خاں لودھی کو ان کی سپاہ کا سر جتھہ تھا۔ ان کا سپہ سالار بنا کر روانہ کیا اور نہر گنگ کے کنارے پر دونوں افواج کا مقابلہ ہوا اور کشت وخون عظیم کے بعد اخلاص خاں بھاگے لشکر بادشاہی نے لوٹ مار سے دل کا ارمان نکالا۔ وہیں پٹن کی طرف گھوڑے اٹھائے شہر مذکور آبادی سے گلزار ہو رہا تھا مگر اس طرح لٹا کہ کسی کے پاس پانی پینے کو پیالہ تک نہ رہا۔ اس باتوں نے اہلِ دکن کو ان لوگوں سے بیزار کر دیا۔ جو ہوا موافق ہوئی تھی بگڑ گئی اگرچہ زور بازو اور قوت لشکر رکھتا تھا مگر اس کی چال کی غضب تھی۔ اس لیے چاند سلطان بیگم نے آہنگ خاں حبشی کو لکھا کہ:

"جس قدر ہو سکے دکنی دلاوروں کی سپاہ فراہم کر کے حفاظت قلعہ کے لیے حاضر ہو۔"

وہ سات ہزار سپاہ سے احمد نگر کو چلا۔ شاہ علی اور مرتضیٰ اس کے بیٹے کو ساتھ لیا اور وہ چھ کوس پر آ کر رکا اور اس نے جاسوس کو بھیج کر حالات معلوم کیے۔ تاکہ محاصرہ کے بارے میں جو علم ہو تو اس کو اطلاع ملی کہ

''قلعہ کی شرقی جانب خالی ہے۔ ابھی تک کسی کو ادھر کا خیال نہیں آہنگ خاں تیار ہوا۔''

قدرت الٰہی کا مرتب مشاہدہ فرمائیں کہ:

اسی دن شاہزادہ نے گشت کرنے پر مقام دیکھا اور خانخاناں کو حکم دیا کہ تھا۔

''ادھر بندوبست تم بذات خود کرو اور وہ بھی اسی وقت جنت بہشت سے اٹھ کر یہاں آن اترا اور جو مکانات پائے ان پر قبضہ کر لیا۔''

آہنگ خاں نے تین ہزار سوار انتخابی اور ایک ہزار پیادہ توپچی ساتھ لیے اور اندھیری رات میں کالی چادر اوڑھ کر قلعے کی طرف چلا۔ مگر دونوں طرف ایک دوسرے سے بے خبر تھے۔ خانخاناں فوراً دو سو سواروں کو لے کر عمارت پر توپ خانہ کے کوٹھے پر چڑھ گیا اور اس نے تیر اندازی شروع کر دی۔ ان کا میر شمشیر بھی دولت خان لودھی سنتے ہی چار سو سواروں کو لے کر بھاگا۔ پیر خاں دولت خاں کا بیٹا چھ سو بہادروں کو لے کر کمک کو پہنچا اور اندھیرے میں ایسی جنگ ہونے لگی آہنگ خان نے دیکھا کہ:

''اس حالت میں سوا مرنے کے لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا؟''

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ خانخاناں کی تمام افواج لڑائی میں مصروف ہیں۔ ان کی خواب گاہ بالکل خالی ہیں۔ چار سو کئی دلیر اور شاہ علی کے بیٹے کو لے کر گھوڑے مارے اور بھاگم بھاگ کرتے ہوئے قلعہ میں گھس ہی گیا۔ شاہ علی ستر برس کا بوڑھا تھا اس کی ہمت نہ پڑی۔ دم کو غنیمت جانا اور باقی فوج کو لے کر جس راستہ سے آیا تھا اسی راستے سے واپس بھاگا۔ دولت خان نے اس کا پیچھا کیا۔ مارا مار دوڑا اور نو سو آدمی کاٹ کی واپس لوٹا۔ بادشاہی لشکر گر پڑا تھا۔ مورچے امراء میں تقسیم تھے بے زور مارتے تھے۔ شہزادہ کی سرکار میں فتنہ انگیز اور کوتاہ اندیش مجھے دور کر گئے تھے وہمیدان میں دھادا بولتے تھے۔ البتہ دربار میں کھڑے ہو کر ایک دوسرے پر خوب داؤ پیچ مارتے تھے شہزادہ کی تدبیر میں اتنا زور نہ تھا کہ ان کی شرارتوں کو دبا سکے۔ اور آپ وہ کرے جو کہ مناسب ہو۔ یہ بات غنیم سے لے کر ان کی رعایا تک سب جان گئے تھے تو اب حالت یہ تھی کہ:

رسد کی تنگی پیدا ہو چکی تھی۔ مورچے خراب تھے رات کو شبخون مارتے تھے اور نامی سردار مارے گئے میدان میں معرکے ہوتے تھے کئی دفعہ غنیم کو شکست ہوئی۔ مگر کسی نے تعاقب نہ کیا سب کھڑے تماشا دیکھتے رہتے تھے تو ایک رات خانخاناں کے مورچے پر شبخون مارا۔ فوج ہوشیار تھی بڑی سختی سے مقابلہ کیا۔ دلاوروں کی سپاہ گری کام آئی۔ حریف صبح ہوتے خاک اڑا کر قلعہ میں بھاگ گئے۔ حضور انور تازہ دم فوج لے کر پہنچے تو ساتھ اندر گھس جاتے۔ بڑی کوششیں کیں اور مورچے بڑھاتے بڑھاتے تین سرنگیں برجوں کے نیچے پہنچیں۔ روپیہ بھی بہت خرچ کیا مگر اس شیر بی بی نے اپنی ہمت اور جاسوسوں کی تلاش میں پتے لگا کر دو سرنگوں کے سرے نکال لیے۔ حملہ کرنے سے ایک دن قبل زمین کھود کے باروت کے تھیلے کھینچ لیے۔ اس پر طرہ کہ مشکیں اور تھیلیاں بھر بھر کر اتنا پانی ڈالا کہ آگ کی جگہ پانی ابلنے لگا۔ قلعے والے تیسری زحمت کی فکر میں تھے کہ ادھر سے شہزادہ اور خانخاناں فوجیں لے کر سوار ہوئے اور بہادر حملہ کے لیے تیار کھڑے حکم ہوا کہ تھیلیوں کو آگ لگا دو۔ داد و اصادق محمد خاں فساد کی دیاسلائی روزانہ تھی کی سرنگ پانی پانی دوسری اور تیسری آگ لگائی تو پچاس گز دیوار گری تو عجب قیامت کا منظر نظر آیا۔ امرا میں کسی نے بھی دھاوا نہ کیا۔ حیران رہ

گئے کہ اور سرنگیں کیوں نہیں اگر آگے یہ بڑھتے تھے کہ مبادا بٹونڑوالی آفت یہاں بھی نازل نہ ہو۔ اور سب ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے۔ قلعہ والوں کو یہ علم تھا کہ:

"امرائے شاہی یک دل نہیں ہیں۔"

تو آہنگ نے جب یہ حالت دیکھی تو انھوں نے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا مگر چاند بی بی کہ اس شیر دل عورت نے اس معمولی سی فرصت کو غنیمت سمجھا اور اس نے پردہ کر کے ہاتھ میں تلوار لی تو بجلی کی طرح برج پر آئی اور انھوں نے پل بھر میں دیوار کو پھر اٹھالیا اور اس پر چھوٹی چھوٹی توپیں چڑھا دیں۔ جب شاہی لشکر کا ریلا دے کر جاتا تو اس طرف تو وہاں سے اولوں کی طرح گولے برستے تھے اور اکبری فوج ٹکر کھا کر واپس ہوتی تھی اس طرح ہزاروں آدمی کام آئے مگر کام کچھ نہ ہو سکے۔ آخر کار شام کو ناکام واپس خیموں میں چلے گئے۔

جب رات کو شاہزادہ مراد لشکر اور دیگر مصاحبوں سمیت نامراد خیموں میں گئے اور چاند بی بی چپ کر نکلی۔ وہ گھوڑے پر سوار مشعل روشن، چونے اور گچ کے ساتھ چنائی شروع کر دی۔ تمام مزدور اور اہلکار کام میں مصروف تھے۔ بادشاہی لشکر صبح کو اٹھا تو مورچوں پر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ:

پچاس گز فصیل جس کا تین گز عرض تھا راتوں رات سکندر اور اس کے علاوہ اس شیر کی بچی نے ایسی جنگی تدابیر کیں کہ ان کے بیان کرنے کی جگہ یہاں نہیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ آخیر میں جب غلہ ختم ہو گیا اور رسد بھی بند ہو گئی تو کہیں سے بھی امداد کی امید نہ رہی تو چاند بی بی نے لشکر شاہی پر چاندی سونے کے گولے ڈھال ڈھال کر مارنے شروع کر دیے۔

اسی موقعے پر خان خاناں کو اطلاع ملی کہ:

"سہیل خاں حبشی عادل شاہ کا نائب ستر ہزار فوج لے کر آتا ہے اور ان کے ساتھ ہی یہ بھی علم ہوا کہ اسد اور بنجارہ کا راستہ بھی بند ہو چکا ہے۔ لشکر کے جانور بھوکوں مرنے لگے تو چاند بی بی نے صلح کا پیغام دیا۔ برہان الملک کے پوتے کو حضور میں حاضر کرتی ہوں اور یہ طے پائے کہ:

i- احمد نگر اس کی جاگیر ہو۔

ii- ملک برار کی کنجیاں، معہ ہاتھی جواہر گراں بہا، نفائس و عجائب پیش کرتی ہوں۔

iii- آپ محاصرہ اٹھا لیں۔

مگر چاند بی بی کے اہلکاروں نے کہا کہ:

قلعہ میں ذخیرہ نہیں رہا اور غنیم نے ہمت ہار دی ہے۔ کام آسان ہے۔ صلح کی کوئی ضرورت نہیں مگر پھر بھی حالات کے تحت ان میں صلح ہو گئی اور ان کو یہ بھی خبر آئی تھی کہ:

"بیجاپور سے عادل شاہی لشکر جمعیت کر کے چاند بی بی کی مدد کو آ رہا ہے۔"

بہر حال دونوں کے درمیان صلح ہو گئی اور انھوں نے محاصرہ شرائط کے مطابق اٹھا لیا گیا اور ملک میں امن و امان کی فضا بحال ہوئی۔

خان خاناں کا مقدر چمکا

ان حالات میں خان خاناں کے مقدر نے بھی زوردار انگڑائی لی اور اس نے شہزادہ مراد اور صادق محمد خاں کو شاہ پور میں چھوڑ دیا اور خود شاہ رخ مرزا اور راجی علی کو ساتھ لے کر بیس ہزار فوج کے ساتھ آگے بڑھا اور وہ نہر گنگ کے کنارے سون پت کے پاس جا ٹھہرا اور وہاں قیام کر کے اس نے علاقے کے حالات کا جائزہ لیا اور ایک دن اس نے وہاں قیام کر کے فوجیں آراستہ کر کے مقام "رشتی" پر فوجوں کو تقسیم کیا۔ دریا میں پانی کم تھا۔ پایاب اتر گیا پاتھری سے بارہ کوس ماندیر کے مقام پر میدان جنگ قائم کیا۔

۷ اجمادی الثانی ۱۰۰۵ھ بمطابق ۱۵۹۷ء کو سہیل خاں عادل شاہ کا سپہ سالار تمام افواج کو لے کر آیا۔ دائیں طرف امرائے نظام شاہی اور بائیں طرف قطب شاہی۔ وہ بڑے غرور کے ساتھ فوجیں لے کر آیا اور آ کر قلب میں قائم ہوا۔ اس کے برعکس چغتائی سپہ سالار بھی بڑی شان سے میدان میں آیا تو چاروں طرف سے پیر جمائے قلعہ باندھا۔ خان خاناں کی فوج میں راجی علی خاں اور راجہ رام چندر راجپوت دائیں پہلو پر تھے اور خود مرزا رخ شاہ اور مرزا علی بیگ اکبر شاہی کو لیے قلب میں کھڑا تھا۔

جنگ کی ابتدا

پہلے دن نکل چکا تھا کہ لڑائی کی ابتدا توپوں سے ہوئی سہیل خاں کو اس لڑائی میں اپنے توپ خانے پر بڑا فخر تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں اس وقت تک صرف دکن میں ہی ایسا توپ خانہ تھا کسی اور کے پاس نہیں تھا تو پہلے بھی ہراول نے ٹکر کھائی۔ راجی علی خان اور راجہ رام چندر نے توپ خانہ خالی کرنے کی فرصت ہی نہ دی اور اس پر جا پڑے۔ اس دوران دونوں فوجوں میں ڈٹ کر مقابلہ ہوا نہ کبھی کوئی غالب آتا کوئی دوسرا۔

شاہی فوج کے بہادروں نے بہادری سے لشکر بادشاہی کو کھینچ کر ایک دشوار گزار مقام پر لے گئے۔ پھر جو حملہ آور ہوئے تو دست راست سے آئے اور ادھر ادھر نکل کر پھیل گئے۔ میدان میں لڑائی زوروں پر تھی۔ سردار حملے کرتے تھے۔ مگر کوئی فیصلہ نظر نہ آتا تھا۔ دن بڑی سے ڈھل رہا تھا۔ مگر لڑائی طول کھینچ رہی تھی۔ آخر کار اچانک خان خاناں کی قسمت نے قدرتی طور پر یاوری کی کہ:

علی بیگ رومی توپ خانہ غنیم کا رہا تھا۔ وہ خود بچتا ادھر سے ہم پہلو بچا کر نکلا اور خان خاناں کے پاس آیا اور اس نے یہ کہا کہ:

"آپ کیا کر رہے ہیں؟ حریف نے تمام توپ خانہ ٹھیک آپ کے مقابل میں چن رکھا ہے اور اب مہتاب دکھایا چاہتا ہے۔

لہٰذا جلدی دائیں کو ہٹو"

خان خاناں خود بھی تجربہ کار سپہ سالار تھا۔ اس نے اس تجویز کے ساتھ اتفاق کیا اور اس نے فوج کو بڑے بندوبست کے ساتھ پہلو میں سرکایا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے دو سوار راجی علی خاں کے پاس بھی روانہ کیے تاکہ اس کو اصل صورت حال سے آگاہ کیا جائے اور تم بھی "اپنی جگہ بدل لو" مگر راجی علی خاں کی عقل میں یہ بات نہ آئی وہ آ کر خان خاناں کی خالی کردہ جگہ پر آ کھڑا ہوا۔ فضا کا گولہ انداز ساعت کا منتظر تھا۔

راجی علی خاں کا وہاں آنا تھا کہ اس کو موت نے گھیر لیا۔ حریف نے سپہ سالار کو سامنے دیکھ کر آگ دیتے ہی حملہ کر دیا اور وہاں راجی علی خاں اپنی فوج کو لیے کھڑا تھا عجب گھمسان کا رن پڑا۔ مگر افسوس کا مقام تو یہ ہوا کہ:

"دکن کی کنجی اس میدان کی خاک میں گم ہو گئی۔"

اس میں شک کی بات نہیں کہ راجی علی خاں اور راج رام چند نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور اس جنگ میں تیس ہزار دلاور ان کے ساتھ کام آئے تھے۔

اب دن زیادہ ڈھل آیا تھا کہ سہیل خان نے دیکھا کہ:

"میدان صاف ہے اور خیال کیا کہ خان خاناں کو اڑا دیا جائے اور فوج کو بھگا دیا جائے۔ اس لیے وہ حملہ کر کے آگے بڑھا۔ مگر شام بھی قریب تھی جہاں صبح کو بادشاہی لشکر میدان جما کر کھڑا ہوا تھا وہ وہاں آن پڑا۔"

دوسری طرف خان خاناں کو اپنے ساتھی راجی علی خاں کی حالت کا کچھ علم نہ تھا جب اس نے دیکھا کہ آگ کا ہادی سامنے سے ہٹ چکا ہے تو گھوڑے کو لے کر سامنے کی فوج پر جا پڑا اس نے حریف کو تباہ کر دیا سہیل خاں کی فوج نے سجے ہوئے خیمے خالی کر دیے۔ فوج دکن کے سپاہی اس علاقے کے باسی تھے۔ انھوں نے جو سامان اٹھا سکے باندھ لیا اور چھاؤنی چھوڑ کر روانہ ہو گئے۔ خود اپنی فوج کے بیوفاؤں نے بھی مروت کے سر پر خاک ڈالی۔ یہ لوگ گھر کے راز دان تھے۔ وہ خزانوں اور بیش بہا کارخانوں پر گر پڑے اور طمع کے تھیلوں کو خوب بھرا۔ اگرچہ سہیل خاں کی فوج کا کافی نقصان ہوا تھا مگر اس نے ہمت نہیں ہاری تھی بلکہ خوش تھا کہ اس نے شاہی فوج کے سپہ سالار کو ختم کر دیا ہے۔ اب شام ہو چکی تھی تو وہ ایک ندی کے ٹیے پر نالہ تھا وہیں رک گیا۔ اس کے پاس تھوڑی سی فوج تھی تو دوسری طرف خان خاناں بھی تو کل بخدا کے سہارے وہیں ٹھہر گیا۔ تا کہ کل کا منظر دیکھا جائے۔ لطف کی یہ بات تھی کہ رات کا وقت ہے غنیم پہلو میں کھڑا ہے مگر کسی کو ایک دوسرے کا علم نہیں۔

اقبال اکبری کی طلسم کاری

اب چونکہ رات کا وقت تھا روشنی کا کوئی انتظام نہ تھا تو سہیل خاں کے کسی آدمی نے کوئی اپنی مشعل جلا کر اس کے سامنے روشنی کی تو شاہی فوج کے افسران اور دلاوروں کو وہ روشنی بھی نظر آ گئی تو انھوں نے آدمی بھیجے کہ:

"معلوم کریں کہ حال کیا ہے؟"

وہاں انھوں نے جا کر دیکھا کہ سہیل خاں چمک رہے ہیں اور وہاں بے شمار توپیں بھری کھڑی ہیں تو انھوں نے جھٹ سیدھا کر کے نشانہ باندھا اور داغ دیا اور اتفاق سے اندھیرے میں گولے بھی ٹھیک نشانے پر لگے جس سے حریف کے غول میں ولولہ پڑ گیا اور گھبرا کر وہاں سے نکلے مگر سہیل خاں حیران ہوا کہ:

"یہ کیسے گولے کدھر سے آتے ہیں؟"

اس نے آدمی بھیج کر اپنے پاس کے رفیقوں کو بلایا اور دوسری طرف خان خاناں نے فتح کے نقارے پر ڈنکا دینے کا حکم دیا کہ:

"کرنا میں شادیانہ فتح بجاؤ۔"

رات کا وقت تھا۔ روشنی کا انتظام نہ تھا۔ اندھیری رات ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ مگر شاہی فوج نے اپنے لشکر کی کرنا پہنچانی اور سب نکل کر فتح کی آواز پر آ گئے تو وہ جب آئے تو پھر مبارک باد کی کرنا پھونکی۔ اور جب کوئی سردار فوج لے کر آتا تو وہ اللہ اللہ کا نعرہ "کرنا" میں ادا کرتے تھے تو اس طرح رات کے موقع پر گیارہ مرتبہ کرنا بجی۔ سہیل خاں بھی آدمی دوڑا رہا تھا اور اپنی جمعیت کو صف آرا کر رہا تھا لیکن اس کی فوج کی یہ حالت تھی کہ:

جوں جوں شاہی فوج کی "کرنا" کی آواز سنتے تھے۔ ان کے حوصلے پست ہوئے جاتے تھے۔ سہیل خاں کے نقیب بھی بولتے تھے مگر سپاہیوں کے دل دہل رہے تھے اور جان بچانے کی کوشش میں تھے۔ دوسرے الفاظ میں سہیل خاں کی فوج شکست کا سماں پیش کر رہی تھی۔

صبح ہوتے ہی خان خاناں کے سپاہی دریا سے پانی لینے کے لیے گئے تو دیکھا کہ سہیل خاں بارہ ہزار فوج لیے کھڑا ہے مگر خان خاناں کے پاس چار ہزار سے زائد ایک فوج نہ تھی مگر اکبری اقبال کے سپہ سالار نے کہا کہ:

"اندھیرے کو غنیمت جانو۔ اندھیرے کے پردے میں ہی بات بن جائے گی۔ ہماری فوج تھوڑی ہے اگر دن نکل آیا تو پردہ کھل جائے گا تو زیادہ مشکل پڑے گی۔"

ادھر سے سہیل نے بھی فوج کو ڈنکا کیا اور ادھر سے خان خاناں نے بھی تھکی ہی حملے کا حکم دے دیا مگر دولت خان ان کا ہراول تھا اس نے کہا کہ:

"اس حالت میں فوج کثیر پر حملہ کرنا جان گنوانے کے برابر ہے مگر میں اس پر بھی حاضر ہوں۔ میرے پاس چھ سو سوار ہیں غنیم کے پیٹ میں گھس جاؤں گا۔"

خان خاناں نے کہا کہ:

"دلی کا نام برباد کرتے ہو۔"

اس نے کہا کہ:

"ہائے دلی" خان خاناں کو بھی بہت پیاری تھی۔

وہ کہا کرتا تھا کہ:

"مروں گا تو دلی میں ہی مروں گا۔"

دولت خان نے چاہا کہ:

گھوڑے اٹھائے۔ سید قاسم بارہہ بھی اپنے سید بھائیوں کو لیے کھڑے تھے۔ انھوں نے آواز دی کہ:

"بھائی ہم تم تو ہندوستانی ہیں۔ مرنے کے سوا دوسری بات نہیں۔ نواب کا ارادہ معلوم کر لو۔"

دولت خاں پھر واپس ہوئے اور خان خاناں سے کہا کہ:

"سامنے دہ انبوہ کثیر ہے اور فتح آسمانی ہے۔ یہ تو بتا دیجیے کہ اگر شکست ہوئی تو آپ کہاں ڈھونڈے ملیں گے؟"

خان خاناں نے کہا کہ:

"سب لاشوں کے نیچے۔"

یہ کہہ کر لودھی پٹھان نے سادات بارہ کے ساتھ باگیں اٹھائیں میدان سے کٹ کر پہلے شکست کھایا اور چھوڑ دے کر ایک مرتبہ غنیم کی کمر گاہ پر گرا۔ ان میں ہل چل مچادی گئی اور خان خاناں سامنے سے حملہ کر کے پہنچا تھا اور دونوں فوجوں میں لڑائی دست و گریباں ہو رہی تھی۔ سہیل خاں کا لشکر بھی آٹھ پہر کا بھوکا پیاسا اور تھکا ہارا ماندہ تھا۔ وہ اس حملے سے ایسا بھاگا کہ جس کی کسی کو ہرگز امید نہ تھی۔ مگر اس کے باوجود بہت ہی کشت و خون ہوا۔ سہیل خاں خود بھی زخم کھا کر گر پڑا۔ اس کو اٹھا کر گھوڑے پر بٹھایا اور دو بازو پکڑ کر معرکے سے نکال لے گئے۔ مگر تھوڑی دیر میں میدان صاف ہو گیا خان خاناں لشکر میں بے لاگ فتح کے نقارے بجنے لگے۔ بہادروں نے میدان جنگ کو دیکھا تھر او پڑا تھا۔

لوگوں نے یہ بے پر کی خبر اڑا دی کہ:

راجا علی خاں میدان سے بھاگ کر الگ ہو گیا ہے اور کسی نے یہ بھی کہا کہ:

"وہ غنیم سے جاملا ہے۔ بہر حال جتنے منہ اتنی باتیں ہوتی رہیں۔ مگر جب تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ وہ شیر دموری کے میدان میں سکون کی نیند سو رہا ہے۔ اس کی لاش بڑی شان سے اٹھا کر لائے۔ خان خاناں کو فتح کی بڑی خوشی ہوئی مگر راجا علی خان کے سانحے نے اس کے مزا کو کرکرا کر دیا۔ حرمت آیا۔

خان خاناں نے مال غنیمت کے مال میں نقد و جنس ۷۵ لاکھ روپیہ کا مال سب سپاہ میں تقسیم کر دیا۔ صرف اپنے لیے دو اونٹ رکھ لیے۔

یہ معرکہ خان خاناں کے اقبال کا وہ کارنامہ تھا کہ جس سے سارا ہندوستان کانپ اٹھا تھا۔ بادشاہ سلامت اکبر اعظم کو اطلاع دی گئی تو وہ بھی عبداللہ ازبک کے مرنے کی خبر سن کر پنجاب سے واپس آئے تھے تو وہ اس فتح کی خوشی سے بہت مسرور ہوئے اور خلعت گراں بہا اور تحسین آفرین کا فرمان بھیجا۔

خان خاناں فتح کے شادیانے بجاتے شاہ پور آئے۔ شہزادہ کو مجرا کیا اور تلوار کھول کر اپنے خیمے میں بیٹھ گئے۔ مگر صادق محمد وغیرہ مخالفت کی دیا سلائی سلگاتے جاتے تھے اور تیل بھی چھڑکتے تھے مگر خان خاناں عرضیاں کر رہا تھا اور شہزادے نے باپ کو لکھا کہ:

"حضور ابوالفضل اور سید یوسف خاں مشہدی کو بھیج دیں۔ خان خاناں کو بلالیں۔"

خان خاناں بھی تو اکبر اعظم کے لاڈلے تھے مگر انھوں نے لکھا کہ:

"حضور! شہزادے کو بلالیں۔ خانہ زاد اکیلا فتح کا ذمہ لیتا ہے۔" مگر یہ بات بادشاہ سلامت بھلی معلوم نہ ہوئی۔ خان خاناں نے دیکھا کہ:

"میری بات نہیں چلتی اس لیے وہ اپنی جاگیر کو روانہ ہو گیا۔"

راجہ ساجا سنگھ کو حکم ہوا کہ:

"تم شاہزادے کو لے کر آؤ۔ اس کی پندونصائح کے بعد بھیجیں گے اور روپیہ خواص کو خان خاناں کے پاس بھیجا جس مقام پر ملو وہیں سے دھکا دے کر الٹا پھیر دو اور کہو کہ:

"جب تک شہزادہ دوبارہ رخصت ہو کر وہاں پہنچے ملک وسپاہ کا انتظام کرے۔"

اگرچہ شہزادہ شراب خوری اور اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے آنے کے اہل نہ تھا۔ مگر معتمد دربار کا ارادہ تھا کہ:

اس کے مزاج دانوں نے خیرخواہی خرچ کر کے کہا کہ:

"اس وقت ملک میں حضور کا جانا مناسب نہیں۔ شہزادہ رک گیا۔"

ادھر خان خاناں نے کہا کہ:

"جب تک شہزادہ وہاں ہے میں نہ جاؤں گا۔"

بادشاہ کو خان خاناں کی یہ باتیں ناگوار گزریں۔ غرض خان خاناں ۱۰۰۶ھ بمطابق ۱۵۹۸ء اپنے علاقے پر چلے گئے اور وہاں سے دربار آئے اور کئی دن تک عتاب وخطاب میں رہے۔ بادشاہ سلامت کے سامنے کھل کر بات ہوئی اور اپنی خدمات میں بہت کچھ عرض کیا۔ چند روز میں جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے شیخ اور سید دکن کو بھیجے گئے۔ شہزادے کی نوبت حد سے گزر چکی تھی اور شیخ کے پہنچنے سے قبل ہی شہزادہ مراد نامراد ہو کر ۱۰۰۷ھ بمطابق ۱۵۹۹ء اس دنیا سے مستقل طور پر روانہ ہو گئے تھے۔

۱۰۰۶ھ میں شاہ عباس نے یہ حال دیکھ کر بادخراسان پر حملہ کر کے فتح کر لیا۔ اور ان ہی دنوں میں تحائف گراں بہا کے ساتھ ایلچی دربار اکبری میں روانہ کیا۔ ۱۰۰۶ھ میں خان خاناں نے حیدر علی نوجوان بیٹے کا داغ اٹھایا۔ وہ اس سے بہت پیار کرتا تھا اور اس کو پیار کی وجہ سے حیدری کہا کرتا تھا۔ اس نے بھی شراب پینی شروع کر دی جس کی وجہ سے اس کی صحت تباہ و برباد ہو کر رہ گئی اور وہ ہر وقت شراب کا نشہ کرتا تھا اور مست رہتا تھا۔ آخر کار اس بے ہوشی کے عالم میں نہ معلوم کس حالت میں اس کو آگ لگ گئی اور جل کر راکھ ہو گیا۔ یہ خان خاناں کے لیے بڑا صدمہ اور دل کا داغ تھا۔ مگر بڑوں کی اولادوں کا ایسا ہی حشر ہوتا ہے۔ کیونکہ بڑے لوگ اپنی مصروفیات کی وجہ سے بچوں کی تربیت پر مناسب توجہ دینے سے قاصر ہوتے ہیں اور بچوں کا زیادہ وقت آیاؤں اور دائیوں/نوکروں کی گود میں گزرتا ہے۔ تو وہ بھی بچوں کو کچھ کہتے ڈرتے ہیں بلکہ لرزتے ہیں تو اس لیے ایسے بچے بگڑ جاتے ہیں۔ جن کا تدارک کرنا پھر ماں باپ کے بس کا روگ بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایسے اعلیٰ معتبر ماں باپ اپنی مصروفیات کے باوجود مناسب وقت اولاد کو بھی دیں تاکہ ان کا مستقبل تباہ نہ ہو۔ اولاد اللہ تعالیٰ کی گرانقدر انسان کے لیے نعمت ہے۔ اس پر دنیا کی بقا کا انحصار ہے۔

ماہ بانو بیگم کی وفات

۱۰۰۶ھ میں بادشاہ لاہور سے آگرہ گئے تھے اور ان کے ہمراہ اور بھی تھے ماہ بانو بیگم خلیم بیگم بہن خان خاناں کی بیگم مدت سے بیمار تھیں۔ وہ انبالہ کے مقام پر ایسی شدید بیمار ہوئیں کہ ان کی طبیعت سنبھل نہ سکی۔ جس کی وجہ سے وہ سفر کے قابل نہ رہیں اور اس کو اسی جگہ پر چھوڑنا پڑا۔ بادشاہ ادھر روانہ ہوئے مگر بیگم ماہ بانو خلیم سے اس دار فانی سے دار البقا کا سفر اختیار کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اکبر بادشاہ کوئی مرزا عزیز کوکہ کی بہن خان خاناں کی بیگم تھیں۔ دو امیر دربار سے آئے اور رسوم سوگواری کو ادا کیا۔

سمرقند و بخارا

اکبر بلکہ تمام سلاطین چغتائی ملک موروثی یعنی سمرقند اور بخارا سے جان نچھاور کرتے تھے۔ اس کو دل و جان سے تحریر رکھتے تھے۔ ۱۰۰۵ھ میں عبداللہ آخر یک فوت ہوا تو ترکستان میں لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ ہر روز ایک بادشاہ بنتا ہے تو دوسرے دن اس کا سر قلم ہو جاتا تھا یا کسی اور وجہ سے الگ ہو جاتا تھا۔ دکن میں بھی جو لڑائیاں جاری تھیں تو ان کو شیخ ابوالفضل اور سید کی تدبیر اور شمشیر انہیں سنبھال نہ سکی تھیں تو ان حالات کا جائزہ لینے کے بعد اکبر نے تمام امرائے دربار کو جمع کیا اور ان سے صلاح و مشورہ لیا کہ پہلے دکن کا فیصلہ کیا جائے یا اسے ملتوی کر کے ادھر چلنا مناسب ہے۔

مگر اس کو اس بات کا بھی رنج تھا کہ وہاں جو اس بیٹا جان سے گیا۔ مگر پھر بھی ملک فتح نہ ہوا۔ اس لیے آپس میں متفقہ طور پر یہ فیصلہ طے ہوا کہ:

"پہلے گھر کی طرف سے خاطر جمع کرنی چاہیے۔"

چنانچہ ۱۰۰۷ھ شاہزادہ دانیال کو لشکر عظیم اور کافی سامان دے کر پھر روانہ کیا جائے اور اس کے ہمراہ خان خاناں کو ساتھ کہا۔ مراد کی نامرادی نے نصیحت دلائی۔ اب کی روانگی بندوبست سے ہوئی۔ جانا بیگم خانخاناں کی بیٹی کے ساتھ شہزادہ دانیال کی شادی کر دی گئی۔ اس طرح خان خاناں کو دانیال کا خسر قرار دیا گیا تا کہ دونوں میں عزت و محبت کا رشتہ قائم ہو جائے۔ خیال اور تجویز تو قابل تعریف و عمل تھی مگر ان میں بھی وہی صلاحیتیں ہوں۔ خان خاناں شہزادے کو ساتھ لے کر دکن میں داخل ہوا مگر اکبر بادشاہ کی تدبیر کام کرتی نظر نہ آتی تھی کیونکہ دونوں نے دغا بازی کی چالیں چلنی شروع کیں۔ خان خاناں شہزادہ کی آڑ میں چلتا تھا۔ اس لیے اس کی بات خوب چلتی تھی۔ ابھی میدان معرکہ تک پہنچ نہ پاتے تھے کہ جو تھ نہ ملا۔

شیخ اکبر نامہ میں لکھتے ہیں کہ:

"قلم سے ورد مجبوری یہ رہا ہے میں نے احمد نگر کا سب بندوبست کر لیا تھا۔"

شہزادہ کا فرمان پہنچا کہ جب تک ہم نہ آئیں قدم آگے نہ بڑھائیں اس فرمان کی تعمیل کی گئی۔ خان خاناں بھی بڑا دانا شخص تھا ادھر شیخ کو روک دیا گیا کہ:

"احمد نگر پر حملہ نہ کرنا ہم آتے ہیں۔ ادھر راستہ میں آسیر پر اٹک رہے کہ صاف کر کے احمد نگر لیں گے یہ بھی شیخ پر چوٹ تھی۔"

کیونکہ آسیر شیخ کا سمدھیانہ تھا تو شیخ نے اکبر کو لکھا کہ:

"شاہزادہ لڑکپن کرتا ہے احمد نگر کی مہم بگڑی جاتی ہے۔"

اکبر بادشاہ بھی تدبیر کا بادشاہ تھا اس نے شہزادے کو لکھا کہ:

"احمد نگر کو روانہ ہو ایسا نہ ہو کہ موقع ہاتھ سے نکل جائے اور خود وہاں پہنچ کر محاصرہ کر لو۔"

اکبر نے یہاں سے ابوالفضل کو واپس بلا لیا گیا۔

اکبر بادشاہ کی ہدایات پر خانخاناں نے احمد نگر کا محاصرہ کر لیا۔ چاند بی بی سامان کی فراہمی امراء سے لشکر کی دلداری اور فصیل وغیرہ کی مضبوطی میں برابر کوشش کر رہی تھیں۔ بیگم نے یہ بات اپنے ایک وزیر سے کہی کہ:

"قلعہ محفوظ ہوتا نظر نہیں آتا۔ بہتر ہے کہ ننگ و ناموس کو بچائیں اور قلعہ حوالہ کریں۔"

چیتر خاں اور سرداروں کو بیگم کے اس ارادے سے آگاہ کیا گیا اور بہکایا کہ:

"بیگم امرائے اکبری سے سازش رکھتی ہے۔"

یہ سنتے ہی دکنی بگڑ گئے اور اس پاک دامن بی بی کو شہید کر دیا امرائے اکبری نے سرنگیں اڑا کر دھاوا کیا۔ چیتر خاں اور سواروں دکنی دلاور موت کا شکار ہوئے اور جس لڑکے کو نظام الملک بنایا گیا تھا وہ بھی گرفتار ہو گیا۔ خان خاناں اسے لے کر حاضر ہوا اور مقام برہان پور میں پیش کیا۔ ۴۵ جلوس میں چار ماہ بیس دن کے محاصرہ میں قلعہ فتح ہوا اور یہ فتح خان خاناں کے نام پر مشہور ہوئی۔

بادشاہ نے آسیر کو فتح کیا اور آگرہ کی طرف بڑھے اور ملک شاہزادہ کے نام پر نامزد کیا اور دانیال کی مناسبت سے اس خاندیس کا نام تبدیل کر کے "داندیس" رکھا گیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابوالفضل کو دانش اور دریائے تدابیر تھے اگر خان خاناں بھی اس کے آگے طفل مکتب تھے مگر آفت کے ٹکڑے تھے ان کو جوانی کے نکتے اور چھوٹی چھوٹی چالیں ایسی آتی تھیں کہ شیخ ابوالفضل کی عقل حیران رہ جاتی تھی۔

۱۰۰۹ھ میں خان خاناں نے تلنگانہ کے ملک میں فتوحات کا نشان گاڑ دیا۔ شیخ ۱۰۱۱ھ کو ملک بقا کو سدھار گئے خان خاناں نے کئی برسوں کی محنت کے بعد دکن کو تسخیر کر لیا تھا جب تسخیر سے فارغ ہوئے تو ۱۰۱۳ھ میں دربار میں طلب کر لیے گئے اور دانیال کے اتالیق مقرر ہوئے۔

۱۰۱۳ھ میں ان پر بڑی نحوست یہ آئی کہ شہزادہ مدت سے بلائے شراب میں مبتلا تھا۔ اس نے بھائی کے مرنے سے بھی اصلاح نہ کی۔ آخر کار خود بھی تینتیس برس چھ ماہ کی عمر میں اس دار فانی سے رخصت ہو گیا۔ جس کا سب کو بڑا صدمہ ہوا۔ جس کا سب سے زیادہ صدمہ خان خاناں کو ہوا کہ اس کی جوان سال بیٹی عفیفہ جانا بیگم بیوہ ہو گئی۔ اس سے زیادہ اس کے لیے کیا صدمہ ہوگا؟ اور بیٹی بھی زندگی سے مایوس پژمردہ حالت میں گھر دیکھی نہ جاتی تھی۔ مگر پھر بھی صبر کا دامن اس نے ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ سب کچھ اللہ کا کیا برداشت کیا۔

جہانگیر کا دور اور عبدالرحیم خان خاناں پر عنایات

جہانگیری دور آیا تو خان خاناں دکن میں تھے۔ ۱۰۱۶ھ میں اس نے قدم بوسی کی تمنا کا اظہار کیا۔ جس کی اجازت دی گئی بچپن میں وہ جہانگیر کا اتالیق بھی رہ چکا تھا۔ وہ برہان پور سے آیا۔ سامنے آ کر بڑے رعب و احترام سے میرے قدموں میں گر پڑا اور میں نے بھی بڑی شفقت و محبت سے اس کا سر اٹھا کر بہت محبت کے ساتھ سینے سے لگایا اور بوسہ دیا تو اس نے بھی دو تسبیحیں موتیوں کی جن کی مالیت تین لاکھ ہوتی تھی مجھے دیں۔

اس کے مقابلے میں جہانگیر نے بھی خان خاناں کو بھی ایک سمند گھوڑا دے کر خوش کیا۔ اس کے علاوہ فوج ہاتھی جو کہ لڑائی میں لاجواب تھا اور بیس ہاتھی عنایت کیے۔ چند روز کے بعد خلوت کمر شمشیر مرصع فیل خاصہ عطا ہوا اور دکن کو روانہ ہوئے اور قرار یہ کر گئے کہ:

"دو برس میں سب ملک سرانجام دوں گا مگر علاوہ فوج سابق کے بارہ ہزار سوار اور دس لاکھ کا خزانہ مرحمت ہو۔"

اب ان کو وزیر الملک کا خطاب دیا گیا اور پنج ہزاری کا منصب عنایت کیا گیا اور مہم پر رخصت کیا گیا امرائے نامی بھی تیس ہزار فوج کے ساتھ رفاقت میں دیے۔

گویا کہ جہانگیر کے دور اقتدار کی ابتدا عبدالرحیم خان خاناں کے لیے نیک شگون ضرور تھی مگر چونکہ وہ ہر دل عزیز سپہ سالار اور حکمران تھا۔ اس کو نوجوان شہزادوں نے پریشان کرنے کی کوشش کی اور دیگر درمیان کے منافق اور دشمن لوگوں نے بھی فائدہ اٹھایا۔

زندگی میں خان خاناں کی پہلی شکست

خان خاناں کے اقبال کا ستارہ عمر کے گزرنے کے ساتھ ڈھلتا جا رہا تھا وہ دکن کی مہمات میں مصروف تھا کہ ۱۰۱۷ھ میں جہانگیر نے پرویز شاہزادہ کو دو لاکھ کا خزانہ دے کر اور دس ہاتھی، تین سو گھوڑے دے کر عنایت کیے اور سیف خاں کو اتالیق مقرر کر کے لشکر کے ساتھ کہا اور حکم دیا کہ:

”خان خاناں کی مدد کرو۔“

مگر خان خاناں کو پھر مراد شہزادے کا معاملہ دہرانا پڑا۔ خان خاناں تجربہ کار بوڑھا سپہ سالار اور دوسری طرف نوجوانوں کی عقل بے راہروی اور جنگی ناتجربہ کاری دونوں کی طبیعت میں موافقت پیدا نہ ہو سکی۔ مگر کام بگڑنے شروع ہوئے۔ عین برسات کے موسم میں لشکر کشی کر دی۔ برسات بھی سخت قسم کی تھی۔

تو اس موسم برسات میں جنگ شروع کرنا مناسب نہ تھا لہٰذا بارش کی طرح ان پر تکالیف، ذلتیں، مصائب نازل ہوئیں جن کا انجام یہ ہوا کہ:

> ”جس خان خاناں نے آج تک شکست کا داغ چہرے پر نہ لگنے دیا تھا وہ ان نوجوانوں کی وجہ سے لگ گیا۔ اس نے ۶۳ برس کی عمر میں زندگی میں پہلی بار شکست کھائی۔ فوج کا بہت نقصان ہوا۔“

خان خاناں بڑی ذلت آمیز حالت میں برہان پور پہنچا وہی احمد نگر جس کو اس نے گولے مار مار کر فتح کیا تھا اس کے قبضے سے نکل گیا۔ مگر اس پر یہ تماشا کیا گیا کہ:

شہزادے پرویز نے جہانگیر باپ کو لکھا کہ:

کہ یہ سب کچھ شکست محض عبدالرحیم خانخاناں کی ناقص حکمت عملی کا نتیجہ تھی تو یا ہمیں دربار میں بلائیں یا ان کو بلا لیں اور خان خاناں نے بھی اقرار لکھ کر بھیجا کہ:

> ”فدوی اس مہم میں ذمہ لیتا ہے مگر تیس ہزار سوار مجھے اور ملیں جو ملک بادشاہی غنیم کے تصرف میں ہے اگر دو برس کے اندر نہ لے لوں تو پھر حضور میں منہ نہ دکھاؤں گا۔“

آخر ۱۰۱۸ھ میں خان خاناں بلائے گئے۔

۱۰۲۰ھ میں سرکار قنوج اور کالپی وغیرہ خان خاناں اور اس کی اولاد کو عنایت ہوئے۔ ۱۰۲۱ھ میں جب یہ معلوم ہوا کہ:

”دکن میں شہزادہ اور امراء سب سرگرداں پھرتے ہیں۔ تو جہانگیر کو پھر کہنہ مشق اور تجربہ کار پرانے سپہ سالار کا خیال آیا تو درباریوں نے

سب نے متفقہ طور پر یہ عرض پیش کی کہ اس معاملے میں عبدالرحیم خان خاناں سے بہتر دکن کی مہمات کے لیے کوئی بھی موزوں سپہ سالار نہیں ہے اور جو وہ وہاں کے حالات جانتا اور سمجھتا ہے دوسرا کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا تو وہ دربار میں حاضر ہوئے اور ان کو شش ہزاری منصب ذات، خلعت حاضرہ، کمر شمشیر مرصع، فیل خاصہ اور اسپ ایرانی عنایت ہوئے اور اس کے ساتھ بہت سے انعامات و اکرام کے ساتھ شاہ نواز کو بھی خواجہ ابوالحسن کے ساتھ رخصت کیا گیا۔ خان خاناں واقعی گوہر نایاب تھے۔ جس کی قدر صرف شاید کر کے سوا کسی کو نہ ہوئی ہو۔

مرزا عبدالرحیم خان خاناں کا ستارہ غروب

افسوس کا مقام ہے کہ مرزا عبدالرحیم جس نے ساری زندگی کامیابی و کامرانی کی حالت میں گزاری ہو۔ تمام مہمات جنگی میں سرخرو رہے ہوں اور ہر وقت دربار سے خلعت حاضرہ اور انعام و اکرام کی بارش ہوتی رہی ہے اب بڑھاپے میں ان پر وہ وقت آیا کہ زمانے کے حادثے ان پر بگولے بن کر گرنے لگے۔ یعنی

i- ۱۰۲۸ھ میں ان کا بڑا بیٹا ایرج فوت ہو گیا۔ جس کا ان کا بڑا صدمہ ہوا۔ یہ زندگی کا پہلا داغ تھا۔

ii- دوسرے سال رحمن داد بھی ان سے روٹھ گیا۔

iii- تیسرے برس میں تو ادبار نے ایسا نحوست کا شبخون مارا کہ اقبال میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اور پھر ایسا بھاگا کہ واپسی کا نام بھی نہ لیا۔ خان خاناں کی عمر بھی جواب دیتی گئی۔ آخر کار وہی ہوا جو ہونا تھا۔ ۱۰۳۱ھ میں شاہجہان دربار طلب ہوئے کہ ہم قندھار جا کر ملک موروثی کو زیر نگیں کریں۔ وہ خان خاناں اور داراب کو لے کو حاضر ہوئے اور صلاح و مشاورت کے بعد یہ مہم مذکور ان کے نام پر قرار پائی۔ مگر آسمان نے اور ہی شطرنج چلائی کہ:

شاہجہان نے دھولپور کا علاقہ باپ سے مانگ لیا باپ نے دے دیا۔ مگر بیگم نے وہی علاقہ شہریار کے لیے مانگا ہوا تھا اور شریف الملک شہریار کی طرف سے اس پر حاکم تھا۔ شاہجہان ملازم وہاں قبضہ لینے کے لیے گئے تو طرفین کے امیروں میں تلواریں چل گئیں اور اس حالت میں شریف الملک کی آنکھ میں تیر لگا کہ ان کی آنکھ کا کمزی ہو گئی۔

اس سے حالات خراب ہو گئے اور شہریار کا سارا لشکر بپھر گیا اور ایک عظیم ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔

شاہجہان نے اپنے دیوان افضل کو معاملہ سلجھانے کے لیے روانہ کیا۔ انھوں نے آگ کو بجھانے کی بہت کوشش کی مگر بیگم آگ و بگولا ہو رہی تھی۔ یہاں آتے ہی افضل خاں قید ہو گئے اور بادشاہ کو بہت سا لگا بجھا کر کہا کہ:

"شاہجہاں کا دماغ بہت بلند ہو گیا ہے۔ اسے قرار واقعی نصیحت دینی چاہیے۔"

اس حالت میں (جہانگیر) بادشاہ نے فوج کو تیاری کا حکم دے دیا اور امرا کو حکم دیا گیا ہے کہ:

"فوری طور پر شاہجہاں کو گرفتار کر کے لاؤ۔"

ادھر چند روز ہوئے تھے کہ شاہ ایران نے قندھار واپس لے لیا تھا اور یہ مہم بھی شاہ جہان کے نام قرار پائی تھی۔ مگر اس مہم کو بھی بیگم نے شہریار کے نام پر تبدیل کروائی تھی۔ اور بارہ ہزاری آٹھ ہزار سوار کا منصب دلوایا اور جہانگیر کو بھی لاہور لے آئی اور شہریار یہاں لشکر کی تیاری کرنے لگا۔ مگر حالات اہم پیدا ہوئے کہ شاہ جہاں باپ سے باغی ہو گیا۔

ایسے حالات میں خان خاناں کے لیے یہ زیادہ بہتر تھا کہ دونوں سے کنارہ کشی کر جاتا؟ کیونکہ ممکن تھا کیونکہ جہانگیر نے شاہ جہان کی شادی شاہنواز کی بیٹی سے کی تھی اور آصف ماں نور جہاں کے بھائی کی بیٹی بھی شاہ جہاں کے عقد میں تھی تو ایسے حالات اور تعلقات رکھتے ہوں گے تو گھر کے جھگڑے اسے حق سے محروم نہ کریں گے۔ تقدیر کی بات ہے کہ جو دن اس لیا تھے بعد خیال کیے تھے وہ زندگی میں ہی سامنے آ گئے ہیں۔ جب جہانگیر کے گھر کے حالات بگڑے۔ تو جب شاہ جہان نے ہمراہی کی فرمائش کی تو خان خاناں نے اپنے اور جہانگیری تعلقات ضرور غور کیا ہوگا مگر اس کے ساتھ اس کے ذہن میں یہ بھی خیال تھا کہ یہ باپ بیٹے کی لڑائی ہی نہیں ہے بلکہ یہ سوتیلی ماں کا جھگڑا ہے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے میں کوشش کر کے صلح کرا دوں گا اور کرا بھی سکتا تھا۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ ان کے معاملات بھی پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتے چلے گئے اور خان خاناں نے کسی قسم کی مداخلت نہ کی۔ بیگم (سوتیلی ماں) نے کام وایسا بگاڑ دیا کہ اصلاح ممکن ہی نہ رہی۔ جس کو شاہ جہاں نے عرضداشت دے کر دربار بھیجا اور اس کو قید کر دیا گیا اور یہ بھی دیکھا گیا کہ خان اعظم جو اکبر کا رضاعی بھائی تھا اور اس کا بڑا احترام آتا تھا اسے گوالیار کے قلعہ میں قید رہنا پڑا۔

خان خاناں بڑا نمک خوار قدیم اور ملازم با اعتبار تھا اس نے جہانگیر کے پاس یہ مخبری کی کہ:

"امرائے دکن سے اس کی سازش ہے اور ملک عنبر کے خطوط جو اس کے نام تھے وہ شیخ عبدالسلام لکھنوی کے پاس ہیں۔"

جہانگیر نے مہابت خاں کو حکم دیا کہ:

"اس نے شیخ عبدالسلام کو گرفتار کر لیا۔"

جب اس سے تحقیقات کی گئیں تو اس نے صاف انکار کر دیا اور اس غریب کو اتنا مارا کہ وہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا مگر مقصد حل نہ ہو سکا۔ شاہ جہاں بھی خان خاناں سے شاکی ہوا کہ اس نے ستر برس کی عمر میں بغاوت اور کافر نعمتی کی ہے۔ اور اس نے باپ کی پیروی کر کے اس عمر میں اپنے تئیں ازل سے اپ...... ملعون اور مردود کیا۔

شاہزادے مراد کا بھائی شاہ جہاں سے مقابلہ

بیگم نے شاہزادے مراد کو سیاہ جرار دے کر بھائی کے مقابلہ پر روانہ کر دیا اور مہابت خاں کو اس کی افواج کا سپہ سالار مقرر کیا۔ جب دونوں لشکر مقابلہ پر آئے تو ایک ایک...... دونوں پہاڑوں میں سے آگے ہو کر ٹکرایا۔ دونوں میں بڑا خون خرابہ ہوا اور بڑے بڑے امیر و سردار ہلاک ہوئے مگر شکست شاہ جہاں کی فوج کو ہوئی۔ وہ اپنے لشکر کو لے کر کنارے ہٹا اور دکن کو چلا گیا۔ اس موقع پر یا تو خان خاناں اپنی نیک نیتی سے دونوں میں صلح کی تدبیر کرتا تھا یا انتہائے درجہ کی چالاکی تھی کہ:

"جہانگیر سے بھی سرخرو رہنا چاہتا تھا۔"

مہابت خاں سپہ سالار سے اس نے پیغام وسلام کیے۔ اس معاملے میں چالاک سپہ سالار کے طبع دریائے طبع نے انشاپردازی کی موج ماری اپنے ہاتھ سے خط لکھا اور بادشاہ کی ہوا خواہی کے مضمون لکھ کر اس میں یہ شعر بھی لکھ دیا کہ:

صد کس بہ نظر نگاہ دارم
ورنہ پدر نہ بہ آرائی

یہ خط کسی نے پکڑا کر شاہ جہاں کو میرے دیا۔ اس نے انھیں بلا کر خلوت میں دکھایا۔ وہ بڑا شرمندہ ہوا آخرکار بیٹوں سمیت دولت خاں کے پاس نظر بند ہوئے۔ اور اس جیرنگی کر سید مظفر بارہہ کے سپرد کیا۔ قلعہ میں لے جا کر قید کرو۔ لیکن داراب بے گناہ تھا۔ اس لیے دونوں کو سمجھا بجھا کر رہا کر دیا گیا۔ بادشاہ نے شہزادہ پرویز کو بھی امرا کے ساتھ فوجیں دے کر روانہ کیا وہ دریائے نربدہ پر جا کر رک گیا تھا۔

کیونکہ شاہ جہاں کے سرداروں نے گھاٹوں کا خوب بندوبست کر رکھا تھا۔ یہ بھی ساتھ تھے اور کوئی مجرم قیدی نہ تھا۔ عبدالرحیم خان خاناں تھے دیکھنے تو نظر بند تھے مگر محبت میں بھی شامل ہوتے تھے۔ جب مہابت خاں اور پرویز دریا کے کنارے پہنچے تو سامنے شاہ جہاں کا لشکر دیکھا تو لشکر کے ڈیرے ڈلوا دیے اور جنگ کے لیے تیاری کرنے لگے اس وقت مہابت خاں نے ایک دوست نمائی خط خان خاناں کے نام تھا اور وہ شاہ جہاں کے ہاتھ جا لگا۔ خط میں بہتری اور صلاح وامن کی تعلیم تھی اور نیک تمناؤں کے ساتھ دانستہ طور پر لکھ گیا تھا تاکہ دونوں میں صلح ہو کہ امن وامان کی فضا قائم ہو اور باپ بیٹوں میں بھی حالات معمول پر آ جائیں۔ اس سلسلے میں مہابت خاں کی خان خاناں سے بھی بات چیت ہوئی وہ تو پہلے ہی ان کے بہی خواہ تھے۔ خان خاناں نظر بندی ان کر کے بچے چالیس تھے۔ مگر بوڑھے ہو چکے تھے۔ جب اس کے امرا کو اس کا علم ہوا تو وہ بھی بہت خوش ہوئے اور انھوں نے انتظامات میں دہرا کر دی۔ بہرحال ہر ایک کی نیت کو خدا ہی جانتا ہے کہ مہابت خاں نے یہ کام کس نیت سے کیا تھا۔ بہرحال شاہ جہاں کا کام بگڑ گیا اور وہ دل شکستہ ناکامی کے عالم پیچھے ہٹا اور اس اضطراب کے ساتھ دریائے تاپتی سے پار اترا کہ فوج اور سامان فوج کو بہت نقصان پہنچا اور بہت سے امیر اور سردار بھی چھوڑ کر چلے گئے۔ اب مہابت خاں سے موافقت کرنے کے لیے برہان پور پہنچے۔ دونوں میں صلاح ہوئی کہ نظر بند رکھو اور ان کا خیمہ پرویز کے سامنے ہو تاکہ ایک دوسرے کا حال معلوم رہے۔ مہابت خاں برہان پور پہنچ کر نہ ٹھہرا اور دریائے تاپتی اتر کر تھوڑی دور تعاقب کیا اور وہ دکن سے بنگالہ کی طرف گیا۔

جانا بیگم باپ کے ساتھ تھیں۔ وہ بھی دانیال کی بیوی تھیں۔ اس کے بچے بھی ساتھ تھے اور وہ باپ کے پاس اسی خیمہ میں ہی رہی۔ فہیم ان کا خاص غلام جو کہ بڑا ہی بے نظیر تھا۔ اسے دلاوری نے دودھ پلایا تھا۔ وہ بھی اس معرکے میں مارا گیا جس کا خان خاناں کو بہت دکھ ہوا تھا۔ جب شاہ جہاں کو یہ خبر ملی تو اس نے ان کے بچوں کو قید کر لیا اور ان کی حفاظت راجہ بھیم کے سپرد کی۔ (راجہ بھیم رانا کا بیٹا تھا) اور اس کا خان خاناں کو بہت دکھ ہوا اور راجہ کو پیغام بھیجا کہ:

"میرے عیال کو چھوڑ دو میں لشکر شاہی کو ادھر سے پھوڑ کر حکمت عملی کر کے پھر دیتا ہوں۔"

اگر یہی حال ہے تو سمجھ لو کہ کام مشکل ہو جائے گا میں خود آ کر عیال کو چھڑا لوں گا۔

مگر راجہ نے جواب دیا کہ:

"ابھی تک پانچ چھ ہزار جانثار رکاب میں موجود ہیں۔ اگر تم نے حملہ کیا تو سب سے پہلے تمھارے بچوں کو قتل کروں گا۔ پھر تم آن پڑو گے تو یا تم نہیں یا ہم نہیں۔"

شاہ جہاں کے لشکر بادشاہی سے معرکے بھی ہوتے جن میں بڑے بڑے سردار مارے گئے اور وہ لڑتا بھڑتا بنگالہ میں جا نکلا یہاں داراب سے قول و قسم لے کر بنگالہ کی حکومت دی۔ اس کی بیوی بچوں کو یرغمال میں لے لیا اور آپ بہار کو روانہ ہوئے کچھ عرصہ کے بعد داراب کو بلا بھیجا۔ اس نے لکھا کہ:

"مجھے زمینداروں نے گھیر رکھا ہے اور میں حاضر نہیں ہو سکتا ہوں۔ شاہجہان کی قوم برباد ہو چکی تھی اور وہ واپس دکن کو چلا گیا۔ اور وہ جا کر بادشاہ سے مل گیا۔ بادشاہی لشکر نے ملک پر قبضہ کر لیا۔"

داراب سلطان پرویز کے لشکر میں حاضر ہوا جہانگیر کا حکم پہنچا کہ:

"داراب کا سر کاٹ کر بھیج دو۔"

اس کا سر کاٹ کر ایک خوان میں کھانے کی طرح بد نصیب باپ کے پاس بھیج دیا گیا۔ اللہ اکبر جس خان خاناں کے ہاں کسی کو جمال مارنے کی جرأت نہ ہوتی تھی بدحمن دردکے مرنے کا نام زبان سے نکالے چپ بیٹھا تھا۔ مہابت خاں کے بزیدیوں نے بموجب اس کے حکم سے کیا کہ:

"حضور نے یہ تربوز بھیجا ہے۔ خونی جگر باپ نے آب دیدہ ہو کر کہا کہ:

"دوست شہیدی ہے۔"

کسی نے خوب کہا ہے کہ:

"شہید پاک شد داراب مسکین"

اب افسوس کا مقام تو یہ تھا کہ جن جانباز دلاوروں نے اس ملک کے لیے جانیں اور عمریں ضائع کر دیں۔ انھوں نے ملک کے لیے میدان میں گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔ ان کی جانیں مفت میں ضائع ہو رہی تھیں انھوں نے اپنی چھری سے اپنے پیٹ چاک کیے۔ جو کہ محض بیگم صاحبہ کی خود غرضی اور خود پرستی کی بدولت۔ بیگم صاحبہ کی عقل کی بات نہ تھی۔ مگر چند دنوں کے بعد باپ بیٹا ایک ہو گئے۔ مگر مفت میں امرائے بیچارے رہ گئے اگر کیا کرتے ہو۔

۱۰۳۴ھ میں خان خاناں حضور میں طلب ہوئے۔ جب دربار میں آئے تو انھوں نے ندامت کی پیشانی کو دیر تک زمین پر رکھے رہا سر نہ اٹھایا تو میں نے کہا کہ:

"جو کچھ وقوع میں آیا وہ تقدیری باتیں ہیں وہ نہ تمھارے اختیار کی باتیں ہیں نہ میرے اختیار کی تھیں۔ اس کے سبب سے ملامت اور خجالت دل پر نہ لاؤ۔ ہم اپنے تئیں تم سے زیادہ شرمندہ پاتے ہیں۔ اور جو کچھ ظہور میں آیا۔ تقدیر کے اتفاقات تھے

ہمارے تمہارے اختیار کی بات نہیں۔''

ارکان دولت کو حکم دیا کہ:

''انھیں لے جا کر اتار دو اور کئی دن کے بعد لاکھ روپیہ انعام میں دیا تا کہ اسے اپنے مصرف میں لاؤ اور چند دنوں کے بعد صوبہ قنوج عطا ہوا اور خانخاناں کا خطاب جو اس سے چھین کر مہابت خاں کو دیا گیا تھا پھر انھیں واپس دیا گیا تو انھوں نے شکریہ کے طور پر یہ شعر کہتے شہر میں لکھ دیا.....

مرا	لطف	جہانگیری	تائیدات	یزدانی
دوبارہ	زندگی	داد	و	دوبارہ	خانخانی

مگر بیگم کی مہابت خاں سے بگڑی۔ فرمان گیا کہ حاضر ہو اور اپنی جاگیر کا اور فوج کا حساب کتاب دو۔ بادشاہ لاہور سے گلگشت کشمیر کو چلے گئے۔ وہ ہندوستان کی طرف سے آیا۔ اس کے ساتھ چھ ہزار راجپوت تھے۔ لاہور ہوتا ہوا حضور میں حاضر ہوا مگر تیور بگڑے گئے اور غصہ بھرا۔ خان خاناں ادھر ہی تھے۔ اس نے خیال کیا کہ:

''جو بل افغان ہے اور تمام جانثار اس کے ذاتی غلام ہیں۔ آخر بازی بیگم کے ہاتھ رہے گی۔ لہٰذا اس کی ملاقات کو نہ گئے۔''

اور کوئی وکیل بھی مزاج پرسی کے لیے نہ بھیجا۔ مگر وہ بھی سمجھ گیا کہ اب وہ خان خاناں ہیں مہابت خاں چنانچہ جب کنارہ جہلم پر پہنچ کر بادشاہ کو قید کیا تو اس وقت آدمی بھیجے کہ:

خانخاناں کو بحفاظت دلی پہنچا دو۔ تعمیل کی گئی جب دلی چلے گئے اور وہاں سے لاہور میں بٹھا دیا۔ وہاں جا کر جو کچھ مہابت خاں نے کیا اس نے بادشاہ اور بیگم دونوں کو قید کر دیا مگر بیگم کی دانائی اور حکمت عملی سے آہستہ آہستہ اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ آخر یہ بھاگ کر خانخاناں کا دل کے دشمنوں سے چھلنی ہو رہا تھا۔ بڑی التجا و تمنا سے عرض گزاری کہ:

''اس نمک حرام کے استیصال کی خدمت مجھے مرحمت ہو۔''

بیگم اس کی جاگیر خان خاناں کی تنخواہ میں مرحمت کی اور بہت سے انعامات عطا کیے۔ اجمیر کا صوبہ بھی مرحمت کیا۔ ۲۷ برس کے بڑھاپے پر کئی زندگی کے ادوار گزارے تھے اگر اس نے اپنی زندگی کے گرانقدر تجربات اور عقل کے بل بوتے پر ہر قسم کے حالات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا اور کسی سے اپنے حالات کی شکایت نہ کی۔ جس کا یہ نتیجہ ظاہر ہوا کہ آخری عمر میں بھی بیگم نے انھیں بہت سے انعام و کرام سے نوازا۔ اور زندگی کی ماضی کی تمام تلخیوں کا ازالہ ہو گیا جو کہ اس کی آخری زندگی کا بہت بڑا اثاثہ اور سرمایہ تھا۔ اگرچہ اس پر قیامت کے صدمات گزر چکے تھے مگر حماقت نے بے وفائی کی۔

عبدالرحیم کی وفات

مرزا عبدالرحیم خان خاناں جس نے ساری زندگی ہندوستان کے جنگی میدانوں میں گزار دی اور ہر میدان میں فتح حاصل کی اور بادشاہ

وقت سے داد و تحسین کے ساتھ لاکھوں انعامات حاصل کیے اور جاگیریں حاصل کیں۔ زندگی میں اعلیٰ مقام پر شہزادوں کی اتالیقی کی۔ زندگی میں بیٹوں کی زندگی سے محرومی کے صدمات بھی برداشت کیے۔ بیٹی کے غموں کے بار اٹھائے۔ حتیٰ کہ اس کی زندگی شہزادوں کی قوتی رنجشوں کا بھی مرکب بنی اور آخر کو انجام وہی ہوا پھر اس کے مقدر میں تو لکھتے تھا اور جہاں تقدیر کا نوشتہ ہوتا ہے اسی مقام پر ہی ہوتا ہے جو کہ قدرت کا اٹل فیصلہ ہے۔

اب مرزا عبدالرحیم جو کہ اکبر اعظم کی بیوی کی بہن کا بیٹا تھا اور خود اکبر اعظم ان کو خالو رشتہ میں لگتا تھا۔ آج وہ اپنے پیدائشی علاقے لاہور میں ہی بیمار ہو رہا ہے یعنی وہ لاہوری دنیا کو خیر باد کہنے کی ایک آخری جنگ کی تیاری کر رہا ہے۔ وہ لاہور میں بیمار ہوئے اور دہلی میں پہنچ کر ضعیف غالب ہوا اور اواسط ۱۰۳۶ھ میں اس دنیا فانی سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اور ان کو ہمایوں کے مقبرے کے قریب دفن کیا گیا تھا۔

جہانگیر نے ان کی تعریف میں لکھا ہے کہ:

خان خاناں قابلیت و استعداد میں یکتائے روزگار تھے۔ زبان عربی، ترکی، فارسی، ہندی، جانتے تھے۔ فارسی و ہندی میں خوب شعر کہتے تھے۔ شجاعت اور شہادت اور سرداری میں نشان بلکہ نشان قدرت الٰہی کا تھا۔ حضرت عرش آشیانی کے حکم سے واقعات بابری کا ترجمہ فارسی میں کیا۔

نظام الدین بخشی نے طبقات ناصری کے آخر میں امرائے عہد کے حالات مختصر طور پر یوں درج کیے ہیں۔ ان کا ترجمہ یوں ہے:

اس وقت خان خاناں کی عمر ۳۰ برس کی تھی کہ ان کو منصب خانخانی اور سپہ سالاری ملی۔ عالی خدمتیں اور انھوں نے عظیم فتوحات کیں۔ فہم و دانش اور علم و کمالات اس بزرگ نہاد کے جتنے دیکھیں وہ سو میں ایک اور بہت کم ہوں گے۔ شفقت عالم، علما اور فضلاء کی تربیت، فقراء کی محبت اور طبع نظم اس نے میراث پائی۔ فضائل کی مدت انسانی میں آج اس کا نظر امرائے دربار میں نہیں ہے۔"

بہت سی باتیں ان کے خاندان کے علاوہ ان کی طبیعت سے وابستہ تھیں جو کہ ان کی اپنی ایجاد تھیں اور بعض بادشاہی خصوصیت کی محور رکھتے تھے۔ دوسرے کو وہ رتبہ حاصل نہ تھا۔ مثال کے طور پر "پرجا" کہ اس کی تمغی بادشاہ اور شہزادوں کے سوا کوئی امیر نہ لگا سکتا تھا۔ ان کو اور ان کے خاندان کو اجازت تھی۔ یہ ان کی شان کے لیے بہت بڑا اعزاز اور شرف زمانہ تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ مرزا عبدالرحیم خان خاناں نے ابتدائی زندگی بڑی مشکلات میں گزاری، جوانی جنگوں میں کٹ گئی۔ عزت و شہرت حاصل کی اور آخر میں اپنے مالک حقیقی سے بھی عزت پائی ہوگی۔ اللہ کے حوالے۔

مرزا عبدالرحیم کا مذہب

مذہب انسان کی زندگی میں ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان کا کوئی نہ کوئی مذہب یا دین ضرور ہوتا ہے کیونکہ اس کا تعلق اس کے خالق کی تعلیمات سے ہوتا ہے۔ مذہب تو انسانی تجربات کا نچوڑ ہوتا ہے البتہ دین اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کرام علیہم السلام کے توسط سے نازل ہوتا ہے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو الہامی کتب عطا ہوئیں تو اس طرح دنیا میں یہودیت، نصرانیت اور مسلمان نام کے طبقے وجود میں آئے اور مذاہب میں ہندوازم، بدھ ازم، جین مت اور زرتشت وغیرہ شامل ہیں جو کہ انسانی تجربات پر ہوتی ہیں۔ تو مرزا عبدالرحیم خان خاناں کا مذہب کیا تھا صاحب ماثر الامرا لکھتے ہیں کہ:

وہ اپنا مذہب سنت و جماعت ظاہر کرتے تھے مگر لوگ کہتے تھے کہ وہ شیعہ ہیں۔ تقیہ کرتے ہیں۔ مگر اس میں شرک نہیں۔ فیض ان کا شیعہ سنی سب کو برابر پہنچتا تھا کسی مذہب کے لیے خاص نہ تھا۔ البتہ ان کے بیٹے ایسی تعصب کی باتیں کرتے تھے جس سے ثابت ہوتا تھا کہ:

وہ سنت و جماعت کا مذہب رکھتے ہیں۔ خان خاناں بالعموم احکام شریعت کو مانتے تھے اور جہاں تک ممکن ہو سکے ان کی پابندی بھی کرتے تھے۔ لیکن دربار کے دور میں گھر جاتے تو شراب بھی پی لیتے تھے مگر مجلسوں میں مجبوری سے پھنس جانے کی وجہ سے شراب کا بنیاد دوسرے معنی رکھتا ہے آخر وہ ایک ترک بچہ سپاہی زادہ ہی تھا وہ حکم کا بندہ تھا۔

اخلاق وعادات

مرزا عبدالرحیم خانخاناں بڑے آشنا اور آشنا پرستی میں ماہر تھے وہ خوش مزاج، خوش اخلاق اور محبت میں نہایت گرم جوش، اپنے دل رہا اور دل فریب کلام سے غیروں کو بھی اپنا بنا لیتے تھے۔ ان کی باتوں میں اس قدر تاثیر تھی کہ فوری طور پر باتیں دل میں اتر جاتی تھیں۔ وہ شیریں کلام، لطیفہ گو، بذلہ سنج اور نہایت ہی طرار زدار تھے۔

دربار اور عدالتہائے بادشاہی کی خبروں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ مگر حق پوچھو تو علی العموم اخبار اور واقعات کے عاشق تھے۔ وہ ہر وقت حکومت کے بارے میں معلومات جمع کرنے کی فکر میں مصروف رہتے تھے۔ دار الخلافہ میں بے شمار افراد ملازم تھے ان کو دن رات کے اوقات میں برابر ڈاک چوکی میں بھیجا جاتا تھا۔ مرزا عبدالرحیم خانخاناں اس قدر فرض شناس اور مستعد فرد تھے کہ وہ عدالت خانے، کچہریاں، چوکی چبوترہ حتیٰ کہ وہ بازار اور کوچہ میں سے بھی جو کچھ سن پاتے تھے اس کو حیطہ تحریر میں لے آتے تھے۔ وہ رات کو بیٹھ کر پڑھتے تھے اور فضول قسم کا مواد رات کو جلا دیتے تھے۔

مرزا عبدالرحیم خاں خاناں بادشاہی یا اپنے ذاتی معاملات میں کسی کی طرف رجوع کرنے میں اپنے عالی مرتبت کا خیال نہ رکھتے تھے۔ یہ اس کی سادگی کا حال تھا کہ جو دشمنوں سے بھی بگاڑ نہ رکھتے تھے۔ مگر دشمنوں سے اتنے وہ بے خبر بھی نہ رہتے تھے جونہی ان کو موقع ملتا تھا تو ان پر ہاتھ صاف کر دیتے تھے۔ اس میں کوئی شک کی بات نہیں ہے کہ وہ ایک زمانہ ساز آدمی تھے۔ ان کا زندگی میں ایک اصول تدبیر تھا کہ:

"دشمن کو دوست بن کر مارنا چاہیے۔"

اس کی یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ وہ ترقی مدارج اور جاہ و دولت کے ہر وقت محتاج تھے۔ ماثر الامراء میں لکھا ہے کہ شجاعت، سخاوت، دانش و تدبیر بندوبست جنگی و ملکی میں وہ افسر تھے اور انھوں نے دکن میں تیس برس کی زندگی کامیابی سے گزاری تھی اور دکن کے ہر سلاطین اور امراء کو اپنے جال میں پھنسائے رکھا جو بھی شاہزادہ دربار شاہی سے جاتا تھا تو وہ کہتا تھا کہ:

"یہ غنیم سے ملے ہوئے ہیں۔"

یہ محض باتیں کرنے کی ہیں مگر اصل معاملات وہی جانتا ہے جو حکومت کے معاملات کو سنبھالنا چاہتا ہے کہ اس کو کس قدر مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ ساری دنیا ایک مزاج کی نہیں ہوتی۔ مخلوق میں سے کوئی شریف، کوئی بدمعاش، کوئی تخریب کار، کوئی اصلاح کار ہوتا ہے۔ ان میں کوئی سیاسی مزاج کی بات کر کے شرارت کرتا ہے تو دوسرا مذہبی جھگڑا چھیڑ کر بات بڑھاتا ہے۔ گویا کہ ہر فرد کا مزاج اور زبان کا مزا مختلف ہوتا ہے۔ اس کے

مطابق اس کی زندگی کا لائحہ عمل طے ہوتا ہے۔

مگر لوگ محض دوسروں پر تنقید کرتے اس کی محنت و کاوشوں کا صلا اپنے کھاتے میں ڈالنا پسند کرتے ہیں۔ تو ایسے نااہلوں کے مقابلے میں انسان ویسا ہی نہ بن جائے تو کیوں کر اسر کرتے۔ حکیم یونان نے کیا خوب کہا ہے کہ:

''انسان کے نیک رہنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ہم معاملہ میں نیک ہوں ورنہ اس کی نیکی نہیں بچ سکتی۔''

یہ اس نے بے شک درست کہا ہے کیونکہ اگر وہ اپنی ذات سے نیک رہے تو بد طبیعت شیطان اس کے کپڑے پھاڑ اس کی کھال تک نوچ ڈالے۔ اس لیے واجب ہے کہ بے ایمانوں کے ساتھ ان سے زیادہ بے ایمان بنے۔ اس کا یہ مطلب ہو کہ جس طرح معاشرہ ہو ویسا ہی وہ بھی عمل کرے تو وہ زندگی میں کامیاب ہوگا ورنہ ناکام۔

خانخاناں ہفت ہزاری منصب کا مالک تھا اگر وہ ملکوں میں خود مختاری حکومت کرتا تھا۔ اس کے تعلقات کئی لوگوں سے پڑتے تھے۔ اگر اس طرح کام نہ بنتا تو ملکداری کا کام کیسے چلتا تھا؟ ایسے نامرادوں سے اس طرح جان نہ بچاتا تو وہ خود کس طرح بچتا تھا۔ اس کے اردگرد سارے کے سارے ہی منافق تھے۔ اور وہ ان سے بڑا محتاط تھا جس کی وجہ سے وہ ان سے محفوظ رہتا تھا۔ ورنہ وہ ضرور مارا جاتا تھا کیونکہ کاغذوں پر بیٹھ کر لکھنا معمولی کام نہیں تو اور بات ضرور ہے مگر مہموں کا سر کرنا اور سلطنتوں کا کام چلانا ایک الگ معاملہ ہے۔ یہ محض اس شخص کا کام تھا جو کہ اپنی زندگی میں تحیر و خوبی کر گیا اور اپنے نیک نام کو لوگوں کے لیے ایک یادگار چھوڑ گیا۔ اب موجودہ امراء اور وزراء میں ان کے پائے کا کوئی بھی شخص نظر نہیں آتا۔ جس کو ان کے برابر رکھ کر تولا جائے۔

علمی استعداد اور تصنیفات

مرزا عبدالرحیم خانخاناں عربی زبان کے ماہر تھے۔ مگر اس کی مادری زبان فارسی اور ترکی تھی۔ ترکی اس کے گھر کی زبان تھی۔ اس کے گھر میں تمام لوگ وچاک ترک اور ایرانی تھے۔ اس کی طبیعت ایک قسم کی ہمہ گیر تھی۔ مرزا عبدالرحیم خانخاناں کی خط و کتابت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فارسی کا عمدہ انشا پرداز تھا۔ اس زمانے کے لوگ اپنے بزرگوں کی ہر بات کی خصوصاً زبان کی بڑی حفاظت کرتے تھے ان میں بڑی اہم بات یہ تھی کہ بادشاہ وقت ترک تھا۔

جہانگیر اپنے بچپن کے حالات میں لکھتا ہے کہ:

''میرے باپ کو بڑا خیال تھا کہ مجھے ترکی زبان آئے اس کے اس نے مجھے کو پھوپھی کے سپرد کر دیا تھا تا کہ اس سے ترکی میں بات کیا کروں اور ترکی سیکھوں۔''

مآثر الامراء میں لکھا ہے کہ:

''مرزا عبدالرحیم خانخاناں عربی فارسی اور ترکی میں بڑے رواں تھے۔ وہ اکثر زبانیں جو عالم میں رائج تھیں ان میں بات کرتا تھا۔''

اس کی تصنیفات میں درج ذیل کتب اہم تھیں۔

ا۔ توزک بابری یہ کتاب ترکی زبان میں لکھی گئی تھی۔ مگر اکبر اعظم کے حکم سے ترجمہ اس کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا یہ ترجمہ ۹۹۸ھ کو کیا گیا تھا اور اس ترجمے کے صلے میں بہت سی تحسین و آفرین کے پھول حاصل ہوئے۔ اس کتاب کی عبارت بڑی سادہ اور عام فہم تھی اور باہر کے خیالوں کو نہایت صفائی سے ادا کیا گیا تھا۔ یہ کام ان کے علاوہ دوسرا کوئی بھی کرنے کے اہل نہ تھا اگرچہ ملا اور علماء ان کے اردگرد بہت تھے۔ وہ شخص ان سے ملتا ہوگا اور ان کو ہدایات دیتا ہوگا اور جب یہ نسخہ تیار ہوتا تو ملاؤں نے یوں کہا کہ:

عشق و جنوں کی راہیں اہل وفا سے پوچھو
کیا جانیں شیخ صاحب ملا نے آدمی ہیں

ترجمہ: دشت جنوں کی راہیں وحشت زدوں سے پوچھوں۔ شیخ کو کیا معلوم کہ ملا نے آدمی ہیں؟

اکبر اعظم کا دور حکومت ایک نئی روشنی کا زمانہ تھا۔ اس نے علم سنسکرت بھی حاصل کیا جو آتش میں اس کی مثنوی ہے۔ جس کا ایک مصرع دری میں ہے تو دوسرا سنسکرت میں ہے۔ فارسی میں دیوان نہیں ہے البتہ غزلیں اور رباعیات ہیں۔ مگر جو کچھ بھی ہے وہ بہترین ہے۔ ان کی سب باتیں اور کلام قابل تحسین و آفرین ہے۔ جس کو پڑھنے سے قاری کا ذہن و دل باغ باغ ہو جاتا ہے اور زمانے کے بارے میں ان کو ضرور معلومات حاصل ہوتی ہیں اور عقل کے دریچے کھل جاتے ہیں۔

اولاد اور کارنامے

اولاد ہر ماں باپ کو عزیز ہوتی ہے۔ یہ ایک انسان کے انسانی اور بشری تقاضے ہیں۔ اسی طرح مرزا عبدالرحیم خانخاناں بھی ایک انسانی اور بشری تقاضے کے تحت اپنی اولاد سے بڑی محبت اور پیار کرتے تھے مگر مرزا عبدالرحیم نے تو ساری عمر مہموں اور جنگوں میں گزاری تھی اور اکبر اعظم کے دربار میں اس کی اولاد نے پرورش پائی جس کی وجہ سے اکبر اعظم بھی مرزا عبدالرحیم کے بچوں سے بہت پیار کرتا تھا۔

i۔ مرزا عبدالرحیم خانخاناں کا سب سے بڑا بیٹا ایرج تھا۔ ان سے اکبر اعظم اور ابوالفضل بھی بڑی محبت کرتا تھا۔

ii۔ مرزا عبدالرحیم کے دوسرے بیٹے کا نام "داراب" تھا۔

iii۔ اس کے تیسرے بیٹے کا نام "قاران" تھا۔ جس کے بارے میں اُن کی بڑی آرزو تھی تو جب آرزو اللہ تعالیٰ نے پوری کی تو خوشی سے اکبر اعظم نے ہی یہ نام بچے کا رکھا تھا۔ جس کو سب سے بڑا پسند کیا۔ ان کی تحریروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بچوں سے بہت زیادہ محبت و پیار کرتا تھا اور اسی طرح اس نے ان کی تعلیم و تربیت پر بھی توجہ دی۔

مرزا ایرج مرزا عبدالرحیم کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت کے بارے میں ابوالفضل نے اس کی یوں رہنمائی کی کہ:

"ایرج کو دربار میں بھیجنا ضروری نہیں ہے۔ اگر تمہیں اس کے خیال و تحقیق کی درستی کا خیال ہے تو اس طریقہ سے یہ امید پوری

نہیں ہوسکتی۔"

تو گویا سب بزرگوں کو بچوں کی تربیت کا بڑا احساس تھا۔

ایرج کا کارنامہ

۴۰ھ میں جلوس اکبری میں خانخاناں دکن میں تھے۔ تو ایرج بھی اس کے ساتھ تھا۔ عنبر حبشی فوج لے کر تلنگانہ کو عبور کرتا ہوا چڑھ آیا۔ امراء نے بار بار درخواست کر کے خانخاناں سے ملک حاصل کی۔ تو خانخاناں کو ایرج کو بھیجا۔ تو وہاں بڑے زور کا معرکہ ہوا۔ تو اس نوجوان ولاور ایرج نے اس بہادری سے تلوار چلائی کہ باپ دادا کا نام روشن ہو گیا اور لشکر کے پرانے پرانے سپاہی اور دلاور اس کی اس بہادری اور جوانمردی پر عش عش کر اٹھے اور اس کو داد دینے لگے تو جب اس بہادری کی خبر دربار تک پہنچی تو اسے دربار سے بہادری کا خطاب دیا گیا جو کہ بڑے اعزاز کی بات تھی۔

جہانگیر کے عہد حکومت میں ایرج اور داراب نے اور اس کے دیگر برادران نے ایسے ان مٹ کارنامے سرانجام دیے کہ باپ کا دل اور دادا کی روح باغ باغ ہوئی تھی۔ خصوصی طور پر ایرج نے بہت ہی شجاعت، عالی ہمت اور بہادری کے مظاہرے کیے جن کو دیکھ کر سب نے لکھا ہے کہ:

"یہ دوسرا خانخاناں کہاں سے آ گیا ہے؟"

جہانگیر نے اپنی توزک بابری میں ہر جگہ پر اس کی تعریف لکھی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس سے بہت ہی خوش ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ یہ تعریفیں و تحسین لکھتا رہا ہے اور...... کے لیے جانفشانی کے لیے امیدیں وابستہ رکھتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگ اپنے بادشاہ کے سامنے اپنی جان قربان کر دیتے تھے۔ یہ اس کا خلوص اور محبت تھی۔ اسے ان سے اور ان کی نسل سے اپنی بلکہ اپنی اولاد کے لیے کئی بلکہ ہزاروں امیدیں وابستہ تھیں۔ وہ ہمارے موجودہ حکام کی طرح خود غرض اور دولت پرست نہ تھے۔ وہ اپنے خادموں کی خدمت کی قدر کرتے تھے اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

۱۰۲۰ھ میں جہانگیر نے ایرج کو شاہنواز کا خطاب دیا اور ۱۰۲۱ھ میں تین ہزاری ذات، تین ہزاری منصب کا خطاب دیا۔ ۱۰۲۲ھ میں عنبر پر ایسی نمایاں فتح حاصل کی کہ خنجر و شمشیر کی زبان سے صدائے آفرین نکلی۔

داراب نے جانبازی کے رتبے کو حسد کی نگاہ سے دیکھا۔ ۱۰۲۶ھ میں بارہ ہزار سوار جرار خوش آپ پر عنایت ہوئے اور اس نے بارا کوٹ پر گھوڑے روڑا دیے۔ اسی سن میں ان کی بیٹی کی شاہزادہ شاہجہان سے شادی ہوئی۔ ۱۰۲۷ھ میں اسے پنج ہزاری منصب کے ساتھ دو ہزار سوار اور دو اسپہ سہ اسپہ عنایت ہوئے۔

مرزا عبدالرحیم خانخاناں کا بیٹا ایرج باپ دادا کے نام کو روشن کرنے والا سپوت تھا۔ مگر دولت و اقتدار ایک فتنہ اور شیطان کا عمل ہے۔ اس سے بہت کم حکمران محفوظ اور مامون رہ سکتے ہیں بلکہ اکثر حکمران اس کے نشے میں ملوث ہو کر اپنی جانوں کو بھی ضائع کر بیٹھے تھے تو مرزا عبدالرحیم خانخاناں کا یہ سپوت بھی اسی زمرے میں آ کر اپنے آپ کو باپ سے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے جدا کر بیٹھا۔ جس کا ذکر ذیل کی سطور میں کیا جا رہا ہے۔

مرزا عبدالرحیم خانخاناں کو صدمات

۱۰۲۸ھ کا واقعہ ہے کہ جب ابوالفضل اتالیق ہو کر رخصت ہونے لگا تو انھوں نے تاکید کے ساتھ ان کو بتایا کہ:

''سنا ہے کہ شاہ نواز (ایرج) شراب کا بہت عاشق ہو گیا ہے اور وہ شراب بہت پیتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو بڑے افسوس کی بات ہے وہ اس چھوٹی عمر میں اپنی جان ضائع کر دے گا۔ اس کو اس کے اس حال پر مت چھوڑو۔ بلکہ اس کی خود حفاظت کرنا اگر اس کی حفاظت نہ کر سکو تو ہم اس کو حضور (دربار اکبری) میں طلب کر لیں گے۔ تا کہ اس کی اصلاح پر پوری توجہ دی جا سکے۔''

تو جب مرزا عبدالرحیم خانخاناں برہان پور پہنچا تو اس نے دیکھا کہ بیٹے کی طبیعت بہت ہی کمزور اور ضعیف ہو چکی ہے۔ اس کا علاج کروایا گیا اور وہ کئی دن تک بستر مرگ پر پڑا رہا۔ طبیبوں اور معالجوں نے بہت کوشش کے ساتھ علاج کیے۔ مگر کوئی علاج کارگر ثابت نہ ہوا۔ اور یہ نوجوان مرزا عبدالرحیم کا سپوت جو کہ میدان میں نام پیدا کر کے حضور سے خطابات حاصل کر چکا تھا۔ تو وہ عین جوانی کے عالم میں ۳۳ برس کی عمر میں ہزاروں حسرت دار مان لے کر رحمت اور مغفرت الٰہی میں جا داخل ہوا۔ یہ افسوس ناک خبر سن کر سب کو بڑا افسوس اور دکھ ہوا۔ مگر کوئی بھی کچھ نہ کر سکا اور اس وقت کا اس بہادر کے جانے سے ہر ایک کو بڑا ہی دکھ اور افسوس ہوا۔ خواہ کوئی اس کا دوست تھا یا دشمن سب نے ہاتھ ملنے شروع کیے۔

راجہ (جہانگیر) جو کہ اس کے قریبی خدمت گاران میں سے تھے وہ مرزا عبدالرحیم خانخاناں کے پاس پرسہ دینے گئے تو انھوں نے ان کی بڑی دل جوئی اور محبت کی۔ اس (ایرج) کا منصب اس کے دوسرے بھائیوں میں تقسیم کر دیے گئے۔

داراب کو پنج ہزار ذات اور سوار کر دیا۔ خلعت، ہاتھی، گھوڑا، شمشیر مرصع دے کر باپ کے پاس بھیجا تا کہ شاہ نواز خاں کی جگہ برار و احمد نگر کا صوبہ ہے۔

مرزا عبدالرحیم خانخاناں کے تیسرے بیٹے کا نام رحمٰن داد تھا۔ تو راجہ نے دوسرے بھائی کو دو ہزاری آٹھ سو سوار عطا کیے۔ منوچ جو کہ شاہ نواز (ایرج) مرزا عبدالرحیم کا پوتا اس کو دو ہزاری ہزار سوار عطا کیے گئے۔

طغرل بھی دوسرا بیٹا تھا تو جہانگیر نے اس کو ہزاری ذات پانچ سو سوار دیے۔

حقیقت کی بات ہے کہ اس جوانمرد اور جوان سال بیٹے کی موت نے جہانگیر کے دل و دماغ پر ایک گہرا داغ لگایا تھا۔ جہانگیر نے اپنی توزک بابری میں بار بار ذکر کیا ہے کہ:

''اگر عمر وفا کرتی تو اس سلطنت میں وہ خوب خدمتیں سرانجام دیتا تھا۔''

مرزا عبدالرحیم خانخاناں کے ایرج سے چھوٹے بیٹے کا نام داراب تھا۔ وہ بھی اپنے باپ کی طرح اور بھائی کا پیشوا بڑا ہی بہادر اور جوانمرد ثابت ہوا تھا۔ اس نے بھی اپنے بھائی کی وفات کے بعد ان مٹ جوہر دکھائے۔

داراب کا کارنامہ

۱۰۲۹ھ میں خانخاناں کی عرضی آئی کہ:

"بری وغیرہ سرداروں دکن جنگلی قوموں کو ساتھ لے کر جنگ کے لیے ہجوم کر رکھا ہے اور تھانے دار تنگ کر داراب کے پاس چلے آئے ہیں۔"

تو یہ سن کر بادشاہ نے دولاکھ روپیہ بھیجا۔ تو داراب نے کئی ذی مرتبہ امراء کو بھیجا تھا۔ وہ اپنی فوج کو کٹوا کر واپس آجاتے تھے۔ آخر کار وہ ان کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے خود تیار ہو گیا اور وہ ان سے لڑتا بھڑتا ان کے گھروں تک جا پہنچا اور سب کو قتل و غارت کے لیے پریشان کر دیا۔

داراب نے وہاں اس قدر جرأت اور بہادری کے نشان ثبت کیے کہ وہاں کی سپاہ خود حیران رہ گئی۔ آخر کار وہ معرکہ جو کہ کئی امراء کے جانے سے سر نہ ہوسکا تھا۔ وہ داراب نے خود جا کر حل کر دیا اور وہاں سے بہت سا مال غنیمت حاصل کیا جو کہ سپاہ میں تقسیم کر دیا گیا۔ داراب اپنے بھائی کے نقش قدم پر چلنے کا خواہشمند تھا اور باپ کی بھی یہی تمنا تھی کہ وہ اپنے باپ دادا کا نام روشن کرے۔ سلطنت جہانگیری بھی اس کی بہت حوصلہ افزائی کر رہی تھی اور اس کو اس بہادری کے کارنامے پر بہت سے انعام و اکرام سے نوازا تھا۔

داور حمٰن

داور حمٰن بھی مرزا عبدالرحیم خانخاناں کا فرزند ارجمند تھا۔ وہ بھی ایسے ہی خوبصورت پھولوں کے کمالات سے آراستہ تھا۔ اس کو بھی باپ بہت عزیز رکھتا تھا۔ اس کی والدہ قوم سودیہ مقام امرکوٹ کی رہنے والی تھی اور وہ فخر کیا کرتا تھا کہ:

"بادشاہ میرے ننھیال میں پیدا ہوئے تھے۔"

تو جب وہ فوت ہو گیا تو کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی تھی کہ وہ اس کے باپ کے سامنے اس خبر کا اظہار کرے اور اس کو بھی اس کی موت سے آگاہ کردے۔

تو حضرت شاہ عیسیٰ سندھی ایک بزرگ تھے تو انھیں اہل محلہ نے جا کر کہا کہ:

"وہ جا کر مرزا عبدالرحیم خانخاناں کو داور حمٰن کی موت کے بارے میں مطلع کر دے۔"

تو انھوں نے لباس ماتمی پہنا اور فاتحہ پڑھی جس میں کوئی آیت یا حدیث وغیرہ اور چند کلمات افسوس کے ادا کیے اور واپس چلے گئے اس سلسلے میں جہانگیر تزک بابری میں لکھتا ہے کہ:

۱۰۲۹ھ میں پھر خانخاناں کو دوسرا بڑا داغ جگر نصیب ہوا۔ اس کا رحمٰن داد بیٹا بالا پور میں فوت ہو گیا تھا۔ وہاں اس کو کئی دن تک بخار رہا۔ ابھی نقاہت باقی تھی کہ ایک دن غنیم فوج کا دستہ باندھ کر نمودار ہوئے (یعنی حملہ آور ہوئے) تو ان کے بڑے بھائی داراب نے فوج لے کر تیاری کی۔ اسے جو معلوم ہوا تو وہ بھی شجاعت کے جوش میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اور وہ بھی سوار ہو کر گھوڑے دوڑاتے بڑے بھائی کے پاس جا پہنچا۔ اور اس طرح غنیم کا مقابلہ کر کے ان کو بھگا دیا تو فتح کی خوشی میں فوج کی طرح لہراتا ہوا گھر آ گیا۔ مگر چونکہ خوشی کا عالم تھا اس لیے کسی پرواہ نہ کی۔

اور گھر میں آ کر اپنے کپڑے اتار ڈالے تو بدن کو ہوا لگ گئی اور بدن درد کرنے لگا تو اس وجہ سے زبان بھی بند ہو گئی۔ دو دن تک اسی حالت میں رہے تو تیسرے روز اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

داور بخش بھی بڑا بہادر اور دلاور تھا اور خدمت اور شمشیر زنی کا ماہر تھا اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اپنا بہادری کا جوہر تلوار میں دکھاتے۔ اس عالم میں جواں سال بیٹے کی وفات پر باپ کی کیا حالت ہوگی؟ یہ وہی جانتا ہے۔ ابھی تک اس کے بڑے ایرج کی مرگ کا زخم نہیں بھرا تھا کہ یہ دوسرا بڑا گہرا زخم آ لگا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بہادر دلاور سپہ سالار کو بھی بڑا صبر اور حوصلہ دے دیا تھا۔

امراللہ

مرزا عبدالرحیم کا ایک لونڈی کے پیٹ سے بیٹا تھا مگر وہ تعلیم وتربیت سے بے بہرہ تھا۔ مگر وہ بھی جوان تھا۔ اس کے بارے میں جہانگیر نے خوش ہو کر یوں لکھا ہے کہ:

''گونڈانہ علاقہ خاندیس کا الماس پر جو کر قبضہ کیا۔''

حیدرقلی

باپ اسے پیار سے حیدری کہتا تھا۔ کئی بھائیوں کے بعد میں پیدا ہوا تھا مگر وہ بھی سب سے پہلے اس جہان فانی سے رخصت ہو کر ماں باپ کو داغ مفارقت دے گیا۔ گویا مرزا عبدالرحیم خانخاناں کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے پھول عطا کئے مگر جلد ہی کملا کر گر پڑے اور اس کے حصہ میں صرف چند دنوں کی خوشبو کی سونگھنی ہی آئی۔

گل کچھ تو اس چمن کی ہوا کھا کے گر پڑے
وہ کیا کرے کہ غنچہ بھی کملا کے مر پڑے

گویا کہ مرزا عبدالرحیم خانخاناں کی اولاد نرینہ میں درج ذیل بیٹے تھے:

i- ایرج ii- داراب
iii- داور بخش iv- امراللہ (لونڈی کا بیٹا)
v- حیدر علی

مگر تاریخی معلومات کے مطابق ان میں سے ایرج، داراب، داور بخش اور حیدر قلی۔ اس کی زندگی میں ہی اس کو گہرے داغ مفارقت دے کر دار فانی سے رخصت ہو گئے تھے۔ صرف امراللہ جو کہ اس کی لونڈی کے پیٹ سے تھا۔ وہ باقی نظر آتا ہے۔ جس نے کہاں تک اپنے بھائیوں کے کارناموں کی پاسداری کی ہوگی۔ اس کے بارے میں تاریخ مغلیہ بھی خاموش ہی نظر آتی ہے۔

ان بیٹوں کے علاوہ مرزا عبدالرحیم کی بیٹیاں بھی اولاد میں شامل تھیں۔ جن کا ذکر ذیل کی سطور میں کیا جاتا ہے مگر بیٹیوں کے مقدر بھی کوئی اچھے نظر نہیں آتے ہیں۔ وہ بھی باپ کے لیے ایک دردناک باب ہی بنی ہوں گی۔

مرزا عبدالرحیم کی بیٹیاں

مرزا عبدالرحیم کی دو بیٹیاں تھیں۔

ایک بیٹی کی نسبت دانیال کے ساتھ تھی۔ مگر افسوس کہ جانا بیگم جو کہ اپنے سہاگ میں خوش و خرم تھی تو زمانے کی ستم ظریفی نے اس کے بدنصیبی کے ہاتھوں رنڈاپے کی خاک اس کے سر پر ڈال دی۔ اس عفیفہ کو بھی گہرا زخم آیا۔ دکھ آگ سے تن کو داغ داغ کیا تو وہ بھی اسی حالت میں بڑھیا ہو کر فوت ہو گئی۔ مگر جب تک حیات رہی۔ اس وقت تک اس عورت نے کوئی خوشی نہ دیکھی اور نہ ساری عمر اچھا کپڑا ہی پہنا حتیٰ اس نے رنگین رومال تک سر پہ نہ رکھا۔

مرزا عبدالرحیم خانخاناں کی دوسری بیٹی کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ مگر یہ جمال الدین انجو فرہنگ جہانگیری کے مصنف امرائے اکبری میں داخل تھے۔ ان کے دو صاحبزادے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام میر امیر الدین تھا۔ اس بیٹی کو اس کے ساتھ منسوب کیا گیا تھا وہ لڑکا بھی بڑا سعادت مند اور باپ کی خدمت سے ایک دم جدا نہ ہوتا تھا۔ مگر خدا کو منظور کہ وہ لڑکا بھی عین جوانی کے عالم میں اسد ار فانی سے ناکامی دے کر جدا ہو گیا اور مرزا عبدالرحیم خان خاناں کی بیٹی کا سہاگ لٹ گیا اور بیوہ ہو کر بیوگی کی زندگی بسر کرنے لگی تھی۔ جو کہ عورت کے لیے بڑے ہی تاسف کا دور ہوتا ہے۔

مرزا عبدالرحیم کی سخاوت

مرزا عبدالرحیم جود و کرم کے باب میں بڑا ہی دریا دل شخص تھا۔ وہ ہر وقت عطا و انعام کے بیے بہانے ڈھونڈتا رہتا تھا۔ وہ علماء، صلحاء، فقراء اور مشائخ میں سب کو ظاہرا اور خفیہ طور پر ہزاروں روپے اور اشرفیاں اور دولت و مال تو سوچے سمجھے لٹا دیتا تھا۔ وہ شعراء اور اہل کمال کا تو باپ کی طرح خیال رکھتا تھا جو بھی آتا تھا وہ اس کے در کو ہی اپنا سہارا بناتا تھا اور وہ ایسے محسوس کرتے تھے کہ اپنے گھر میں بیٹھے ہیں۔ وہ بادشاہ کے دربار میں جانے کی تمنا نہ رکھتے تھے مآثر الامراء میں لکھا ہے کہ:

مرزا عبدالرحیم کے وقت میں اہل کمال کا مجمع تھا۔ ان کے دربار میں سخاوت کے بہت ہی لطیفے اور قصے مشہور تھے جو شعراء اپنے شعروں اور قصیدوں میں اکبر کی بھی تعریف کرتے تھے تو پھر بھی یہ انعام ان کو دیا کرتا تھا۔ مآثر رحیمی ایک قصیدوں کی کتاب ہے جس کے مصنف ملا باقی ہیں۔ انھوں نے اس کتاب میں اس امر کا ذکر کیا ہے کہ کس تقریب میں یہ قصیدہ لکھا گیا ہے اور اس کے بدلے میں کس کو کتنا انعام دیا گیا ہے۔

خانخاناں کا دستر خوان ہر وقت بچھا رہتا تھا۔ اور بہت ہی وسیع تھا۔ جس پر کھانے رنگا رنگ کے تعلقات سے رنگین اور اس کے فیض سخاوت کی طرح اہل علم کے لیے عام تھے۔ جب وہ دستر خوان پر بیٹھتا تھا تو مکانوں میں درجہ بدرجہ صدہا بندگان خدا بیٹھے تھے اور لذت سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اکثر کھانوں کی رکابیوں میں روپے، اشرفیاں رکھ دیتے تھے۔ جو جس کے حوالے میں آئے اس کا مقدر تھا۔ اس کی قسمت آج تک وہ مثل زبانوں پر ہے خان خاناں جس کے کھانے میں بتانا۔

اس کی سخاوت کا ایک واقعہ یوں لکھا گیا ہے کہ:

ایک دن ملازموں کی چٹھیاں دستخط کر رہے تھے کہ کسی پیادے کی چٹھی پہ ہزار دام کی بجائے ہزار روپے لکھ دیے گئے تو ان کی دوستی مناسب نہ سمجھی۔ بلکہ یہ کہہ کر ٹال دیا کہ:

"اب جو قلم سے نکل گیا اس کا مقدر یہی ہوگا۔"

حالانکہ اس کے بارے میں دیوان نے عرض بھی کیا کہ یہ غلط لکھا جا چکا ہے۔ اس کی درستی ضروری ہے۔ مگر تنی طبیعت نے گوارا نہ کیا۔

ایک دن نظیری نیشا پوری نے کہا کہ:

نواب صاحب! میں نے آج لاکھ روپے کا ڈھیر نہیں دیکھا کہ کتنا ہوتا ہے۔ انھوں نے خزانچی کو حکم دیا کہ:
اس کے سامنے لاکھ روپے کا انبار لا کر رکھ دے۔"

تو خزانچی نے اس کے سامنے لاکھ روپے کا ڈھیر لگا دیا تو نظیری نے کہا کہ:

"خدا تعالیٰ آپ کی بدولت آج لاکھ روپے دکھائے۔"

خانخاناں نے کہا کہ:

"اللہ جیسے کریم کا اتنی بات پہ کیا شکر کرنا۔"

اور سارے روپے اس کو دے دیے اور کہا کہ:

"خیر اب شکر الٰہی کرو تو ایک بات بھی ہے۔"

ایک دن ایک بھوکا برہمن خانخاناں کے گھر آیا تو اس کو گھر میں داخل ہونے سے دربان نے روک لیا تو اس بھوکے برہمن نے دربار ی سے کہا کہ اس کو کہہ دو کہ:

"تمہارا ہم زلف ملنے آیا ہے اور اس کی بی بی اس کے ساتھ ہے۔"

خدمت گار نے عرض کیا تو اسے بلا لیا گیا۔ اس کو خان خاناں نے اپنے پاس بٹھایا اور رشتہ کا سلسلہ کھلا تو اس نے کہا کہ:
"خان خاناں صاحب! اپدا اور بپتا دو بہنیں ہیں۔ میرے گھر گئی۔ دوسری آپ کے گھر آئی ہے۔ آپ اور میں ہم زلف نہیں تو اور کیا ہیں؟"

نواب بہت خوش ہوا۔ اور اس کو خلعت دی اور خاصہ کے گھوڑے پر طلائی ساز کروا کر سوار کیا اور بہت کچھ نقد و جنس دے کر رخصت کیا۔

ایک دن دربار میں مجلس جما کر بیٹھے تھے کہ جس میں رہا بی...... اہل غرض اور اہل مطلب لوگ حاضر مجلس تھے تو ایک غریب آدمی شکستہ دل آ کر مجلس میں بیٹھ گیا اور جوں جوں اس کو جگہ ملتی چلی گئی۔ وہ خان خاناں کے نزدیک ہوتا چلا گیا۔ جب وہ بہت ہی قریب ہو گیا تو اس نے ایک توپ کا گولہ بغل سے نکالا۔ اور اس کو خان خاناں کی طرف لڑکا دیا جو کہ نواب کے زانو سے جا کر ٹکرایا تو نوکر اس کی طرف دوڑے مگر نواب نے منع کر دیا اور حکم دیا کہ:

"گولے کے برابر سونا تول دو۔"

تو مصاحبوں نے پوچھا کہ:

''یہ قول شاعر کو سوئی پر لگتا ہے۔''

آہن	کہ	پارس	آشنا	شد
فی	الحال	بہ	صورت	طلاء شدہ

خان خاناں کی سخاوت کے اتنے کثیر اور زیادہ قصے اور حکایات ہیں کہ جن کو شمار کرنے کے لیے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہوتی۔ بہر حال وہ اپنے تمام ہم عصر لوگوں سے دریا دل اور سخی شخص تھا اس کی سخاوت کی کوئی برابری نہیں کر سکا وہ ہر وقت فقراء اور مساکین کی تلاش میں رہتے تھے تا کہ ان میں کچھ تقسیم کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے جیسے ان کو دل دیا تھا اسی طرح ان کو دل بھی دے رکھا تھا اور وہ فراخ دل ہو کر اپنا دل غربا میں تقسیم کرتے تھے۔

مرزا عبدالرحیم خان خاناں بہت ہی حسین اور خوبصورت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی خوبیاں اور اوصاف سن کر ایک عورت کو اشتیاق ہوا کہ وہ بھی حسین تھی۔ اس نے اپنی تصویر کھنچوائی اور ایک بڑھیا کے ہاتھ خان خاناں کے پاس بھیج دی اور وہ آ کر ان سے خلوت میں ملی اور اپنے مطلب کو اس کے سامنے بیان کیا اور کہا کہ:

''یہ...... بیگم کی تصویر ہے۔ انھوں نے پیغام دیا ہے کہ آپ کی تعریفیں سن سن کر میرا جی بہت خوش ہوتا ہے۔ مگر میرا ارمان یہ ہے کہ تمھیں جیسا ایک فرزند میرے ہاں سے ہو۔ تم بادشاہ کی آنکھیں ہو۔ زبان ہو۔ مرتبت و بازو...... ہوں۔ یہ بات کوئی مشکل نہیں ہے۔''

تو خان خاناں نے یہ سن کر کہا کہ:

''دائی اماں اس کو میری طرف سے یہ کہنا کہ یہ بات تو کچھ مشکل نہیں۔ مگر یہ مشکل ہے کہ خدا جانے اولاد ہو یا نہ ہو اور اگر ہو تو کیا خبر ہے بیٹا ہو یا بیٹی اور وہ زندہ بھی رہے پھر خدا جانے ایسی صورت ہو یا نہ ہو۔ یہ بھی ہو جائے تو اس کے اقبال سے کیا زور ہے؟ خدا چاہے دے خدا چاہے شدے۔ اگر انھیں مجھ جیسے بیٹے کی حاجت ہے تو کہنا کہ:

''تم مال میں بیٹا۔ خدا کا شکر ادا کرو۔ جس نے پلا پلایا بیٹا تمھیں دیا میں جو شاں کو اس قدر روپیہ بھیج دیتا ہوں۔ وہی تمھیں بھیجا کروں گا۔'' (اپنی ماں کو)

☆ ☆ ☆

باب ۷

راجہ مان سنگھ

۱۔ راجہ مان سنگھ کی رفاقت نے اکبر کو اپنائیت اور محبت سکھائی۔

۲۔ راجہ مان سنگھ کی ملنساری اور وفاداری نے اکبر کے دل پر نقش کر دیا۔

۳۔ مان سنگھ کو پرانے پرانے امراء اور وزراء کے ہمراہ سپہ سالار بنا کر مہم رانا پر روانہ کیا۔ اور بنگالہ اس کی جاگیر جگت سنگھ اس کے ولی عہد کو عنایت کی۔

۴۔ خسرو جہانگیر کا بڑا بیٹا تھا۔ مان سنگھ اس کا اتالیق مقرر ہوا اور اس کو سات ہزار چھ سو سوار کے منصب عطا کیے گئے۔

۵۔ جب تک اکبر کی سلطنت عروج پر رہی اس وقت تک راجہ مان سنگھ کا ستارہ سعد اکبر (مشتری بر ہمپت) رہا۔

۶۔ خاندانی راجہ مرد کہن سال، مروت انسانیت کے جواہر سے خزانہ دار تھا۔

۷۔ زمانہ کے نشیب و فراز سے خوب واقف تھا۔

۸۔ بھاڑا مل راجہ بھگوان داس کے باپ اور مان سنگھ کے دادا تھے۔

راجہ مان سنگھ پر طائرانہ نگاہ

والد	:	جگ مل
جاگیر	:	تاج گنج کے روضے کی جگہ پٹنہ حاجی پور
وفات	:	۱۰۲۳ھ
دادا	:	راجہ بہاڑا مل
خاندان	:	ہندو برہمن (کچھورحہ)
آپ کے ساتھ رشتہ	:	پھوپھی اکبر کے حرم میں تھی
رانیوں کی تعداد	:	۱۵۰۰ (پندرہ سو)
وفات کے وقت ستی		
ہونے والی کی تعداد	:	(۶۰) ساٹھ رانیاں
بھائی	:	۵ بھائی تھے
راجہ مان کا درجہ	:	سب سے چھوٹا تھا

حالات زندگی

راجہ مان سنگھ اکبر کے عہد سلطنت میں اس کا بڑی اہم درباری شخصیت بھی۔ جس کا تعلق ہندو مذہب سے تھا۔ اس کے باپ کا نام جگ مل اور دادا کا نام بھاڑا مل تھا۔ تاریخ کے مطابق یہ راجہ مان سنگھ ہی تھا کہ جس کی وجہ سے اکبر بادشاہ کو اس قدر ہندوستان میں پذیرائی حاصل ہوئی اور ہندوستان میں تیموری خاندان کی بنیاد مضبوط ہوئی۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ راجہ مان سنگھ نے اپنی رفاقت اور ہمدردی اپنائیت اور محبت کرنی سکھ دی تھی اور اس نے خلق عالم کو سکھا دیا کہ:

''راجپوتوں میں جو یہ خیال رائج ہے کہ ان کا سر جائے مگر ان کی بات نہ جائے۔''

اس کی جو صورت اس نے دکھا دی اس میں کوئی شک نہیں کیا جاتا کہ ان بت کے پوروں نے اس ترک بادشاہ کو اپنی رفاقت دے کر اپنی جان کو جان نہ سمجھا اور ہر محاذ پر اس کا ساتھ دے کر اس کی رفاقت اور ہمدردی کا ثبوت دیا۔ ان کی ہمدردی اکبر کے ساتھ یہاں تک ہوئی کہ وہ اکبر کے دل پر نقش ہو گئے اور ان کو احساس دلا دیا کہ:

''ملک ہندا ایسی جزائے شریعت سے مرکب ہے کہ اگر ان کے ساتھ غیر قوم بھی محبت اور ہمدردی کرے تقریباً ایسا اپنی قوم سے بھی بڑھ کر کرتے ہیں۔ راجہ مان سنگھ کچھواہہ خاندان میں عظیم الشان خاندان راجہ چلے آ رہے تھے اور ان کے ساتھ تمام قوم کچھواہہ اکبر کی جاں نثاری پر کمر بستہ ہو گئی تو ان کی وجہ سے راجپوتوں کے اکثر خاندان بھی اکبر کے ساتھ آ ملے۔ لیکن اکبر کی دلربائی اور دلداری کا جادو بھی ایسا ان پر کارگر ہوا کہ آج تک چغتائی خاندان کی محبت کا دم بھرتے ہیں۔

راجہ بھاڑا مل کی بصیرت و دانائی

۹۶۳ھ میں دربار اکبری سے پہلے جلوس کے سال مجنون قاں قاقشاں نارنول پر حاکم تھا اور حاجی شیر خاں کا غلام تھا۔ اس نے مجنون خاں پر حملہ کر دیا۔ راجہ بھاڑا مل اور آمیز جو کہ اس وقت کچھواہہ خاندان کے اہم چشم و چراغ تھے۔ وہ حاجی خاں کے ساتھ تھے تو اس حالت میں مجنوں خان بڑا پریشان ہو گیا اور حیران ہوا کہ اب حالات کا کیسے سامنا کیا جائے؟

راجہ بھاڑا مل مروت و انسانیت کے جواہر سے مالا مال تھا اور وہ حالات کے نشیب و فراز کو اچھی طرح سمجھتا اور جانتا تھا۔ اس نے فریقین کے ساتھ گفت و شنید کر کے ان دونوں کو صلح کرنے پر قائل کر لیا۔ اور اس نے حاجی خاں جو کہ شیر شاہ کا غلام تھا۔ اس سے محاصرہ ختم کر دیا اور مجنون خاں کو محاصرے سے نکلوایا اور اس کو عزت و حرمت کے ساتھ دربار شاہی کو روانہ کیا۔

جب مجنون خاں دربار اکبری میں پہنچا تو راجہ کی دست اخلاص عالی ہمتی اور اس کے عالی خاندان حالات کا اکبر کے ساتھ تذکرہ ہوا تو اکبر سن کر بڑا متاثر ہوا اور اس نے دربار سے ایک فرمان لے کر اس کو طلب کرنے کے لیے لے کر گیا تو راجہ فرمان پاتے ہی حاضر دربار ہوا تو اکبر نے راجہ بھاڑا مل کا بڑے اچھے انداز سے پرتپاک استقبال کیا۔ یہ وہ مبارک وقت تھا کہ اکبر جو ہو کی مہم مار کر آیا تھا۔

راجہ بھاڑا مل کا درباریوں میں شامل ہونا

جس دن راجہ اور اس کے فرزندوں اور ہمراہی بھائی بندوں کو خلعت و انعام مل رہے تھے اور وہ یہ حاصل کر کے رخصت ہوئے اور بادشاہ ہاتھی پر سوار ہو کر باہر نکلے تھے۔ ہاتھی مست تھے اور جوش مستی میں ادھر ادھر جھومتا پھرتا تھا۔ اور اس کی اس مستی سے لوگ ڈر کر بھاگ رہے تھے تو ایک دن یہ مست ہاتھی راجپوتوں کی طرف بھی جھکا مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹے بلکہ اسی طرح کھڑے رہے تو بادشاہ کو راجپوتوں کی بہادری اور دلاوری بڑی پسند آئی تو بادشاہ نے راجہ بھوڑا مل کی طرف متوجہ ہو کر یوں ارشاد ہوا کہ:

ترانہال خواہم کرد عنقریب ے بینی کہ اعزاز و افتخارت زیادہ برزیادہ میشود۔

ترجمہ: تجھے میں چاہتا ہوں۔ عنقریب تو دیکھے گا کہ تجھ پر افتخار و انعام زیادہ سے زیادہ ہوں گے۔

اس دن سے اکبر بادشاہ کے دل میں راجپوتوں اور خاص کر راجہ بھاڑا مل کی قدر میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا اور ان کی بہادری اور دلیری اکبر کے دل پر نقش ہوتی چلی گئی۔ اکبر نے مرزا شرف الدین حسین کو "میوات" کا حاکم مقرر کر دیا تھا تو اس نے اپنے ارد گرد کو اپنے علاقے میں شامل کرنا شروع کر دیا اور اس نے آبینہ کے علاقے کا بھی قبضہ کرنا چاہا مگر راجہ بھاڑا مل کا ایک فسادی اور فتنہ پرور بھائی شرکت ریاست کے باعث مرزا سے آملا اور اس کے لشکر کے ساتھ نکلا چونکہ یہ ان کے گھر کی پھوٹ تھی۔ اس لیے مرزا غالب آ گیا۔ اور راجہ کے چند بھائی بند گروے کر پھرا۔

۹۶۸ھ میں بادشاہ نے اجمیر شریف کی زیارت کا ارادہ کیا تو راستہ میں ایک امیر نے عرض کیا کہ:

"راجہ بھاڑا مل جو دلی میں حاضر دربار ہوا تھا۔ اس میں مرزا نے بڑی زیادتی کی ہے اور وہ آج کل پہاڑوں اور جنگلوں میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ وہ شخص بڑا ہی عالی ہمت اور بامروت خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ تو اگر حضور کی نگاہ کرم ہو تو وہ شخص عظیم خدمات سرانجام دینے والا ہے۔"

تو بادشاہ نے حکم دیا کہ:

"تم خود جا کر اس کو بلا لاؤ۔"

چنانچہ وہ لینے کے لیے گیا مگر وہ خود نہ آیا اور اپنا بھائی امیر مذکور کے ہاں بھیج دیا۔ مگر اکبر بادشاہ نے اس عمل کو مناسب نہ سمجھا اور کہا کہ:

"وہ خود آ کر دربار میں حاضر ہو۔"

تو اس کو دوبارہ رابطہ کیا گیا تو راجہ بھاڑا مل نے اپنے بڑے بیٹے بھگوان داس کو اپنے اہل وعیال کے ساتھ چھوڑا اور خود دربار اکبری میں حاضر ہوا۔ اس وقت اکبر سانگا نیر کے مقام پر قیام پذیر تھا۔ تو بادشاہ نے بڑی عزت افزائی کی اور راجہ بھاڑا مل کو اپنے امرائے خاص میں

شامل کرلیا۔ راجہ کے دل میں ایسی محبت اور وفا کا جوش پیدا ہوا کہ رفتہ رفتہ اپنے بیگانوں اور اکبراعظم میں کوئی فرق نہ رہا۔ تو چند دنوں کے بعد راجہ بھگوان داس اور مان سنگھ بھی آ گئے تو اکبراعظم نے بھاڑا مل کی عزت افزائی کی خاطر ان کو بھی شامل دربار کرلیا اور راجہ بھاڑا مل کو رخصت کر دیا مگر دونوں کے دل مل گئے تھے مگر اکبر نے چلتے ہوئے یہ حکم دے دیا تھا کہ:

''جلد چلے آنا اور سامان کر کے آنا تاکہ دوبارہ واپس جانے کی حاجت نہ رہے۔''

راجہ بھاڑا مل اگرچہ ہندو تھا مگر وہ اکبر کے ساتھ بڑا ہی وفادار اور مخلص ہو چکا تھا تو اس نے آئین سلطنت کو سب پر غالب سمجھا تو راجہ بھاڑا مل کی بیٹی اور راجہ مان سنگھ کی پھوپھی کو بیگمات اکبری میں داخل کر کے اکبر نے مزید تعلقات میں استوار پیدا کر لی۔ یہ اکبر بادشاہ کی اس قول کے پیش نظر عمل تھا جو شاہ طہماسپ نے اس کے والد ہمایوں کو ایران میں ایک جگہ پر شکار کرتے ہوئے اترے ہوئے اور بیٹھے ہوئے مشورہ دیا تھا کہ:

''افغانوں کو تجارت میں ڈال دو۔ اور راجپوتوں کو دلاسا و محبت کے ساتھ شریک حال کرو۔'' (ماثر الامرا)

اکبر نے ہندوؤں کو کیسے اپنا بنایا؟

اگرچہ اکبر بادشاہ ترک ماوراالنہری تھا۔ مگر اس نے ہندوستان میں آ کر جس طریقے سے ہندوؤں اور ہندوستانیوں سے اپنائیت ظاہر کی اور اس طریقہ انسانی کو رائج کر کے فروغ کر دیا۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔

واضح رہے کہ جب ہمایوں ایران میں گیا تو اور اس نے شاہ طہماسپ سے ملاقات کی تو ایک دن دونوں بادشاہ شکار کو نکلے تو کسی مقام پر وہ تھک کر اتر پڑے۔ تو شاہی فراش نے اٹھ کر غالیچہ ڈال دیا۔ جس پر شاہ بیٹھ گیا۔ مگر ہمایوں کے ایک زانو کے نیچے فرش نہ تھا تو اسی عرصے میں کہ شاہ اٹھیں اور غالیچہ کھول کر بچھائیں۔ ہمایوں کے ایک جاں نثار نے فوراً اٹھ کر اپنے تیردان کا کارچوبی غلاف چھری سے چاک کیا اور اپنے بادشاہ کے نیچے بچھا دیا۔ بادشاہ طہماسپ کو یہ پھرتی اور بادشاہ کی ہوا خواہی بہت پسند آئی اور کہا کہ:

''برادر ہمایوں! تمھارے ساتھ ایسے ایسے جانثار نمک حلال تھے تو پھر تو ملک ہاتھ سے اس طرح نکلا آیا اس کا کیا سبب ہے؟''

تو بادشاہ ہمایوں نے جواب دیا کہ:

''بھائیوں کے حسد اور عداوت نے کام خراب کر دیا تھا۔ ایک نمک خوار تو کر اپنے آقا کے بیٹے سمجھ کر کبھی ادھر ہو جاتے تھے کبھی ادھر۔''

تو شاہ طہماسپ نے کہا کہ:

''ہندوستان میں دو فرقے کے لوگ بہت ہیں۔ ان میں

i- افغان

ii- راجپوت

"اگر خدا تعالیٰ کی مدد شامل حال ہوتو آپ کی دفعہ وہاں پہنچو تو افغانوں کو تجارت میں ڈال دو اور راجپوتوں کو دلاسا و محبت کے ساتھ شریکِ حال کرو۔"

تو ہمایوں جب دوسری بار ہندوستان آیا تو اسے موت نے مہلت نہ دی اور شاہ طہماسپ کی اس تدبیر پر وہ عمل نہ کر سکا۔ البتہ اکبر نے اس پر من وعن عمل کر کے لوگوں کو اس کی صداقت ظاہر کر دی۔ اکبر اس حقیقت کو سمجھ چکا تھا کہ:

"ہندوستان ہندوؤں کا گھر ہے اور مجھے اس ملک میں اللہ تعالیٰ نے بادشاہ بنا کر بھیجا ہے ملک گیری اور تسخیر کی حالت میں ممکن ہے کہ اس ملک کو تلوار کے زور سے زیر کیا اور اہل ملک کو ویران کر دیا۔ ملک والوں کو دبا لیا۔ لیکن جبکہ میں اسی گھر میں رہنا اختیار کروں گا تو یہ ممکن نہیں کہ ان کے ملک کے کل فوائد و آرام میں اور میرے امرا اٹھائیں اور ملک والے ویران و پریشان رہیں اور پھر میں آرام سے بھی بیٹھ سکوں اور یہ اس سے بھی زیادہ مشکل ہے کہ انھیں بالکل ہی فنا کر کے نیست و نابود کر دوں۔

اکبر یہ بھی جانتا تھا کہ میرے باپ پر چچا وں کے ہاتھ سے کیا گزری؟ اور چچاؤں کی اولاد اور ان کے غمخوار بھی موجود ہیں اور جو ہم قوم ترک اس وقت میرے ساتھ ہیں وہ ہمیشہ دو دھاری تلوار ہیں۔ انھوں نے جدھر فائدہ دیکھا ادھر ہی ہو گئے۔

غرض جب اس نے خود ہندوستان ملک سنبھالا تو اس نے لوگوں کو ایسا تاثر دیا کہ:

"جس میں خاص و عام اہل ہند یہ نہ جانیں کہ غیر قوم ترک، غیر مذہب مسلمان کہیں سے آ کر ہم پر حاکم بن بیٹھے ہیں۔ اس لیے ملک کے فوائد و منافع پر کوئی بند نہ رکھا۔ اس کی سلطنت ایک دریا کی مانند تھی کہ جس کا کنارہ ہر جگہ سے گھاٹ تھا۔ آؤ اس کو سیراب ہو جاؤ۔ دنیا میں کون ہے کہ عقل رکھتا ہو اور دریا کے کنارے پر نہ آئے۔"

جب اکبر کی سلطنت وسیع ہوئی تو بہت سے راجے، مہاراجے، ٹھاکر، سردار دربار میں آنے لگے۔ اکبر نے بھی ان کی بڑی عزت و حوصلہ افزائی کی کیونکہ وہ بھی سمجھ دار اور مصدق کا قبلہ بادشاہ تھا۔ ملنساری اس کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ اس سے تمام کو یہ تاثر ملا کہ وہ ان کے لیے ایک متاصل ہو کر آیا ہے اور ان کو اکبر سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہوئیں اکبر نے ہندوستانیوں کے ایسا رویہ اختیار کیا کہ وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ:

"اکبر کا یہ برتاؤ محض ہمارے پھسلانے کے لیے نہیں ہے بلکہ ہم کو اپنا کر تے اور وہ ہمارا ہو رہا ہے۔ اور اس کی عنایتیں اور دن رات کے کاروبار اور اپنائیت کے برتاؤ اس خیال کی ہر دم تصدیق کرتے تھے۔"

اور اس حسن سلوک کی حد یہاں تک جا پہنچی کہ ہم قوم اور غیر قوم کا کوئی ان کے ہاں فرق نہ رہا۔ سپہ سالاری اور ملک گیری سے جلیل القدر عہدے ترکوں کے برابر ہندوؤں کو ملنے لگے اور دربار میں بھی ہندو و مسلمان برابر نظر آنے لگے۔ چوغے اور عمامہ کو اتار کر جامہ اور پگڑی وار کھوڑی اختیار کر لی اور داڑھی کو رخصت کر دیا گیا۔ تخت دو پہیم کو چھوڑ کر سنگھاسن پر بیٹھنے اور ہاتھی پر چڑھنے لگے۔ فرش فروش سواریاں اور دربار کے سامان آرائش سب ہندوانہ ہونے لگے ہندو اور ہندوستانی لوگ ہر وقت خدمت میں حاضر رہنے لگے۔ جب بادشاہ کا یہ رنگ دیکھا گیا تو اس کے تمام ارکین و امرا ایرانی، تورانی سب کا وہی رنگ ڈھنگ ہو گیا۔ ترکوں کا دربار اندر سبھا کا تماشا تھا تو روز کا جشن ایران و توران کا قدیمی رسم تھی مگر اس نے اس کو بھی ہندوانی طرز پر رنگ دے کر اسے بھی ہندو بنا دیا تھا۔ اکبر کی ہر سالگرہ پر جشن ہوتا تھا۔ شمسی بھی اور قمری بھی۔ ان میں تلادان کرتے

تھے۔ اناج کے دفعات میں تلتے تھے۔ برہمن بیٹھ کر ہون کرتے تھے اور سب کی گٹھریاں باندھ دعائیں دیے جاتے تھے۔ دسہرہ کو آتے۔ رشید باد دیں دیتے۔ پوجا کرواتے۔ ماتھے ٹیکہ لگاتے جواہر و مروارید کے مرصع راکھی ہاتھ میں باندھتے۔ بادشاہ ہاتھ پر باز بٹھاتے۔ قلعے کے برجوں پر شراب رکھی جاتی تھی۔

گائے کا گوشت، لہسن، پیاز بہت سی چیزیں حرام اور بہت سی حلال کر دی گئیں۔ صبح کو ہر روز جمنا کے کنارے سے شرق رویہ کھڑکیوں میں بیٹھتے تھے۔ تاکہ سب سے پہلے آفتاب کا درشن ہو۔ ہندوستان کے لوگ ہر صبح کو بادشاہ کے دیدار کو بڑا مبارک تصور کرتے تھے اور جو لوگ دریا پر اشنان کو آتے تھے مرد عورتیں بچے ہزار در ہزار سامنے آتے تھے۔ بادشاہ کی تعریف کرنے لگا اور خوش ہوتے تھے۔ اکبر بادشاہ بھی اپنے بچوں سے ان لوگوں کے بچوں کو دیکھ بہت خوش ہوتا تھا۔ جس کے وہ واقعی حقدار بھی تھے کیونکہ انھوں نے اسے حاکم تسلیم کر رکھا تھا۔ اکبر نے یہ سب کچھ کیا مگر راجپوتوں نے بھی اپنی جاں نثاری کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ جہانگیر نے تزک بابری میں لکھا ہے کہ

"اکبر نے اسلام ہند کو ہند میں فقط اس لیے اختیار کیا تھا کہ یہ غیر ملک کا تازہ میوہ ہے۔ یا نئے ملک کا نیا سنگار ہے یا یہ کہ اپنے پیروں اور پیار کرنے والوں کی ہر بات پیاری لگتی ہے۔ مگر اس بات نے اسے مذہب کے عالم میں بدنام کر دیا۔ اور یہ بدمذہبی کا داغ اس طرح دامن پر پکا لگا یا کہ آج تک بے خبر اور بے درد ملا اس کی بدنامی کا سبق ویسا ہی پڑھے جاتے ہیں۔ اس مقام پر سبب اصلی کا نہ لکھنا اور دور کر بادشاہ پر ظلم کا جاری رکھنا مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔"

میرے دوستو! تم نے کچھ سمجھ لیا اور باقی آئندہ سمجھ لو گے کہ ان علماء نے زر پرست کی سیہ سیاہی اور بدنفسی نے کس قدر جلد انھیں اور ان کے ہاتھوں اسلام کو ذلیل و خوار کر دیا۔ ان نااہلوں کے کاروبار کو دیکھ کر نیک نیت بادشاہ کو ضرور خیال ہوا ہو گا کہ

حسد اور کینہ وری علماء کتابی کا حصہ ہے۔ اچھا انھیں سلام کروں، اور جو بزرگ اہل باطن اور صاحب دل کہلاتے ہیں۔ ان میں ٹٹولوں کہ شاید ادھر سے کچھ حاصل ہو۔ چنانچہ اطراف ملک سے مشائخ نامدار بلائے گئے اور ہر ایک سے الگ الگ خلوت میں بحث ہوئی لیکن جن کو دیکھا خاکستری جامہ کے اندر خاکسار تھا۔ مگر خوشامد اور خود بھی دو چار بیگھہ مٹی کا سائل ہی پایا گیا۔ افسوس کہ میری یہ آرزو مندی کی بات کا کہ:

"کوئی بات یا فقیرانہ کرامات یا راہ خدا کا راستہ ان سے ملے۔ انھیں دیکھا تو خود ان سے مانگنے آتے تھے۔ معجزہ کہاں، کرامات کجا؟ باقی رہے اخلاق، توکل، خوف الٰہی، دردمندی، سخاوت، ہمت، ظاہری باتیں۔ اس سے بھی پاک وصاف پایا تو آخر کار انجام یہ پایا کہ:

"چرکمائی خدا جانے کہاں کہاں دوڑ گئی؟"

غرض جہانگیر نے کسی بھی ملا وغیرہ نے اپنی آرزو کے مطابق وہ علم، معرفت، طریقت اور شریعت کا علم پایا جو بھی ان کے پاس آیا اس نے کچھ نہ کچھ طلب ہی کیا۔ اس میں قناعت اور توکل کا شائبہ تک بھی نظر نہ آیا۔ جہانگیر ذاتی طور پر ان سے مطمئن نہ ہوا۔ بہر حال اکبر کا اپنی سلطنت کو وسیع اور مضبوط کرنے کا تاریخی طریقہ لوگوں کے حسب حال تھا اگرچہ مذہب کی اس میں پیروی ہوتی تھی یا کہ نہیں۔ اکبر کو بطور مسلمان کے یہ عمل کرنا چاہیے یا کہ نہیں یہ ایک الگ سوال ہے جس کا جواب کسی اور موقع پر ضبط تحریر میں لایا جائے گا۔

راجہ مان سنگھ کی تلوار زنی

۹۷۹ھ کو اکبر نے گجرات پر فوج کشی کی تو راجہ مان سنگھ بھی ان کے ہمرکاب تھا۔ راجہ مان سنگھ جوانی کے عالم میں تھا اور بہادری اور جوانمردی کا جوش وطوفان دل میں برپا تھا۔ اس وقت راجپوتی خون کہتا ہوگا کہ:

''چنگیزی ترک جن کے دل فتح یابی نے بڑھائے ہیں۔ اس وقت باگ سے باگ ملائے ہیں۔ ان سے قدم آگے بڑھا رہے ہیں اور انھیں بھی دکھلا دو کہ راجپوتی تلوار کی بات کیا رنگ دکھاتی ہے۔ کیا راؤ میں کیا میدان جنگ میں جدھر وہ اکبر کا اشارہ پاتا تھا فوج کا دستہ لیتا تھا اور اس طرح جا پڑتا تھا جیسے شیر و پلنگ شکار پر جاتے ہیں۔''

تو اسی عرصے میں خان اعظم احمد آباد میں گھر گئے تھے۔ اور چغتائی شہزادے فوج دکن کے ساتھ لے کر اس کے گرد چھا گئے تو اکبر نے آگرہ سے کوچ کیا اور ایک ماہ کا سفر طے کرتے ہوئے سات دن میں جلدی سے احمد آباد پہنچا۔ راجہ بھگوان داس اور کنور مان سنگھ اس مہم میں ان کے ساتھ تھے اور بادشاہ اکبر اس طرح سے جاں نثاری کرتے تھے کہ جس طرح شمع کے گرد پروانے۔

راجہ مان سنگھ شعلہ پور کی مہم مار کر آیا تھا اور جے پور کی سرحد سے گزرا تو اسے معلوم ہوا کہ:

''رانا پرتاپ کوملمیر میں ہے۔''

تو اس نے وکیل بھیج کر پیغام دیا کہ:

''آپ سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔''

تو رانا پرتاپ نے اودے ساگر تک استقبال کے لیے جھیل کے کنارے ضیافت کا انتظام کیا۔ جب وہاں کھانے کا وقت آیا تو رانا پرتاپ خود نہ آیا اور اس کے بیٹے نے آ کر کہا۔

''رانا پرتاپ کے سر میں درد ہے وہ نہ آئیں گے آپ کھانے پر بیٹھیں اور اچھی طرح کھائیں۔''

تو راجہ مان سنگھ نے کہا کہ:

''جو مرض ہے وہ عجب نہیں کہ وہی ہے جو میں سمجھا ہوں۔ مگر یہ موروعلاج مرض ہے اور جب وہی مہمانوں کے آگے تھال نہ رکھیں گے تو کون رکھے گا؟''

تو رانا پرتاپ نے کہلا بھیجا کہ:

''مجھے اس کو بڑا رنج ہے مگر کیا کروں جس شخص نے بہن ترک کے ساتھ بیاہ دی تو اس کے ساتھ کھانا بھی کھایا ہی ہوگا؟''

راجہ مان سنگھ اپنی حماقت پر پچھتایا کہ:

''میں اس جگہ پر کیوں آیا ہوں؟''

راجہ مان سنگھ کے دل پر اس قدر یہ صدمہ ہوا کہ کوئی اس کو بیان نہیں کر سکتا۔ تو وہاں چاول کے چند دانے لے کر ''ان دیوی'' کو چڑھائے وہی اپنے پگڑی میں رکھ لیے اور وہاں سے چلتے ہوئے کہا کہ:

''تیری عزت بچانے کو ہم نے اپنی عزت کھوئی اور بہنیں بیٹیاں ترک کو دیں۔ تمہاری یہی مرضی ہے کہ خوف میں رہیں تو ہمیشہ رہو۔ تجھے پورا اختیار ہے۔ اس لیے کہ اس ملک میں تمہارا گزارا نہ ہوگا۔''

راجہ مان سنگھ گھوڑے پر سوار ہوا اور رانا پرتاپ کو خطاب کر کے کہا کہ: (اس وقت آ گئے تھے)

''رانا جی! اگر تمہاری شیخی نہ جھاڑ سروں تو میرا نام مان نہیں۔''

تو رانا پرتاپ نے جواب دیا کہ:

''ہم سے ہمیشہ ملتے رہنا۔''

کسی بے لحاظ نے برابر سے کہا کہ:

''جی اپنے پھوپھا (اکبر) کو بھی ساتھ لانا۔''

جس زمین پر یہ ضیافت ہوئی تھی اس کو کھدوایا۔ گنگا جل سے دھلوا کر پاک کیا۔ سردار نہائے۔ پوشاک بدلی۔

گویا کہ سب اس کے آنے سے ناپاک ہو گئے تھے۔ اس بات کی ہر خبر اکبر کو بھی پہنچتی رہی۔ جس کی وجہ سے اس کو بہت غصہ آیا۔ اس کے دل میں یہ مصلحت خیال تھی کہ:

''ایسا معاملہ نہ ہو کیونکہ راجپوت کی ذات غیرت کھا کر بگڑتے جائے اور جس تعصب کی آگ کو میں نے سو سو پانی سے دھیما کیا ہے وہ پھر بھڑک نہ اٹھے۔''

مگر یہ معاملہ رک نہ سکا اور چند روز کے بعد رانا پرتاپ پر اکبر نے فوج کشی کر دی۔ (سلیم جہانگیر) اس فوج کا سپہ سالار مقرر ہوا۔ راجہ مان سنگھ اور مہابت خاں بھی ان کے ہمرکاب ہوئے تاکہ شہزادہ ان کی رہنمائی میں حملہ کرے۔ بادشاہی لشکر رانا پرتاپ کے ملک میں داخل ہوا اور چھوٹے چھوٹے مقابلوں کو سر کرتا ہوا آگے بڑھا تو رانا پرتاپ ایک ایسے مقام کڈھب پر لشکر لے کر کھڑا تھا جسے پہاڑوں کے سلسلوں اور گھاٹیوں کے پیچوں نے خوب مضبوط کر رکھا تھا۔ اس طویل مسافت میں پہاڑ جنگل گھاٹیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہر طرف عمودی پہاڑ کھڑے تھے اور چوڑائی اس قدر کم تھی کہ صرف دو گاڑیاں گزر نہیں سکتی تھیں گویا کہ بڑا ہی بے ڈھب مقام تھا اور پہاڑ کے اوپر اور نیچے راجپوتوں کی افواج ڈھیرے جمائے کھڑی تھیں۔ ٹیلوں کے رو برو اور پہاڑیوں کی چوٹیوں پر ''بھیل'' جو اصلی کیڑے ان پتھروں کے تھے تیر کمان لیے ہر وقت انسانوں کی تاک میں تھے کہ جب بھی کوئی انسان ان کے منہ میں آئے تو بھاری بھاری پتھر حریف پر لڑھکائیں۔

رانا پرتاپ کے ساتھ مقابلہ

درہ کے دہانہ پر رانا میواڑ کے سورما سپاہیوں کو لیے کھڑا تھا۔ غرض کہ یہاں ایک زبردست گھسان کی جنگ ہوئی اور وہاں کئی راجہ اور ٹھاکر جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ گرم میدان میں رانا قرمزی جھنڈا لیے کھڑا تھا جو کہ راجہ مان سنگھ کے انتظار میں تھا کہ وہ نظر آئے تو اس کا معاملہ برابر کر دوں۔ رانا قرمزی کے پیادہ مان تو پورے نہ ہو سکے مگر جہاں سلیم (جہانگیر) ہاتھی پر کھڑا لشکر کو لڑا رہا تھا تو وہ وہاں جا پہنچا اور وہ ایسا بے جگر ہو کر وہاں گیا

کہ سلیم اس کے برچھے کا شکار ہو جاتا تو مگر قدرت مولائی کہ ہاتھی کے ہودہ کے تختے ان کی جان بچانے کا باعث بن گئے۔

رانا پرتاپ کے گھوڑے کا نام ''چیتک'' تھا جو کہ بہت ہی وفادار جانور تھا۔ جس کا یہ ثبوت تاریخ نے دیا ہے کہ:

اس لڑائی کے موقع جو تاریخ پھوڑ میں شامل ہیں۔ ان میں گھوڑے کا ایک پاؤں سلیم (جہانگیر) کے ہاتھی پر رکھا ہوا ہے اور سوار اپنے حریف پر نیزہ مارتا ہے۔ اس وقت فیل بان کے پاس بچاؤ کا کوئی سامان نہ تھا۔ وہ مارا گیا اور بہت ہاتھ بے مہاوت رک نہ سکا اور وہ اس قدر تیزی سے بھاگا کہ سلیم (جہانگیر) کی جان بچ گئی۔ وہاں اس قدر گھمسان کی لڑائی ہوئی کہ:

مغل نمک حلال اپنے شہزادے کے بچانے میں اور پھواڑ کے سورما اپنے ینا پتی کی مدد میں ایسے جان توڑ کر لڑے کہ ہلدی گھاٹ کے پتھر شنگرف ہو گئے، پرتاپ نے سات زخم کھائے۔ دشمن اس پہ باز اور جروں کی طرح گرتے تھے مگر وہ ہمت نہ ہارتا تھا۔ اور برابر بہادری سے اپنی فوج کے ساتھ شاہی فوج کے ساتھ جنگ کر رہا تھا۔

رانا پرتاپ تین دفعہ شاہی فوج کے درمیان سے نکلا اور عین ممکن تھا کہ اس کا کام ہو جائے۔ جہاں سردار نے دوڑ کر رانا پرتاپ کو وہاں سے نکالا اور لے گیا۔ راجہ کا چتر ایک ہاتھ میں اور جھنڈا دوسرے ہاتھ میں لے کر ایک اچھے مقام کی طرف لے بھاگا۔ اگرچہ خود بھی اپنے جاں نثاروں کے ساتھ مارا گیا تھا۔ مگر انھوں نے رانا پرتاپ کو بچالیا۔ اس وقت سے اس کی اولاد میواڑ کے بادشاہی نشان اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے اور درباروں میں رانا کی داہنی طرف جگہ پاتی ہے۔

راجہ مان سنگھ نے فوج کو خطاب کیا اور انھوں نے نقارہ قلعہ کے دروازے تک بجایا۔ ان کے پاس بے شمار توپیں اور جھلے آگ برسا رہے تھے اور اونٹوں کے رسالے آندھی کی طرح دوڑ رہے تھے تو مقابلے میں فوج کو شکست ہوئی۔ بائیس ہزار راجپوت میں سے صرف آٹھ ہزار بچے تھے۔ اگر رانا پرتاپ کی فوج کو شکست ہو گئی تھی۔ مگر اس وقت جان بچا کر نکل جانا ہی اس کی فتح تھی۔

رانا پرتاپ اپنے چیتک گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگ نکلا تھا۔ اگرچہ اس کے تعاقب میں دو مغلوں نے بھی اپنے گھوڑے دوڑائے مگر وہ قابو نہ آسکا۔ بلکہ اس نے راستے میں دونوں...... کو ختم کر دیا اور وہ اپنے بھائی سے جاملا۔ دونوں بھائی مدت کے بچھڑے بڑے پرتپاک انداز سے ایک دوسرے کے گلے ملے۔ اس جگہ پر ایک افسوس ناک یہ معاملہ پیش آیا کہ رانا پرتاپ کا وفادار گھوڑا ''چیتک'' بیٹھ گیا اور اس کے بعد اس نے دم توڑ دیے رانا پرتاپ کے بھائی ''سکت'' نے اسے گھوڑا دیا۔ جس کا نام ''انگارو'' تھا۔ رانا پرتاپ نے اس مقام پر اپنے وفادار گھوڑے کی یاد میں ایک یادگاری عمارت تعمیر کروائی۔ تو ''سکت'' سے رانا پرتاپ بھائی سے چلتے ہوئے ہنس کر کہا کہ:

''بھائی جی! جب کوئی جان بچا کر بھاگتا ہے تو دل کا کیا حال ہوتا ہے؟''

پھر اس کی خاطر جمع کی۔ حوصلہ ہوا۔ کہ جب موقع پاؤں گا تو پھر آؤں گا۔''

سکت وہاں سے روانہ ہو کر ایک مغل کے گھوڑے پر چڑھا اور وہ سلیم (جہانگیر) شاہی فوج میں آکر شامل ہو گیا تو اس نے لوگوں سے کہا کہ:

''پرتاپ نے اپنے دونوں تعاقب کرنے والوں کو ہلاک کر دیا ہے اور اس کی حمایت میں میرا گھوڑا بھی مارا گیا ہے اور اب

ناچار میں ان میں سے ایک کے گھوڑے پر آیا ہوں۔"

سکٹ کی ان باتوں کا کسی کو بھی یقین نہ آیا تھا۔

آخر کار سلیم (جہانگیر) نے بلا کر کہا کہ:

"سچ سچ کہہ دو تو میں تجھے معاف کروں گا۔"

مگر اس کیس پاہی نے اصل صورت حال بیان کر دی۔ مگر سلیم اپنے عہد پر قائم رہا مگر سلیم نے کہا کہ:

"اب تم بھائی کے پاس جو کہ ٹند رودوا وراس کے پاس ہی رہو۔"

چنانچہ سکٹ اپنے ملک واپس چلا گیا۔

رانا پرتاپ بڑا ہی مغرور اور اکڑنے والا حکمران تھا۔ جب کہ ہندوستان کے تمام راجے اکبر بادشاہ کی اطاعت قبول کر رہے تھے مگر وہ اپنی راجپوتی اکڑ میں ہی رہا اور اس نے اکبر کو کوئی عزت نہ دی۔ جس کی وجہ سے اکبر نے دوبارہ اس پر فوج کشی کی اور اس کی فوج اور ملک کا ستیا ناس کر کے رکھ دیا جو کہ اس کی اکڑ کا ہی صرف نتیجہ تھا۔ رانا پرتاپ کی اس تباہی و بربادی کا حال ذیل کی سطور میں بیان کیا جاتا ہے۔

کنڈہ کی جنگ

۹۸۳ھ میں اکبر اپنے لشکر کے ساتھ اجمیر شریف گیا تھا۔ وہاں اس نے نذر چڑھائی۔ ایک رن درگاہ میں مان سنگھ کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ وہاں دیر تک دعائیں اور التجائیں جاری رہیں۔ تو وہیں بیٹھ کر امراء وزراء کے ساتھ مل کر فوج کشی کا بھی پروگرام طے ہوا۔ مان سنگھ کو خطاب فرزندی کے ساتھ سپہ سالاری عنایت ہوئی اور راجہ مان سنگھ کو پانچ ہزار سوار تھی کہ کچھ خاصہ کے اور کچھ ماتحت امرا تھے۔ اس کے ہمراہ کر دیے اس کی فوج میں بہت سے کہنہ مشق سپاہی اور لڑاکے دلاور شامل کیے گئے تھے۔ اور ان کا رخ رانا پرتاپ کی ریاست کی طرف کر دیا گیا تا کہ اس پر حملہ آور ہوں اور اس کی گستاخی کی سزا اس کو دیں۔ یہ لشکر ایک طوفانی حالت میں اودے پور میں جا داخل ہوا۔ کنڈہ (راجہ مان سنگھ) نے مانڈل گڑھ پر رک کر لشکر کا انتظام کیا اور ہلدی گھاٹی سے نکل کر کنڈہ پر جا پہنچا کیونکہ رانا پرتاپ اس مقام پر مقیم تھا۔ جس سے ان کے مقابلے کا مقصد عیاں تھا۔ جب رانا پرتاپ کو علم ہوا تو وہ اپنے دار الخلافہ سے باہر آیا اور وہ اپنی راجپوت خود کے ساتھ شاہی فوج کے مقابلے کے لیے تیار ہو کر آیا۔ راجہ مان سنگھ کو بھی اپنی جوانی پر بڑا فخر اور غرور تھا۔ وہ بھی کسی کو اپنے برابر نہ سمجھتا تھا۔ وہ خود چند کہنہ مشق امرا کے ساتھ قلب میں قائم ہوا اور کئی پرے باندھ کر لشکر کو سد سکندر بنایا۔ مضبوط دیوار بنائی۔ اور عمدہ عمدہ بہادر چن کر ہر فوج کے لیے کمک تیار کی۔

رانا پرتاپ کے ساتھ تقریباً تین ہزار سوار تھے جو کہ پہاڑوں سے بادلوں کی طرح اٹھے۔ اس کے ساتھ دو قسم کی فوج تھی ان میں سے ایک فوج نے ہراول شاہی سے ٹکر کھائی۔ لڑائی کی جگہ ناہموار تھی ہراول اور کمک غٹ پٹ ہو گئی۔ بھگوڑی قسم کی لڑائی لڑنی پڑی۔ دونوں سرداروں کی افواج نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ دونوں اطراف سے بے شمار آدمی کام آئے جس فوج میں رانا شامل تھا۔ اس نے گھاٹی سے نکلتے ہی قاضی خاں بدخشی کو جا لیا جو کہ دہانہ روک کر کھڑے تھے اور اسے اٹھا کر قلب میں ڈال دیا گیا۔ سیکری وال شیخ زادے تو آنکھتے ہی بھاگے۔ شیخ ابراہیم، شیخ منصور (شیخ ابراہیم

خلعت سلیم کے داماد) ان کے سردار تھے اور بھاگتے ہوئے ایک تیر اس کے چوتڑوں پر لگ گیا تھا۔ قاضی خاں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور آخر کار وہ قلب میں آ گیا۔ تو ایک سردار گھوڑا اڑاتا نقارہ بجاتا آیا اور اس نے کہا کہ:

''بندگان بادشاہی یلغار کر کے آن پہنچا ہے۔ لشکر شاہی کا بہت شور تھا۔''

اس کا بہت اثر ہوا۔ لوگ بھاگتے ہوئے رک گئے اور جو بھاگ رہے تھے وہ رک کر پلٹ پڑے۔ اور انھوں نے دشمن کے ساتھ مقابلہ کیا جس سے دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے۔

راجہ رامساری گوالیاری راؤ کے آگے آگے بھاگا آتا تھا۔ اس نے راجہ مان سنگھ کے راجپوتوں کی جان پر عجیب کارپردازی کی وہ ایسے بھاگے کہ انھوں نے آصف خاں کو بھی بھگوڑا کر دیا جو دائیں طرف سادات بارہ تھے ان میں پناہ لی۔ اگر سادات بارہ ثابت قدمی کا مظاہرہ نہ کرتے اور ہراول کی طرح دم دبا کر بھاگتے تو بہت زیادہ ان کی رسوائی ہوتی تھی۔

رانا نے اس حالت میں ہاتھیوں کو بادشاہی ہاتھیوں کے ساتھ آ ٹکرایا۔ ان میں دو دست دیو زنکر مدمکرم سو گئے یعنی وہ دونوں ہلاک ہو گئے تھے۔ حسین خاں بادشاہی فیل بان مان سنگھ کے آگے بیٹھا تھا۔ وہ اس سے گر پڑا۔ مان سنگھ آپ مہاوت کی جگہ پر بیٹھ گیا اور اس نے اس استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا کہ کوئی اس کا مقابلہ نہ کر سکا۔ جس کی وجہ سے شاہی فوج کا قلب قائم رہا۔ ادھر سے راسا بھاگا تھا۔ اس نے اپنے اور تین بیٹوں کے خون سے داغ بدنامی کو دھو دیا۔ غلیمان نے قلیم کی طرف سے رام پرشاد ہاتھی کو بڑھایا جو کہ بڑا ہی قوی ہیکل اور جنگلی قسم کا ہاتھی تھا۔ وہ بہت سے جوانوں کو ہلاک کرتا ہوا اور صفوں کو چیرتا ہوا آگے نکل گیا۔ کماں خاں فوجدار شاہی نے ادھر سے گجراج ہاتھی کو سامنے کیا جو کہ دیر تک آپس میں لڑتے بھڑتے رہے۔ آخر کار بادشاہی ہاتھی ہار گیا۔ اقبال اکبری نے رام پرشاد کے مہاوت کو قضا کی گولی مار دی۔ وہ گولی کھا کر زمین پر آن گرا اور بادشاہی فیل بان پھرتی سے رانا کے ہاتھی پر آن بیٹھا۔

اور اس نے بے مثال کارنامے سرانجام دیے۔ اتنے میں یک سوار جو مان سنگھ کے اردلی تھے۔ رانا کی فوج پر ٹوٹ پڑے اور اس قدر شدید مقابلہ ہوا کہ مان سنگھ کی سپہ سالاری اس دن کام آ گئی تو ملا کہا کچ ہو کہا کہ:

''ہندو میزند شمشیر اسلام''

ترجمہ: ''ہندو اسلام کی تلوار چلاتا ہے۔''

رانا پرتاپ کے ساتھ راجہ مان سنگھ کا مقابلہ ہوا انھوں نے اوپر تلے کئی وار کیے۔ آخر کار رانا پرتاپ کمزور ہو گیا اور وہ بھاگ نکلا اور اس نے راجہ مان سنگھ سے زخم کھائے۔ اس کی فوج میں ابتری پھیل گئی اور رانا پرتاپ کے سردار بھاگ بھاگ کر اس کی طرف لوٹنے لگے۔ آخر کار رانا پرتاپ کے تمام سردار پہاڑوں میں گھس گئے۔ گرمی کا موسم تھا۔ گرمی کی وجہ سے سب تنگ تھے۔ دونوں فوجیں صبح سے دوپہر تک میدان جنگ میں سخت سورج کی تپش میں لڑتی رہیں۔ پانچ سو آدمی ہلاک ہوئے ۱۲۰ مسلمان اور باقی تمام ہندو جنگ میں کام آئے اور زخمی غازی تین سو ہوئے۔ لوگوں کا عام خیال یہ تھا کہ:

"رانا بھاگنے والا نہیں۔ وہ ادھر ادھر ہی ہوگا اور وہ دوبارہ پلٹ کر حملہ کرے گا۔"

اس لیے اس کا کسی نے تعاقب نہ کیا اور اپنے خیموں میں لوٹ آئے اور زخمیوں کی مرہم پٹی میں مصروف ہو گئے تو دوسرے دن وہاں سے کوچ کیا اور کوکنڈہ میں آ گئے۔ مگر رانا نے چند معتبر جاں نثار گلوں پر تعینات کیے تھے۔ کچھ لوگ مندروں سے بھی نکلے۔ اس طرح ان کی تعداد بیس تک ہو گئی تھی تو انھوں نے خوب ڈٹ کر مقابلہ کر کے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے اور ہندوؤں کی اس رسم کو تازہ کیا جس کے تحت جب کبھی وہ شہر خالی کرتے تھے تو وہ اپنی جانوں کے نذرانے ضرور پیش کرتے تھے جو کہ ان کی ننگ و ناموس کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ مگر رانا کے شبخون کا بھی خیال تھا کیونکہ شہر کے اردگرد پتھروں سے خندقیں بن چکی تھیں۔

راجہ مان سنگھ نے اپنے مقتولین کی فہرست تیار کروانی شروع کیں تو سید محمود خان بارہ نے کہا کہ:

"ہمارا تو نہ کوئی آدمی ضائع ہوا نہ گھوڑا اور خالی رسم نویسی سے کیا حاصل غلہ کی فکر کرو۔"

اس وقت قلت غلہ کی وجہ سے لشکر میں کہرام مچ چکا تھا۔ اس وجہ سے باری باری غلہ کی تلاش میں جانے کا پروگرام بنایا گیا۔ وہ پہاڑوں پر چڑھ کر ذخیرہ آبادی کی تلاش کرتے تھے۔ وہ اناج اکٹھا کرتے اور آدمی باندھ لاتے تھے۔ اور اس طرح انھوں نے جانوروں کے گوشت سے گزارہ کرنا شروع کیا۔ آموں کی وہاں بہتات تھی۔ لشکر کے سپاہیوں نے خوب آم کھا کر مزے اڑائے جس کی وجہ سے وہ بیمار بھی ہو گئے اور لشکر میں گندگی پھیل گئی۔

ادھر بادشاہ بھی فکر مند تھا۔ اس نے ایک سردار کو مراسلہ دے کر روانہ کیا تا کہ لڑائی کا حال معلوم ہو سکے۔ یہاں فتح ہو چکی تھی۔ سردار نے حال معلوم کر کے واپسی کا عازم کیا۔ خدمت میں سب قبول ہوئیں۔ باوجود اس کے چند چغلخوروں نے کہہ دیا کہ:

"فتح کے بعد کوتاہی ہوئی ورنہ رانا پرتاپ گرفتار ہو جاتا تھا۔"

بادشاہ کو بھی اس کا احساس ہوا مگر تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ شیطانی طوفان ہے۔

بنگال کی بغاوت اور راجہ مان سنگھ

۹۸۹ھ میں بنگال میں اکبری امراء نے بغاوت کر دی۔ وہ نمک حرام لوگ تمام نئے اور پرانے ترک اور بعض کابلی افغان تھے۔ انھوں نے سمجھا کہ:

بادشاہ کی مخالفت کے لیے جب تک کوئی بادشاہی روڑی ہمارے ہاتھ میں نہ ہوگی ہم باغی ہی کہلائیں گے۔

انھوں نے مرزا حکیم کو عرضیاں لکھ کر یہ احساس دلایا کہ:

"تم بھی تو ہمایوں بادشاہ کے لخت جگر ہیں اور برابر کا حق رکھتے ہیں اگر آپ ہمت کر کے آئیں تو غلام قدیم (ہم باغی لوگ) آپ کی خاطر جاں نثاری کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

اس کو بھی بابری عہد کی مخالفت تھی۔ اس کا سب سے بڑا مدد گار اور بہی خواہ شاہ منصور کو کرتا تھا۔ جس کا باپ سلیمان بیگ اندجانی اور دادا لقمان

بیگ تھا جو کہ کسی زمانے میں بابر بادشاہ کا منظورِ نظر تھا۔ ان خام طمع لوگوں نے اپنے خیال کو روشن انداز میں بیان کر کے نوجوان شہزادہ کے سامنے پیش کر دیا تو اس نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اس نے بیتاب کارہا کر لیا۔ اس نے ایک سردار کو فوج دے کر آگے روانہ کیا اور وہ پشاور سے بڑھ کر دریائے اٹک آ کر ٹھہرا تو یوسف خاں وہاں کا جاگیردار تھا۔ اس نے بھی ایک سردار کو روانہ کیا مگر اس کے ساتھ فوج نہ تھی۔ وہ بھی کیا کر سکتا تھا۔

اکبری ستارہ چمکا کہ ایک دن وہ اس طرف شکار کے لیے نکلا۔ انھوں نے غنیم کو جنگل میں دیکھ تو ان کا وہاں مقابلہ ہو گیا۔ اور دونوں میں خوب مقابلہ ہوا۔ مگر غنیم مقابلہ نہ کر سکا اور وہ بھاگ نکلا اور وہ پشاور میں آ کر فوت ہو گیا تو اکبر نے یوسف خاں کو بلایا اور مان سنگھ کو فوج کا سپہ سالار بنا کر وہاں روانہ کیا۔ اس وقت اکبر کے بھائی بندوں میں بگاڑ پیدا ہو گیا تھا تو اس پر دونوں طرف کے حامی ہوتے تھے۔ ہر ایک کے خدمت گار تھے۔ تو بعد میں مقابلہ کرنے کے بعد جس کی فتح ہوئی اس طرف سب جا ملتے تھے۔ مگر اکبر کو شاہ ایران طہماسپ کی نصیحت اچھی طرح یاد تھی تو انھوں نے اقتدار سنبھالتے ہی راجپوتوں کو زور دیا اور خاص کر ایسے موقعے پہ ان سے اور ایرانیوں سے اور سادات بارہ سے کام لیتا تھا کیونکہ وہ بھی بخاریوں اور افغانوں سے قیمیں کھانے والے نہ تھے۔ ایرانی جانثاری اور وفاداری کے ساتھ لیاقت کے تیلے تھے۔ اور سادات بارہ کی تو ذات مالک شمشیر ہے۔

تو راجہ مان سنگھ نے سیالکوٹ میں آ کر اپنی جاگیر میں قیام کیا اور اپنی فوج کی حالت کو سدھارنے لگا اور اس نے ایک نوجوان چاک و چوبند سردار فوج دے کر آگے روانہ کیا تا کہ قلعہ اٹک کا بندوبست سنبھالے۔ تو راجہ بھگوان داس نے لاہور کو مضبوط کیا۔ دوسری طرف مرزا حکیم نے جب یہ سنا کہ سردار مردار ہو گیا ہے تو شادمان اپنے کوکہ کو عمدہ سپاہ کے ساتھ روانہ کیا۔ وہ بڑا ہی دلاور نوجوان تھا۔ اس نے فوری طور پہ قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی مان سنگھ بھی چڑھی پہنچ گئے تھے۔

جب ان کو یہ خبر ملی تو ان کے سینوں میں راجپوتی خون کھولنے لگا اور اس نے اٹک آ کر دم لیا مگر شادمان خوابِ غفلت میں پڑا تھا وہ نقارہ کی آواز سن کر خوابِ خرگوش سے جاگا اور محاصرہ اٹھا کر بڑے حوصلے کے ساتھ سامنے آیا۔ کنور مان سنگھ اور شادمان نے خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ سورج سنگھ مان سنگھ کے بھائی نے ایسے مردانہ وار حملے کیے کہ اس کے ہاتھ شادمان خاں زخم کھا کر خاک ہلاکت پہ آ گرا۔

مرزا حکیم نے جب یہ سنا کہ:

شادمان دنیا سے رخصت ہو گیا ہے کہ وہ بڑا فکرمند ہوا اور خود لشکر لے کر روانہ ہوا۔ مگر اکبر کے برابر پیغامات آتے رہے کہ ہمارے آنے تک حملہ نہ کرنا...... ان کو یہ خطرہ تھا کہ کہیں یہ لڑکا بہادروں کے سامنے نہ ٹھہر سکے گا اور شکست مقدر ہو گی۔ اور دل برداشتہ ہو کر ترکستان نہ چلا جائے عبداللہ خاں اسے غنیمت سمجھے گا۔ وہ ادھر سے فوج لے کر آیا تو پھر معاملہ اور ہو جائے گا۔ غرض یہ پیچھے ہٹتے رہے اور وہ آگے بڑھتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ لاہور پہنچ گئے اور وہ راوی کے کنارے باغ مہدی قاسم خاں میں آ ٹھہرا تو راجہ بھگوان داس، کنور مان سنگھ، سید حامد بارہ اور چند دیگر امرا اور بار شہر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ گئے۔ وہ شہر میں بیٹھے مرزا حکیم کے حملوں کا زور سے دندان شکن انداز میں دیتے رہے۔ لاہور کے ملانے بلانا چاہتے تھے۔ مگر اس کا بندوبست بڑی مشکل سے کیا گیا تو جب اکبر نے یہ خبر سنی تو وہ خود روانہ ہو پڑا۔

مرزا حکیم کا یہ خیال تھا کہ:

بادشاہ بنگالہ کی مہم میں مصروف ہے اور ملک خالی پڑا ہوا ہے تو اس نے بات مذکور میں بیس دن گزارے اور جب اس کو یہ علم ہوا کہ:

''ادھر نمک حراموں کے کام بگڑتے جا رہے ہیں اور اکبر سرہند میں آن پہنچا ہے تو دماغ محاصرہ ترک کر دیا اور باغ مہدی قاسم سے ایک کوس اوپر جا کر ٹھہرا اور جلال پور علاقہ گجرات میں دریائے چناب پر قیام کیا۔ بھیرہ کے قریب جہلم اترا اور اس جنگ میں لوٹ مچا دی اور وہ وہاں سے بھی بھاگا تو مقام کھیپ کے پاس دریائے سندھ اتر کر کابل کو بھاگ گیا اس کے سرہند سے اکبر کو پیغام آیا کہ:

''اس کا تعاقب نہ کرنا۔''

کنور مان سنگھ اکبر کے حکم کی تفصیل میں پشاور میں تھا۔ تو اکبر نے لشکر شاہانہ ترتیب دے کر شاہزادہ مراد کو روانہ کیا اور وہ کابل تک پہنچے اور مرزا کا پورا پورا بندوبست کرے۔ اس کے ساتھ کینہ مشق اور پرانے کردار ساتھ تھے مگر ان میں وہی ہراول دستہ کا افسر قرار پایا تھا۔ یہ لشکر روانہ ہوا تو خود بادشاہ اقبال کا لشکر لے کر ان کی پشت پناہ ہوا۔ جب اکبر اٹک تک آ پہنچا تو امرا کو مدت تک ہندوستان میں رہنے سے وہ ملک ایک نئی دنیا نظیر آنے لگی۔ جہاں چاروں طرف پہاڑ پر قدم پہ خطرات، منزلیں کٹھن اور خونی برف کے خطرات سامنے نظر آنے لگے۔ لشکر کے اکثر افراد ہندو تھے۔ جو اٹک کو یاد کرنا بھی پسند نہ کرتے تھے اور اب سب کی یہ رائے تھی کہ صلح کر لی جائے تو انھوں نے اکبر بادشاہ کو ہر ممکن انداز سے اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے رضامند کرنے لگے مگر اس کی یہ رائے تھی کہ:

''مرزا حکیم نے کئی دفعہ تنگ کیا ہے۔ تو اگر اس کو اب بھی چھوڑ دیا گیا تو کل پھر وہ بار وقت دانت کاٹے گا۔''

اکبر نے اس سلسلے میں ابوالفضل کو جلسہ مشاورت بٹھانے کا حکم دیا۔ تو شیخ نے ہر ایک کا بیان اور اس کے دلائل لے کر عرض کیا۔ لیکن بادشاہ کی رائے ان کا کچھ اثر نہ ہوا۔ مان سنگھ جو شہزادہ کو لیے آگے بڑھا اسے اور آگے بڑھا دیا گیا اور خود بھی لشکر لے کر روانہ ہو گیا۔ برسات کا موسم تھا۔ بارشیں خوب ہو رہی تھیں۔ تو برسات کی وجہ سے اٹک کا پل نہ باندھا جا سکا۔ خود بادشاہ اور اس کا لشکر کشتیوں میں سوار ہو کر اتر گئے اور فوج کا بھاری سامان اٹک کے کنارے پر پڑے رہ گیا۔ یہ بھی احساس تھا کہ کہیں فوج شاہی کے جلو پہنچنے سے صلاح و صلح کا موقع بھی شدہ ہے اور نوجوان بھائی کی جانیں بھی ہاتھ سے رفتہ جائے۔ چنانچہ دریائے اٹک سے اتر کر مرزا حکیم کے نام ایک فرمان جاری کیا جس کا خلاصہ مضمون یہ تھا کہ:

''ہندوستان کے تمام سلاطین نے آ کر اطاعت قبول کر لی ہے اور وہ اپنی اپنی جگہ پہ حکومت کر رہے ہیں اور تم اس سعادت سے محروم کیوں ہو۔ بزرگان سلف نے چھوٹے کو بمنزلہ فرزند شمار کیا ہے لہٰذا تم عقل سے کام لو اور خواب غفلت سے بیدار ہو کر ملاقات سے خوش کرو اور دیدار سے محروم نہ رکھو۔''

مرزا حکیم نے امتیاز بال سام اور بذات نام عفو تقصیر کے مضمون سے دیا جو کہ بے بنیاد اور بے قاعدہ تھا مگر اکبر نے ایک امیر کو اس کے پیغامبر کے ساتھ کہا اور کہلا بھیجا کہ:

''تمہارا عفو تقصیر اس پر منحصر ہے کہ جو کچھ ہوا ہے اس پر ندامت کا اظہار کرو اور آئندہ کے لیے عہد کو پکا کرو اور جس ہمشیرہ کو خواجہ حسن سے منسوب کیا ہے اسے ادھر روانہ کر دو۔''

مرزا حکیم نے کہا کہ:

"سب صادق دل سے منظور ہے مگر ہمشیرہ کے بھیجنے پر خواجہ حسن راضی نہیں ہوگا اور وہ بدخشاں نے کیا ہے۔ میں بہر حال اپنے کیے پر پشیمان ہوں۔"

کردہ ام توبہ و از کردہ پشیمان شدہ ام

کافرم باز نہ گوئی کہ مسلمان شدہ ام

ترجمہ: میں نے اب توبہ کر لی ہے اور اپنے کیے پر شرمندہ ہوں۔ اب دوبارہ منکر نہیں ہوں گا کیونکہ فرمانبردار ہو گیا ہوں۔

اکبر بادشاہ نے مرزا حکیم کے اس ندامت آمیز بیان پر ابوالفضل کو جلسہ مشاورت کا حکم دیا اور اس کو جلسے کا سیکرٹری مقرر کیا گیا سب نے متفقہ طور پر یہ رائے دی کہ:

"جب مرزا اپنے کیے پر ندامت کا اظہار کر رہا ہے اور عفو تقصیر بادشاہ کے حرم کا آئین ہے۔ جرم بخشی کریں۔ ملک بخشی کریں۔ اور یہیں سے واپس چلیں۔"

پنجاب کا ملک ہے۔ برسات کا موسم ہے دریا بھی چڑھا ہوا ہے تو واپس لوٹنا آگے بڑھنے سے زیادہ مشکل ہے کیونکہ شاہی فوج کے ساتھ سامان بہت زیادہ ہے۔ قاعدہ کو چھوڑ کر لوٹنا کسی بھی حالت میں مناسب نہیں ہوگا۔ مگر امرائے دولت ابوالفضل کی اس تقریر سے خفا ہو گئے ان میں بہت زیادہ طویل بحث ہوئی مگر آخر کار شیخ ابوالفضل نے کہا کہ:

"بہت خوب ہر شخص اپنی رائے حضور میں عرض کر کے دو کترین سے جب تک نہ پوچھیں گے نہ بولوں گا تو سب اٹھ کھڑے ہوئے۔"

بادشاہ نے پوچھا کہ:

"شیخ ابوالفضل کہاں ہے اور اس کی رائے کیا ہے؟"

تو ایک شخص نے جواب دیا کہ:

"شیخ ابوالفضل بیمار ہے مگر اس کی رائے ہمارے ساتھ ہی ہے۔"

بادشاہ پریشان ہوا اور اس نے کہا کہ:

"ہمارے سامنے تو وہ رائے تھی جلسہ میں ان کے ساتھ ہو گیا۔"

شیخ ابوالفضل دوسرے دن اکبر کے سامنے حاضر ہوا تو اس نے دیکھا کہ بادشاہ کے تیور بدلے ہوئے ہیں تو ابوالفضل سمجھ گیا کہ دغاباز دوں نے مکاری چلائی ہوگی۔ جان سے بیزار ہو گیا آخر کار اس نے تحقیق کی تو دل کو قرار آیا۔

تو بادشاہ نے غصے میں آکر کہا کہ:

"کابل کی سردی اور سفر کی تکلیف لوگوں کو خوفزدہ کرتی ہے۔ وہ آرام طلب ہو چکے ہیں۔ مصلحت کا خیال نہیں کرتے۔ اچھا

امرا کہیں رہیں ہم اہلِ صدمت کے ساتھ جریدہ یلغار کر کے جائیں گے۔"

اس کو کوئی بھی برداشت نہ کر سکتا تھا کہ اکبر جائے اور باقی کوئی رہ جائے۔ اب سب نے فوری طور پر تیاری کر لی اور روانہ ہوئے۔ اس میں بڑا لحاظ یہی تھا کہ:

"پیغام سلام میں مرزا راہ برآ جاتے اب نہ ہو کہ مایوس ہو کر گھبرائے اور اچانک ترکستان کو چلا جائے۔"

تو اکبر نے نظام الدین بخشی کو بھیجا کہ:

"یلغار کر کے جلال آباد جا کر لشکر شاہزادہ میں بیٹھ کر امرائے مشورت کر کے اصل صورت حال بتائے۔"

نظام الدین بخشی گئے اور بہت جلد واپس آ گئے اور وہ یہ پیغام لائے کہ:

"اگرچہ مرزا زمان سے کہتے ہیں کہ ہم بہت ہیں بہت ہیں۔ مگر ان کی اصل حالت یہی کہتی ہے کہ فتح حضرت کے قدموں میں ہے۔"

انھوں نے پشاور میں ڈیرے ڈال دیے اور مسلم کو راجہ بھگوان داس کی حفاظت میں لشکر کے ساتھ چھوڑ دیا اور آگے روانہ ہو پڑے۔ مگر مرزا حکیم کو بھی کئی فتنہ پرور لوگ مشورے دے رہے تھے جو کہ زیادہ تر ان کے اہم مشورے یہ تھے:

i- اکبر ادھر نہیں آئے گا۔

ii- اگر وہ ادھر آ بھی نکلا تو وہ اس قدر پیچھا نہ کرے گا۔

iii- اس نے فقیر ہو کر ترکستان جانے کا بھی خیال کیا۔

iv- ایک یہ بھی مشورہ دیا گیا کہ بنگش کے راستے سے جا کر ہندوستان میں فساد برپا کرے۔

v- افغانستان کے پہاڑوں میں جا کر ماحول کے مطابق لوٹ مار کرتا پھرے۔

مگر مرزا حکیم نے شہر کی چابیاں بزرگانِ شہر کے حوالے کر دیں۔

اور اپنے عیال کو بدخشاں روانہ کر دیا اور خود دولت و مال اور ضروری سامان لے کر باہر نکل گیا۔

ہر حال عالی ہمت فسادیوں نے اکبر کے ساتھ دوبارہ معرکہ کرنے کا مشورہ دیا کیونکہ اگر میدان ہاتھ آ گیا تو بہتر ورنہ بھاگنے اور جان بچانے کے راستے تو ہر وقت کھلے ہیں۔ آخر کار مرزا حکیم خود بھی نوجوان تھا۔ اس کی رگوں میں خون نے جوش مارنا شروع کیا اور اس نے نعرہ لگایا کہ:

"لے مرے یا مارے اپنا ملک کسی کو نہ دوں گا۔"

اس نے سرداروں کو روانہ کیا کہ حشری لشکر سمیٹتے چلے جاؤ اور جہاں موقع ملے لشکر بادشاہی پر بھی اپنے ہاتھ صاف کرتے جاؤ۔ اکبر بادشاہی آگے روانہ تھی اور مرزا حکیم نے بھی پیچھے سے ہمت کے نشان پر پھر پرا چڑھایا۔ بادشاہی لشکر رواں دواں تھا مگر مرزا حکیم کے آدمیوں نے پہاڑوں سے نکل کر شاہی لشکر پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا مگر صرف رہزنوں کی طرح۔ البتہ فریدوں خاں نے راجہ مان سنگھ کے لشکر کا پیچھا مارا اور خزانہ شاہی کو لوٹ کر لے گئے اور سرداروں کو پکڑ کر لے گئے۔ ڈاک چوکی آفیسر دورہ کے طور پر بادشاہ کے لشکر سے مان سنگھ کے لشکر تک آتا جاتا تھا وہ اس

وقت پہنچی تھی کہ بیرلٹ رہی تھی وہ یہ حالت دیکھ کر فوری طور پر واپس پلٹا۔

اس وقت کنور نوجوان شاہزادہ مراد کو لیے خود کابل جا پہنچا تھا اور بادشاہ جلال آباد سے بڑھ کر جنوب کی طرف سرخاب پر تھے وہ مرزا کی کی بدحالی اور اپنے لشکر کی خوش اقبال کی خبریں برابر آ رہی تھیں کہ اچانک خبروں کا سلسلہ بند ہو گیا تو حاجی محمد احدی افسر ڈاک نے آ کر عرض کیا کہ:

''فوج بادشاہ کو شکست ہوئی اور افغانوں نے راستہ بند کر دیا ہے۔''

یہ سن کر اکبر کو بڑا فکر لاحق ہوا۔ اس کے بعد ڈاک چوکی کے افسر نے نہایت اضطرار کے ساتھ آ کر خبر دی لیکن فقط اس قدر کہ لڑائی ہوئی اور لشکر بادشاہی نے شکست کھائی۔ تو اکبر نے فوری طور پر مشاورت کے لیے بلا لیا۔

اور یہ موضوع زیر بحث آئے کہ:

i- ''خبر کیوں بند ہے؟''

''اگر شکست ہوئی تو اپنا لشکر کثیر تھا اور فقط پندرہ کوس کا فاصلہ اب تک سینکڑوں لوٹے مارے آ جاتے ایک آدمی کا آنا اور پھر خبر کا بند ہو جانا چہ معنی دارد؟ یہ خبر غلط ہے۔''

ii- دوسرا زیر بحث موضوع یہ آیا کہ:

''اب کیا کرنا چاہیے؟''

تو ہر ایک نے اپنے ذہن اقبال کے مطابق رائے دی تو ان میں سے بعض نے کہا کہ:

''الٹے پاؤں پھرنا چاہیے جو لشکر شاہی پیچھے آتا ہے اسے ساتھ لے کر پورا سامان لے آئیں، اور فرارواقعی تدارک کریں۔''

مگر اس راستے پر یہ اعتراض کیا گیا کہ:

اگر بادشاہ نے ایک قدم پیچھے ہٹایا تو لاہور تک ٹھہرنے کی جگہ نہ ملے گی اور ہوا بالکل بگڑ جائے گی اور مرزا کے حوصلے بلند ہو جائیں گے اور بادشاہی لشکر ہمت ہار بیٹھے گا اور افغانوں کے کتے بلیاں تمہارے لشکر کو پھاڑ کھائیں گے۔ ملک افغانی ہے ہماری طاقت بکھر جائے گی۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی ہماری طاقت کے تین ٹکڑے ہو گئے۔

i- ایک فوج اٹک کے کنارے پڑی ہے۔

ii- دوسری پشاور میں ہے۔

iii- تیسری خورد کابل میں پہنچ گئی ہے۔

تین جگہ پر لڑائی کرنی پڑے گی۔

iii- مگر ایک رائے یہ بھی آئی تھی کہ۔

اسی جگہ پر ٹھہرنا چاہیے اور جو لشکر پیچھے آ رہا ہے اس کا انتظار کیا جائے۔ مگر اس پر بھی یہ اعتراض کیا گیا کہ:

''اس وقت توقف بھی ہٹنے سے کم نہیں۔ اگر بادشاہ چند سرداروں کے ساتھ ان کے درمیان گھر گیا تو بھی بڑی مشکل ہو گی۔''

ابوالفضل وغیرہ مردم شناس تھے انھوں نے کہا کہ:

"توکل بخدا بڑھے چلو اگرچہ رکاب میں جاں نثار کم ہیں مگر وزن میں زیادہ ہیں کیونکہ جنگ آزمودہ جانباز ہیں اور وہ خلوص اور صدق دل سے وفادار اور جاں نثار ہیں اگر مرزا حکیم نے لشکر کو روکا بھی ہو گا تو وہ دمامہ دولت کا آواز سنتے ہی کھسک کر ہٹ جائے گا۔"

سب کا اس رائے کے ساتھ اتفاق ہوا اور تمام آگے کی طرف روانہ ہوئے۔

شمر کے بند ہونے کی یہ وجہ بتائی کہ

مرزا کا ماحول فریدوں فساد کا فتنہ لیے پہاڑ کے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا۔ اس نے اپنے بازو میں اتنی طاقت نہ دیکھی تھی۔ کہ دانی مشیروں کے ساتھ سینہ بہ سینہ مقابلہ کرے۔ اس کے فوج کے پیچھے سے آ کر حملہ آور ہوا۔ ان کی کا طاقت تھی وہ بھاگنے لگے۔ جنگلی دلاور وٹ کر حملہ آور ہوئے۔ افغان لوٹ کے لیے بھاگنے کو فتح پر بہتر تصور کرتے تھے وہ پہاڑوں میں رک گئے۔ بادشاہ نے کئی لاکھ کا خزانہ بھیجا تھا جو کہ قلیچ خاں کی تحویل میں تھا۔ اور وہ بھی پیچھے آنے والی فوج میں تھا۔ جس کو حریف لوٹ کر لے گئے تھے۔ اس عالم میں افسر ڈاک چوکی جا پہنچا بھیڑ کو بھاگتا دیکھ کر پلٹا اور بادشاہ کو خبر پہنچائی۔ بادشاہ اس وقت سرخاب اور جگر لک کے درمیان میں تھا۔ جبکہ اس کو فتح کی خوشخبری ملی تو بادشاہ نے وہیں گھوڑے سے اتر کر سجدہ کیا اور دیر تک شکر الٰہی ادا کرتا رہا۔

اب دوبارہ میدان جنگ گرم ہوا۔ مرزا حکیم دن کی جنگ سے گھبراتا تھا وہ صرف شبخون مارنا چاہتا تھا۔ مگر راجہ مان سنگھ اس ارمان میں تیار بیٹھا تھا کہ حریف مرزا حکیم ہمارے سامنے آئے۔ مگر مرزا سامنے پہاڑ پر تھا۔ شب رات کی رات کو بہت زیادہ شورش ہوئی۔ مگر جب دن نکلا تو مرزا ایک گھاٹی سے نکل کر آیا اور لڑائی کا میدان گرم ہوا۔ دونوں فوجوں میں بڑا کشت وخون ہوا۔ مرزا نے بھی خوب جان توڑ کر مقابلہ کیا۔ وہ بھی شکست تسلیم کرنے سے جان دینے کو بہتر سمجھتا تھا۔ مان سنگھ نے اس قدر ہمت اور زور سے لڑائی کی کہ مرزا حکیم میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا۔

دوسرے دن صبح کے وقت تھا کہ فریدوں خاں مرزا کا ماموں فوج لے کر آ گیا۔ مان سنگھ کی فوج ہی آ کر تھی۔ تو دونوں کی تلواریں ٹکرانے لگیں۔ میدان جنگ کی زمین پہاڑی تھی اور ناہموار بھی۔ مان سنگھ کو پہاڑی سے کھڑا لڑائی کے بارے میں جوانوں کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اور جنگ کا نظارہ بھی کر رہا تھا۔ تو اچانک دشمن نے زور کا حملہ کیا تو ہراول کی فوج سینہ سپر ہو کر مقابلے پر آئی۔

مگر لڑائی دونوں فوجوں میں دست وگریبان تھی لڑائی کی حالت دیکھ کر افغانوں کے بڑھتے دل بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر میں قدم اکھڑ گئے۔

نشانچی نے نشان پھینکا اور سب میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مرزا کا اپنا خیال تھا۔

اگر فوج نے اپنی جان عزیز سمجھی تو میں اپنی جان قربان کر دوں گا۔ مگر چند جاں نثاروں سے آ کر اگر مرزا نے جھنجھلا کر انھیں دور ہٹا دیا اور دوبارہ حملہ پر تیار ہو گیا۔ محمد علی اسپ باگ پکڑ کر گھوڑے سے لپٹ گیا اور کہا کہ:

"پہلے مجھے مار، پھر اختیار ہے کہ جس کو بھی مار دو۔ مگر مرزا بھی بھاگ گیا۔"

اس میدان میں راجپوت سورماؤں نے خوب کارنامے دکھائے بھگوڑوں کا تعاقب کیا۔ ان کا خیال تھا کہ کہیں مرزا حکیم کسی ٹیلے کے پیچھے سے چکر مار کر فوج کا پیچھا نہ مار دے۔ بعض گھوڑے سواروں نے ایک پہاڑ کے ٹیلے پر جا کر مرزا حکیم کو جا لیا تو اس نے جان کو بچا لینا ہی فتح عظیم سمجھا۔

سپہ سالار فتح کے دمامے بجاتا کابل میں داخل ہوا اور اکبر بادشاہ بھی اس کے پیچھے ہی تھا اور اس دن انھوں نے خاک پر ڈیرہ جمایا کہ راجہ مان سنگھ سرداروں کے ساتھ وہاں آ پہنچے اور سرخروئی کے ساتھ فتح کی مبارک باد ادا کی۔ بادشاہ نے کابل میں پہنچ کر ملک پھر مرزا حکیم کے حوالے کر دیا اور پشاور اور سرحدی ملک کا انتظام اور اختیارات کنور مان سنگھ کے سپرد کر دیے اور بخارا ایک پر قصہ تعمیر کیا۔

راجہ مان سنگھ کی ہمشیرہ کی شادی

۹۹۳ھ میں یہ مشاورت طے ہوئی کہ خاندان کچھواہہ کے ساتھ ولی عہد سلطنت کا تعلق بڑھایا جائے تو اسی سلسلے میں راجہ مان سنگھ کی بہن سے شادی ٹھہری اس شادی کی دھوم دھام اور آرائش کی تفصیل تو بہت طویل ہے۔

اس وقت سلیم کی عمر ۱۶ برس کی تھی اور بادشاہ اپنے تمام امراء کے ساتھ شادی پر گئے۔ مجلس عقد میں قاضی، مفتی اور شرفائے اسلام حاضر ہوئے۔ نکاح خوانی ہوئی اور دلہن کا دو کروڑ ٹنکے کا مہر باندھا گیا۔ غرضیکہ تمام ہندووانہ رسوم ادا کی گئیں۔ لڑکی کے باپ بھگوان داس نے بھی کئی طویلے گھوڑے، سو ہاتھی، حبشی، ہند غلام ساتھ دیے۔ دلہن کے لباس کے رنگارنگ تیار ہوئے تھے۔ امراء کو ہر ایک کے حسب حال خلعت اور گھوڑے عراقی، ترکی، عربی، سنہری، سرکیلی زین اور ساز و یراق سے آراستہ دیے۔

بڑی دھوم دھام سے شہزادے کی شادی رچائی گئی تھی جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

۹۹۵ھ کو راجہ مان سنگھ کی بہن کے ہاں اللہ تعالیٰ نے لڑکا عطا فرمایا۔ جس کا نام خسرو رکھا گیا۔ خسرو لاہور شہر میں پیدا ہوا تھا اور یہیں اس کی چھٹی کی شادیاں اور مبارک بادیاں ہوئی تھیں۔ وہی بچہ جوان ہو کر باپ سے باغی ہوا اور اسی لاہور میں گرفتار ہو کر آیا اور قید ہوا تو وہ چنگیزی کے بموجب تلوار گلے میں لٹکتی ہے۔ سر جھکائے تھر تھر کانپتا تھا اور وہ دربار میں باپ کے سامنے کھڑا ہے۔

اکبر کی حسن تدبیر کے ساتھ راجہ مان سنگھ کی حسن لیاقت کا ذکر بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس کی نوجوان عمر اور کابل جس ملک، جہاں سر شور ملانوں اور وحشی مسلمانوں کی خدائی اور راجہ مان سنگھ ان پر حکمرانی کرے گا۔ اس نے نہایت کامیابی اور زور و شور سے حکومت کی۔ اس کے ماتحت راجپوتوں کے علاوہ ترک، افغان اور ہندوستانی سردار بھی تھے جو کہ ہر وقت اس کے حکم کے منتظر رہتے تھے اور وہ برفانی پہاڑوں پر ہر وقت گھوڑوں کی طرح دوڑتے اور بھاگتے رہتے تھے اور جہاں کہیں وہ کوئی معاملہ دیکھتے تھے وہاں وہ فوری طور پر اصلاح کرتے تھے۔ غرضیکہ راجہ مان سنگھ کی فرمانروائی بڑی ہی حسن تدبیر کے ساتھ تھی۔

راجہ مان سنگھ کو خلعت و انعام

بادشاہ اکبر کشمیر سے ہو کر کابل کو چلے تھے کہ راستے میں راجہ بھگوان داس کے فوت ہونے کی خبر ملی تو اکبر بادشاہ نے بہت افسوس کیا اور راجہ

مان سنگھ کو فرمان:

''راجگی کا خطاب، خلعت خاصہ، اسپ بازین زریں اور پنج ہزاری منصب سے بلند کیا۔''

بہار کے بندوبست سے راجہ مان سنگھ کی خاطر جمع ہوئی یعنی اس کو اطمینان ہوا مگر اکبری سپہ سالار سے ایک بیٹھا جاتا تھا۔ اس نے ۹۹۷ھ میں اڑیسہ کی طرف گھوڑے دوڑا دیے اور یہ ملک مذکور سرحد بنگالہ کے پرے واقع تھا۔ اول وہاں کا راجہ پرتاپ دیو تھا۔ نرسنگھ دیو جو کہ اس کا ناخلف بیٹا تھا۔ اس ناخلف بیٹے نے باپ کو زہر دے کر مار ڈالا اور خود بھی جلد ہی مارا گیا۔ سلیمان کررانی دانش و دین کا پتلا اس وقت بنگالہ میں فرماں روائی کرتا تھا۔

اس نے ملک مذکور کو مفت میں قبضے میں لے لیا اور چند روز کے بعد زمانہ نے اس کا ورق بھی الٹ دیا۔ اڑیسہ قتلو خاں وغیرہ افغانوں کے ہاتھ میں رہا۔ اس وقت مان سنگھ نے نشان فتح پھر بڑا چڑھایا۔ برسات کا موسم تھا۔ بارشیں زوروں پر تھیں۔ ادھر سے قتلو بھی آ گیا، اور اس نے ۲۵ کوس کے فاصلے پر ڈیرے ڈال کر میدان جنگ مانگا تو مان سنگھ کے بڑے بیٹے کو مقابلے پر بھیجا گیا۔ اور وہ اپنے باپ کا رشید فرزند تھا۔ مگر اس میں ابھی نوجوانی کا خون تازہ تھا۔ وہ بہتر طریقے سے انتظام نہ کر سکا اور فتح کی بجائے ان کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا مگر سپہ سالار نے خود آگے بڑھ کر شکست کو فتح میں بدلا۔ جس کے لیے اس کو سرداروں کی داد جوئی کرنی پڑی۔ اور فوج کو پھر سمیٹ کر سامنے آیا۔

اس وقت ان کے غیبی مدد یہ ہوئی کہ اس وقت قتلو خاں مر گیا اور افغانوں میں پھوٹ پڑ گئی اور اکثر سرداران ٹوٹ کر ان کے ساتھ آ ملے یعنی شاہی فوج کے ساتھ آ کر مل گئے اور باقی سرداروں نے صلح کر لی۔ وہاں اکبری خطبہ پڑھا گیا خراج و تحائف سالانہ پیشکش کیا کریں گے۔ جب حکم ہوگا ادائے خدمت کو حاضر ہوں گے۔ سپہ سالار نے بھی اس مصلحت جانی۔ ۱۵۰ ہاتھی اور تحائف گراں مایہ لے کر ارسال دربار ہوئے۔

راجہ مان سنگھ کی مشرقی بنگال میں کوچ

جب تک عیسیٰ (قتلو وکیل) زندہ رہا تو عہد و پیمان کا سلسلہ بھی مناسب رہا مگر چند سالوں کے بعد چند نوجوان افغانوں کی ہمت نے زور پکڑا تو انھوں نے اول جگن ناتھ کا علاقہ قبضے میں لے لیا۔ اس کے بعد انھوں نے بادشاہی ملک پر بھی قبضہ کرنے کے ارادے بنا لیے۔ ادھر راجہ مان سنگھ بھی تاک میں بیٹھا تھا اور وہ اس انتظار میں تھا کہ کوئی ..... شکایت کر کے حملہ کرنے کا جواز پیدا کرے (کوئی بہانہ ہاتھ آئے) جب اس نے ان نوجوان افغانوں کے حالات دیکھے تو وہ لشکر جرار لے کر خود نکلا۔ وہ خود دریا کے راستے نکلا اور اپنے سرداروں کو جھارکھنڈ کے راستے سے بڑھایا۔ انھوں نے دشمن کے علاقے میں ہو کر فتح و فیروزی کے نشان لہرانے شروع کر دیے۔ افغان نے صلح کرنے کی کوشش شروع کر دیں۔ مگر راجہ مان سنگھ صلح کے حق میں نہ تھے۔ راجہ مان سنگھ نے ان کو لڑائی کی دعوت دی۔ تو ناچار انھوں نے بھی لڑائی کے لیے تیاری شروع کی۔ انتہائی سے فوجوں کو جمع کیا ان کے ہمسایہ راجاؤں نے بھی ان کی رفاقت کی اور یہ شاہانہ لڑائی شروع ہوگئی۔ دونوں طرفوں سے بہادروں نے اپنی بہادری کے کارنامے ظاہر کیے ہاتھیوں کی میدان جنگ میں دوڑ تھی۔ مگر اکبری بہادر انھیں تیر دوز کر کے خاک تودہ بنا دیتے تھے۔

آخر کار سورما سپہ سالار نے فتح حاصل کی اور ملک کو وسیع کرتے کرتے دریائے شور تک پہنچا دیا اور شہر میں اکبر کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ جگن ناتھ جی نے بھی اکبر بادشاہ پر دیا کی کہ اس نے اپنا مندر ملک سمیت اس کے حوالے کر دیا اور مان سنگھ پجاری وغیرہ۔

تو انھوں نے یہ مناسب خیال کیا کہ یہاں ایک ایسا شہر آباد کیا جائے جہاں سے ہر طرف مدد پہنچ سکے اور وریائی حملہ سے محفوظ ہو اور دشمنوں کی چھاتی پر ایک ضرب ہو۔ بڑی طویل ہمت کے بعد آ گرمحل کے مقام پر سب کا متفقہ فیصلہ ہوا۔ اس کا سنگ بنیاد بھی رکھا گیا اور اس کا نام اکبر نگر رکھا گیا۔ یہی اکبر نگر بعد میں راج محل کے نام سے مشہور ہوا۔ اسی مقام پر قلعہ عظیم الشان تعمیر ہوا جس کا نام سلیم نگر رکھا گیا۔ قلعہ شیر پور بھو د چا اکبر نگر، بلند عمارتوں کے سجے ہوئے گھروں، قلعے یا ذوؤں کے چند روز میں طلسمات کا عالم دکھانے لگے۔ اور راجہ مان سنگھ کے دم سے دولت کی آواز پرہم بتر کے کنارے کنارے تمام مشرقی بنگال میں گونجنے لگی۔ راجہ مان سنگھ کی شہرت سارے مشرقی علاقہ بنگال میں پھیل گئی اور لوگ اس کی بہادری، داناوری اور حسن سپہ گیری کی تحسین و آفرین کرنے لگے۔ راجہ مان سنگھ نے بھی واقعی تلوار زنی کا ثبوت دے کر واقعی اپنے ان مٹ کارنامے ظاہر کیے جو کہ تاریخ اکبری میں سنہری حروف سے کندہ کیے گئے ہیں۔

راجہ مان سنگھ کے کارنامے

راجہ مان سنگھ اور اکبر بادشاہ کے ملکی سلطنت کو وسیع کرنے اور اس کے انتظام و انصرام کے بات میں شہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ ان میں سے ایک کارنامہ راجہ مان سنگھ اور اکبر بادشاہ کا ملک اڑیسہ کے راجہ رام چندر کے بارے میں ہے جو کہ ذیل میں بیان کیا جاتا ہے جو کہ دونوں کے لیے باعث فخر ہے۔

ملک اڑیسہ میں راجہ رام چند فرماں روا تھا اور وہ مان سنگھ میں دربار میں بلانے پر خود نہ آیا بلکہ اس نے اپنے بیٹے کو بھیجا مگر راجہ مان سنگھ نے کہا کہ:

"بیٹے کا آنا مناسب نہیں ہے راجہ کو خود آنا چاہیے۔"

راجہ قتلو کی مہم میں راجہ مان سنگھ اس کی مدد بھی کر چکا تھا یعنی وہ اس کا احسان مند فرماں روا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ کیوں نہ آیا؟ اس کے نہ آنے کی یہ وجہ بتائی گئی کہ:

"وہ جرأت نہ کر رہا تھا ہر ملکی معاملات میں اس کے ساتھ وہاں کیا سلوک ہو؟"

تو راجہ مان سنگھ نے تمام خدمتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے بیٹے کو اس کی طرف فوج دے کر روانہ کیا تو راجہ مان سنگھ کے بیٹے نے جاتے ہی لوٹ مار شروع کر دی اور اس علاقے کے کئی قلعے فتح کر لیے۔ راجہ رام چند قلعہ بند اور محاصرہ کا دائرہ تنگ ہوا۔ جس سے راجہ رام چند کو بڑی پریشانی لاحق ہوئی۔ تو اس وقت اکبر بادشاہ کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے راجہ مان سنگھ کے لیے ایک فرمان جاری کیا۔ جس کا مضمون یہ تھا کہ:

"اگر راجہ رام چند ابھی نہیں آیا تو پھر آ جائے گا۔ ایسا ہرگز نہ کرنا چاہیے۔ ملک و دولت کی ترقی ان باتوں سے نہیں ہوتی۔ لہٰذا جلد محاصرہ اٹھا لو کیونکہ یہ آئین حق شناسی کے خلاف ہے۔"

تو مان سنگھ نے اکبر بادشاہ کے فرمان کی تعمیل میں فوری طور پر محاصرہ راجہ رام چند سے اٹھانے کا حکم دیا اور بیٹے کو واپس بلا لیا گیا۔

۱۰۰۱ھ میں بنگال اور اڑیسہ کے ملک کو صاف کر کے حسب الطلب راجہ رام چند حاضر دربار ہوا اور اس کے علاوہ اس کے ملک کے نامور

بہت سے سردار اور امراء بھی اس کے ساتھ تھے ان کو بھی اکبر بادشاہ کے دربار میں حاضر کیا گیا تھا۔ ان کے ماتھے پر بھی نور کا تلک لگایا گیا۔ بنگالہ کی صفائی کا تحفہ مورخوں نے اس کے نام ہی لکھا ہے۔

اکبر بادشاہ کی اس فراخ دلی کی تعریف کرنی ضروری امر ہے کہ اس نے ہندوستان کے راجاؤں کو قابو کرنے کے لیے بڑی ہی فراخ دلانہ حکمت عملی پر کام کیا۔ اس نے کسی کے ساتھ بغض یا حسد کا کام جاری نہیں رکھا۔ بلکہ نرمی اور مروت کے ساتھ سب کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی۔ جس میں وہ کامیاب نظر آتا ہے۔ اور اس نے ہندو، مسلمان اور افغانوں کو ایک جگہ پر رکھ کر ان سے سلطنت کے امور کے بارے میں مشورت کی۔ اس نے سب کو اپنی مہربانیوں سے نوازا۔ کسی کو بھی اس سے گلہ یا شکوہ نہیں رہا۔ یہ اکبر کی سلطنت کا بہت بڑا اہم کارنامہ شمار ہوتا ہے۔

راجہ مان سنگھ کا اتالیق کا اعزاز

۱۰۰۴ھ میں اکبر بادشاہ نے سالانہ جشن منایا۔ جس میں اکبر نے خسرو جہانگیر کے بیٹے کو باوجود خوردسال کے پنج ہزاری منصب پر مامور کر کے اڑیسہ اس کی جاگیر میں دے دیا۔ اس کے علاوہ اور راجپوت سرداروں کے حقوق بھی اس میں شامل کیے گئے تھے اور راجہ مان سنگھ کو اتالیق کا اعزاز بخشا گیا تھا اور اس کی سرکار (حکومت) کا انتظام بھی راجہ کے سپرد کیا گیا اور راجہ کو ملک بنگالہ دے کر ادھر روانہ کر دیا گیا۔ اور اس ملک سے اس کی تنخواہ بھی مقرر کر دی گئی۔ اب راجہ نوجوان جگت سنگھ اس قابل ہو گیا تھا کہ وہ سلطنت کے امور خود سنبھال سکتا تھا اور ملک کے تمام انتظامات و انصرام کے بارے میں خود دیکھ بھال کرنے کے قابل ہو گیا تھا اس میں اس قدر شعور اور لیاقت و صلاحیت کا مادہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ملکی سلطنت کے اہم امور کو بھی فوری طور پر اپنی دانست اور مفاد عامہ کے تحت حل کر سکتا تھا۔ اس سے عوام اور دیگر ماتحت عملہ بھی مطمئن تھا۔

راجہ مان سنگھ کی نحوست کا سال

۱۰۰۴ھ راجہ مان سنگھ کے لیے نحوست کا سال شمار کیا گیا ہے جس کا پس منظر یوں بیان کیا گیا ہے کہ:

کوچ بہار کے نام نے سورما سپہ سالار کے دربار میں اکبری اطاعت قبول کر لی۔ اس کے پاس سامان و دولت بہت زیادہ تھا۔ اگرچہ اس کے بیٹے جگت سنگھ کو ۱۰۰۵ھ میں کوہستان پنجاب کا انتظام دے دیا گیا مگر مان سنگھ کے لیے یہ سال نحوست کا شمار کیا گیا جس کی وجہ یہ ہے کہ:

راجہ مان سنگھ کا بیٹا ہمت سنگھ نے اسہال کے مرض سے نڈھال ہو کر انتقال کیا۔ جس کا اس کا بہت بڑا صدمہ اور غم پہنچا۔ اس کے مرنے سے تمام قوم کچھواہہ میں کہرام مچ گیا۔ بادشاہ نے راجہ مان سنگھ کو تسلی و تشفی دی، جس سے ان کو کچھ سہارا ہوا۔ مگر مجبوری تھی اس معاملے میں کوئی بھی کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔

شیخ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ:

"ہمت سنگھ نوجوان تھا۔ انتظام اور سربراہی کی لیاقت و صلاحیت اس کی سرشت میں تھی۔ وہ کسی موقع پر بھی گھبراتا نہ تھا۔ اس کے مرنے سے ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا تھا۔"

i- ہمت سنگھ

ii- درجن سنگھ

iii- جگت سنگھ (مہان سنگھ پوتا) بھاؤ سنگھ

راجہ مان سنگھ کے لیے دوسرا بڑا صدمہ

۱۰۰۴ھ میں ہی عیسیٰ خاں افغان نے اپنے ملک میں بغاوت کا علم بلند کر دیا اور لوگوں کو ورغلا کر حاکم وقت کے خلاف کر دیا۔ تو اس کی اطلاع جب راجہ مان سنگھ کو ملی تو وہ بڑا پریشان ہوا اور اس سے اس کی سرکوبی کے لیے اپنے جوان سال بیٹے درجن سنگھ کو روانہ کیا۔ اس کے ساتھ بڑے تجربہ کار اور کہنہ سال سردار بھی کیے گئے۔ اس کو جنگی ساز و سامان کے ساتھ بھاری جمعیت کے ساتھ عیسیٰ خاں افغان کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا گیا۔ مگر ان کے اپنے سرداروں میں سے ایک سردار دشمن کے ساتھ ملا ہوا تھا جو کہ نمک حرام سردار تھا۔ اس نے جا کر عیسیٰ خاں افغان کو بھی ان کی آمد کی اطلاع دے دی۔ جس کی وجہ سے وہ بھی چوکنا ہو گیا تو دشمن ایک جگہ پر چھپ کر بیٹھ گیا اور بے خبری میں ان پر حملہ کر دیا۔ دونوں فوجوں میں لڑائی تو سخت ہوئی مگر راجہ مان سنگھ کا جواں سال بیٹا درجن سنگھ مارا گیا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی جانیں ضائع ہوئیں۔ مال خانہ بھی لٹ گیا تو پھر عیسیٰ خاں کو اپنے اعمال کا پچھتاوا لگا۔ اس نے سارا مال واپس کر دیا اور بڑا شرمندہ ہوا۔ آخر کار اس نے اپنی بہن بھی رشتہ میں دے دی۔ دنیا کا تو سارا مال حاصل ہو گیا مگر راجہ مان سنگھ کو اس کا جوان سال بیٹا درجن سنگھ حاصل نہ ہو گا۔ جو کہ کبھی نہ ہو سکا۔

راجہ مان سنگھ کو تیسرا صدمہ

۱۰۰۷ھ بھی راجہ مان سنگھ کے لیے کوئی اچھا سال خیال نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ:

اکبر کو سمرقند اور بخارا پر قبضہ کرنے کی تمنا تھی اور اسی طرح رانا نے میواڑ سے اطاعت لینے کا خواہشمند تھا۔ چنانچہ عبداللہ خاں ازبک والی توران کے مرنے سے بڑے بڑے ارادوں کے منصوبے باندھے اور شطرنج پر مہرے پھیلائے ان کو یہ ارادہ تھا کہ:

''ادھر کے منصوبے جیت کر تسلی پا کر ملک موروثی پر چلتے۔ شہزادہ دانیال، عبدالرحیم خان خاناں شیخ ابوالفضل کو دکن کی طرف روانہ کیا گیا تھا۔ اور خود ان کے پیچھے روانہ ہوا۔ اکبر نے جہانگیر کو مہم رانا پر روانہ کیا۔ راجہ مان سنگھ کو پرانے پرانے امیروں اور سرداروں کے ساتھ سپہ سالار بنا کر روانہ کیا گیا اور بنگالہ اس کی جاگیر جگت سنگھ اس کے (راجہ مان سنگھ) ولی عہد کو عطا ہوئی۔ نوجوان کنور خوشی خوشی روانہ ہوا تو وہ آگرہ میں جا کر اپنے کاروبار میں مصروف ہو گیا کہ اچانک جگت سنگھ کا وہاں انتقال ہو گیا تو اس وقت کچھواہہ کے ہر گھر میں ماتم بچھ گیا بلکہ لوگوں میں ایک کہرام مچ گیا۔

اس کی موت کا اکبر کو بھی بڑا صدمہ ہوا اور اکبر بادشاہ نے مہا سنگھ اس کے بیٹے کو باپ کی جگہ دی۔ یعنی راجہ مان سنگھ کے پوتے کو۔ تو سرشور افغانوں نے جگت سنگھ کی موت کو اپنے لیے غنیمت سمجھا اور انھوں نے بڑے زور کا طوفان اٹھایا مگر مہان سنگھ بڑی ہمت والا تو جوان تھا۔ وہ ہمت کر کے آگے بڑھا مگر نوجوانی تو تھی اور تجربہ کار نہ تھا اس کو ندامت کا بھی منہ دیکھنا پڑا اور ٹھوکر کھائی۔ تو انہوں نے مقام بھدراک کے مقام پر لشکر کشی

کی اور بادشاہی لشکر کو مقام بھدلاک پر شکست دی اور بنگالہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے علاوہ جہانگیر بڑا عیاش آدمی تھا۔ وہ اودے پور کے پہاڑوں میں جا کر پتھروں میں خاک چھانتا پھرے۔ اس کی مراد پوری ہوئی کہ رانا کی مہم بادشاہ اکبر نے ملتوی کر دی اور بنگالہ کی طرف کوچ کیا۔ اس کے باپ نے "اسیر" کا محاصرہ کرتے ہوئے تھا۔ اور قلعہ والے بہت تنگ تھے۔ خان خاناں احمد نگر کو فتح کرنا چاہتا تھا۔ دکن کے علاقہ میں اکبری اقبال نے ایک زلزلہ ڈال رکھا تھا۔

ابراہیم عادل شاہ نے تحائف کے ساتھ بیٹی کو بھی روانہ کیا تاکہ اس کی شادی شہزادہ دانیال کے ساتھ ہو۔ مگر شہزادے نے باپ کی اس مصلحت کا خیال نہ کیا اور راجہ مان سنگھ کو بنگالہ کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ آپ آگرہ پہنچا اور قلعہ میں جا کر دادی کو سلام بھی نہ کیا۔ اس نے چاہا کہ:

"خود جا کر ملے تو اوپر سے اور کشتی میں بیٹھ کر الہ آباد کو روانہ ہو جائے اور وہاں جا کر عیش و آرام کرنے لگا۔"

مگر اس کے باپ اکبر بادشاہ کو بیٹے کی یہ ادا پسند نہ آئی۔

بغاوت بنگالہ اور راجہ مان سنگھ کی بہادری

دربار میں یہ عام تاثر پھیل گیا کہ:

"رانا کی طرف سے ہٹنا اور بنگالہ کی طرف جانا مان سنگھ کی تجویز ہے۔"

مگر شہزادے کی طرف سے بھی بغاوت کے آثار نظر آنے لگے اور تمام امرا اور وزرا کی عرضیاں موصول ہونے لگیں۔ یہ بھی عام طور پر حقیقت تسلیم کی جاتی ہے کہ جب کسی ملک کا بادشاہ بوڑھا ہو جاتا ہے تو سب وزرا اور امرا کی نظریں ولی عہد کی طرف جھک جاتی ہیں لیکن مان سنگھ کا تعلق خاص شہزادہ کے ساتھ تھا۔ اس نے ان وہموں کی بدنما تصویریں پیش کیں۔ اور راجہ کے نام پر جو حرف آیا اس کا اسے بہت رنج ہوا۔

راجہ بغاوت بنگالہ کی خبر سنتے ہی شیر کی طرح ادھر جھپٹا تو جب وہ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ گھوڑا گھاٹ، بکرم پور وغیرہ پر غنیم نے بغاوت کے جھنڈے گاڑ رکھے تھے۔ تو راجہ نے ان جگہوں پر اپنی افواج روانہ کیں اور جدھر مناسب سمجھا خود یلغار کر کے روانہ ہوا۔ اکبری اقبال کی برکت اور راجہ مان سنگھ کی بہادری، دلاوری اور ہمت اور نیک نیتی نے ایک عمر تک بغاوت کی آگ کو ٹھنڈا کر دیا اور وہ ڈھاکہ میں آ ...... حکومت کرنے لگا اور اس کو سکون و آرام ملا۔

راجہ مان سنگھ کو پرگنہ جواز کا مرحمت ہونا

۱۰۰۳ھ میں ہندوستان کی صفائی اور توران کی کشش نے اکبر بادشاہ کو دوبارہ اپنی طرف متوجہ کیا۔ اور اس کے دل میں توران کی چاہت نے جنم لیا تو سپہ سالار خان خاناں اور دیگر سرداروں کو مشورے کے لیے طلب فرمایا تو اس سلسلے میں راجہ مان سنگھ کو بھی بلایا گیا۔ اور اسی سن میں اسے پرگنہ جوند بھی مرحمت فرمایا گیا اور اس کو یہ حکم دیا گیا کہ:

"وہ قلعہ رہتاس کی مرمت اور اس کے بیٹے بھاؤ سنگھ کو ہزاری ذات پانچ سو سوار عنایت ہوا۔"

۱۰۱۳ھ میں خسرو (راجہ مان سنگھ کے بھانجے) کو دہ ہزاری منصب ملا اور راجہ مان سنگھ اتالیق ہو کر سات ہزاری چھ سوسوار کے منصب پر فائز ہوا اور بھاؤ سنگھ پوتا (راجہ مان سنگھ) ہزاری منصب اور تین سو سوار پر فائز ہوا۔

راجہ مان سنگھ کے لیے یہ بڑا اعزاز تھا کہ اس کو پانچ ہزاری کا منصب محض اس کی تیغ زنی، وفاداری اور جاں نثاری کی وجہ سے دیا گیا تھا۔ اس سے قبل یہ منصب کسی کو بھی عطا نہ ہوا تھا اور اکبر بادشاہ کی یہ اس کے لیے بڑی قدر دانی تھی۔ اور یہ تاریخ اکبری سے واضح ہوتا ہے کہ جب تک اکبر زندہ رہا اس وقت تک راجہ مان سنگھ کا ستارہ اقبال بھی بلند رہا مگر اس کے بعد اس میں زوال پذیری واقع ہوئی۔

خسرو کی بغاوت

اکبر کے عہد سلطنت تک راجہ مان سنگھ کا ستارہ اقبال بلند رہا۔ مگر اس کی زندگی کے بعد اس میں بھی خم آ گئے اول خسرو کے خیال سے خود اکبر کو واجب تھا کہ اسے آگرہ سے سرکا دے۔ چنانچہ حکم ہوا کہ:

''اپنی جاگیر پر جاؤ۔''

مطیع الفرمان نے کل آرزوؤں کو اپنے پیارے آقا کی خوشی کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا۔ اس کے پاس بیس ہزار کا لشکر جرار تھا اور تمام قوم کچھواہہ اس کا گروہ تھا۔ اگر یہی قوم اکڑ جاتی تو تمام قوم تلوار پکڑ کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ مگر خود فوراً بنگالہ کو روانہ ہو گیا اور خسرو کو بھی ساتھ لے لیا تو اس دوران اکبر کی سلطنت کا ستارہ غروب ہو گیا اور جہانگیر نے مغلیہ سلطنت کی باگ ڈور سنبھال لی تو جہانگیر نے بھی اپنی سابقہ تمام رنجشوں کو بھلا کر اسے بنگالہ کا صدر دوبارہ دے دیا مگر مقدر کا لکھا کوئی بھی تبدیل نہیں کر سکتا۔ چند ماہ کا ہی عرصہ گزرا تھا کہ خسرو (جہانگیر کے بیٹے) نے بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ مگر جہانگیر کے حوصلے کی بھی داد دی جاتی ہے کہ اس نے اس معاملے پر راجہ مان سنگھ کے کاروبار میں کوئی تبدیلی نہ کی اور خسرو کی بغاوت کے سلسلے میں راجہ مان سنگھ کا کوئی تاثر قبول نہ کیا اور راجہ مان سنگھ کی بھی یہ حکمت عملی بڑی عمدہ تھی کہ اس لیے بھی کسی کا ساتھ نہ تھا اگر وہ بھانجے کا بھلا چاہتا تھا مگر اس نے اس نازک موقع پر کوئی ایسی بات یا حرکت نہ کی کہ جس سے بادشاہ (جہانگیر) کو پتا چلے کہ راجہ مان سنگھ اپنے بھانجے خسرو کی طرف داری کر رہا ہے۔ جس کی وجہ سے دونوں کے حالات معمول پر رہے اور کسی نے بھی ایک دوسرے کے معاملات میں مداخلت نہ کی۔ جس سے کسی بھی طرف کے جذبات مجروح ہوں۔ راجہ مان سنگھ نے قلعہ رہتاس کے آگے بلا زمت کی کہ ملک پٹنہ میں واقع ہے۔ راجہ کو بلایا گیا تو وہ اپنے ساتھ سو ہاتھی نر و مادہ بھی بطور تحفہ کے لایا۔ ایک گھوڑا راجہ مان سنگھ کو مرحمت کیا۔

جب والد بزرگوار نے خاندیس اور صوبہ دکن بھائی دانیال کو عطا کیا اور آگرہ کو پھرنے لگا تو محبت کی نظر سے گھوڑا مانگا جو کہ اسے دے دیا گیا۔

یہ لوگ بڑے ہی شوخ طبع، مردم شناس اور بڑے ہی مسخرے تھے۔ اپنا کام نکالنا جانتے تھے۔

راجہ مان سنگھ کی وفات

خانجہاں وغیرہ امرائے بادشاہی دکن میں کارنامے دکھا رہے تھے۔ مگر خسرو کی وجہ سے اس کا معاملہ نازک تھا۔ اس لیے وہ وطن چلا گیا۔ اپنے

پرانے اہلکاروں سے صلاح و مشورہ کر کے جہانگیر سے عرض کیا کہ لشکر لے کر دکن پہنچو تو راجہ مان سنگھ دو برس تک دکن میں رہا اور ۱۰۲۳ھ میں اس دار فانی سے ملک بقا کو کوچ کر گیا اس کے بیٹوں میں صرف "بھاؤ سنگھ" جیتا رہ گیا۔ باقی تمام جوان بیٹے اس کی زندگی میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ جن کا اس کے دل کو بڑا صدمہ پہنچا۔ جہانگیر نے اس کے بیٹے بھاؤ سنگھ کو اس کا خلف مقرر کیا۔ جہانگیر نے راجہ مان سنگھ کے بیٹے بھاؤ سنگھ کو مرزا راجا کا خطاب دیا اور اس کے ساتھ چار ہزاری ذات تین سو سوار کے منصب سے ممتاز کیا اور آبیر علاقہ مرحمت کیا جو کہ اس کے آبا ؤ اجداد کا وطن تھا تو اس وجہ سے مہان سنگھ بھی راضی ہوا۔ اور اس کی دلداری اور حوصلہ افزائی کے لیے پہلے منصب پر پانچ صدی بڑھا کر "گلدھنہ" کا ملک بھی اسے انعام میں دے دیا گیا۔

بعض لوگوں نے یہ خبر تراشی ہے کہ اس نے جہانگیر کے عہد میں ترقی نہ کی۔ یہ بات غلط ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس نے اکبر بادشاہ کی دستار کو اپنے ہاتھوں سے مضبوطی سے تھامے رکھا اور اپنی زندگی پر خطر حالات میں بڑے پر امن طریقے سے گزار لی۔ جس کی وجہ سے وہ امن و عافیت کے راستے سے منزل آخر تک صحیح و سلامت پہنچا اور جو اعزاز و اکرام اس کو اکبر بادشاہ نے عطا کیے تھے وہ اس کے پاس محفوظ رہے اور گویا کہ اس نے اپنی عزت کو محفوظ رکھ کے زندگی بسر کر لی۔

سیرت و کردار

راجہ مان سنگھ نے ملک گیری اور ملک داری کے اوصاف سے مزین تھا۔ وہ جس طرف بھی لشکر لے کر گیا وہ کامیاب ہو کر فتح پا کر ہی واپس آیا اور بہت سا مال غنیمت بھی ساتھ لایا۔ یہی وجہ ہے کہ کابل میں آج تک ہر فرد کی روح کی زبان پر اس کا نام زندہ ہے۔ اس کے زمانے میں اکبر بادشاہ کی حکومت ہالکا رو دریائے شور تک جا پہنچا تھا اور بنگالہ میں اپنی نیکی کے طفیل ایسے کارہائے نمایاں سر انجام دیے تھے جو کہ آج تک سرسبز ہیں اور عوام ان سے مستفید ہو رہے ہیں۔ اس کے دور میں بھاٹ کی سرکار میں ۱۰۰ ہاتھی فیل خانے میں ہر وقت جھومتے تھے۔ تیس ہزار کا جرار لشکر اسی کی ذات کا نوکر تھا۔ جن میں معتبر سردار، امرا عالیشان کی سواریاں امیرانہ جلوس سے نکلتی تھیں۔ تمام سپاہی بیش تنخواہ کی وجہ سے آسودہ حال تھے۔ ہر فن کے صاحب کمال اس کے شاہانہ دربار میں حاضر رہتے تھے اور عزت و خوشحالی کے عالم میں زندگی بسر کرتے تھے۔

راجہ مان سنگھ بڑا ہی خوش مزاج، خوش اخلاق اور ملنسار شخص تھا وہ بڑا ہی عجز و انکسار کا مظاہرہ کرتا تھا۔ جب وہ تقریر کرتا تھا تو وہ عاجزی و انکساری کے الفاظ استعمال کرتا تھا۔

جب راجہ مان سنگھ دکن کی مہم پر گیا تھا تو خانجہاں لودھی سپہ سالار تھا۔ چند و پنج ہزاری صاحب وقار و ذیل کے موجود تھے۔

- i- خانخاناں عبد الرحیم مرزا
- ii- راجہ مان سنگھ
- iii- آصف خاں
- iv- شریف خاں اور دیگر امیر الامراء موجود تھے۔

بالاکوٹ کے مقام پر لشکر شاہی کو مشکل کا سامنا ہوا۔ ملک میں قحط پڑ گیا تھا اور راستوں کی خرابی کی وجہ سے اس کا سامان بھی بند ہونے لگا تو

امرا و وزرا نے جلسہ کر کے مشاورت کرنی چاہی مگر کوئی واضح صورت سامنے نہ آئی تھی۔ آخر کار ایک دن راجہ مان سنگھ نے سر دیوان اکبر کو کہا کہ:

''اگر میں مسلمان ہوتا تو ایک تم صاحبوں کے ساتھ کھانا کھایا کرتا۔ اب کہ داڑھی سفید ہو چکی ہے تو کچھ کہنا مناسب نہیں ہے

ایک پان ہے آپ صاحب قبول فرمائیں۔''

سب سے پہلے مان سنگھ نے راجہ مان سنگھ کا پان قبول کیا۔ تو پنج ہزاری سے لے کر صدی کے منصبدار تک حسب حیثیت نقد اور جنس لوازم ضیافت برابر ہر شخص کی سرکار میں پہنچ جاتا تھا۔ ہر تھیلے میں اس شخص کا نام لکھا ہوتا تھا تو تین چار ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ بازار میں ہر شے کے انبار لگے تھے اور جو آجیر میں نرخ ہوتے تھے وہی یہاں بھی ہوتے تھے یعنی اشیاء مہنگی نہ ہیں کنور اس کی رانی بڑی عقلمند اور منتظم بی بی تھی۔ وہ سارے کاروبار منتظم انداز سے کرتی تھی اگرچہ وہ گھر میں بیٹھی تھی حتیٰ کہ مسلمانوں کو کوچ و مقام کے موقع پر مسلمانوں کو حمام و مسجد کی وضع کے خیمے بھی دستیاب ہوتے تھے۔ جیسے راجہ خان سنگھ خوش اخلاق، شگفتہ مزاج اور خوش و خرم رہتا تھا۔ راجہ مان سنگھ فقرا اور مساکین کی خدمت میں بھی حاضر ہوا کرتا تھا اور ان کے ساتھ سادگی سے بیٹھ کر بات چیت کرتا تھا۔

وہ فقرا اور مساکین کے معاملے میں ہندو اور مسلمان میں کوئی فرق نہ کرتا تھا۔ سب کے ساتھ اس کا سلوک مساوی تھا۔ بنگالہ کے سفر میں ایک مقام پر شاہ دولت کے اوصاف و کمالات سنے تو خدمت میں حاضر ہوئے وہ بھی ان کی پاکیزگی اور سنجیدہ گفتگو سے بہت خوش ہوئے اور انھوں نے کہا کہ:

''راجہ مان سنگھ مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے۔''

تو اس نے مسکرا کر کہا کہ:

''خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ o (قرآن پاک، پارہ اول، سورہ بقرہ) ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے میرے دل پر مہر لگا دی ہے۔''

''یہ اللہ تعالیٰ کی مہر ہے بندہ کس طرح گستاخی کر سکتا ہے۔''

راجہ مان سنگھ کے اصل قدر دان اکبر بادشاہ ہی تھا۔ اس کے بعد جہانگیر کے اس کی خدمات کی قدر نہ کی بلکہ اس سے مختاط رہا۔ اگر اکبر زندہ رہتا تو وہ اس کی سلطنت کو مزید وسیع کرتا تھا۔ اگر اس کی موت سے مہلت دے دی۔ اکبر راجہ مان سنگھ کے ساتھ اپنے بیٹوں کی طرح سلوک کرتا تھا جو کہ قابل تعریف عمل ہے۔

راجہ مان سنگھ اور مذہب

راجہ مان سنگھ اور اس کے کل خاندان نے اپنی ساری زندگی اکبر بادشاہ کے لیے قربان کر دی تھی۔ انھوں نے ہر وقت اکبر بادشاہ کی خوشیوں کو سامنے رکھا اور ان پر قربان کر دیا۔ مگر مذہب کے معاملے میں بات کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ جن دنوں میں دین الٰہی اکبر شاہی کا زیادہ چرچا تھا اور شیخ ابوالفضل اس کے خلیفہ بنے تھے۔ بیربل برہمن کہلاتے تھے تو انھوں نے سلسلہ دینی میں چوتھا نمبر حاصل کیا لیکن راجہ مان سنگھ سنجیدگی اور عقل کے نقطے سے بال بھر بھی نہ ہٹا تھا۔

چنانچہ ایک رات بعض مہمات سلطنت کے باب میں جلسہ مشاورت منعقد ہوا تو ان کو حاجی پور پٹنہ جاگیر عنایت ہوئی۔ ان کے بعد خلوت ہوئی تو خان خاناں بھی موجود تھے اکبر مان سنگھ کو مذہب کے بارے میں جانچنے لگے کہ:

''دیکھو کہ یہ مریدوں میں شامل ہوتا ہے یا کہ نہیں؟''

باتوں کا سلسلہ جاری رہا مگر اس راجپوت سپاہی نے صاف اور بے تکلف جواب دیا کہ:

''حضور! اگر مریدی سے مراد جاں نثاری ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہیں امتحان کی حاجت نہیں۔ اگر کچھ اور ہے اور حضور کی مراد مذہب سے ہے تو ہندو ہوں فرمایئے مسلمان ہو جاؤں۔ اور راستہ جانتا نہیں ہوں۔ کونسا ہے کہ اختیار کروں؟''

یہ سن کر اکبر بادشاہ بھی خاموش ہو گیا اور اس نے بات کو آگے نہ بڑھایا۔

''مگر مصنف کا یہ خیال ہے۔ جو شخص مذہب میں پورا ہوگا وہی وفا و اخلاص میں پورا ہوگا۔ اور وفا و اخلاص کا استقلال ہر مذہب کی اصل ہے۔''

ہر مذہب اچھا ہے ان میں اچھی باتیں پائی جاتی ہیں۔ اخلاق و اخلاص و استقلال کی تعلیم و تربیت پائی جاتی ہے اور اگر کوئی اپنے مذہب کی روح کے مطابق عمل ہی نہ کرے تو اس مذہب کا کوئی قصور نہیں ہوتا مگر اس کے پیروکار کا قصور ہوتا ہے جو کہ اپنے مذہب کو چھوڑ کر اس کی تعلیمات کے مطابق عمل نہیں کرتا تو اسی طرح ہندو کا مذہب بھی اخلاقی تعلیمات کا مرکب ہے اگر کوئی اس پر عمل نہ کرے تو ہندو مذہب کا کوئی قصور نہیں ہے اور نہ اس سے ہندو مذہب میں خامی ہی واقع ہو جاتی ہے۔

راجہ مان سنگھ کی رانیاں

راجہ مان سنگھ کی اس کی وفات کے وقت ۱۵۰۰ رانیاں تھیں اور ہر ایک سے ایک ایک یا دو دو بچے تھے۔ ان کی ساری اولاد باپ کی طرح بہادر اور دلاور تھی۔ مگر قدرت کاملہ کا کرشمہ ہے کہ ان کی زندگی میں ہی سب بھگوان کو پیارے ہو گئے۔ صرف ان کی اولاد میں سے بھاؤ سنگھ ہی جیتا چھوڑ گئے مگر وہ بھی شراب نوشی کا عادی تھا جب راجہ سرگباش ہوئے تو ساٹھ رانیوں نے ستی ہو کر اس کے ساتھ رفاقت کی۔

جس قلعہ زمین پر تاج گنج کا روضہ ہے وہ راجہ مان سنگھ کی تھی۔

قارئین حضرات! اس زمانہ کے ہندو اور مسلمانوں کے لیے اگر کوئی عہد ہے جن کی تقلید ملک کی بہتری اور خلق خدا کی آسودگی اور مختلف بلکہ متضاد مذاہب میں محبت و یگانگت پیدا کرنے کے لیے ضرور ہے اور وہ عہد اکبری ہے اور اس بے نظیر مبارک عہد کے پیشرو اور مرد میدان مسلمانوں میں اکبر بادشاہ اور راجہ مان سنگھ درباری ہیں۔ اس وقت کے وہ لوگ جو دونوں مذہبوں کے لوگوں کو آپس میں لڑانے کی فکر و دھن میں رہتے بیٹھے تھے وہ کہاں گئے؟ جو بات دل سے نہیں نکلتی وہ اثر نہیں رکھتی۔ آپ ان پاکیزہ نعمتوں کے حالات زندگی کا مطالعہ کریں اور ان کو اپنا پیشرو بنائیں۔ کیونکہ اکبر بادشاہ اور راجہ مان سنگھ درباری وہ شخص ہیں جو کہ اگر ان کے نصف فوٹوگراف بنا کر ہر قومی جلسے کو ان سے زینت دی جائے تو دونوں فریق میں اتحاد بڑھانے کی وجہ بنے گا۔

سوچنے کا مقام ہے کہ راجہ مان سنگھ نے یہ اتحاد اپنے دھرم کو پورے طور پر برقرار رکھ کر قائم کیا تھا۔ یہی ایک خوبی ہے کہ جو راجہ مان سنگھ کی بے انتہا عزت اور عظمت ہمارے دلوں میں بٹھاتی ہے۔ وہ کیا دینداری ہے جو دوسروں کے دل کو ٹھیس (آزار) پہنچائے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہب میں ہزاروں امور ہیں جن کو دونوں فریق نیکی تصور کرتے ہیں۔ پس دین دار بننے کے لیے ایسی ہی نیکیوں پر عمل کرنا چاہیے۔ راجہ مان سنگھ کا نام اخلاقی تاریخ میں سنہری حروف سے قیامت تک چمکے گا۔ لہٰذا ہر مذہب میں اللہ تعالیٰ نے مثالی کردار کے لوگ پیدا کیے ہیں جو کہ اس کی بے نیازی کا کرشمہ ہے کیونکہ اس کا کام قدرت کاملہ ہے۔

☆ ☆ ☆

باب ۸

شیخ عبدالقادر بدایونی امام اکبر بادشاہ

۱۔ شیخ عبدالقادر بدایونی امام اکبر شاہ نے ملائی کے دائرہ سے باہر قدم نکالنا نہ چاہا اور اسی کو دنیا کا فخر اور دین کی دولت سمجھ لیا۔

۲۔ ان کی تاریخ اپنے مضمون ومقصود کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ الماری کے سر پر تاج کی جگہ پر رکھی جائے۔

۳۔ ان کی طرز تحریر کا ایک ڈھب ہے یہ خوبی ان کے قلم میں خداداد تھی۔

۴۔ شیخ عبدالقادر بدایونی مذہبی فاضل تھے۔ فقہ، اصول فقہ اور حدیث کو خوب حاصل کیا تھا۔ ان کا دل عشق کی حالت سے گداز تھا۔

۵۔ اکبر بادشاہ کے دربار کے امام تھے۔

۶۔ ان کی فضیلت میں شیر شاہ اور سلیم شاہ کے زمانے میں اضافہ ہوا۔

۷۔ اس کا کہنا تھا کہ:

''انسان اس سے نکلا ہے خدا تعالیٰ نے ایسے حل کر دینے کی ہدایت کی ہے۔ اس لیے ملنساری، اتحاد، ارتباط کو اصول سلطنت قرار دیا جائے۔''

۸۔ ان کی بڑی خوبی تھی کہ وہ ہر شخص کے جزوی جزوی خصائل، عادات واطوار کو چھتے تھے اور خوبصورتی سے اظہار خیال کرتے ہیں۔

۹۔ وہ بادشاہ اکبر اعظم کی جلوت وخلوت میں اہم دخل رکھتے تھے۔

شیخ عبدالقادر بدایونی پر ایک طائرانہ نگاہ

پیدائش : ۱۷ ربیع الثانی ۹۴۷ھ موضع ٹونڈہ میں پیدا ہوئے

والد : ملوک شاہ ابن حامد شاہ

ننھیال : بیانہ میں

پرورش : بساور میں

خاندان : فاروقی شیخ

نانا : مخدوم اشرف

مرشد : سید محمد مکی

دربار اکبری : ۹۶۰ھ میں سلیم شاہی میں

وفات : بروز جمعۃ المبارک ۲۳ جمادی الثانی ۱۰۰۴ھ

اولاد : ۹۸۷ھ میں فرزند محی الدین بعمر چالیس سال

شادی : سیمہ سلطان بیگم ۹۷۵ھ کو بدایونی میں

دفن : باغ انبہ واقع عطاپور نواح بدایوں

عمر : ۵۷ برس تقریباً

اعزاز : ۷ قراءتوں میں قدرت رکھتے تھے

والد کا انتقال : ۹۶۹ھ میں

دفن : بساور میں

دادا : حامد شاہ

حالات زندگی

شیخ عبدالقادر بدایونی ٹوڈہ کے مقام پر ۹۴۷ھ یا ۹۴۹ھ کو پیدا ہوئے تھے جو کہ بمطابق عیسوی ۲۱ اگست ۱۵۴۰ء ہوتے ہیں۔ ٹونڈہ کا علاقہ بساور کے نزدیک ہے اور اسے ٹونڈہ بھیم بھی کہا جاتا ہے۔ یہ علاقہ بادشاہوں کے عہد میں سرکار آگرہ تھا اور صوبہ اجمیر سے متعلق رہا تھا۔ شیخ عبدالقادر بدایونی کی ننھیال بیانہ میں تھے جو کہ آگرہ اور اجمیر کی سڑک کے کنارے پر واقع ہے۔ وہ شیر شاہ کے بیان میں یوں لکھتے ہیں کہ:

''جس طرح پیغمبر صاحب نے نوشیرواں کے زمانے میں فخر کر کے فرمایا ہے کہ بادشاہ عادل کے زمانے میں میری ولادت ہوئی ہے۔ تو الحمدللہ میں بھی اس بادشاہ کے عہد میں ۱۷ ربیع الثانی ۹۴۷ھ بمطابق ۲۱ اگست ۱۵۴۰ء کو پیدا ہوا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی نہایت شگفتہ دلی کے ساتھ یوں لکھتے ہیں کہ:

''باوجود اس کے کہتا ہوں کہ کاش اس گھڑی اور اس دن کو سال و ماہ کے دفتر سے مٹا دیتے تاکہ میں عدم کے خلوت خانے میں عالم خیال اور عالم مثال کے لوگوں کے ساتھ رہتا اور کوچہ ہستی میں قدم نہ رکھنا پڑتا اور اس کے ساتھ رنگا رنگ کے مصائب نہ برداشت کرنے پڑتے۔ جو دین و دنیا کے ٹوٹے کی نشانیاں ہیں۔''

پھر اس کے بعد تھوڑی دیر...... کا بھی اظہار یوں کرتے ہیں کہ استغفراللہ مجھ شکستہ کی جہاں کیا مجال ہے کہ امرالٰہی میں دم مار سکوں؟ ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسی دلیر زبانی سے دین کے معاملے میں گستاخی نہ ہو جائے۔ جو کہ وبال عاقبت دوام ثابت نہ ہو۔ چنانچہ پیغمبر صاحب کے اور چند بزرگوں کے قول میں یوں لکھتے ہیں کہ:

''جو خدا کو نہ بھائے اس سے توبہ ہے۔''

''جو خدا کو پسند نہ آئے اس سے توبہ کرو۔''

گل را چہ مجال است کہ گوید بہ کلال

کز بہر چہ سازی و چرا مے شکنی

انھوں نے شیر شاہ کی تعریف میں لکھا ہے کہ:

شیر شاہ کے دور حکومت میں سڑکوں کے دونوں طرف سایہ دار درخت لگے ہوئے تھے تاکہ مسافروں کو سفر کرتے ہوئے گرمی نہ لگے اور ان کے عہد حکومت میں چوری کا نام و نشان نہ تھا۔ ہر عورت و مرد مال و زر اور ہیرے جواہرات کے ساتھ جہاں کہیں جانا چاہے وہ جانے میں کوئی ڈر محسوس نہ کرتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ کوئی کسی کی طرف نظر بھی میلی سے دیکھے۔ یعنی پرسکون اور پرامن دور حکومت تھا۔

پرورش و تعلیم و تربیت

ملا شیخ عبدالقادر بدایونی نے بساور میں پرورش پائی اور اس علاقے کو اپنی تصنیفات میں محبت کی وجہ سے وطن کہتے ہیں۔ ان کا خاندان امیر نہ تھا بلکہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر ان کا تعلق فاروقی شیخ خاندان سے ضرور تھا اور شیخ عبدالقادر کا ددھیال ننھیال دونوں صاحب علم اور دین دار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ علمی اور دینی نعمتوں کی قدر جانتے تھے۔

شیخ عبدالقادر بدایونی کے والد محترم کا نام ملوک شاہ تھا اور اس کے دادا کا نام حامد شاہ تھا۔ مگر دونوں اطراف سے شرفاء اور علماء میں شمار ضرور ہوتے تھے۔ جس کی وجہ سے معاشرے میں ان کا ایک مقام ضرور تھا۔ ان کے والد شیخ پنجو سنبھلی کے شاگرد تھے اور وہ معقول عربی، فارسی کی کتب پڑھی تھیں، ان کے نانا مخدوم اشرف تھے۔ سلیم کے عہد میں فرید تارن ایک پانچ ہزاری سردار کچھواڑہ متصل بیانہ صوبہ آگرہ میں تھا۔ اس کی فوج میں ایک جنگی عہدہ دار تھے۔ غرض فاضل مذکور ۹۵۰ھ سے ۹۶۰ھ تک رہنے والا محترم ملوک شاہ کے پاس ہی زیر تربیت رہے تھے۔ اس وقت اس کی پانچ سال کی عمر تھی جبکہ سنبھل میں وہ قرآن پاک پڑھتے رہے۔ اس کے بعد نانا نے اپنے پیارے نواسے کو اپنے پاس رکھ لیا اور بعض ابتدائی کتابیں اور مقدمات صرف ونحو خود بھی انھوں نے پڑھائے۔ فاضل بدایونی بچپن ہی سے قرأت اور خوش .... پڑھتے تھے۔

اس وقت ۹۶۰ھ سلیم شاہی کا دور اقتدار تھا۔ مگر یہ شاگردی ان کو بہت مبارک آئی کہ ایک دن اس کی سفارش سے دربار اکبری میں جا پہنچے اور ے اماموں میں داخل ہو کر امام اکبر شاہ کہلانے لگے جو کہ اس حقلی عمر میں اس اہم اعزاز کا بہت مقام تھا۔

انھوں نے خود ہی لکھا ہے کہ:

”اس وقت ان کی بارہ سال عمر تھی کہ والد نے سنبھل میں آ کر یہاں حاتم سنبھلی کی خدمت میں حاضر کیا۔ ۹۶۱ھ میں اگر وہ بارہ سال کی عمر کے تھے تو اس سے معلوم ہو کہ وہ ۹۴۹ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ ان کی خانقاہ میں رہ کر قصیدہ بردہ یاد کیا اور وظیفہ کی اجازت پائی اور فقہ حنفی میں صبر کا کنز کے چند سبق بھی پڑھے اور اس وقت ان کے مرید بھی ہوئے۔“

اسی سلسلے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

”میاں نے ایک دن والد مرحوم سے کہا کہ ہم تمہارے لڑکے کو اپنے استاد شیخ عزیز اللہ صاحب کی طرف سے بھی کلاہ اور شجرہ دیتے ہیں۔ تاکہ علم ظاہری اور باطنی سے بہرور ہوں۔“

تاکہ اس کا اثر تھا کہ فن فقہ انھوں نے خوب حاصل کیا۔ اگرچہ تقدیر نے انھیں اور شغلوں میں بھی مصروف کر رکھا تھا مگر وہ عمر بھر اسی کے ذوق و شوق میں مصروف رہے۔ ملا شیخ عبدالقادر بدایونی کی تیزی طبع کی کیفیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ عدلی افغان کے حال میں لکھتے ہیں کہ:

۹۶۱ھ میں میاں کی خدمت میں آنے سے پہلے بادشاہی سرداروں نے عدلی کے باغیوں سے لڑ کر فتح پائی تھی تو اس وقت ان کی عمر بارہ سال کی تھی۔ جب میں میاں کی خدمت میں حاضر ہوا تو ایک دن وہ باتوں باتوں میں فرمانے لگے کہ:

''ان دنوں میں یہ خبر سن کر فی البدیہہ ہم نے کہہ دیا تھا کہ:

''فتح ہائے آسمانی شد''

دیکھو تو کتنے ہوئے ہیں؟''

تو میں نے عرض کیا کہ:

''ایک کم ہوتا ہے۔''

تو انھوں نے فرمایا کہ:

''قدما کی رسم خط کے بموجب ایک ہمزہ اور لگا دو۔''

تو میں نے عرض کیا کہ:

''پھر تو پوری ہے۔''

شیخ سعد اللہ نحوی جو کہ فن مذکور میں مثال نہیں رکھتے تھے وہ بیانہ میں مقیم تھے۔ جب فاضل مذکور نانا کے پاس آئے تو ان سے کافیہ پڑھا۔ اس وقت ہیموں نے سر اٹھایا تھا۔ اور اس کا لشکر لوٹ مار کرتا ہوا بستاور آ پہنچا۔ وہ اس وقت سنبھل میں تھے۔ انھوں نے سارے بسا ور کو لوٹ لیا۔ جس سے وہ برباد ہو گیا اور اسی لوٹ مار میں ان کے والد محترم کا کتب خانہ بھی لٹ کر تباہ و برباد ہو گیا تو دوسرے ہی سال قحط کی مصیبت آ پڑی۔ وہ کہتے ہیں کہ:

بندگان خدا کی بدحالی دیکھی نہ جاتی تھی۔ لاتعداد افراد بھوکوں مر گئے اور ایسا سماں تھا کہ انسان کو انسان کھائے جا رہا تھا۔

۹۶۳ھ میں علم کے شوق نے باپ بیٹا کے دلوں میں حب وطن کی گرمی کو ٹھنڈا کر دیا اور تحصیل علم کی خاطر آگرہ جا پہنچے۔ تو وہاں آگرہ میں انھوں نے شرح شمسیہ اور مختصرات پڑھے تھے۔

قاضی ابوالمعالی کو جب عبداللہ خاں نزدیک سے جلا وطن کیا تو ان کا بھی تصور عجیب سا نظر آتا ہے وہ آگرہ میں آئے ان کے تو جب علم منطق توران میں پہنچا تو دیکھتے ہی دیکھتے لوگ بڑے شوق سے ان کی طرف متوجہ ہوئے مگر بہت جلد ہی لوگ عالم و فاضل بن گئے۔ فلسفی فلیسوف اور جب وہ کسی نیک بخت صاحب دل کو دیکھتے تو اس کی خوب ہنسی اڑاتے اور اس کو کہتے کہ:

''گدھا ہے گدھا۔''

لوگ ان کو منع کرتے تو وہ جواب دیتے کہ:

''ہم دلیل منطقی سے ثابت کرتے ہیں۔''

دیکھو یہ ظاہر ہے کہ یہ لاحیوان ہے اور حیوان عام ہے۔ جبر انسان خاص ہے۔ عجیب حیوانیت اس میں نہیں تو انسانیت جو کہ اس سے خاص ہے وہ بھی نہیں ہے تو اس صورت میں وہ گدھا نہیں تو اور کیا ہے؟''

جب ایسی باتوں کی بحث لوگوں میں عام ہونے لگیں اور حد سے گزر گئیں تو صوفیہ کرام نے تحریری طور پر عبداللہ خاں ازبک کو صورت حال

سے مطلع کیا اور منطق کا پڑھنا پڑھانا حرام قرار دیا تو ان حالات میں وہاں سے ذیل کے علمائے کرام بدعقیدہ ہو کر نکالے گئے۔

i- قاضی ابو المعانی بخارائی

ii- ملا عصام

iii- ملا مرزا جان، اور اسی طرح کے دیگر کئی علماء بدعقیدہ ہو کر نکال دیے گئے تھے۔ تو شیخ عبدالقادر بدایونی کہتے ہیں کہ:

"چند اسباق میں نے بھی خود شرح وقایہ کے پڑھے تھے (قاضی ابو المعالی سے) اور حق یہ ہے کہ وہ اس علم میں دریائے بایاں تھے یعنی وہ بڑے ماہر اور کمال رکھتے تھے۔ اسی اسباق میں نقیب خاں بھی شریک تھا۔"

اکبر کے اس دور اقتدار میں اکبری سلطنت کا طلوع، بیرم خاں کا دور شیخ مبارک کی برکتیں۔ علم و کمال کی برکت علم و کمال پھیلانے لگی کہ فاضل بدایونی حلقہ درس میں شامل ہو کر فیضی اور ابوالفضل کے اور نقیب خاں کے ہم درس ہوئے۔ وہ شیخ مبارک کے ذکر میں یوں گویا ہیں کہ:

"چہ مع اوراق عنفوان شباب میں آگرہ میں چند سال ان کی ملازمت میں سبق پڑھتا رہا۔ ان کا حق مجھ پر ہے عظیم۔"

اقبال اکبری کے دربار سے اس نے خود التجا کی کہ:

"حضور سے کل شائستہ اور کارواں امیر یہاں آئیں تو قلعہ سپرد کروں گا۔"

تو بیرم خاں نے میر علی بیگ کا نام تجویز کیا تو اس نے ان سے کہا کہ:

"تم بھی میرے ساتھ چلو۔ یہ خود بھی ملا تھے اور ملا کے بیٹے بھی تھے۔"

مگر علم کے شوق نے انھیں اجازت نہ دی۔ اس نے ان کے ملا شیخ مبارک کو بہت مجبور کیا۔ ان کے مجبور کرنے کی حد یہاں تک ہوئی کہ اس نے کہا کہ:

"یہ نہ چلیں تو میں بھی جانے سے انکار کر دوں گا۔"

غرض پیارے دوست کی تمنا اور دونوں بزرگوں کے کہنے سے رفاقت اختیار کی چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

برسات کا موسم تھا تو سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے قنوج، لکھنوتی، جون پور اور بنارس کی سیر کرتے ہوئے عجائب عالم کا مشاہدہ کرتے ہوئے اور جا بجا مشائخ علم سے ملاقاتیں کرتے ہوئے چلتے رہے۔ حتیٰ کہ سفر کرتے ہوئے علاقہ خیار میں جا پہنچے تو وہاں جمال خاں نے بڑے اچھے انداز سے پرتپاک طور پر استقبال کیا اور علی بیگ نے ہمیں وہیں رہنے دیا اور خود سیر کے بہانے سوار ہو کر نکلے۔ جمال خاں قدرے بدنامی سے گھبرا گیا۔ تو اس کے دل میں کسی نے شبہ ڈال دیا تھا۔ بہر حال ہم نے اس کو سمجھانے کی کوششیں کیں مگر بے سود۔ آخر کار ہم کشتیوں کے ذریعے دریا پار کیا اور جنگل میں آئے شیخ محمد غوث گوالیاری جو ہندوستان میں بڑے مشائخ تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ پہلے اس جنگل میں اور پہاڑ کے دامن میں یاد الٰہی کے ساتھ گزران کیا کرتے تھے۔ ہم اس مقام پر پہنچے کہ ایک ان کا رشتہ دار آ گیا۔ اس نے ساتھ لے جا کر غار دکھایا کہ یہاں وہ ۱۲ برس تک بیٹھے رہے اور بناسپتی کھا کر زندگی گزارتے تھے۔

۹۷۰ھ میں خود بسوان علاقہ سنبھل میں تھے تو جب ان کے پاس خط پہنچا کہ مخدوم اشرف ثانا بھی "بساور" میں فوت ہو گئے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ:

میں نے ان سے جزئیات اور علوم عربیہ (منطق و فلسفہ) ان سے پڑھے تھے اور ان کے بڑے عربیہ حق دیے ور اہل علم کے ذمہ تھے۔ مجھے ان کے فوت ہونے کا بڑا رنج ہوا۔ والد تو پہلے ہی فوت ہوئے تھے تو ایک ہی برس میں دو گہرے زخم لگے۔ اب دنیا میرے لیے حاتم کدہ بن گئی بلکہ مجھ سے زیادہ دنیا میں کوئی بھی غمزدہ نہ تھا۔

۹۷۳ھ میں بٹیالی میں پہنچ کر حسین خاں سے ملاقات ہوئی تو جوانی کے ذوق میں انھوں نے دربار شاہی کی طرف دھکیل دیا مگر اس افغان دین دار کی محبت ایمانی اور خوبیوں کی کشش نے راستے روک لیے وہ خود لکھتے ہیں کہ:

"وہ شخص صاحب اخلاق، متواضع، درویش سیرت، سخی، پاکیزہ، پابند سنت وجماعت، قلم پرور، فضل ودیعت تھا وہ ہر ایک سے نیکی سے پیش آتا تو دس برس تک وہیں رہا۔ یہ وہ سب ہی اچھا قابل تعریف شخص تھا جو کہ پیغمبروں کے مساوی کردار کا اگر حامل نہیں تو اولیاء واصحاب کے برابر تو ممکن ہے۔"

۹۷۳ھ تا ۹۸۱ھ (آٹھ برس) تک حسین خاں کے پاس رہے علماء وفقراء کی خدمت کرتے رہے۔

شادی

۹۷۵ھ میں رخصت لے کر بداؤں میں گئے۔ مگر ملا صاحب دوبارہ دلہا بنے۔ انھوں نے نہایت خوبصورتی سے شادی رچائی۔ ۹۷۵ھ میں شادی ہوئی۔ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پہلی شادی سے خوش نہ تھے۔ تو ان کو اللہ تعالیٰ نے ایک لڑکا عطا کیا۔ وہ حسین خاں کے پاس تھے اور وہ لکھنؤ میں جاگیر پر تھے اور وہاں اودھ میں سیر کرتے ہوئے علماء وفضلاء کی مجلس میں بھی جاتے رہے اور ان سے بہت فیض پایا۔ اس موقع پر فارغ ہو کر بداؤں چلے گئے اور اس سال شیخ محمد چھوٹے بھائی جن کی شادی کی تھی وہ بھی شادی کے تین ماہ کے بعد فوت ہو گیا۔ اور نور چشم عبداللطیف بھی فوت ہو گئے مگر ملا صاحب اس دور میں اکیلے رہ گئے۔

۹۸۷ھ میں چالیس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے ایک فرزند جس کا نام محی الدین رکھا، عطا فرمایا۔ وہ بساور میں پیدا ہوئے۔ ۱۰۰۲ھ میں مصیبتوں کے پہاڑ مجھ پر ٹوٹ پڑے اور جبرتوں کے تازیانے زبردست لگنے شروع ہوئے کہ جن لہو ولعب اور گناہوں میں اب تک مبتلا تھا ان سے توبہ کی توفیق نصیب ہوئی۔ اور خدا تعالیٰ نے میری بداعمالی سے مجھے آگاہ کیا۔

"آہ کہ گر من چنیں بجانم آہ"

ملا صاحب کے نشتر

یہ بھی مصدقہ بات ہے کہ پرانے بزرگ اپنے دور کی باتوں اور تعلیمات کے ہی خوگر رہتے ہیں۔ تو نئی تہذیب اور تعلیم ان کی پرانی باتوں کے ساتھ ٹکراتی اور تضاد رکھتی ہے جو کہ ان کو برا معلوم ہوا۔ اکبر نے انھیں دستہ میں کھینچنا چاہا۔ مگر انھوں نے سختی کا مظاہرہ کیا تو بہر حال ان کو راستے

سے ہٹانے کے لیے کئی انتظامات کیے گئے۔ ان خیالات کی ابتدا تھی جو فاضل مذکور دربار میں پہنچا۔ اس نے شروع میں خوب ترقی کے قدم اٹھائے۔ یہ تو جوان تھا۔ نئے نئے ولولے، جوش اور جوانی کی تمنائیں تھیں۔ مگر دوسری طرف بوڑھے ملا / عالم تھے جن کی بوسیدہ روایات کو پسند نہ کیا جاتا تھا۔

مگر حقیقت کو بھول گئے کہ سب کے اصول ایک ہی جیسے ہیں۔ مگر صرف زمانے کے مزاج ہی تبدیل ہو گیا ہے۔ اگر ان کے ساتھ سختی کروں گا تو خود بھی متاثر ہوں گا۔ وہ نئے زمانے میں پرانی تہذیب کے مسائل کو واجب العمل سمجھتا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کے درمیان مخالفت کے بیج بو گئے اور جو میرے فتح فیضی اور ابوالفضل اس کے خلیفہ اور استاد بھائی تھے۔ وہ نئے خیالات نہ رکھتے تھے بلکہ زمانہ کا مزاج بدل چکا تھا۔ اس لیے بھی ان کے ساتھ کسی نے بھی موافقت نہ کی اور ان کا ساتھ نہ دیا۔ اب حالات نے یہ رنگ دکھایا کہ:

''وہ لڑائی کرنے کے حق میں ہے مخدوم الملک اور شیخ صدر شریعت کا ٹھیکہ لیے ہوتے تھے مگر انھیں بھی قابل موافقت نہ سمجھتا تھا۔ کیونکہ دیانت دار اور امانت دار اور سچے دل سے شریعت کی پابندی چاہتا تھا۔ بہر حال کوئی مشہور عالم یا نامی عارف ایسا نہ تھا جو ان کے نشتر سے محفوظ رہا ہو اور زخمی نہ ہوا ہو۔

ملا بڑی سادہ طبیعت کے مالک تھے مگر ان کی طبیعت بڑی ہی شگفتہ و شاداب تھی۔ ان کی طبیعت انشاپردازی کی جان تھی۔ وہ علم و فضل کے اور شخصیت فقر کے گائے گئے تھے۔ بین پر ہاتھ دوڑاتے تھے۔ شطرنج دو طرح کا کھیلتے تھے اور لوگ ان کو برتن کے نام سے یاد کرتے تھے۔ بہر حال وہ اپنی کتاب میں ہر معاملے کو نہایت ہی خوبصورتی سے ادا کرتے تھے۔ ان کا ہر چٹکلہ اور فقرہ لطیفہ ہوتا تھا۔ ہزاروں تیر اور خنجر اس کے شگاف قلم میں ہیں۔ اس کی تحریر میں عبارت آرائی کا کام نہیں۔ بہر حال کوئی بلا تکلف لکھا جاتا تھا اور اس کا جو حصہ جی چاہتا تھا سوئی چبھو دیتا تو جہاں دل چاہتا خنجر کا زخم کر دیتا۔ چھری چاقو مارتا چلا جاتا تھا اور وہ اس خوبصورتی سے مارتا تھا کہ زخم کھانے والا بھی بجائے رونے کے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتا تھا۔ وہ اپنے آپ پر بھی پھبتیاں اور نقلیں کہتا جاتا تھا۔ اس کے لکھنے کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دوست و دشمن میں ذرا برابر بھی فرق نہ کرتا تھا۔ جن لوگوں کو برا کہتا ہے وہ بھی جہاں اپنے ساتھ سلوک کرتے ہیں۔ لکھ دیتا ہے اور جب کسی بات پر خفا ہوتا ہے تو وہیں اس کو صلواتیں سنانی شروع کر دیتا ہے۔

ملا کے ساتھ عجیب مگر خوفناک سانحہ

۹۷۹ھ میں وہ ایک اپنے خوفناک سانحہ کی یوں تفصیل دیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ:

وہ کانت گولہ حسین خاں کی جاگیر میں تھا تو ملا وہاں آیا۔ اس کے پاس صدارت کا عہدہ تھا اور فقراء کی خدمت کی بھی ذمہ داری اس کے سپرد تھی تو شیخ بدیع الدین مدار کا مزار مکن پور علاقہ قنوج میں واقع تھا۔ مجھے بھی اس مزار کی زیارت کا اشتیاق ہوا تو میں وہاں مزار پر زیارت کے لیے چلا گیا تو وہاں مجھ سے ایک بڑی بے ادبی واقع ہوئی مگر اس گناہ کی سزا بھی اس وقت اس جگہ پر مل گئی یعنی دوسری طرف سے چند آدمیوں کو اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا اور انھوں نے اپنی تلواریں کھینچ لیں۔ جس کی وجہ سے نو زخم سر، ہاتھ اور کندھوں پر آئے۔ تمام زخم گہرے تھے مگر سر کا زخم بڑا گہرا تھا جو کہ ہڈی کو توڑ کر مغز تک جا پہنچا تھا اور ...... سفر کا ثمرہ پایا۔ اپنے ہاتھ کی چھنگلی بھی کٹ گئی تو میں وہیں بے ہوش ہو کر پڑا، خیال تھا کہ زندگی کے دن

پورے ہو چکے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے بچا لیا۔

تو وہاں سے بانگر موئے کے قبضے میں آیا تو وہاں ایک بہت ہی قابل تجربہ جراح مل گیا۔ اس نے زخموں پر مرہم پٹی کی جس سے وہ مندمل ہو گئے تو اس مایوسی کی حالت میں اللہ تعالیٰ سے عہد کیا کہ

''حج کروں گا انشاء اللہ تعالیٰ۔''

تو وہاں سے بانگر موئے سے کانت گول میں آ گیا۔ وہاں آ کر غسل صحت کیا۔ مگر زخموں میں پانی بھر گیا اور دوبارہ بیمار ہو گیا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے خدا حسن خاں کو میرے لیے فرشتہ رحمت بنا کر روانہ کیا۔ انھوں نے میرے زخموں کی دیکھ بھال بڑے اچھے انداز سے کی تو تمام زخم میرے درست ہو گئے۔ تو وہاں سے بدایون آ گیا۔ تو وہاں آ کر دوبارہ زخموں کو چھیڑ دیا۔ جس کا نتیجہ قدرے بہتر معلوم نہ ہوا۔ دن کو بھی خوب ڈراؤنے نظر آنے لگے اور بچپن کی کہانیاں اور قصے درست ثابت ہونے لگے۔ اور خدا کی قدرت کاملہ پر یقین پختہ ہونے لگا۔

اسی سال بدایوں میں ایک بڑی آگ پھوٹ پڑی یا لگ گئی۔ تو اس آگ نے ہرا بھرا اور غیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اتنی تعداد سے مرد و عورت متاثر ہوئے کہ ان کا شمار کرنا محال ہے اس کو آگ نہ کہا جائے بلکہ قہر خدا کہا جائے تو بہتر ہے۔ تو اسی وقت ایک مجذوب جہاں دوآب کے علاقہ سے آیا تو میں نے اسے گھر میں ٹھہرایا۔ وہ باتوں باتوں میں ایک دن کہنے لگا کہ:

''یہاں سے نکل جائیں۔''

تو میں نے کہا کہ:

''کیوں نکل جاؤں؟''

اس نے جواب دیا کہ:

''یہاں خدائی کا تماشا نظر آئے گا مگر مجھے اس کی باتوں کا یقین نہ آیا۔''

تو ۹۸۱ھ میں ۱۰ برس کے پرانے دوست اور دینی بھائی حسین خاں سے اس کا جھگڑا ہو گیا۔ جس کے بارے میں کسی کو وجہ معلوم نہ ہو سکی کہ اس بگاڑ کی وجہ کیا تھی۔ وہ سیدھا سادہ سپاہی باوجود رتبہ آقائی کے مقام عذر خواہی میں آیا اور بدایوں میں ان کی ماں کے پاس آیا۔ اور سفارش چاہی مگر ملا صاحب نے ان کی ایک نہ مانی کیونکہ انھوں نے دربار شاہی میں جانے کی تجویز مصمم کر لی تھی تو لطف کی بات یہ ہوئی کہ اکبر کے دل میں بھی علم کی شعاعیں روشن ہو گئیں۔ تو اس نے محدود العقل علما کی یاوہ گوئیوں کو نظر انداز کر کے فہمیدہ اور مصلحت بیں بہت لوگوں کی قدر و منزلت کرنے لگا۔ اس کا رات کو جلسہ ہوتا تھا تمام علماء و فضلاء وہاں جمع ہوتے اور وہاں علمی مباحث منعقد ہوتی تھیں۔ مگر اس وقت ملا کی عمر جوانی کی تھی اس میں بھی جوش اور تیزی دماغ موجود تھی۔ اس وقت فیضی اور ابوالفضل بھی آگرہ میں کر گئے تھے۔ جمال خاں فو..... جو کہ اکبر کے مصاحبوں میں سے تھا۔ وہ بہت ہی قابل تعریف انسان تھا۔ غربا کی مدد کرتا تھا۔ سخی تھا۔ مگر وہ قدرت خدا کی وہ ۹۸۲ھ کو فوت ہو گیا۔

ملا کی ملازمت

۹۸۱ھ میں حسین خاں سے الگ ہو کر آگرہ میں آ گیا تو جلال خاں قورچی اور مرحوم جالینوس حکیم عین الملک کے ذریعے سے ملازمت شاہی حاصل کر لی۔ مگر ان دنوں میں جنس و دانش کا بڑا رواج تھا۔ تو جلدی ہی اہل نشست میں داخل ہو گیا تو بادشاہ نے علماء سے لڑا دیا۔ بادشاہ سلامت خود بات کو سمجھتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بہت سے لوگوں کو زیر کیا۔ پہلی ہی ملازمت میں فرمایا کہ:

"یہ بدایونی فاضل حاجی ابراہیم سرہندی کی سرکوب ہے وہ چاہتے تھے کہ وہ کسی طرح سے زک (شرمندگی) پائے۔"

میں نے اسے بھی خوب الزامات لگائے اور بادشاہ بہت خوش ہوئے۔ شیخ عبدالنبی صدر عالی قدر پہلے ہی خفا ہوئے تھے کہ ہم سے پالا پار آن پہنچا۔ اب جو مناظرے ہوئے تو ملا صاحب اس فتح یابی پر ناحق خوش ہوئے کیونکہ اس بات کا علم نہ تھا یہ فتح اپنی فوج کی شکست ہوئی ہے۔ کیونکہ بادشاہ سلامت کل علماء سے اعتقاد دھوتا گیا تھا اور ان کے ساتھ یہ ملا صاحب بھی ان کی نظروں سے گر گئے۔ ان دنوں میں شیخ فیضی و ابوالفضل کا ستارہ چمک رہا ہوتا۔ وہ ملازمت میں آیا تو اس نے بہت سی عنایات پائیں۔ جس کا اظہار ان کی تحریروں سے بخوبی ہوتا ہے۔

ملا صاحب پر شہنشاہ اکبر کی بھاری عنایت

ملا صاحب کہتے ہیں کہ بادشاہ اکبر نے مجھ پر بے نہایت اور بڑی محبت سے کہا کہ:

"سنگھاسن بتیسی" کی ۳۲ کہانیاں جو راجہ بکرماجیت کے حال پر ہیں ان کو سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کر کے طوطی نامہ کے رنگ میں نظم و نثر میں ترتیب دو اور ایک ورق نمونے کے طور پر آج ہی مجھے دکھاؤ۔ چنانچہ اس دن ملا صاحب نے ایک ورق تیار کر کے بادشاہ سلامت کے حضور میں پیش کر دیا۔ جس کو بادشاہ سلامت نے بہت سراہا اور پسند فرمایا۔ جب یہ کام مکمل ہو گیا تو نامہ خرد افزا اس کا تاریخی نام رکھا گیا اور اس کو کتب خانے کی زینت بنایا گیا۔

۹۸۳ھ کی صحبتیں موافق طبع تھیں کیونکہ ان کی بنیاد اصول و فروع مذہب پر تھیں اور بادشاہ نے بھی ابھی تک اس دائرے سے باہر قدم نہیں رکھا تھا۔ اکبر بادشاہ بعض علماء سے اس وجہ سے ناراض تھا کہ:

"وہ جو فروشی اور گندم عالی کے دیندار اور سلطنت میں صاحب اختیار بنے ہوئے تھے اور بعض سے وہ اس لیے خفا تھے کہ وہ زبانی جمع خرچ کرتے، مغالطے اور غلط اور دھوکے کی دلیلیں لا کر ان کے جو یدار بنے بیٹھے تھے۔"

مگر ان سب کو انھوں نے دبا لیا۔ ان کی غلطیوں کو پکڑ لیتے تھے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ معرکہ کرنے سے گریز کرتے تھے۔

ملا کی امامت اور بادشاہ کی کرم فرمائی

۹۸۳ھ کو مرزا سلیمان والی بدخشاں ادھر آ گیا تھا تو اکبر نے اس کا بڑے پرتپاک انداز سے استقبال کیا۔ مرزا سلیمان بھی عبادت خانے

میں آتا تھا۔ اور ان کی علاوہ شیخ سے بات چیت ہوتی تھی۔

ملا صاحب فرماتے ہیں کہ:

''وہ صاحب حال شخص تھا۔ اس سے معرفت کے بلند خیالات سنے گئے۔ انھوں نے کبھی نماز باجماعت ترک نہیں کی تھی تو ایک دن میں نے عصر کی نماز پڑھ کر دعا پر اکتفا کیا اور الحمد (سورہ فاتحہ) نہ پڑھی تو مرزا سلیمان والی بدخشاں نے اعتراض کیا کہ:

''حمد کیوں نہیں پڑھی۔''

تو میں نے جواب دیا کہ:

''آنحضرت کے عہد میں نماز کے بعد فاتحہ کا معمول نہ تھا بلکہ بعض روایتوں میں مکروہ بھی آیا ہے۔''

تو مرزا سلیمان والی بدخشاں نے کہا کہ:

''ولایت میں علم نہ تھا یا علماء نہ تھے؟''

تو میں نے جواب دیا کہ:

''ہمیں تو کتاب سے غرض ہے نہ کہ تقلید سے۔''

بادشاہ نے خود فرمایا کہ:

''آہستہ سے پڑھا کرو۔''

جس کو میں نے قبول کیا مگر کتاب سے کراہت کی روایت نکال کر دکھا دی۔

گجرات کی لوٹ مار میں اعتماد خاں گجراتی کے کتب خانے کی عمدہ کتب خزانہ عامرہ میں جمع تھیں۔ اور ان میں ایک کتاب جس کا نام ''انوار المشکوٰۃ'' بھی تھا۔ اس میں ایک فصل پہ نسبت اور نسخوں کے زیادہ تھی تو ابھی تک بادشاہ اپنی کو مخاطب کر کے مسئلوں کے بارے میں بحث کرتا تھا۔

حضور اکبر بادشاہ کے پاس سات امام تھے ہر ایک کو ہفتہ کے ایک دن کی امامت تفویض کی جاتی تھی۔ تو ملا صاحب بڑے خوش آواز شخص تھے تو ان کو بدھ کے روز کی امامت دی گئی۔ انھوں نے بدھ کی امامت کے لیے بڑا اہتمام کیا اور اس سال بیش کا منصب دیا اور کچھ مزید خرچ بھی عنایت کیا تو بادشاہ شیخ ابوالفضل اور مجھے کام دیا گیا تو شیخ ابوالفضل نے فوراً شروع کر دیا اور اس نے بڑی محنت سے کام ختم کر لیا مگر میں نا تجربہ کار اور سادہ لوح تھا۔ اپنے آپ کو بھی نہ سنبھال سکا۔ سادات انجو میں سے ایک شخص نے ایسے ہی موقع پر اپنے اوپر آپ مسخر کیا جو کہ میرے حسب حال تھا۔

مرادو اغلی سازی وبیستی

مینا و بادہ بدیں مستی

مجھے ان دنوں قناعت کا بڑا خیال تھا کیونکہ بادشاہ سلامت سے کچھ جاگیریں جائے گی اس پر قناعت کریں گے تو اس پر صبر کروں گا۔ مگر نہ ہو سکا۔ کیونکہ وہ میسر نہ ہو سکی۔

ملا صاحب کی بدحالی

ملا صاحب کی ابتدا بڑی اچھی تھی مگر افسوس کا مقام ہے کہ وہ اس کو جاری نہ رکھ سکے۔ اگر وہ اپنی اچھی روش کو جاری رکھتے تو یقیناً وہ بہت ترقی کرتے اور خوشحال پاتے۔ اس کے جاری نہ رکھنے کی وجہ ایک اور بھی تھی کہ وہ بہت ضدی شخص تھے اور اپنی غلط بات پر بھی ایسے ڈٹ جاتے تھے کہ ان کے نقصان کا بھی احساس نہ کرتے تھے بلکہ وہ اپنی ضد کو قابل فخر سمجھتے تھے اور تعریف کرتے تھے۔ ملا صاحب کو بخشی کا عہدہ ملا مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ مگر ابوالفضل نے فوری طور پر قبول کر لیا اور اس نے خوب ثمرہ پایا۔

۹۸۳ھ میں انھوں نے رخصت مانگی۔ مگر بادشاہ سلامت نے منظور نہ کی مگر بادشاہ نے ایک گھوڑا اور کچھ نقدی دی۔ اور ہزار بیگھہ زمین بھی دی اور کہا کہ:

"فوجی دفتر سے تمہارا نام نکال دیتے ہیں۔ ان دنوں میں بخشی کے عہدے پر نظر کر کے یہ انعام مجھے بہت نظر آیا جو کہ ہزاری کا ہم پلہ تھا۔"

یہ سب کچھ ٹھیک تھا مگر صدر کی ناموافقت اور زمانہ کی بدمددی سے خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا۔ اور آئندہ ترقی کا رستہ بند ہو گیا۔ اتنا صرف ہوا کہ فرمان میں مدد معاش کا لفظ لکھا گیا نہ کہ جاگیر۔

بار بار عرض کی گئی کہ اتنی زمین پر ہمیشہ حاضری کیونکر ہو سکے گی تو فرمایا کہ:

"فوج کے زمرہ میں ترقی مل جائے گی۔ انعام سے بھی امداد ہوا کرے گی۔"

تو شیخ عبدالنبی صدر صاحب بولے کہ:

"تمھارے ساتھیوں میں سے کسی کو اتنی مدد معاش نہیں دی گئی۔"

اب تک ۲۴ برس ہو گئے آگے ترقی کا راستہ بند ہے اور مددیں قدرت الٰہی کے پردے میں ہوا کرتی ہیں، ایک دو دفعہ سے زیادہ انعام کی بھی صورت نہ دیکھی صرف وعدوں پر ہی زندگی گزار دی۔ اور اب تو زمانے کا ورق ہی الٹ گیا۔ البتہ خدمتیں ہیں جن کا کچھ نتیجہ نہیں اور صرف مہمل پابندیاں ہیں کہ مفت میں گلے پڑی ہوئی ہیں۔ اب اس کے بعد اختلافی مسائل بھی سامنے آنے لگے جس سے بادشاہ اور شیخ صدر وغیرہ کے دلوں میں اختلاف پڑ کر حالتیں بدلنے لگیں۔ ان مسائل میں سے ایک پہلا مسئلہ یہ سامنے آیا کہ:

"ایک خداوندکی ایک وقت میں کتنی جوروئیں (بیویاں) ہونی چاہییں؟"

ایک دن جلسہ میں امراء سے اکبر نے دریافت کیا کہ:

"تعداد نکاح کی کہاں تک اجازت ہے؟"

اس نے یہ بھی وضاحت کی کہ جوانی میں تو ان کا خیال نہ تھا مگر اب بڑھاپے میں ان باتوں کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ تو اس بڑھاپے کی بیویاں کیا کرنا چاہیے؟ یعنی کتنی بیویاں رکھی جائیں؟

توہر شخص حاضر نے اپنی اپنی دانست کے مطابق جواب دیا مگر اکبر نے فرمایا کہ:

''ایک دن شیخ صدر یہ کہتے تھے کہ بعض کے نزدیک تو 9 بیبیاں جائز ہیں۔''

مگر بعض بولے کہ

''ہاں!! ابن ابی لیلے کی یہی رائے ہے۔''

کیونکہ اس آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ:

''فانکحوا ماطاب لکم مثنی وثلاثۃ ......''

یعنی نو بیویاں اور جنھوں نے دو دو تین تین چار چار کے معنوں کا خیال کیا۔ وہ ۱۸ بھی بتاتے ہیں۔ مگر یہ تمام روایات اور تحویلات اسلام کی تعلیمات سے خارج ہیں۔ نو بیویاں صرف پیغمبر اسلام کے لیے جائز تھیں اور اب اس کے امتیوں کے لیے ایک وقت میں صرف چار بیویاں رکھنے کی اجازت ہے۔ اگر وہ ان میں انصاف کر سکتے تو۔ تو اس وقت شیخ الاسلام سے پوچھا گیا تو انھوں نے بھی وہی جواب دیا۔ کہ میں نے اختلاف علماء کا بیان دیا تھا۔ فتویٰ نہیں دیا تھا۔ مگر یہ بات بادشاہ کو بہت بری لگی اور اس نے سخت ناپسند کیا اور کہا کہ:

''اگر یہ بات ہے؟ تو شیخ نے نفاق برتا ہے ہم سے جب کچھ اور کہا اور اب کچھ اور کہتے ہیں اور اس بات کو دل میں رکھا۔''

جب ایسی اختلافی باتیں ہونے لگیں تو بادشاہ کا مزاج علماء کرام سے متنفر ہو گیا تو زمانے کے تاک میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی اپنی اپنی زبان بولنے لگے۔ اس وقت عالم یہ تھا کہ محدثی کا نقارہ بجتا تھا اور اس کی شہرت تھی کیونکہ وہ مدینہ منورہ سے حدیث کا فیض لے کر آیا تھا اور امانت دار کا حق کیونکہ امام اعظم کی اولاد تھے یہ اب یہ حال ہوا کہ مرزا عزیز کوکہ نے کہا کہ:

''حدیث النجوم سوء النطق۔''

تو کچھ پچھ جاتا ہے۔

غرض کہ بادشاہ دونوں سے بے اعتقاد ہو گیا تھا اور فیضی اور ابوالفضل کے اس موقع کو غنیمت جانا۔

برہمن کا شوالہ بنوانا

انہی دنوں میں متھرا کے قاضی نے شیخ صدر کے پاس استغاثہ کیا کہ:

مسجد کے مصالح پر ایک سرشور و مالدار برہمن نے قبضہ کر کے شوالہ بنالیا ہے تو جب اس کو منع کیا گیا تو اس نے پیغمبر کی شان میں بے ادبی اور گستاخی کی اور اس کے ساتھ مسلمانوں کی بھی بہت سی تذلیل کی۔ تو جب شکایت کی گئی تو شیخ ابوالفضل نے طلبی کا حکم دیا۔

''مگر وہ برہمن حاضر نہ ہوا۔''

تو نوبت اکبر تک جا پہنچی تو بیربل اور ابوالفضل جا کر اپنی رسائی اور ذمہ داری پر اس کو جائز لے آئے۔ تو ابوالفضل نے لوگوں سے جو کچھ سنا تھا۔ عرض کیا اور کہا کہ:

''بے ادبی بے شک اس سے ہوئی۔''

تو اس مسئلے پر علماء کے دو گروہ ہو گئے۔ ان میں سے ایک طبقے نے یہ فتویٰ دیا کہ:

''اس برہمن کو شان رسول میں گستاخی کی وجہ سے قتل کی سزا دی جائے۔''

تو دوسرے طبقے نے کہا کہ:

''صرف جرمانہ اور اس کے جرم و سزا کی تشہیر کی جائے۔''

مگر شیخ صدر بادشاہ سے قتل کی توثیق چاہتے تھے۔ مگر بادشاہ سلامت واضح احکام نہ دیتے تھے۔ مگر وہ ٹال دیتے تھے اور کہتے تھے کہ:

''احکام شرعی تمھارے متعلق ہیں ہم سے کیا پوچھتے ہیں؟''

اس وضاحت نہ ہونے کی وجہ سے برہمن کافی مدت تک قید ہی رہا۔ محل کی رانیوں نے بھی سفارشیں کیں مگر شیخ کا بھی کچھ ضد تھا اور خیال تھا۔ آخر جب شیخ نے بہت تکرار کیا تو کہا کہ:

''بات وہی ہے جو کہ میں کہہ چکا ہوں۔ اور جو مناسب جانو وہ کر لو۔''

تو شیخ نے گھر پہنچتے ہی قتل کا حکم صادر کر دیا۔

جب یہ خبر اکبر بادشاہ کو ملی تو وہ بہت ناراض ہوا تو اندر سے رانیوں اور باہر سے مصاحبوں نے یہ واویلا کھڑا کر دیا کہ:

''ملانوں کو حضور نے اس قدر سر چڑھا لیا ہے کہ وہ اب حضور کی خوشی کا بھی خیال نہیں کرتے بلکہ وہ اپنا جلال دکھاتے ہیں۔''

آخر کار ہوئی روز قدر کے بعد مجھ سے بھی پوچھا گیا تو میں نے عرض کیا کہ:

''حقیقت میں جو حضرت نے فرمایا اسی طرح ہے۔''

مگر شیخ کو اصل معاملے کا علم نہیں تھا اور میں نے کہا کہ:

''شیخ عالم دین ہے باوجود اس روایت کے جو دیدہ دانستہ قتل کا حکم دیا۔ تو ظاہر ہے کہ اس میں مصلحت ہوگی۔''

انھوں نے فرمایا کہ:

''مصلحت کیا ہے؟''

میں نے کہا کہ:

''فتنہ کا دروازہ بند ہو اور عوام میں جرأت کا مادہ نہ ہو۔''

شیخ عبدالنبی کا کام روز بروز تنزل پذیر ہونے لگا اور آہستہ آہستہ کدورت بڑھتی گئی۔ دل پھرتا گیا۔ اوروں کو ترجیح دینے لگے اور نئے اور پرانے اختیارات ہاتھ سے نکلنے لگے۔ دربار میں جانا چھوڑ دیا۔ شیخ میاں کے بھی تاک میں لگے تھے تو وہ انہی دنوں میں آگرہ سے فتح پور پہنچے تو ملازمت کے وقت بادشاہ نے سارا ماجرا اس کو سنایا تو انھوں نے کہا کہ:

''آپ خود مجتہد اور زمانہ کے امام ہیں۔ شرعی اور ملکی احکام کے اجرا میں ان کی ضرورت کیا ہے؟''

تو بادشاہ نے کہا کہ:

''جب تم ہمارے استاد ہو اور سبق تم سے پڑھا ہے تو ان ملاؤں کی منت سے خلاصی کیوں نہیں دیتے؟''

بادشاہ ان بے علم ملاؤں سے سخت بیزار ہو چکا تھا کیونکہ وہ ہر معاملے میں اکبر بادشاہ کے ساتھ مخالفت شروع رکھتے تھے اور اکبر بادشاہ اور ملاؤں کے درمیان اختلاف کی خلیج وسیع تر ہوتی جا رہی تھی جو کہ دونوں کے لیے مناسب نہ تھی۔

بادشاہ اور درباریوں کی شہرت بد

شیخ صدر مسجد میں تشریف رکھتے تھے اور اس کے گرد ملانے جمع تھے۔ ہر ایک اپنی اپنی زبانی اہل دربار کو بے دینی اور بدمستی کے الزامات دے کر بدنام کرنے کی کوشش کی۔ مخدوم الملک سے ان کے حالات خراب تھے۔ ایسے یہ نازک حالات کا دور تھا۔ جبکہ دونوں آپس میں مل بیٹھے تھے شیخ مبارک اور اکبر بادشاہ تو اس وقت جو بھی بادشاہ کروانا چاہتا تھا تو شیخ مبارک اس کی وضاحت کر دیتا تو تمام ملاؤں کو بلا کر حکم دیتا تھا کہ جلد ان پر اپنی مہر ثبت کریں۔ ورنہ یہ امامت کیا ہے۔ ملامت کیا ہے؟

آخر کار مخدوم الملک کے ساتھ ہی ان کو حج پر روانہ کر دیا اور ان کے ساتھ یہ حکم دیا تھا کہ:

''وہیں عبادت میں مصروف رہیں اور جب تک تم کو طلب نہ کیا جائے تو واپس نہ آئیں۔''

بیگمات نے بھی بہت سفارش کی مگر خیر بہت حاصل نہ ہو سکی۔ کیونکہ ہر روز نت نئی شکایتیں حاصل ہوتی رہتی تھیں جو بے بغاوت کا بھی خطرہ ہو سکتا تھا۔ جس کی وجہ سے اکبر بادشاہ کو ملاؤں سے محتاط رہ کر یہ بھی اختیار رکھنا پڑتا تھا اور اپنی سلطنت کے انتظامات کیلئے طرح لوگوں کے ساتھ بھی اتفاق کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ لوگوں کی مخالفت میں اضافہ نہ ہو۔ اور حالات خراب نہ ہوں۔

۹۸۵ھ میں راجہ بھگوان کو بریلی کے علاقہ میں رعایا کو بحال کرنے کے لیے روانہ کیا گیا تو جب وہ وہاں بریلی کے علاقہ میں پہنچا اور اس سے چند دن وہاں قیام کر کے حالات کا جائزہ لیا تو اس کے بعد اس نے ایک رپورٹ دربار شاہی کو روانہ کی جس کا مضمون یہ تھا کہ:

''شیخ عبدالغفار کو روانہ کر دو۔ کیونکہ وہ اس ملک کے اچھے اور برے لوگوں کو بھی جانتا ہے اور ملک کے حالات سے بھی اچھی طرح واقف ہے۔ اور لوگ اس پر اعتبار بھی کرتے ہیں۔ نیز دربار میں اس کے پاس کوئی خاص خدمت بھی نہیں ہے۔''

تو جب یہ مراسلہ اکبر بادشاہ کے پاس پہنچا تو اس نے بار بار غور سے پڑھ کر سنا۔ مگر اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

تو اس سال اجمیر کے مقام سے حاجیوں کا ایک قافلہ مکہ معظمہ حج کے لیے روانہ ہوا تو شاہ ابو تراب کو امیر الحج مقرر کیا گیا۔ بہت سا سامان ساتھ دیا گیا۔ سلاطین گجرات ان سے بڑا اعتقاد رکھتے تھے۔

تو میں نے شیخ عبدالنبی صدر سے کہا کہ:

''مجھے بھی رخصت دلا دو۔''

تو شیخ ابوالفضل نے دریافت کیا کہ:

"اس کی ماں زندہ ہے۔"

تو اس نے جواب دیا کہ:

"ہاں، زندہ ہے۔"

تو شیخ ابوالفضل نے سوال کیا کہ:

"بھائیوں سے کوئی خدمت کرنیوالا موجود ہے؟"

میں نے جواب دیا کہ:

"کوئی نہیں۔"

تو انھوں نے کہا کہ:

ماں سے حج پر جانے کے لیے اجازت حاصل کرلو۔ مگر والدہ نے اجازت سے انکار کردیا اور حسرت کے مارے ہاتھ ملتا رہا۔ حج کی سعادت بھی نصیب نہ ہوئی۔"

ملا عبدالقادر کی تصنیف

بادشاہ اکبر ۹۸۶ھ میں پنجاب کا دورہ کر کے دریا کے راستے دہلی پہنچا اور وہ آ پہلی کشتی سے اتر کر خانی کشتی پر سوار ہوا۔ اس نے سانڈنیوں کی ڈاک بٹھادی اور عین موقع پر اجمیر پہنچ کر عرس میں شامل ہوئے اور دوسرے ہی دن عرس سے فارغ ہو کر رخصت ہو کر آگرہ روانہ ہوئے تو صبح کے وقت ٹونڈہ پہنچے۔

تو ملا صاحب لکھتے ہیں کہ:

"میں بساور سے چل کر بادشاہ کے استقبال کے لیے پہنچا تھا۔ تو میں نے حاضر خدمت ہو کر کتاب الاحادیث بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔ اس میں جہاد کی فضیلت اور تیراندازی کے ثواب بیان کیے گئے تھے۔ اور اس کا نام بھی تاریخی رکھا تھا۔ اس کتاب کو اکبر بادشاہ نے بہت پسند فرمایا اور خوش ہو کر اس کتاب کو کتب خانہ شاہی میں جگہ دی گئی۔ اس خوشی کی وجہ سے بادشاہ نے غیرحاضری اور وعدہ خلافی کا کوئی ذکر نہ کیا۔ ۹۷۸ھ سے پہلے کی تصنیف ہوئی۔ ملا سکون سے بیٹھنا پسند نہ کرتا تھا کچھ نہ کچھ تحریر کرتا ہی رہتا تھا۔

ملاؤں کی اصلیت کیا؟

راجہ مان سنگھ کو جب فتح ہوئی تو رانا بھاگ گیا تو امراء مشوروں کے بیٹھے اور انھوں نے علاقے کے بندوبست کے انتظامات کے لیے بحث شروع کی۔ رام پرشاد ایک بڑا اونچا اور جنگلی ہاتھی رانا کے پاس تھا۔ بادشاہ نے کئی مرتبہ مانگا تھا۔ مگر اس نے نہ دیا۔ وہ بھی لوٹ میں حاصل ہوا تھا۔ تو

امراء کا مشورہ ہوا کہ اسے فتح نام کے ساتھ حضور میں بھیجنا چاہیے تو آصف خاں نے (شیخ عبداللہ رد بدایونی) میرا نام لیا۔ کہ یہ صرف ثواب کی خاطر آئے تھے ان کے ساتھ بھیج دو۔

تو مان سنگھ نے کہا کہ

"ابھی تو بڑے بڑے کام کرنے ہیں۔ وہ لبعد ان معرکہ میں صف جنت کے آگے امامت کریں گے۔"

تو میں نے جواب دیا کہ:

"یہاں کی امامت کے پیے تھا ہے۔ میرا اب یہ کام ہے کہ میں جاؤں اور بندگان حضرت کی صف کے آگے امامت کروں گا۔"

مان سنگھ اس لطیفے پر بہت خوش ہوئے اور سفارش نامہ لکھ کر رخصت کیا۔ تو وہ مانکپور اور ڈھل گڑھ سے ہوتا ہوا آبیرے کے راستے پہنچا جو کہ مان سنگھ کا وطن تھا۔ اس کے ساتھ ہی جے پور آباد ہے۔ راستے میں مان سنگھ کی فتح کا حال لوگ بیان کرتے رہے مگر یقین نہ آتا تھا۔ آبیرے سے پانچ چھ کوس کے فاصلے پر ہاتھی بجن میں پھنس گیا اور وہ جوں جوں آگے بڑھنے کی کوشش کرتا تھا زمین میں دھنستا جاتا تھا اور ملاے بہت پریشان ہوئے اور کافی گھبراہٹ کا بھی شکار ہوئے۔ اور اس ایک واقعہ سے اندازہ لگائیں کہ مہمات سلطنت اور اس کے خطرناک پوجھا گران لوگوں گردنوں میں پڑ جائیں تو چھاتی بچے یا پھٹ جائے؟

اکبر بادشاہ لشکر کو لیے آمیر کے گرد پڑا تھا۔ مگر محاصرہ نے طول کھینچا تو ایک بارش کے موسم میں ابوالفضل فوج لے کر زیر دیوار پہنچا اور اسے ڈال کر بکف قصہ میں کود پڑا۔ پہلے تو اتنا بڑا دل والا تھا جو کہ خود دیوار کو پھاند کر اندر جانے کی کوشش کرتا۔ باتیں تو سارے ہی کرتے ہیں مگر کام کوئی کوئی کرتا ہے جو کام سودمند اور فائدہ مند ہوتا ہے۔

وہاں کے لوگ آئے اور انھوں نے کہا کہ:

"اگلے برس ایک بادشاہی ہاتھی پھنس گیا تھا۔ اس کا یہی علاج ہے کہ تھیوں مشکوں میں پانی بھر بھر کر ڈالتے ہیں تو ہاتھی نکل آیا ہے لہذا مشکی بلائے گئے تو انھوں نے ہمت کر کے جھدی سے بہت سا پانی لا ڈالا اور جب آہستگی سے خود ہاتھی باہر نکل آیا تو گرداب ہلاکت سے نجات پائی۔"

یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہاتھی بڑی مشکل سے نکلا تھا اور آبیرے میں پہنچے تو وہاں کے لوگ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ وہ آدمی وہاں سے گاؤں میں لائے تو گاؤں کے لوگوں نے بار بار خوش ہو کر اس ہاتھی کو دیکھا اور اپنے راجہ کی تعریف کرتے نہ تھکتے تھے۔

چنپر پرشاد ہاتھی

وہ جوں توں کرتے ہوئے فتح پور پہنچے (راجہ بھگوان داس راجہ ان کے باپ تھے) ان کے کوکی کی معرفت فتح نامہ اور ہاتھی ان کے حضور میں گزارا تو انھوں نے فرمایا کہ:

''اس ہاتھی کا نام کیا ہے؟''

تو انھوں نے جواب دیا کہ:

''رام پرشاد۔''

تو انھوں نے کہا کہ:

''یہ سب پیر کی پرورش ہے۔ لہٰذا اس کا نام پیر پرشاد ہے۔''

پھر فرمایا کہ:

''تمہاری تعریف بھی بہت لکھی گئی ہے تو سچ بتاؤ کہ تم کونسی فوج میں تھے اور کیا کیا کام کیا؟''

تو اس نے عرض کیا کہ:

''بادشاہوں کے حضور میں سچ بھی ڈرتے لرزتے ہی کہا جاتا ہے۔ فدوی جھوٹ کیونکر عرض کرے گا۔''

تو سوال کیا گیا کہ:

''جنگی لباس تھا یا ننگے ہی تھے؟''

عرض کیا کہ:

''زرہ بکتر تھا۔''

وہ دریافت کیا گیا کہ:

''وہ کہاں سے دستیاب ہوا؟''

تو عرض کی کہ:

''سید عبداللہ خاں سے حاصل ہوا تھا۔''

یہ تمام جواب بہت پسند کیے گئے تو وہ گنج سے ایک لپ بھر کر انعام دیا گیا۔ ۹۶ خیال:..... گنگیں۔ پھر سوال کیا کہ شیخ عبدالنبی سے مل لیے؟

تو جواب دیا کہ:

''دو گردوارہ سے دربار حاضر ہوا ہوں۔ ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی۔''

تو انھوں نے ایک تھوڑی بڑھیا دی کہ یہ لیتے جاؤ اور شیخ سے ملو تو اس کو کہو کہ:

''اسے از خود ہمارے بیت سے کارخانے کا ہے۔ تمہارے حق لیے فرمائش کر کے منگوایا ہے۔''

میں اسے لے گیا اور ان کا پیغام بھی پہنچا دیا تو شیخ صاحب وصول کر کے بہت خوش ہوئے تو پوچھا کہ رخصت کے وقت میں نے کہہ دیا تھا کہ:

''صفوں کا آمنا سامنا ہو تو دعا سے یاد کرنا۔''

میں نے کہا کہ:

"کل مسلمانوں کے حق میں جو دعا ہے وہ پڑھی تھی۔"

تو انھوں نے کہا کہ:

"یہ بھی کافی ہے الحمدللہ یہی شیخ عبدالنبی ہیں۔ آخر حال میں اس بدحالی کے ساتھ اس دار فانی سے رخصت ہوئے کہ خدا نہ دکھائے اور سنائے۔ مگر اس سے سب کو عبرت حاصل کرنی چاہیے۔"

ہم کسی سے زبردستی خدمت نہیں لیتے؟

ملا صاحب لکھتے ہیں کہ میں وطن سے واپس آگیا تو رمضان کا مہینہ تھا تو اجمیر کے مقام پر قاضی علی نے مجھے بھی پیش کیا تو انھوں نے مدد معاش کے لیے ہزاری دیکھ دیا اور پھر فرمایا کہ:

"میں جانتا ہوں کہ اس فرمان بھی مشروط مشروط ہے۔"

عرض کی کہ:

"ہاں بشرط خدمت۔"

اس کے بعد فرمایا کہ:

"پوچھو کچھ صفت تھا کہ حضرت ہو سکے۔"

تو غازی بدخشانی فوراً بول اٹھے کہ:

"ضعف طالع تھا۔"

ابوالفضل نے بھی جواب دیا کہ:

"مقربوں میں سے ایک ایک نے امامت سابق کے لیے سفارش کی۔ یہاں تک کہ نماز معزول ہو گئی تھی اور امامت بھی تحیف میں آ گئی تھی۔"

شہباز خاں بخشی نے عرض کیا کہ:

"خدمت میں تو ہمیشہ ہی رہتے ہیں۔"

تو پھر فرمایا کہ:

"ہم کسی سے زبردستی خدمت نہیں چاہتے اگر خدمت نہیں چاہتا تو آدھی زمین رہی۔"

میں نے اس کو فوراً تسلیم کیا جو کہ یہ گستاخانہ حرکت سخت ناگوار گزری اور اس نے منہ پھیر لیا۔

قاضی نے پھر عرض کیا کہ:

"اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟"

شیخ عبدالنبی صدر ابھی نکالے نہ گئے تھے کہ لشکر میں ہی تھے تو انھوں نے فرمایا کہ:
''ان سے معلوم کرو کہ بغیر خدمت کے کتنی زمین کے مالک تھے تو شیخ نے مولانا اللہ داد امروحہ کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ:
''عیال دار ہے اور سنا جاتا ہے کہ خرچ بھی زیادہ ہے۔''
حضور اگر اس طرح فرماتے ہیں تو ساتا ٹھ بیگھہ تو ضرور چاہیے ہوگا۔ تو مقربان نے یہ بھی مناسب نہ سمجھی اور مجھے حضور خدمت میں مجبور کیا تو میں مجبوری سے دوبار پھنس گیا۔
اور یہ ساری ناراضی اس بات پر تھی کہ داغ کی خدمت کے یے کہا گیا جس کے لیے اصرار بھی کیا گیا مگر اس کو قبول نہ کیا۔ میں اس کو سمجھتا بھی اور یہی جتا بھی رہا مگر وہ نہ مانے یہ تو اس کی اپنی رضا تھی۔ جس کا میں تو پابند نہیں تھا۔

ملا صاحب مظہری لونڈی پر عاشق ہو گئے

یہ ملا صاحب کی تحریر و تصنیف کی سب سے بڑی خوبی سمجھتے کہ انھوں نے تحریر میں کسی بھی بات کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش نہیں کی خواہ وہ ان کے اپنے بارے میں ہو یا کسی دوسرے کے بارے میں۔ بہر حال انھوں نے بے لاگ کے اس دعویٰ کرنے کی کوشش کی ہے تو اس سلسلے میں ایک ذاتی واقعہ یوں بیان کرتے ہیں کہ:
مظہری نامی ایک لونڈی تھی جس میں ظہور قدرت کا نمونہ تھا تو میں (ملا صاحب) اس پر عاشق ہو گئے تو اس کے عشق نے ایسی آواز دی اور دار شگی طبیعت میں پیدا کی کہ سال بھر برابر بساور میں پڑا رہا تو دوران عجیب و غریب قسم کے خیالات دل و دماغ میں آتے جاتے تھے آخر کار پریشان حال ۹۸۹ھ میں برس دن کی غیر حاضری کے بعد فتح پور میں ملازمت اختیار کر لی۔ ان دنوں سفر کابل سے تا حال ہی واپس آئے تھے تو شیخ ابوالفضل سے پوچھ گیا کہ:
''اس سفر میں وہ کیوں کر رہ گیا تھا؟''
تو انھوں نے عرض کیا کہ:
''یہ ذو مدد معاشیوں میں سے ہے۔''
''بہت ادھر ادھر ہو گئی۔ کابل کے پاس بھی صدر جہاں سے کیا تھا کہ جو لوگ اہل سعادت ہیں ساتھ ہیں یا رہ گئے ہیں پیچھے عاقبت اندیشی اور..... نقصان کا خیال کی آخر توکل خدا نے اپنا کام کیا۔ آج ۷ برس ہوئے اب تک ..... دل سے نہیں جاتی۔ جب یاد کرتا ہوں تو اندازہ روتا ہوں۔ کاش کہ جیسی دیوانہ ہو جاتا سر جاؤں.....

ملا صاحب کی تصانیف

۹۹۰ھ بادشاہ اکبر کی طرف سے یہ حکم ہوا کہ ہجرت کے ہزار سال بیت چکے ہیں۔ مصنفین ہر جگہ ہجری کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ کتاب کیا

ہجری کا ذکر ملتا ہے۔ اب ہم بھی ایسی تاریخ لکھیں کہ جس میں صرف سن ہجری کا ذکر آئے اور اس میں پورے ہزار سال کا حال شاہان اسلام کا درج ہو۔ درحقیقت مطلب یہ تھا کہ تاریخوں کی فاتح ہو۔ تو اس کتاب کا نام تاریخ.... رکھا جائے۔ سنوں کے بجائے ہجرت کے انتقال رحلت لکھیں۔ رول روز وفات سے برس برس دن کا حال ے شخصوں کے سپرد ہوا جیسا کہ تفصیل ذیل میں دیا جاتا ہے:

i- سال اول نقیب خاں کے ذمہ لگایا گیا تھا۔

ii- سال دوئم شاہ فتح اللہ کے سپرد کیا گیا تھا۔

iii- سال سوئم حکیم ہمام حکیم علی کے حوالے کیا گیا۔

iv- سال چہارم حاجی ابراہیم سرہندی کے ذمہ لگایا گیا۔

وہ انہی دنوں میں گجرات میں تھا۔ مرزا نظام الدین اور فقیر (فاضل بدایونی) دوسرے ہفتے میں پھر اسی طرح سے آدمی تجویز ہوئے۔ اس طرح جب ۳۵ سال کا حال مرتب ہوا تو ایک رات میری تحریر میں سے ساتویں سال کا حال پڑھ کر سنایا گیا۔ اس میں خلیفہ حقانی شیخ ثانی کے زمانے میں بعض روایات تھیں۔ جن میں شیعوں اور سنیوں کا اختلاف پایا جاتا تھا۔ نماز کے اوقات کے تقرر کا ذکر ہے اور شہر نصیبین کی فتح کا ذکر تھا کہ بڑے بڑے مرغوں نے برابر چوزے وہاں سے نکلے۔ تو بادشاہ بے حد متاثر ہ آصف خاں ثالث یعنی مرزا جعفر نے بہت بد مددی۔ البتہ شیخ ابوالفضل اور غازی خاں بدخشی ٹھیک ٹھیک تو نہیں کرتے تھے مجھ سے پوچھا کہ یہ باتیں کیونکر تھیں؟

میں نے کہا کہ:

"جو کتابوں میں پایا گیا وہ لکھا گیا ہے۔ اختراع نہیں کیا گیا۔"

تو اس وقت روضۃ الاحباب اور تاریخ کی کتابیں خزانے سے منگوا کر نقیب خاں کو دی گئیں کہ تحقیق کریں۔ تو اس نے تحقیق کرنے کے بعد جو کچھ پایا اور جس طرح پایا اس نے کہا۔ خدا کی عنایت کہ ان بے جا گرفتوں سے خلاصی ہوئی۔

چھتیسویں سال سے ملا احمد ٹھٹھوی کو حکم ہوا کہ:

"تم اس کو مکمل کرو۔"

ترجمہ حکیم ابوالفتح کی سفارش سے ہوا تھا۔

ملا احمد متعصب شیعہ تھے۔ اس نے جو چاہا سو لکھ مارا۔ اپنے چنگیز خاں کے زمانے تک دو جلدیں مکمل کیں۔ تو ایک مدت مخالف مذہب کے جوش سے مرزا فولاد برلاس اس کے گھر آیا اور اس نے کہا کہ:

"حضور نے یاد کیا ہے۔"

وہ نکل کر اس کے ساتھ ہو لیے مگر راستے میں اس کو قتل کر ڈالا کہ اس تاریخ کو سرے سے مقابلہ کرو اور سنوں کی پس و پیش کو درست کرو۔"

اول دوئم جلد کو درست کیا اور جلد سوم کو آصف خاں کے لیے رکھ دیا۔ اس برس کے واقعات میں سے مہابھارت کا ترجمہ ہے یہ ہندوؤں کی

بڑی اہم اور مشہور کتاب ہے۔ اس کتاب میں رنگا رنگ کی پند و نصائح، مصلحتیں، اخلاق، آداب، معاش، معرفت، اعتقاد، بیان مذہب، طریق عبادات اور ان کے ذیل میں کوروں پانڈوں کی لڑائی جو کہ ہندوستان کے فرمانروا تھے جس کو چار ہزار برس کا عرصہ ہو چکا ہے اور بعض کا خیال ہے کہ ۹ ہزار برس سے بھی زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے۔ ہندوستان کے لوگ اس مہابھارت کتاب کو پڑھنے، لکھنے کا عبادت عظیم تصور کرتے ہیں مگر وہ مسلمانوں سے پوشیدہ رکھتے ہیں۔ وہ اکبر پر طنز کر کے کہتے تھے کہ ان کو سبب یہ تھا کہ انھیں دنوں میں شاہ نامہ باتصویر لکھوایا جاتا تھا۔ اور امیر حمزہ کا قصہ بھی ۱۷ جلدوں میں باتصویر مرتب ہو کر ۱۵ برس کے عرصے میں تیار ہوا تھا۔ قصہ ابو مسلم اور جامع الحکایات وغیرہ کو بھی بار بار پڑھا کے سنا گیا اور لکھوایا گیا تھا۔ خیال کیا کہ یہ سب شاعری اور شاعروں کی تراشیں ہیں۔ مگر کسی مبارک وقت میں لکھی گئی تھیں اور ان کا ستارہ موافق تھا جس کی وجہ سے ان کو خوب شہرت ملی۔ پس ہندی کتب کہ بے دانایاں حماب و مرتاض نے لکھی ہیں وہ سب صحیح اور درست ہیں اور ان لوگوں کے دین کا عقائد کا عبادات کا دار و مدار اسی پر ہے۔ دین اور دنیا کی سعادت ہے اور دولت و قسمت بے زوال کا باعث ہے اور کثرت اور اولاد کا سبب ہے۔ اس کام کے لیے انھوں نے پانڈی کی اور پنڈتوں کو جمع کیا اور اصل کتاب کا ترجمہ بتایا گیا۔ چند شب آپ اس کے معنی نقیب خاں کو سمجھاتے رہے وہ فارسی میں لکھتا چلا گیا تیسری رات فقیر (ملا صاحب) کو بلا کر فرمایا کہ:

نقیب خاں کے ساتھ شامل ہو کر لکھا کرو۔ تین چار ماہ تک میں سے دو پرب (فن) میں نے لکھے۔ اس پر کیا کیا اعتراضات نہ ہوئے حرام خور اور شلغم خور و خورد کہا۔ سچ تو ہے کہ قسمت کا لکھا ضرور ہوتا ہے۔ پھر تھوڑا ملا شیری اور نقیب خاں نے لکھا اور تھوڑا حاجی سلطان تھانیسری نے اکیلے نے مکمل کیا۔ پھر شیخ فیضی کو حکم ہوا کہ:

نظم و نثر لکھو وہ بھی دو پرب (فن) آگے نہ بڑھا۔ پھر حاجی مذکور نے دوبارہ لکھی اور جو جو غلطیاں رہ گئی تھیں انھیں درست کیا گیا اور جو جتے خراب لکھے ہوئے تھے ان کی ورق کی گئی اور ترجمہ کے مطابق درست کی گئی۔ آخر کار حاجی کو بھی ایک وجہ سے بھکر کی طرف نکالا گیا۔ اکثر ترجمہ بتانے والے کوروں اور پانڈوں کے پاس پہنچے جو باقی ہیں انھیں خدا نجات دے اور ان کے توبہ نصیب کرے۔ اس کا نام ''رزم نامہ'' رکھا اور دوبارہ باتصویر لکھوا کر امرا کو حکم ہوا کہ مبارک سمجھ کر نقل کرو۔ شیخ ابوالفضل نے دو جزو کا خطبہ بھی لکھ کر لگایا۔ بختاور نے لکھا ہے کہ مراۃ العالم میں۔

''ملا صاحب کو خدمت مذکور کے صلہ میں ۱۵۰ اشرفی اور دس ہزار تنکہ سیاہ انعام میں دیے تھے۔''

رامائن کا ترجمہ

۹۹۳ھ کو ملا عبدالقادر بدایونی کو اکبر بادشاہ کی طرف سے ہندوؤں کی اہم مذہبی کتاب ''رامائن مہابھارت'' کا ترجمہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ یہ مہابھارت سے بھی پہلے کی کتاب ہے اس میں ۲۵ ہزار اشلوک (اشعار) ہیں اور ہر اشلوک ۶۵ حروف پر مشتمل ہے۔ یہ ایک افسانہ ہے جو کہ رام چندر اودھ کا راجہ تھا اور اس کو ایک دوسرا دیو عاشق ہو کر لے گیا تھا۔ اس رانی کا نام ''رانی سیتا تھا'' اور اس کو ایک دوسرا دیو عاشق ہو کر لے گیا تھا۔ وہ جزیرہ لنکا کا مالک تھا وہ (رام چندر) اپنے بھائی لچھمن کے ساتھ اسی جزیرہ میں پہنچا اور اس نے بے شمار لشکر بندروں اور ریچھوں کا وہاں جمع کیا۔ محاسب وہم کو اس کا شمار نہیں ہو سکتا چار کوس کا پل اس نے تیار کیا۔ بعض بندروں کو کہتے تھے کہ

"کود پھلانگ کر عبور کرو۔"

اور بعض اپنے پاؤں سے پل میں اتر پڑے۔ اس کتاب میں ایسی بعید العقل بہت سی باتیں ہیں۔ نہ نادہ بہر تقدیر، رام چندر بندر سوار پل سے اترا تو وہاں ایک ہفتہ تک لڑائی گھمسان کی ہوتی رہی اور راون کو بیٹوں، پوتوں سمیت قتل کر ڈالا اور اس نے ہزار برس کا خاندان چند گھنٹوں میں برباد کر دیا اور لنکا اس کے بھائی کو دے کر واپس لوٹا ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ:

"رام چندر دس ہزار برس تمام ہندوستان کی حکومت کر کے اپنے ٹھکانے پر پہنچا۔"

اس فرقہ کا خیال ہے کہ:

"عالم قدیم ہے کوئی زمانہ نوع بشر سے خالی نہیں رہا اور اس واقعہ کو لاکھ دو لاکھ برس گزر گئے ہیں۔ اور آدم بشر کو سات ہزار برس ہوئے ہیں۔"

یہ واقعات سچ ماننے کے قابل نہیں ہیں کیونکہ محض کہانیاں ہیں۔ جس طرح شاہ نامہ یا امیر حمزہ کا قصہ وغیرہ یا پھر اس زمانے کی کہانی...... جنات اور حیوانات کی سطح زمین پر حکومت لوگ کیونکہ ایسے عجیب واقعات اس زمانے کے ہو سکتے ہیں۔

خدا جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے

۹۹۳ھ کا واقعہ ہے کہ نوروز جشن کا وقت تھا اس وقت ضیافتوں کا عام وقت تھا اور ایک دوسرے کو نذرانے بھی عام دیئے جاتے تھے۔ سب ایک دوسرے کو نذرانے اور ضیافتیں دیتے اور لیتے تھے اور اس وقت تمام عوام خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ گویا کہ جشن نوروز امیر امیروں کے لیے ایک خوشی امید کا دن ہوتا ہے۔

اب ملا عبدالقادر بدایونی دربار کی حالت سے بہت ہی پریشان حال تھا۔ تو ایسے موقع پر کہ جب عبدالرحیم خاں خاناں بہار اقبال نوروز منا رہے تھے وہ خود ۹۹۳ھ میں لکھتے ہیں کہ:

انہی دنوں میں مرزا نظام الدین نے گجرات سے مجھے لکھا کہ:

"خانخاناں نے یہاں سے روانہ ہوتے وقت یہ وعدہ کیا تھا کہ ملا اردو دار رہے اور تم کو حضور سے عرض کر کے لیتا آؤں گا۔"

تو جب عبدالرحیم خاں خاناں دربار میں پہنچے تو پھر جب آداب مقررہ تم جا کر ان سے ملاقات کرو اور حضور سے اجازت لے کر اس کے ساتھ چلے آؤ یہاں کے علاقے کی بھی سیر کرو۔ بڑا پر لطف علاقہ ہے اس کے بعد جیسے تمہاری مرضی ہو کر لینا۔ فتح پور کے دیوان خانہ میں کتب خانہ ہے۔ اسی جگہ پر تمام مترجم اکٹھے بیٹھتے ہیں تو جب خان خاناں وہاں پہنچے تو ملا عبدالقادر بدایونی بھی اپنے وعدہ کے پروگرام کو مدنظر رکھتے ہوئے وہاں پہنچے مگر مرزا عبدالرحیم خاں خاناں کے وہاں اس قسم کا کوئی ذکر نہ کیا اور اس نے اپنا کام ختم کر کے عازم گجرات ہوا اور جو ارادہ شیخ عبدالقادر بدایونی نے دل میں کیا تھا وہ تو دھرے کا دھرا ہی رہ گیا۔ وہ...... نہ ہو سکا۔ جس سے اس کو بڑی مایوسی ہوئی۔ شیخ عبدالسلام کا خیال تھا کہ اس طریقے سے دربار سے خلاصی ہو جائے گی مگر وہ اس کا خیال اس کے دل کے اندر ہی محسوس ہو کر رہ گیا۔

اسے اس واقعے کو کافی وقت گزر گیا۔ اور آخر اس نے دل میں خیال باندھ لیا کہ:

وَمَا تَشَاءُونَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ۝

ترجمہ "جو ہم چاہتے ہیں وہ نہیں ہوتا بلکہ جو خدا چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔"

اب وہ وقت بھی آنے لگا کہ جب اس نے موت سے آشنا، حیات سے رخصت ہونے لگے تو اس وقت بادشاہ کابل کو روانہ ہو گیا تو سیالکوٹ کے سفر میں ملا الہ داد اور صدر نے سینے پر داغ کھایا تو اس کی حرارت جگر تک پہنچ گئی۔ حکیم حسن کو مسہل کی مرض ہوئی تو وہ دو دنوں میں واصل حق ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ شیخ عبدالقادر بدایونی کا بڑا گہرا دوست تھا۔ اللہ تعالیٰ اس کو غریق رحمت کرے۔ شیخ عبدالقادر نے رامائن کا ترجمہ کر کے رات کے جلسے میں پیش خدمت گزرانا۔ جو کہ بہت پسند کیا گیا تھا تو اس کے بارے میں سوال کیا گیا کہ:

"اس کے کتنے جز کیے گئے ہیں؟"

تو جواب میں عرض کیا گیا کہ:

"ستر (۷۰) جز ہوئے ہیں۔"

اور جب اس کی تصحیح کی جائے گی تو ۱۲۰ ہو جائیں گے۔ تو پھر یہ کہا گیا کہ:

"اس کا دیباچہ بھی لکھ دو۔"

مگر اب اس کی طبیعت میں کوئی لکھنے کی امنگ نہ رہی تھی۔ لہٰذا اس نے ان کو ٹال دیا۔ جس کی سب سے بڑی وجہ اس نے یہ بیان کی کہ:

"اس نامہ سیاہ سے کہ کہیں میرے اعمال ہی برباد نہ ہو جائیں۔ خدا تعالیٰ نے پناہ مانگتا ہوں کفر کی نقل کفر نہیں۔"

کیونکہ حاکم کے حکم سے یہ لکھی ہے۔ اس کے دل میں یہ..... ضرور تھی۔

نفرت کے طور پر لکھی ہے۔ میں بہت ڈرتا ہوں کہ کہیں اس کا پھل (اثر) پھنکار یا لعنت کی شکل میں مجھ پر نہ پڑے۔ اور توبہ تو یہ پکارتا ہوں۔ مگر اللہ تعالیٰ کے حضور سے مایوس نہیں ہوں۔ اس وہاب سے توبہ کے قبول ہونے کی امید ضرور رکھتا ہوں۔

تو انہوں نے لکھا ہے کہ:

انہی دنوں میں ایک دن مترجموں کی مدتوں میں نظر کر کے حکیم ابوالفتح سے فرمایا کہ:

"بالفعل یہ پوشاک خاص اسے دے دو گھوڑا اور خرچ بھی عنایت ہوگا۔"

اور شاہ فتح اللہ عضد الدولہ سے فرمایا کہ:

"علاقہ بساور روربہت تمہاری جاگیر میں کیا۔ جو جاگیر اس میں سے اماسوں کو دی ہوئی ہے۔ وہ بھی تمہیں معاف۔"

پھر میرا نام لے کر کہا کہ:

"یہ جوانی بدایونی ہے ہم نے اس کو مدد معاش سوچ کر بساور سے بداؤں میں کر دی ہے۔"

فرمان تیار ہونے پر ایک برس کی رخصت لے کر بساور پہنچا اور وہاں سے بداؤں آیا۔ مگر اس کے بعد ان کا ارادہ تھا کہ:

گجرات، احمد آباد جا کر مرزا نظام الدین احمد سے ملاقات کروں۔ کیونکہ اس نے ۹۹۳ھ میں بلایا تھا مگر دنیاوی تعلقات میں پھنس کر رہ گیا اور اس نے پاس نہ جا سکا تھا۔ مگر اب بھی ارادہ پورا نہ ہوا۔

شیخ عبدالقادر کی والدہ کی رحلت

کشمیر کے علاقہ میں شاد آباد ایک قصبہ ہے۔ ملا شاد آبادی ذ حضل جامع معقول اور منقول تھے۔ انھوں نے حسب احکام کشمیر کی تاریخ لکھی تھی۔ تو ملا صاحب لکھتے ہیں کہ:

''۹۹۹ھ میں فرمائش کی گئی کہ اسے خلاصہ اور سلیس فارسی میں لکھو۔''

جس کو میں نے دو ماہ میں تیار کر کے دے دیا جو کہ بہت ہی پسند آیا اور اس کو کتب خانے کی زینت بنایا۔ جس کو ہر آدمی پڑھتا تھا۔ افضل نے آئین اکبری میں شاہ صوفی کتاب کا اشارہ کیا اس نے راج ترنگنی سے ترجمہ کیا ہے اور وہ سنسکرت زبان میں تھی۔

ایک دن حکیم ہمام نے معجم البلدان جس کے ۲۰۰ جز و تھے۔ وہ اس نے بڑی تعریف و تحسین کرتے ہوئے حضور میں پیش کی۔ اور کہا کہ:

''یہ عربی ہے اس کا فارسی میں ترجمہ ہو جائے تو بہ خوب ہوگا اس کے اندر بہت سی حکایات عجیب و غریب ہیں۔''

تو انھوں نے درج ذیل علماء کو ایک جگہ جمع کر کے ان میں وہ تمام اجزا تقسیم کر دیے گئے۔

i- ملا احمد ٹھٹھہ

ii- قاسم بیگ

iii- شیخ منور

iv- اس طرح دس بارہ شخص جن میں ایرانی اور ہندی وغیرہ شامل تھے۔ مترجموں کی سہولت کے لیے فتح پور میں پرانے دیوان خانہ میں کتب خانہ تھا۔ ملا (شیخ عبدالقادر بدایونی کے حصہ میں دس جزو آئے۔ تو انھوں نے نہایت پھرتی سے ان تمام اجزا کو ایک مہینہ میں تیار کر کے دے دیے جو کہ سب سے پہلے دیے گئے تھے۔ جن کو بہت پسند کیا گیا اور اس کو رخصت حاصل کرنے ایک ذریعہ یا وسیلہ تصور کیا گیا تھا۔

اگر چہ اکبر بادشاہ شیخ عبدالقادر بدایونی کی قابلیت اور اہلیت کا مداح خواں تھا۔ مگر دونوں میں اصل میں نظریاتی اختلاف تھا جو کہ ہر قسم کی حکایات کے راستے میں روڑا اٹکا جاتا ہے اور کام بگڑ جاتا تھا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

اکبر بادشاہ نے بڑے تامل کے بعد ۵ ماہ کی رخصت ملی تو رخصت کے وقت خواجہ نظام الدین نے عرض کیا کہ:

''ان کی ماں مرگئی ہے کہ یاں کی تسکین و تسلی کے لیے جانا ضروری ہے۔''

حضور نے رخصت تو منظور کر دی مگر با دل نخواستہ کے طور پر اور سلام کے وقت صدر جہاں نے تکرار کیا کہ:

''سجدہ بکن''

ترجمہ: سجدہ کرو۔

مگر وہ مجھ سے روانہ ہو سکا اور اس کے بعد حضور نے فرمایا کہ:

''جانے دو۔'' مگر رنجیدہ عام تھیں اور مجھے انھوں نے اس ناراضی سے کچھ بھی نہ دیا۔ خواجہ نظام الدین شمس آباد میں اپنی جاگیر سے جاتے تھے تو میں بھی ساتھ ہوتا تھا وہاں میں جا کر ایک کتاب لکھی۔ جس کا نام ''نجات الرشید'' رکھا گیا جو کہ اس کا تاریخی نام تھا تو اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

''خواجہ موصوف نے مجھے ایک فہرست گناہاں صغیرہ و کبیرہ کی دی ہے اور کہا کہ:

''یہ بہت مجمل ہے یہ تفصیل اور یا دلیل نہیں۔ تم اس کو اس طرح لکھ دو کہ نہ زیادہ طولانی ہو اور نہ ایسی مختصر وغیرہ وغیرہ۔''

میں نے اس کی تعمیل کو لازمی خیال کیا۔ اور اس کی تعمیل کر کے اس کو لوٹا دی۔ اس کتاب کے اندر ان دنوں کے علماء کے دیندار یا اکبری دربار کے اختلافی مسائل ہوتے تھے ان میں مہدوی فرقہ یا شیعوں کے بارے میں اختلافی مسائل تھے۔ جن کو میں نے خوش اسلوبی سے بیان کر دیا۔ جس کا یہ اثر ہوا کہ انھوں نے مجھے بھی مہدویت پر مائل تصور کرنا شروع کر دیا مگر اصل بات یہ ہے کہ میر سید محمد جون پوری جنھوں نے اصل میں مہدویت کا دعویٰ کیا تھا۔ ان کے داماد شیخ ابوالفضل گجراتی سے ملا صاحب کو رابطہ اور کمال اعتقاد تھا اور بعض ذکر و شغل بھی ان سے حاصل کیے گئے تھے اور یا ایسے لوگوں کے..... تھے جس کی وجہ سے ان کی باتوں کو ہر جگہ اچھی طرح بیان کیا گیا تھا۔ کیونکہ پسندیدہ افراد کی باتیں بھی پسند ہوئی ہیں اور وہ ان کے دل کو بہت بھا جاتی ہیں۔

اکبر کی ناراضی اور جامع رشیدی کا ترجمہ

شیخ عبدالقادر بدایونی اپنی تاریخ میں رقمطراز ہیں کہ:

۹۹۹ھ میں گھر میں پہنچا تو وہاں بیمار ہو گیا تھا۔ اور پھر بداؤں پہنچا۔ اپنے اہل و عیال کو بھی وہیں منگوا لیا۔ علاج معالجہ کرتا رہا۔ مرزا تو لاہور چلے آئے مگر میں گھر پر ہی رہا۔ مگر اتفاق کی بات ہے کہ ''نامہ خرد افزا'' سنگھاسن بتیسی، کتاب خانے سے گم ہو گئی۔ حلیم سلطان بیگم نے برابر حضور میں تقاضا کرتی رہی اور بار بار اس نے مجھے یاد کرایا اور بہت سے دوستوں کے قاصد بھی بداؤں بھیجے۔ مگر اتفاق کی بات ہے کہ میں نہ آ سکا تو حضور نے حکم دیا کہ:

''اس کا مدد معاش بند کر دو اور اس کو آدمی بھیج کر گرفتار کر کے لاؤ۔''

مگر مرزا نے خدا اس کا بھلا کرے۔ شیخ ابوالفضل نے بھی عذرداری پیش کی کہ اس کو کوئی مجبوری ہو گئی ہو گی۔ جس کی وجہ سے وہ تا حال حاضر خدمت نہ ہو سکے۔ جب مسلسل احکام آتے رہے تو آخر کار بداؤں سے روانہ ہوا تو حضور کشمیر کے سفر پر تھے بھمبر کی منزل میں حاضر خدمت ہوا تو حکیم ہمام نے عرض کی کہ:

''وہ کورنش کی آرزو رکھتا ہے۔''

تو حضور نے فرمایا کہ:

''وعدے سے کتنے دن بعد آیا ہے؟''

عرض کی کہ:

''پانچ ماہ کے بعد۔''

تو پھر پوچھا کہ:

''کیا وجہ تھی؟''

تو عرض کی کہ:

''بیماری کی وجہ سے حاضر خدمت نہ ہو سکا تھا۔''

اس کی تصدیق میں اکبر بداؤں کا محضر اور حکیم عین الملک کی عرضی بھی اس مضمون کی دلی سے لایا ہوں۔

سب کچھ پڑھ کر سنایا مگر حضور نے فرمایا کہ:

''بیماری پانچ ماہ نہیں ہوئی اور کورنش کی اجازت نہ دی۔''

جس کی وجہ سے بڑی ندامت ہوئی اور بسیار افسوس کا بوجھ ذہن پر سوار ہوا۔ تو ان دنوں میں شہزادہ دانیال کا لشکر رہتاس پر پڑا ہوا تھا۔ تو میں اس افسردگی، شرمندگی اور غمگین حالت میں وہاں پہنچا تو ان دنوں شیخ ابوالفضل فیضی دکن کی سفارت پر تھے۔ جب ان کی مصیبت کی خبر سنی تو انھوں نے بھی ایک لطیفہ سفارش میں لکھا مگر یہ لطیفہ مذکور حضور کے پاس دیر سے پہنچا۔ کیونکہ اس زمانے میں ایسے وسائل آمدورفت اور ڈاک وتار کے نہ تھے جو کہ آج کل ہیں۔ مگر جب لاہور میں حضور کو پڑھ کر سنایا گیا تو انہیں سفارش کرنے کا انداز بہت پسند آیا اور شیخ ابوالفضل کو حضور نے حکم دیا کہ:

''اکبر نامہ میں نمونے کے طور پر داخل کر دو۔ اور فاضل مذکور نے بھی اپنی لیاقت کا سرٹیفکیٹ سمجھا۔''

بہر حال شہزادے کے لشکر میں آ گیا۔ مگر بڑی پریشان کی حالت تھی۔ کچھ سمجھ سے بالاتر تھا کہ اب کیا کروں؟ اس وقت تمام وظائف لعن چھین اور قصیدہ بردہ کا وظیفہ پڑھ پڑھ کر ختم کر دیے مگر آخری سہارا تو اللہ تعالیٰ ہی ہوتا ہے۔ وہ سب کی پکاروں کو سنتا اور قبول بھی کرتا ہے تو پانچ ماہ کے بعد لشکر شاہی کشمیر سے واپس لوٹا اور لاہور میں آ کر خدا نے پھر بادشاہ کے دل میں رحم ڈالا اور مہربان ہوا۔

جامع رشیدی تاریخ کی ایک بڑی موٹی کتاب ہے۔ اس کا ترجمہ حضور کو مطلب تھا۔ یاران مشفق، موافق مرزا نظام الدین احمد وغیرہ نے مجلس میں یا خلوت کی حالت میں میرا ذکر کر دیا تو اس حالت میں مجھے یہ کام سونپ دیا گیا تو حاضر خدمت کا موقع ملا۔ حاضر ہوا تو ایک اشرفی نذر گزرانی بڑی التفات وہ آداب سے پیش آئے۔ تو اس وقت سب ندامت، شرمساری اور دشواری اللہ تعالیٰ نے مدد کر دی۔ تو مجھے جامع رشیدی کے انتخاب کا مجھے حکم ہوا اور علامی شیخ ابوالفضل کی اصلاح سے کرو۔

اس کتاب کے اندر شجرہ خلفائے عباسیہ، مصریہ، بنی امیہ کا تھا۔ جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جا کر ختم ہوتا تھا۔ اور وہاں سے حضرت آدم علیہ السلام تک جا پہنچتا تھا۔ اس طرح تمام انبیائے کرام علیہم السلام کے شجرے عربی سے فارسی میں لکھ کر حضور کی خدمت میں پیش کیے اور خزانہ عامرہ داخل ہوئے۔

اس کے بعد مجھے تاریخ الفی کے ایک دفتر کی اصلاح و تصحیح کا کام سونپا گیا۔ جس کو مکمل کر کے دے دیا تو یہ شرف آفتاب کو جشن تھا۔ تحسین کا درجہ پایا۔ اس کے بعد دفتر دوم کا کام ملا تو ایک برس میں اس کو مکمل کر دیا۔ میں نے اصل کو بالکل نہ بدلا۔

اسی سال خواجہ ابراہیم کا انتقال ہو گیا جو کہ خاص دوست تھے۔ اللہ تعالیٰ ان پر ہزاروں رحمت برسائے۔ (آمین)

مرزا نظام الدین کی رحلت

مرزا نظام الدین خدمات بادشاہی میں قلیچ خاں جیسے کہنہ عمل سردار سے قدرے ناراضگی رکھتے تھے۔ مگر اپنی کارکردگی کی وجہ سے بادشاہ کے دل میں گھر کئے ہوئے۔ بادشاہ ان کا بڑا احترام اور ان پر بڑا اعتماد کرتا تھا۔ چنانچہ قلیچ خاں اور امراء کو مزاج میں دخل رکھتے تھے۔ اور درگاہ سے جدا نہ ہو سکتے تھے ان کو ادھر ادھر روانہ کر دیا گیا۔ چنانچہ ابو بک عین ترقی رو بہ کاروبار میں چشم زخم عظیم پہنچی کہ جس کی اپنے اور بیگانے کو امید نہ تھی۔ تب محرقہ سے ۴۵ برس کی عمر میں عالم بے وفا سے دار البقا میں چلے گئے اور دنیا میں صرف نیک نام کے اعمال ہی رہ گئے۔ اس کے حسن اخلاق سے بہت سے احباب کو ایسا احساس نہ تھا۔ خاص طور وہ مجھے بہت پیار و محبت کے ساتھ لکھتا تھا اور الفت و شفقت کا مظاہرہ کرتا تھا۔ تو میری آنکھوں سے ان حسرت کے آنسو جاری ہو گئے۔ سینہ کوبی بھی کی گئی مگر آخر کار صبر کے سوا کچھ کام نہ آیا اس واقعہ کو بڑی بھاری مصیبت تصور کر کے برداشت کیا گیا دریائے راوی پر پہنچے تو کشتی حیات بھی ختم ہونے کو آئی۔ جنازہ لاہور لایا گیا۔ اور اس کے باغ میں دفن کیا گیا تھا اس کے جنازے میں خاص و عام کی بے شمار تعداد تھی تو اس لیے اخلاق کہ نہ کو یاد کر کے روئے تھے۔

یہ واقعہ ۲۳ صفر ۱۰۰۳ھ کا ہے۔

”ہر عمل اجرے جزائے دارد“

مرزا نظام الدین نے ہندوستان کی تاریخ لکھی تھی جس کا اکبر کا ۳۸ برس کا حال تفصیل سے لکھا گیا تھا۔ اور اس کا نام طبقات اکبری رکھا گیا تو ملا (شیخ عبدالقادر بدایونی) نے نظامی ۱۰۰۱ھ میں اس کی تاریخ لکھی اور اس کا نام تاریخ نظامی رکھا تھا۔ ملا نے صاف صاف اور واضح انداز میں بے مبالغہ مہارت آرائی کی جس سے معاملات و مہمات کی اصلیت واضح ہوئی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ:

”وہ نہ کسی سے خوش تھے اور نہ کسی سے ناراض ہی تھے۔“

اس سال جلوس ۴۰ سال جلوس کا شروع ہوا جشن کے موقع پر دو دن پہلے دیوان خاص میں بیٹھے تھے کہ مجھے بلایا گیا تو میں حاضر خدمت ہوا تو شیخ ابوالفضل سے کہا کہ:

”ہم تو شیخ عبدالقادر تو جوان فانی اور جنونی مشرب سمجھتے تھے مگر وہ تو ایسا فقیہ متعصب نکلا کہ جس کے تعصب کی رگ گردن کو کوئی تلوار ہی کاٹ ہی نہیں سکتی۔“

تو شیخ نے پوچھا کہ:

''حضور کس کتاب میں؟ کیا لکھا؟''

حضور فرمانے لگے کہ:

''اس ازم حالہ میں (مہابھارت) ہم نے ..... کو قیب کو گواہ کر دیا۔''

اس نے کہا کہ تفصیر کی اور میں نے آگے بڑھ کر عرض کی کہ:

فدوی صرف مترجم تھا جو واقعات ہندی نے بیان کیا۔ تفاوت مترجم کر دیا۔ اگر اپنی طرف سے لکھا تو تقصیر کی اور بہت برا کیا۔ تو وہ خاموش ہو گئے۔ ان کے اس اعتراض کا یہ مقصد تھا کہ میں نے ایک حکایت ''ازم نامہ'' میں یوں لکھی تھی کہ جس کا مضمون یہ تھا کہ:

ہندوؤں میں ایک پنڈت شرع کے عالم میں لوگوں سے کہتا تھا کہ:

''آدمی کو چاہیے کہ..... اور غفلت کی حد سے قدم بڑھا کر سب سے پہلے صانع بیچون (اللہ تعالیٰ) کو پہچانے اور عقل کا راستہ لے اور فقط بے علم پر نہ رہے۔ کہ اس کا کچھ نتیجہ نہیں۔ نیک طریقہ اختیار کرے اور جہاں تک ہو سکے گناہوں سے باز رہے۔ یقین جانے کہ ہر کام کی پرسش ہوگی۔ جس پر میں نے یہ مصرع فوراً لکھ دیا تھا۔''

''ہر عمل اجرے و ہر کردہ جزائے دارد''

اس پنڈت نے اس کو منکر قلم حشر نشر حساب میزان وغیرہ سب کو صاف لکھ دیا تھا اور آپ جو تناسخ کے قائل نہیں اسے اس کی مخالفت قرار دیا اور مجھے تعصب اور قباحت کے ساتھ متہم (تہمت) کیا۔

آخر کار میں نے دربان درگاہ کو سمجھایا کہ:

''ہندو جزا و سزا اور اچھے برے اعمال کے قائل ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ جب کوئی مرتا ہے تو لکھنے والا جو عمر بھر اس کے اعمال لکھتا ہے تا بقض روح فرشتے کے پاس لے جاتا ہے۔ اس کا نام بادشاہ عدل ہے۔''

وہ بھلائیوں کا برائیوں کا مقابلہ کر کے کمی و بیشی نکالتا ہے پھر مرنے والے سے پوچھا جاتا ہے کہ:

''پہلے بہشت میں جا کر آرام کر نعمتیں لوگے یا دوزخ میں چل کر عذاب برداشت کرو گے۔''

جب دونوں درجے طے ہو چکتے ہیں تو حکم ہوتا ہے کہ:

''پھر دنیا میں جاؤ اور ایک قالب مناسب حال اختیار کر کے زندگی بسر کرتا ہے اور اس طرح دورے کرتا رہتا ہے۔ آخر کار نجات مطلق پاتا ہے اور آواگون (سزا) سے چھوٹ جاتا ہے۔''

شرف آفتاب کے دن صدر جہاں سے کہا کہ:

''روضہ منورہ حضرت خواجہ اجمیر پر کوئی متولی نہیں ہے۔ فاضل بداؤنی کو وہاں متولی کر دیں تو کیسا ہے؟''

تو انھوں نے فرمایا کہ:

''بہت خوب ہے۔''

میں دو تین ماہ ورنا کی خدمت میں بہت کوشاں رہا۔ تاکہ ان سرگردیوں (مشکلات) سے چھوٹ جاؤں۔ کئی مرتبہ عرضیاں بھی لکھیں مگر کوئی جواب نہ مل سکا۔ اب دل چاہتا تھا کہ رخصت لے کے گمنام ہو جاؤں۔ عید کی رات کو صدر جہاں نے عرض کیا کہ:

''اس کی رخصت کے بارے میں کیا حکم ہے؟''

انھوں نے فرمایا کہ:

''یہاں اسے کام ہیں۔ کبھی کوئی کام نکل آتا ہے تو کوئی آدمی نہیں چلتا۔''

اجازت نہ مل سکی۔

بحر الاسماء کا ترجمہ

انہی ایام میں شیخ ابوالفضل نے کہا کہ:

''اگرچہ فاضل بداونی اجمیر کی خدمت حضرت کرسکتا ہے مگر ہم سے ترجمہ کے لیے اکثر چیزیں دیتے ہیں یہ خوب لکھتا ہے اور ہماری خاطر خواہ لکھتا ہے اسے جدا کرنے کو جی نہیں چاہتا۔''

تو شیخ نے بھی امراء اور وزراء نے بھی تصدیق کی اور ہاں میں ہاں ملائی تو اسی دن حکم دیا گیا کہ:

''...باقی افسانہ حضوری کہ سلطان زین العابدین بادشاہ کشمیر کے حکم سے تھوڑا سا ترجمہ ہوا ہے اور بہت سا باقی ہے اور بحر الاسماء اس کا نام رکھا گیا ہے اسے ترجمہ کر کے پورا کر دو۔''

چنانچہ اخیر جلد کہ جس کے ساتھ جزو تھے ۵ ماہ میں مکمل کر دی۔ اور انہی دنوں میں ایک رات خوابگاہ خاصہ پایہ تخت کے پاس بلایا تو صبح تک مختلف مسائل سے بات چیت ہوتی رہی۔ تو پھر فرمایا کہ:

''بحر الاسماء کی پہلی جلد جو سلطان زین العابدین سے ترجمہ کرائی تھی اس کی فارسی قدیم غیر متعارف تھے اسے بھی مانوس عبارت میں لکھ دو اور جو کتابیں تم نے لکھی ہیں ان کے مسودے تم آپ رکھو۔''

میں نے زمین بوس کر کے دل و جان سے قبول کر لیا اور ان پر کام شروع کر دیا تو بادشاہ نے ہٹ کر فرمائی کی تو دس ہزار سکہ مرادی دیے اور ایک گھوڑا انعام میں دیا۔

اس کتاب کو جلد دو تین ماہ میں تیار کرنے کا حکم دیا گیا یہ کتاب میں نے مقررہ وقت میں تیار کر دی۔ اور وطن جانے کی رخصت جس کا بہت ہی خواہشمند تھا۔ وہ بھی اس کے بعد حاصل کر لوں گا۔ اللہ پر بھروسہ کافی ہے۔

مگر افسوس کا یہ مقام تھا کہ انہی دنوں میں ان کے دوستوں کے اس دار فانی سے دار البقا کی طرف کوچ شروع ہو گئے۔ ۱۰۰۳ھ کے آخر

میں شیخ یعقوب کشمیری جو کہ رخصت لے کر وطن گئے تھے۔ وہ فوت ہو گئے تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ شیخ عبدالقادر بدایونی کے گہرے دوست تھے۔ ان کے بارے میں ان کو بڑا صدمہ پہنچا۔

۲۷ ذوالحجہ کو حکیم عین الملک جو کہ راجی علی خاں کے پاس ایلچی بن کر گئے تھے۔ وہ جب وہاں سے فارغ ہو کر بنڈیہ آئے جہاں ان کی جاگیر تھی تو اس جگہ پر حضرت ہو گئے۔ اب دوستوں سے دنیا خالی ہو رہی تھی۔ مگر ہم کو پریشانیوں نے گھیر رکھا تھا کہ ان کا خاتمہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔

محرم ۱۰۰۴ھ میں حکیم حسن گیلانی نے بھی وفات پائی وہ بہت ہی مہربان درویش طبع شخص تھے۔

شیخ عبدالقادر بدایونی کی وفات

۱۰۰۴ھ کو صفر ۱۰ کو شیخ فیض نے انتقال کیا اور چند دنوں کے بعد حکیم ہمام بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اور دوسرے ہی دن کمال کے صدر بھی رخصت ہوئے۔ اور مال خانے منتقل ہو گئے اور صفر ۱۰۰۴ھ کو عبدالقادر بدایونی بھی چل بسے۔ ان کی عمر بوقت وفات ۵۷ سال تھی اور تذکرہ میں ہی دفن ہوئے ان کی موت پر بہت زیادہ افسوس کیا گیا اور وہ بڑے ہی کمال کے آدمی تھے۔ انھوں نے اکبر کے دربار میں بڑی اہم خدمات سر انجام دی تھیں۔

مگر خوشگو نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ شیخ عبدالقادر بدایونی کو باغ اسپ واقع عطاپور جو کہ بدایوں کے نواح میں واقع ہے وہاں دفن کیا گیا تھا۔ آج کل وہاں آموں کا باغ نہیں ہے بلکہ چند ایک آم کے درخت ہیں اور یہ ملا کا باغ کہلاتا ہے۔ آج کل کوئی بھی عطاپور اور باغ اسپ کا نام نہیں جانتا۔ البتہ جس محلہ میں ان کے گھر تھے اس کو تا حال لوگ جانتے ہیں۔ وہ چنگی ٹیلہ کہلاتا ہے۔ جو کہ سید باڑہ میں ہے۔ مگر لوگوں کا کہنا ہے کہ ان کی اولاد کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے اور ان کی نسل خیر آباد علاقہ اودھ میں باقی ہے۔

☆ ☆ ☆

باب۹

خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش خاں

۱۔ مرزا عزیز کوکلتاش اکبر کا رضاعی بھائی تھا۔ کیونکہ ان کی والدہ نے اکبر کو دودھ پلایا تھا۔

۲۔ مرزا عزیز کو اکبر اعظم نے خان اعظم کا خطاب دیا۔

۳۔ خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش سخاوت کے شہزادے تھے۔

۴۔ ۱۰۰۳ھ کو مہراوزک (مہر انگشتری) اور پھر مہر توزوک (مہر درباری) ان کے سپرد ہوئی۔

۵۔ خان اعظم شیخ ابوالفضل کو اکبر اعظم بادشاہ کی عقل کی کنجی سمجھتے تھے۔

۶۔ اکبر بادشاہ خان اعظم کی والدہ کو "جی جی" کہہ کر پکارتا تھا۔

۷۔ اکبر اعظم خان اعظم کا بہت احترام کرتا تھا۔

۸۔ اکبر اعظم خان اعظم کی والدہ کا بہت احترام کرتا تھا۔

۹۔ اکبر کو بہت سی خواتین نے دودھ پلایا مگر ان سب میں زیادہ نمایاں مرزا عزیز کوکلتاش کی والدہ تھیں۔

مرزا عزیز کوکلتاش پر طائرانہ نگاہ

نام	: مرزا عزیز
والد	: میر شمس الدین محمد خاں
والدہ	: جیجی جی
خطاب	: خان اعظم
دربار میں حاضری	: شروع سے ہی
وفات	: ۱۰۳۳ھ
دفن	: دہلی میں
اولاد	: ۹ بیٹے
باپ کی وفات	: ۹۶۹ھ میں شہید ہوا
والدہ کا انتقال	: ۱۰۰۹ھ کو

حالات زندگی

اکبر اعظم کا رضاعی بھائی مرزا عزیز کے والد کا نام میر شمس الدین محمد خاں تھا اور وہ اکبری عہد میں خان اعظم اور اتکہ خاں کہلاتے تھے بتایا گیا ہے کہ ابھی اکبر پیدا ہی نہیں ہوا تھا کہ بادشاہ بیگم نے مرزا عزیز کی ماں سے کہہ دیا تھا کہ:

''میرے ہاں لڑکا پیدا ہوگا اور تم اسے دودھ پلاؤ گی۔''

اکبر پیدا ہوا مگر عزیز کی ماں کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہ ہوا تھا۔ لہٰذا وہ تو اسے دودھ نہ پلا سکی البتہ اس عرصہ میں اور بیبیاں اور دایاں وغیرہ اکبر کو دودھ پلاتی رہیں۔ تو جب عزیز کی والدہ کے ہاں عزیز پیدا ہوا تو اس کی والدہ نے اکبر کو اپنی گود میں لے لیا اور اس کو (اکبر) دودھ پلانا شروع کیا تو اس لحاظ سے مرزا عزیز اکبر بادشاہ کا رضاعی بھائی شمار ہوتا ہے کیونکہ دونوں نے ایک ماں کا دودھ پیا تھا جبکہ والدین دونوں کے مختلف تھے تو اس لحاظ سے اکبر مرزا عزیز کی بڑی قدر و منزلت اور عشرت کا خیال رکھتا تھا۔ اکبر ہمیشہ خطرناک واقع پر جان نثاری کا قدم آگے بڑھاتا تھا۔ اکبر اعظم خاں اعظم کی والدہ کو جی جی کہہ کر پکارتا تھا وہ ان کو بڑا ادب اور لحاظ رکھتا تھا بلکہ ماں سے بھی زیادہ عزیز کی والدہ کا خیال رکھتا تھا۔

۹۶۹ھ میں جب عزیز کے والد شمس الدین محمد خاں کا انتقال ہوا تو اکبر نے مرزا عزیز کی کہ وہ اکبر کا چھوٹا رضاعی بھائی تھا۔ مرزا عزیز کوکہ کو کہا جاتا تھا کہ:

''ہر وقت اس کے ساتھ رہتے تھے جب وہ ہاتھی پر سوار ہوتے تو اکثر مرزا عزیز کو ہی خواصی پر بٹھاتے تھے۔''

اس کی ہر ادا کو نخرے اور ناز سمجھتا تھا۔ اور اس کی گستاخی کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا بلکہ اس کی گستاخی سے اکبر بہت خوش ہوتا تھا اور جب کبھی کسی حرکت پر غصے ہوتا تو وہ یہ سمجھ کر خاموش ہو جاتا تھا کہ:

''میرے اور اس کے درمیان دودھ کا دریا بہہ رہا ہے تو اکبر چپ ہو جاتا تھا۔''

اکبر اکثر اوقات یہ دعا کیا کرتا تھا کہ:

''مرزا عزیز مجھ پر تلوار بھی کھینچ کر آ جائے تو جب تک وہ مجھ پر پہلا وار نہ کرے میرا ہاتھ اس پر نہ اٹھے گا۔''

تو خان اعظم کو بھی اکبر پر بڑا ناز تھا اور مرزا عزیز یہ فخر سے کہا کرتا تھا کہ:

''ہم اکبر بادشاہ کے عزیز ملکہ بھائی ہیں۔''

اس کا ہم ہر ایک فرد علاقہ کو تھا۔

۹۷۸ھ میں جب عبداللہ خاں ازبک کی طرف سے بغاوت آئی تو اس میں تحائف سلطنت کے ساتھ ان کے (خان اعظم مرزا عزیز) اور منعم خاں خانخاناں کے نام علیحدہ علیحدہ تحائف شامل تھے۔

اس قدر گھرے موسم ہونے کے باوجود اکبر اعظم بہت نقی محتاط اور ان کے حالات سے غافل نہ تھا۔ جب محمد حکیم مرزا کابل سے بغاوت کر کے آیا تھا اور اس کے بعد چتوڑ کی مہم میں اسے خبریں پہنچیں تھیں کہ اتکہ خیل یک رخ نہیں اور یہ آئین سلطنت تھا کہ جب ایک حاکم مدت تک ایک مقام پر رہتا تھا تو اس کی جاگیر تبدیل کر دی جاتی تھی چنانچہ ۹۷۵ھ میں تمام اتکہ خیل کو پنجاب سے بلا لیا گیا تھا اور پنجاب کا علاقہ حسین قلی خاں کو دے دیا۔ مرزا عزیز کو ہمیشہ دربار حضور میں رہتے تھے۔ اس لیے دیپالپور ان کی جاگیر میں بدستور رہا مگر دوسروں کو چند روز کے بعد سنبھل اور قنوج وغیرہ کے علاقوں میں تبدیل کر دیا گیا۔

اکبر اعظم کی مرزا عزیز کے ہاں ضیافت شاہی

دیپال پور کا علاقہ مرزا عزیز کی جاگیر تھا۔ ۹۷۸ھ میں اکبر بادشاہ پاک پتن سے زیارت کے لیے آئے تو انھوں نے (عزیز) نے عرض کی کہ:

"لشکر شاہی مدت سے مصائب اٹھا رہا ہے تو چند دن تک یہاں آرام فرمائیں۔"

بادشاہ نے کئی مقامات پر سفر کیے تھے تو وہ اپنے شہزادوں اور امراء دربار کے ساتھ ان کے گھر گئے تو مرزا عزیز نے ضیافتوں اور جہانداری میں بڑی عالی ہمتی کا ثبوت دیا اور رخصت کے وقت گراں بہا نذرانے پیشکش گزارے۔ ان کے نذرانوں میں درج ذیل گرانقدر مال و دولت شامل تھا۔

- i- عربی اور ایرانی گھوڑے جن پر سونے کے زین تھے۔
- ii- چند ہاتھی نقرئی اور طلائی زنجیریں۔
- iii- مخمل بفت کی جھولیں۔
- iv- سونے چاندی کے آنکس، موتی، جواہرات۔
- v- گراں بہا مرصع کرسیاں، پلنگ۔
- vi- سونے چاندی کی چوکیاں۔
- vii- سینکڑوں باسن طلائی و نقرئی۔
- viii- جواہرات قیمتی بڑے عجائب اجناس۔
- ix- ملک فرنگ، روم، خطہ، یزد کے نفائس تحائف۔
- x- شہزادوں اور بیگمات کے قیمتی لباس اور گرانقدر زیورات۔
- xi- ارکان دولت کو اور ارکین سلطنت بلکہ ارباب منصب۔

اہل فضل، اہل کمال جو بھی ملازم ہمرکاب تھے بلکہ عام لشکر کو خوان و انعام سے فیض پہنچاتے اور سخاوت کے دریا میں پانی کی جگہ دولت کے طوفان اٹھائے۔

خان اعظم کی دلاوری

۹۷۹ھ میں صوبہ گجرات فتح ہوا تو مرزا عزیز کو جاگیر میں دیا گیا۔ لیکن اکبر تو ادھر آیا۔ وہاں محمد حسین مرزا اور شاہ مرزا نے فولاد خاں دکنی اور سرشور افغان وغیرہ سے موافقت کر کے لشکر فراہم کیا اور مقام پیش پر آ کر ڈیرے ڈال دیے ماثر الامراء میں لکھا ہے کہ:

حسن مرزا کی جرأت وشجاعت کا یہ عالم تھا کہ جنگ کے معرکوں میں دلاوران زمانہ کے حوصلے سے بڑھ کر قدم مارتا تھا اور لوگ دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے۔ خان اعظم نے امرائے شاہی کو اطراف سے جمع کیا۔ بعض امرائے اکبری جو حسب الحکم اپنی خدمتوں پر جاتے تھے۔ وہ خود دوڑ کر آتے اور شامل ہوتے۔

الغرض لشکر آراستہ ہو کر میدان کے لیے نکلا۔ تو غنیم بھی دوسری طرف سے اپنی فوج تیار کر کے میدان کے لیے آیا۔ جب دونوں افواج میدان کی طرف بڑھیں تو طرفین نے اپنے اپنے لشکروں کے پرے باندھ کر بازی شطرنج کی طرح ایک دوسرے کی خوبی بہشت کیا تو اتنے میں انھیں اطلاع ملی کہ:

"غنیم کا ارادہ ہے کہ پیچھے سے حملہ کرے۔"

تو انھوں نے چند امرا کو الگ فوج کر کے دے دی تا کہ وہ ان کا بندوبست کر سکیں۔ جب خان اعظم نے میدان میں آ کر فوج کو قائم کیا تو غنیم نے لشکر شاہی کی جمعیت، تعداد اور سامان حرب اور سرداروں کا بندوبست دیکھ کر لڑائی کو اتنا پسند نہ کیا۔ اور صلح کا پیغام دے کر ایک سردار کو خاں اعظم کے پاس بھیجا امرا شاہی صلح پر راضی ہو گئے مگر ایک امیر گھوڑا دوڑا کر خان اعظم کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ:

اب صلح کی پیشکش کو منظور نہ فرمائیے کہ یہ فریب ہے۔ جب آپ کی فوجیں اپنے اپنے مقاموں پر چلی جائیں گی۔ تو یہ پھر سر اٹھا لیں گے۔"

خان اعظم نے اس کی دوراندیشی کی داد دی اور غنیم کو جواب میں کہلا بھیجا کہ:

"صلح منظور ہے لیکن تمھاری نیت صاف ہے تو پیچھے ہٹ جاؤ ہم تمھارے مقام پر آن اتریں۔"

مگر انھوں نے خان اعظم کی یہ بات نہ مانی۔ جس سے ظاہر ہوا کہ ان کی نیت میں فتور تھا۔ جس کی وجہ سے انھوں نے اتفاق نہ کیا تو خان اعظم نے اپنی فوج کو آگے بڑھایا۔ غنیم کی دائیں فوج نے بائیں پر حملہ کیا اور اس کڑک دمک سے آیا کہ خان اعظم کی فوج کا بازو اکھڑ گیا۔ قطب الدین پرانا خدمت گار سردار تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہیں گڑ کر کھڑا ہو گیا تو جب غنیم کے ہاتھی نے حملہ کیا تو بڑھ کر اس کی مستک پر اپنی تلوار سے زور کا وار کیا کہ ہاتھی کی مستک کا پیٹ نکل گیا مگر فوج ہراول پر زور بڑھ گیا تو وہ بھی مقابلہ پر نہ ٹھہر سکی اور آگے کی فوج بھی درہم برہم ہو گئی اور وہ پیچھے ہٹنے لگی اور بھاگنے لگے مگر ساتھ ساتھ لڑتے بھی تھے مگر حریف ان کے پیچھے تعاقب کر رہا تھا۔ خان اعظم قلب کو تھام کیے کھڑے تھے اور وہ تقدیر الٰہی کے فیصلے کا منتظر تھا۔ اتنے میں پانچ سو سواروں کا جتھا ان پر حملہ آور ہوا مگر وہ ٹکر کھا کر پیچھے ہٹ گیا تو غنیم نے جب دیکھا کہ میدان ہمارے ہاتھ رہا اور دائیں میں اتنی طاقت نہیں کہ بائیں کی مدد کو آ سکیں۔ تو بادشاہی سردار دور سے تماشا دیکھ رہے ہیں تو وہ مطمئن ہو کر ٹھہر گیا کہ:

"اب کیا کرنا چاہیے؟"

اس عرصہ میں فوج اس کی لوٹ پر گر پڑی لیکن بائیں فوج قطب الدین خاں پر سخت بنی ہوئی تھی۔ تو خان اعظم اپنی فوج کو لے کر ادھر پہنچا اور اس کے بہادر گھوڑے اٹھا کر باز کی طرح جا پڑے تو غنیم کی فوج ادھر سے تتر بتر ہو گئی کیونکہ اور فوجوں کے لوگ کچھ تو بھاگتوں کے پیچھے بھاگے جاتے تھے کچھ لوٹ مار پر گر پڑے تھے تو سرداروں سے نہ ہو سکا کہ پھیلاؤ کو پھر سمیٹ لیں۔ یہ اقبال اکبری کا طلسمات تھا کہ:

"شکست سے فتح ہو گئی اور بگڑی ہوئی بات دوبارہ بن گئی۔"

خان اعظم اپنی فوج لے کر ایک بلندی پر آن کھڑا ہوا۔ اتنے میں یہ شور اٹھا کہ مرزا پھر ادھر پلٹ آ رہا ہے۔ خان اعظم کی فوج سنبھل کر کھڑی تھی کہ غنیم سے یہ اول غلطی ہوئی کہ:

"اس نے بھاگتوں کا پیچھا کیا جیسا کہ پہلے حملے میں کامیاب ہوا تھا۔"

اس کے ساتھ ہی خان اعظم پر آتا تو میدان اس کے ہاتھ میں آتا تھا۔ یا جس طرح باگیں اٹھا کر گیا تھا۔ اس طرح سیدھا شہر گجرات میں جا داخل ہوتا۔ تو خان اعظم کو اور بھی مشکلات کا سامنا ہوتا تھا۔ اگر غنیم نے ایسا نہ کیا جس کی وجہ سے خان اعظم کا ستارہ اقبال پر رہا۔

اب دوبارہ جو غنیم کے لشکر نے شور اٹھایا تو اس وقت خان اعظم کی فوج ہوشیار ہو چکی تھی اور بھاگے ہوئے بھی واپس آ کر لشکر میں مل گئے تھے۔ تو ایک امیر نے کہا کہ:

"بس یہی موقع حملہ کا ہے۔"

خان اعظم چاہتا تھا کہ:

"باگ اٹھائے اور حملہ کر دے۔"

تو ایک سردار نے مشورہ دیا کہ:

"اتنے زیادہ سردار موجود ہیں سپہ سالار کو حملہ پر جانا کہاں کا انصاف ہے؟"

ابھی حملہ کی نوبت نہ آئی تھی کہ معلوم ہوا کہ:

"غنیم خود ہی پیچھے ہٹ رہا ہے اور اس کی فوج منہ چھپا کر ملامت سے بھاگ گئی۔"

دشمن کی فوج میں ایک مست ہاتھی تھا کہ اس کا فیلبان تیر قضا کا شکار ہوا تھا۔ وہ شتر بے مہار کی طرح سب کو روندتا پھرتا تھا۔ جس طرف نقارہ کی آواز سنتا تھا اس طرف وہ بھاگ کر چل نکلتا تھا۔ شاہی فوج میں فتح کے نقارے بجنے شروع ہو گئے تو وہ بولا کہ:

"خان اعظم نے نقارے بجنے بند کرا دیے اور دیوانے دیو ہاتھی کو پکڑ کر گرفتار کر لیا گیا۔"

خان اعظم فتح کے نشان ہراتا ہوا گجرات میں داخل ہوا مگر غنیم کا پیچھا چھوڑنا مناسب نہ سمجھا تو خان اعظم پھر فوج لے کر چل پڑا۔ جب خبر دربار میں فتح کی پہنچی تو اکبر بہت خوش ہوا اور ایک امیر کے ہاتھ آفرین کا فرمان بھیج کر انھیں بلا بھیجا تو وہ یہ سن کر پھولے نہ سمائے اور خوشی کے مارے بے سروپا دربار کی طرف دوڑے۔

خان اعظم کا برا حال تھا

• ۹۸۰ھ میں خان اعظم ایک بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ اگر اکبر ساتھ نہ دیتا تو اس کا برا حال ہوتا کیونکہ:

خان اعظم گجرات میں بیٹھے تھے اور شاہانہ طور پر حکومت کر رہا تھا کہ وہی محمد حسین مرزا اختیار الملک دکنی کے ساتھ مل گیا اور دکن کے دوسرے بھی کئی سردار اکٹھے ہو کر حملہ آور ہوئے اور تمام احمد نگر کی اطراف میں پھیل گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خان اعظم کو گجرات سے بھاگنا پڑا اور وہ وہاں سے بھاگ کر احمد آباد میں آ کر بیٹھ گیا۔ غنیم کا ۲۰ ہزار لشکر جمع کر کے گجرات آیا اور خان اعظم کا تخت محاصرہ کر لیا تو ایک دن فاضل خاں فوج لے کر خان پور دروازے سے نکلا اور لڑنے لگا تو غنیم نے ایسے امنڈ کر ان پر حملہ کیا کہ سب کو سمیٹ کر قلعہ کے اندر گھسیٹ دیا۔ فاضل خاں سخت زخمی بھی ہو گئے تھے اور غنیمت سمجھا کہ ان کی جان بچ گئی ہے۔ سلطان خواجہ گھوڑے سے گر کر خندق میں جا پڑے۔ فصیل پر سے رسہ ڈالا تو کرہ لٹکایا۔ جب نکلے تو سب کے حوصلے پست ہو چکے تھے اور انھوں نے کہہ دیا کہ:

"اس غنیم کا مقابلہ ہماری ہمت سے باہر ہے۔"

تو انھوں نے واویلا شروع کر دیا اور اکبر بادشاہ کو کمک کے لیے بلانا شروع کیا۔ محل میں جی جی آئی تھیں اور وہ روتی تھی کہ:

"میرے بچے کو جا کر لے آؤ"

تو اکبر کچھ سرداروں کو لے کر تیار ہو کر چل پڑا اور ایک ماہ کا سفر سات دن میں طے کرتا ہوا ساتویں دن گجرات آ پہنچا تو آ کر اس نے غنیم کا مقابلہ کیا۔ جب اکبر نے گجرات فتح کیا تو شاہزادہ سلیم کی وکالت اور نیابت کے ساتھ دو کروڑ ساٹھ لاکھ کا علاقہ کر کے دار الملک احمد آباد سے پایہ تخت گجرات میں ممتاز کیا۔ اس دن ایک تقریب میں خاص مرجع سے میں بھی حاضر تھا اور میں مرزا کا ملازم بھی تھا۔ شب رات کی ۱۵ تاریخ تھی۔ میں نے اس وقت تاریخ کہی کہ:

"گفتا کہ بہ شب برات وارند پدر"

فتوحات بنگالہ

دوسرے سال فتوحات بنگالہ کا سال تھا تو فتوحات بنگالہ کے شکرانے میں بادشاہ نے فتح پور سے اجمیر شریف گئے۔ وہ بڑے بڑے نقارے جلوت میں آئے تھے۔ وہاں نذر چڑھائے۔ خان اعظم پہلے سے اشتیاق حضوری میں عرضیاں کر رہے تھے۔ تو وہ یلغار کر کے احمد آباد سے پہنچے تو بادشاہ بہت خوش ہوئے بلکہ اٹھ کر چند قدم آگے بڑھ کر استقبال کیا۔

۹۸۳ھ میں مرزا سلیمان کی آمد کا انتظار تھا۔ ان کے لیے ضیافت کے انتظامات ہو رہے تھے کہ جس سے جشن جمشید کی شان شکوہ کرتی تھی۔ انھیں حکم پہنچا کہ:

"تم بھی حد ضرور پار ہو تا کہ زمرہ امراء میں پیش ہو۔"

خان اعظم ڈاک بٹھا کر فتح پور میں پہنچا۔ وہ اسی سال داغ کا آئین جاری ہوا اگر امرا کو یہ قانون ناگوار گزرتا تھا۔ تو بادشاہ نے مرزا عزیز کو اپنا وفادار سمجھ کر فرمایا کہ:

"پہلے خان اعظم اپنے لشکر کی موجودات دے گا۔"

ہٹیلے نواب کی آنکھوں پر ان دنوں جوش جوانی نے پردہ ڈالا تھا" ایک میاں باؤلے اوپر سے پی بھنگ ہمیشہ کے لاڈلے تھے۔ وہ اپنی ہٹ پر اڑے رہے۔ اور نئے قانون کی قباحتیں صاف صاف بیان کرنی شروع کر دیں تو بادشاہ نے کچھ فہمائش کی اور ارکان دولت میں اس کی تائید میں تقریریں بھی کیں۔ وہ جواب میں کسی سے نہ دبتے تھے تو بادشاہ نے تنگ آ کر کہا:

"ہمارے سامنے نہ آؤ۔"

کئی دن کے لیے آگرہ بھیج دیا گیا تاکہ وہاں اپنے باغ میں رہو اور آمدورفت کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ نہ کوئی ان کے پاس آتا اور نہ وہ کسی کے پاس جاتے تھے۔ باغ مذکورہ کا نام باغ جہاں آرا تھا۔

۹۸۳ھ کو بادشاہ کو خود خیال آیا کہ تقصیر معاف کر کے اس کو دوبارہ صوبہ گجرات میں روانہ کر دیا جائے۔ مگر وہ بڑا ضدی انسان تھا اس نے بادشاہ کے ساتھ اتفاق نہ کیا تو بادشاہ نے کہلا بھیجا کہ:

"ملک سلاطین عالی جاہ کا تخت گاہ ہے اس نعمت اور حضور کی عنایت کا شکرانہ بجالاؤ اور جاؤ۔"

انھوں نے کہلا بھیجا کہ:

"میں نے سپاہ گری چھوڑ دی ہے میرا نام اہل دعا کے لشکر میں رہنے دیجیے۔"

تو اس کی جگہ پر اس کے حقیقی چچا قطب الدین خاں کو روانہ کیا خان اعظم کو قطب الدین خاں، اس کی والدہ نے بھی بہت سمجھایا اور اس سے خفا بھی ہوئی مگر وہ نہ مانا تو اس موقع پر مرزا خاں کی قسمت نے ساتھ دیا۔ اس کو خان خاناں کا خطاب ملتا تھا۔ تو بادشاہ نے اس کو گجرات بھجوا دیا اور وہ بادشاہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بلکہ سجدے کرتے ہوئے روانہ ہو گیے۔ ۹۸۶ھ میں ان کی ساری خطائیں معاف ہو گئیں مگر اس کی نوبدبختی کے ایام کی ابتداء ہوئی۔

مرزا عزیز کی بلا ٹل گئی

۹۸۷ھ میں مرزا پر سے ایک بہت بڑی مصیبت دور ہو گئی کہ بادشاہ خلوت میں تھا تو اچانک دولت خانہ اقبال سے ایک بہت بڑا شور اٹھا جس کے معلوم کرنے سے علم ہوا کہ:

"مرزا زخمی ہوئے ہیں۔"

جس کی حقیقت یہ تھی کہ جھوپٹ چوہان اتاوہ کا رئیس باغی ہو کر ملک بنگالہ میں چلا گیا تھا اور بنگالہ تتر بتر ہو گیا۔ تو وہ اپنے علاقہ میں آیا اور رعیت کو دل تسلیاں دینے لگا اور ڈاکوؤں کو دبانے لگا۔ اگر حکام بادشاہی نے اسے دبایا اور دربار میں عرضی کی تو حکم ہوا کہ:

"ملک مذکور مرزا عزیز کی جاگیر ہے وہ جا کر اس کا بندوبست کریں۔"

وہ جلدی سے راجہ ٹوڈرمل اور راجہ بیربل کے پاس آیا اور اس سے جرم بخشی کا راستہ دریافت کیا تو مرزا عزیز کو جب یہ حال معلوم ہوا تو اس نے بھی حضور میں عرض کی جس پر حکم یہ صادر ہوا کہ:

"شیخ ابراہیم اور شیخ سلیم چشتی کے خلیفہ اسے بلائیں اور اس کا حال معلوم کریں۔"

وہ ظاہر میں بڑا مسکین اور دل سے مرزا کی گھات میں تھا۔ راجپوتوں کی جمعیت سے لشکر میں آیا اور اس نے شیخ سے کہا کہ:

"مرزا مجھے اپنی پناہ میں لے لیں اور جرم بخشی کا ذمہ لے کر حضور میں لے چلیں۔ ورنہ میں اپنی جان سے ہاتھ دھولوں گا۔"

شیخ ابراہیم وغیرہ اسے اور مرزا عزیز کو ساتھ لے کر حضور میں حاضر ہوئے تو اس وقت کا آئین تھا کہ:

"بارگاہ میں بے اجازت کسی کو ہتھیار لے کر نہ آنے دیا جائے۔"

مگر اس کی کمر میں جمدھر تھا تو ایک پہرہ دار نے جمدھر پر ہاتھ رکھا۔ تو وہ بدگمان ہوا اور اس نے فوراً جمدھر کو کھینچ لیا۔ مگر مرزا نے ہاتھ پکڑ لیا تو اس نے اسے زخمی کر دیا تو پانی میں پڑ کر گھر گئے تو دوسرے دن حضور نے جا کر اس کے حالات سے آگاہی حاصل کی اور اس کو دم تسلیاں دیں۔

مرزا عزیز کے لیے نحوست

۹۸۸ھ کو مرزا عزیز پر دوبارہ ایک بھاری سال آیا۔ جس کی اصل وجہ یہ تھی کہ:

ان کا دیوان اس کا کچھ روپیہ کھا گیا تھا۔ تو اس نے اس کو طلب کر کے اپنے ایک غلام کے سپرد کر دیا کہ وہ اس سے زبردستی کھایا ہوا روپیہ وصول کرے تو اس غلام نے دیوان جی کو باندھ کر اس قدر مارا کہ وہ جان سے ہی مر گیا۔ تو دیوان کا باپ روتا پیٹتا بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا۔ تو بادشاہ کو بوڑھے کی حالت دیکھ کر بڑا ترس اور رحم آیا اور بادشاہ کو اس وقاعہ کا بہت دکھ و رنج بھی ہوا۔ تو قاضی کو بادشاہ نے حکم دیا کہ:

"تحقیقات کی جائیں۔"

تو خان اعظم مرزا عزیز نے کہا کہ:

"غلام کو میں نے سزا دی ہے اور میرا مقدمہ حضور قاضی کے ہاتھ میں نہ دیں۔ اس میں میری بے عزتی ہے۔"

مگر بادشاہ کو یہ بات پسند نہ آئی اور اس نے اس کو منظور نہ کیا تو مرزا عزیز ناراض ہو کر گھر بیٹھ گئے۔ آخر کار کئی ماہ کے بعد بادشاہ نے ان کی خطا معاف کر دی۔

۹۸۸ھ میں بنگالہ میں فساد پھوٹ پڑا تو مظفر خاں سپہ سالار ہلاک ہوا تو اس کو بغیر...... منصب عنایت کیا۔ تو ان کو خان اعظم کا خطاب دے کر ٹوڈرمل کی جگہ پر بنگالہ کی مہم پر سپہ سالار بنا کر روانہ کیا۔

اس ملک میں کئی نامور سپہ سالار جن میں منعم خاں، خان خاناں اور حسین قلی خاں اس ملک میں برسوں رہے تھے۔ انھوں نے وہاں اپنے خون پسینے ایک کیے۔ مگر ملک کی حالت نہ سدھر سکی اور ملک کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ:

”ایک طرف تو افغان اپنا حق سمجھتے تھے۔ اور وہ بے جا فساد برپا کرتے۔ لوٹ مار کرتے۔ دوسری طرف بادشاہ کے نمک حرام امراء بھی وہ خود اور کبھی افغانوں کے ساتھ مل کر ملک میں فساد پھیلاتے اور لوٹ مار کا بازار گرم کرتے۔“

خان اعظم مرزا عزیز اپنی فوجیں بھیج کر ان کا بندوبست کرتے تھے مگر ان پر ان کا کوئی بس نہ چلتا تھا اور امراء امرا ہی پر خفا ہوتے تھے۔ اگر زیادہ خفا ہوتے تو وہ ایک چھاؤنی چھوڑ کر دوسری چھاؤنی میں چلے جاتے تھے امراء لوگوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے۔ انھیں مال و زر بھی دیا جاتا۔ مگر وہ پھر بھی خوش نہ ہوتے اور ملک میں امن وامان قائم نہ ہوتا تھا۔ باغیوں پر روپیہ بھی خرچ کرتے۔ پریشان بھی ہوتے مگر ان کی کوئی تدبیر یا قدم کامیاب نہ ہوتا تھا۔ ۹۹۰ھ میں جب بادشاہ کابل کی مہم فتح کر کے فتح پور میں آئے تو ۹۹۱ھ کے جشن میں شامل دربار ہوتے۔ اور وہاں بغاوت ہوگئی اور بنگالہ سے لے کر حاجی پور تک باغیوں نے لے لیا۔

خان اعظم دوبارہ مہم بنگالہ کے لیے خلعت اور فوج لے کر روانہ ہوئے تاکہ اس بغاوت کا بندوبست کریں۔ ۹۹۲ھ میں اس نے عرض کی کہ:

”اس کی آب و ہوا مجھے موافق نہیں آئی اگر میں چند روز اور یہاں رہا تو زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھوں گا۔“

تو بادشاہ نے اس کو حضور میں بلالیا۔

کیونکہ بادشاہ اس کی ہر لحاظ سے عزت کرتے تھے اور ان کے ہر مشکل کے معاملے میں مدد بھی کرتے تھے کیونکہ اکبر اس کو اپنا بھائی اور اس کی والدہ کو اپنی والدہ سمجھتے ہوئے ان دونوں کا بڑا ہی احترام و خیال رکھتے تھے۔ تو اکبر نے اس کی ساری خطائیں معاف کر کے اس کو دوبارہ اپنے حضور میں بلا کر اس کی تسلی کر دی اور وہ حالات سے مطمئن ہو گئے۔

دکن میں بغاوت

۹۹۳ھ میں دکن کے اطلاع سے بغاوت کی خبریں آنی شروع ہوئی مگر اکبر پہلے ہی دکن کے علاقوں میں پھر رہا تھا تو میر مرتضےٰ اور خداوند خاں امرائے دکن برارے احمد نگر پر حملہ آور ہوئے اور نظام الملک کا پایہ تخت تھا وہ وہاں سے شکست کھا کر راجہ علی خاں حاکم خاندیس کے پاس آئے تاکہ اکبر کے حضور میں حاضر ہوں۔ مرتضےٰ نظام شاہ نے راجہ علی خاں کے پاس آدمی بھیجے کہ فہمائش کر کے روک لو۔ وہ روانہ ہو گئے تھے۔ اس لیے آدمی بھیجے کہ خواتین کو روکیں۔ مگر وہ نہ رکے اور ان کی نوبت لڑائی تک پہنچ گئی۔ جس کا نتیجہ لوٹ مار پر منتج ہوا اور وہ آگرہ پہنچے۔

راجہ علی خاں بڑا ہی دور اندیش اور صاحب حکمت انسان تھا۔ اس کو خیال آیا کہ:

”اکبر بہادر کو یہ امر ناگوار گزرا ہو۔“

وہ جانتا تھا کہ اکبر ہاتھی کا عاشق ہے تو اس نے اپنے بیٹے کے ہاتھ ۱۵۰ ہاتھی دربار روانہ کر دیے اور نوروزی کے جشن میں اس نے مزید نفیس پارچہ جات اور اسباب واجنا اس گزارنے اور اس کے ساتھ دکن کو تسخیر کرنے کے بھی طریقے اور راستے بتائے۔

خان خاناں مرزا عبدالرحیم احمد آباد میں تو پہلے سے ہی موجود تھے تو انھوں نے تمام امراء اور سرداروں کے نام فرمان جاری کیے اور چند امراء کو بھی ان کے ساتھ روانہ کیا اور خان اعظم کو فرزندی کا خطاب اور سپہ سالار بنا کر حکم دیا کہ:

"برا ریتے ہوئے احمد نگر کو جا رو۔"

تو انھوں نے ہشدیہ میں جا کر ڈیرے ڈال دیے اور اپنی فوج کو روانہ کر کے ساتوں پر قبضہ کر لیا تو "ناہر باد" اطاعت قبول کرتے ہوئے حاضر ہوا اور راجہ بھی کمر بستہ حاضر خدمت ہوا اور ملک گیری کا ہنگامہ شروع ہو گیا تو بادشاہ نے ملک مالوہ کے عمدہ عمدہ مقام پیارے لوگوں کی جاگیر کر دیے۔ جب امراء کو ان کی ہمراہی کے فرمان پہنچے تو سب فراہم ہوئے۔

تقدیر کے اتفاق سے ان میں نا اتفاقی کی آندھی اٹھی اور اندھیرا چھانے لگا۔ سپہ سالار پر سب کی بدگمانی چھانے لگی۔ اور وہ بہت گھبرایا کیونکہ اندرونی نا اتفاقی سے انتظام قائم رکھنا مشکل ہوتا ہے اور پورے کا پورا انتظام ہی بگڑ کر رہ جاتا ہے۔

تو اس وقت ماہم بیگم کی نشان شہاب الدین احمد خاں موجود تھے۔ ان کی صورت دیکھ کر باپ کا خون آنکھوں میں اتر آیا۔ خان اعظم اکثر محفلوں میں اس بڑھے کو لیس سال کو ذلیل بادشاہ نے شاہ فتح اللہ شیرازی کو اصلاح و تدبیر کے لیے ساتھ کر دیا تھا۔ کیونکہ وہاں کے حالات سے اچھی طرح واقف تھا اور وہاں کے لوگ بھی اس کی باتوں کو تسلیم کرتے تھے۔ ان کا صرف یہ مقصد تھا کہ ان میں نفاق مٹ جائے اور ان میں کینہ پروری کی آگ کو بجھا یا جائے۔ شاہ فتح اللہ شیرازی ان کو سمجھاتے تھے کہ:

"یہ موقع آپس کی عداوت کا نہیں ہے مہم خراب ہو جائے گی۔ سب کا باپ اکبر بادشاہ ہے۔ اس کی بات میں اور عزت میں فرق آ جائے گا اور دنیا عالم میں سب کی ذلالت اور رسوائی ہو گی۔"

مگر خان اعظم عزیز کوکلتاش نے اس کی اس پند و نصائح کے ساتھ اتفاق نہ کیا اور الٹے اس سے بھی ناراض ہو گئے اگرچہ شاہ فتح اللہ شیرازی ان کے استاد بھی تھے ان کے احترام کو بھی بالا کے طاق رکھ کر خود خان اعظم اور اس کے آدمی پر مجلس تمسخر اڑاتے تھے اور شاہ مولود شائف بھی پریشان اور آزردہ کرتے گئے تھے اگر شاہ شیرازی بڑے ہی سمجھدار اور منصوبہ ساز شخص تھے مگر ان کی ایک بھی نہ سنتے اور بڈھے شہاب الدین احمد خاں سردار کی تذلیل کرتے اور نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ وہ اس ذلالت سے تنگ آ کر اپنی فوج سمیت راہیں دواہیں اپنے علاقے کو روانہ ہو گیا۔ انھوں نے ان کی دلجوئی اور ہمدردی کرنے کے بجائے اس پر یہ جرم عائد کر دیا کہ:

"میں ایک تو اکبر بادشاہ کا بھائی ہوں اور دوسرے فوج کا سپہ سالار بھی تھا تو میری اجازت کے بغیر جانا چہ معنی دارد؟"

وہ فوج لے کر اس کے پیچھے روانہ ہو گئے تو اکبر خاں جو کہ بڑا ہی باہمت اور دلاور سپہ سالار تھا اس پر بھی تہمت لگائی اور اس کو قید کر لیا۔ ان حالات کے باوجود دشمن خوف زدہ تھا کہ شاہی فوج نا معلوم ہمارا کیا حشر کرے گی؟ مگر دشمن نے یہ مشاہدہ کیا کہ حملہ کرنے میں شاہی فوج کی طرف سے دیر ہوتی جا رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی خبر ملی کہ امرا اپنے گھر میں ہی لڑ جھگڑ رہے ہیں تو دشمن کے حوصلے بلند ہو گئے اور ان کے دل جوان ہو گئے تو دشمن نے محمد تقی کو بیس ہزار کی فوج دے کر سپہ سالار بنا کر روانہ کر دیا۔ مرزا محمد تقی خود راجہ علی قلی خاں کے پاس گئے۔ اس وقت بعض دکنی سردار ہوا اور حالات کا رخ دیکھ رہے تھے۔ وہ بھی بدحواس ہو گئے اور قریب تھا کہ سلطنت کی نوبت رسوائی تک پہنچ جائے۔ پر فتح اللہ شیرازی درمیان میں اڑ گئے اور غنیم کے ساتھ حفاظت کروا دی۔ جس سے پردہ عزت رہ گیا۔

خان اعظم کی بدحالی کی کیفیت

راجہ علی قلی خاں حاکم خاندیس دکن کے حصوں کا سردار اور مالک شمشیر تھا وہ خان اعظم کی مدد کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ خان اعظم ان حالات کے تحت موقع کو غنیمت سمجھا اور برار اور احمد نگر کے امراء اور ان کی فوجوں کو ساتھ لے کر روانہ ہو پڑا تو مرزا عزیز نے یہ سن کر ادھر سے شاہ فتح اللہ شیرازی کو روانہ کیا کہ فہمائش کریں اور ان کو سمجھا بجھا کر کام نکالیں۔ راجہ علی قلی خاں دکن کے جنگلوں کا شیر تھا اب وہ کس کی سنتا تھا۔ اب وہ سیدھا آیا اور شاہ فتح اللہ شیرازی ناکام وہاں سے لوٹا اور وہ پریشان ہو کر گجرات میر عبدالرحیم خان خاناں کے پاس چلا گیا تو راجہ علی قلی خاں کی آمد کا سن کر خان اعظم عزیز کوکلتاش بڑا گھبرایا۔ اس نے امراء اور سرداروں کو مشورہ کے لیے جمع کیا مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ جو آدمی دوست اور دشمن میں ہی تمیز نہ کر سکے اور موقع کی نزاکت کو نہ سمجھ سکے۔ اس کو کوئی کیا مشورہ دے گا؟ اور کیوں کوئی مشورہ دے گا؟

کئی دن تک ہنڈیہ میں آمنے سامنے پڑے رہے مگر دونوں میں مقابلے کی طاقت نہ ہوئی۔ دوستوں اور ساتھیوں پر اعتبار نہ ہوا تو آخر کار مجبوری کی حالت میں ایک رات خاموشی سے گمنام انداز میں وہاں سے بھاگ نکلا اور ملک برار کا رستہ لیا۔

ایلچ پور اس کا دار الخلافہ تھا۔ راستے میں جو بھی شہر/گاؤں آتا گیا اس کو لوٹتا گیا۔ اس طرح بہت سی دولت جمع کر لی۔ جتیارا جو وہاں کا راجہ تھا وہ بھی اس کے ساتھ مل گیا اور وہ گندے اور ناہموار راستوں سے اس کی رہنمائی کرتا ہوا لایا اور راستے میں اس کے ذہن میں خیال آیا کہ:

"یہ غنیم سے ملا ہوا ہے۔"

اور اس سے بدگمانی کی تلوار سے اس کا کام تمام کر دیا۔ ایلچ پور میں پہنچ کر بعض امراء کا یہ مشورہ ہوا کہ:

"اسی طرح اسی جگہ سے آگے چلے چلو اور احمد نگر جا کر دم لو۔"

کیونکہ یہ دار الملک دکن کا ہے۔ مگر بعض لوگوں نے یہ بھی مشورہ دیا کہ:

"یہیں ڈیرے ڈال دو اور جو ملک لیا ہے اس کا انتظام کرو۔"

مگر انہیں کسی کی بات پہ بھروسہ اور یقین نہ تھا۔ اس لیے وہ نہ تو اسی مقام پر ٹھہرے اور نہ انھوں نے دریا کا ہی رخ کیا اور غنیم سوچتا رہا کہ:

"سپہ سالار تو بعض علاقے کو چھوڑ کر چلا گیا۔ اللہ جانے اس کے اندر کیا حکمت ہو گی؟"

دشمن کے وارے نیارے ہو گئے۔ ان کو ہنڈیا شہر مل گیا تو انھوں نے اس کو خوب لوٹ کر تباہ و برباد کر دیا۔ غنیم کے ساتھ لڑائی تو ہوتی رہتی تھی۔ ایک مرتبہ لڑائی کا موقع آیا مگر اس میں بھی ذلالت ملی اور وہ درمیان میں ہی چھوڑ کر احمد آباد چلا گیا۔ اس کے ذہن میں یہ خام خیال تھا کہ مرزا عبدالسلیم خاں خاناں میرا ہمنوا ہوئی ہے اور اس سے کمک لا کر غنیم کو تباہ و برباد کر دوں گا۔ مگر مرزا عبدالرحیم خان خاناں مجھو آباد کی منزل میں نظام الدین احمد کے ڈیروں میں آ ملے جبکہ وہ بڑودہ جا گرے تھے۔ لہٰذا ان کا مشورہ ہوا کہ احمد آباد چلو۔ بہن بھی ادھر ہی ہے پھر ان سے مل کر دکن چلیں گے۔ پھر بڑودہ میں آ گئے۔ پھر خان اعظم آگے بڑھ گئے کہ جب تک خان خاناں لشکر لے کر احمد آباد سے آئیں میں لشکر نذر بار کو تیار کرتا ہوں۔ لہٰذا وہ فوج لے کر بھڑوچ کو نکلے۔ جب وہاں پہنچے تو خان اعظم کا خط آیا کہ اب برسات کا موسم آ چکا ہے۔ اس لیے لڑائی موقوف کی جائے۔ راجہ علی قلی خاں اور دکنی سردار اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے اور خان اعظم نذر بار سے دربار میں حاضر ہوئے۔

شہزادہ مراد کی شادی

۹۹۵ھ میں سب کا متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ اپنے تعلقات گہرے کرنے کے لیے اور پیار و محبت کی فضا کو خوشگوار کرنے کے لیے آپس میں رشتہ داری کو بڑھانا چاہیے تو اس مقصد کے تحت انھوں نے شہزادہ مراد کی شادی خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کی بیٹی کے ساتھ ہونی قرار پائی۔

تاکہ خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش اور اکبر اعظم کے تعلقات مزید گہرے ہو جائیں اور ایک دوسرے کے مراتب کا زیادہ خیال کرنے لگیں۔

اگرچہ اس وقت شہزادہ مراد کی عمر صرف سترہ برس کی تھی۔ جس کی عمر میں اگر شادی نہ بھی کی جائے تو کوئی بری بات نہیں ہوتی۔ اکبر اعظم کی والدہ محترمہ کا اسم گرامی مریم مکانی تھا۔ وہ اس شادی پر بہت خوش و خرم تھی تو یہ شادی اکبر اعظم کی والدہ محترمہ مریم مکانی کے گھر میں رچائی گئی تھی۔ اس سے خان اعظم کی عزت افزائی بھی ایک ان کا بڑا مقصد تھا۔ تو اکبر اعظم شہنشاہ ہند خود برات لے کر اپنے بیٹے کی شادی کے لیے خان اعظم کے ہاں گئے تھے اور چونکہ شہنشاہ ہند کے شہزادے مراد کی پہلی شادی تھی لہٰذا اس شادی پر خوب دھوم دھام کے انتظامات کیے گئے اور دلہن کو خوبصورت ملبوسات اور زیورات کے ساتھ شان و شوکت کے ساتھ بیاہ کر لائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک سال کے بعد چاند جیسا بیٹا دیا جس کا نام مرزا رستم رکھا گیا جس نے والدین اور آباؤ اجداد کی خوشیوں کو دوبالا کر دیا۔

خان اعظم عزیز مرزا کوکلتاش کی خواہش کا پورا ہونا

۹۹۷ھ میں احمد آباد گجرات مرزا عبدالرحیم خان خاناں سے لے کر خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کو دیا گیا مگر وہ اس جاگیر پر راضی نہ ہوئے۔ ان کی یہ ضد تھی کہ:

''وہ مالوہ کا ملک اچھا ہے وہ لینا چاہتے تھے۔''

اکبر اعظم شہنشاہ ہند تھے ان کو حکومت کے انتظامات چلانے کے لیے کئی تجاویز کو عملی جامہ پہنانا ہوتا تھا تو انھوں نے اپنے امراء اور وزراء اور قرابت داروں سے کئی بار مشاورت کی اور زمانے کے تمام حالات کے نشیب و فراز کو مدنظر رکھا۔ انھوں نے اس کے فیصلے کے لیے مجلس مشاورت کو بھی بلایا اور ان سے تفصیلی طور پر طویل بحث ہوئی۔

بہر حال طویل مباحثوں کے بعد ان کے ہاں ایسی تجویز پر سب کا اتفاق ہوا کہ جس میں خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کی خواہش بھی پوری ہو گئی۔ سب ارکان مشاورت نے ان کی خواہش کا بھی پورا پورا خیال رکھا۔

جب ان کی خواہش پوری ہو گئی جس سے وہ خود بھی بہت خوش ہوا۔ جس سے اکبر اعظم کو بھی بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ تو وہ اس خوشی کی حالت میں اپنے پورے ساز و سامان کے ساتھ اُدھر (مالوہ) روانہ ہوئے۔

خان اعظم مرزا عزیز کی سخاوت

خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش سخاوت کے شہزادے تھے۔ ان کو اس قدر سخی ہونا بھی ضروری تھا کیونکہ وہ اکبر اعظم شہنشاہ ہند کے رضاعی

بھائی تھے۔ اور دونوں بھائی ایک دوسرے کا بہت احترام و عزت کرتے تھے۔ مرزا عزیز کوکلتاش نے امراء اور لشکر کو ہاتھی گھوڑے، نقد و جنس بے حساب انعام سے دیا گیا جس سے تمام امراء لشکر بہت خوش ہوئے تھے۔

خان اعظم عزیز کوکلتاش نہ صرف سخاوت کے میدان میں ہی سب سے آگے تھے بلکہ وہ انشاپرداز بھی بہت ہی قابل تعریف قسم کے شخص تھے۔ وہ جو کچھ بھی لکھتے تھے وہ ایسے ہوتا تھا کہ جیسے کسی نے موتی پرو دیے ہیں۔ ان کی انشاپردازی میں کسی کو کوئی خامی یا جھول نظر نہ آتی تھی۔ انشا پردازی میں موقع و محل کے مطابق الفاظ کا استعمال ہوتا تھا۔ آداب و احترام کا ہر جگہ لحاظ رکھا جاتا تھا۔

خان اعظم مرزا عزیز نے شہنشاہ ہند کو اپنی فتح کا مراسلہ بنا کر روانہ کیا۔ تو دربار میں اور محلوں میں ان کو بے شمار لوگوں نے مبارکبادیں دیں اور ان کے نام پر خوشی کا اظہار کیا گیا تھا۔ خورم فرزند فوج کو لے کر مظفر کا پیچھا کرتا چلا اور راستے میں اس نے بہت سے قلعے بھی فتح کرنے چاہے مگر امراء ہمراہی کی کمزوری کی وجہ سے ایسا نہ کر سکا کیونکہ سپہ سالار کے لیے امراء ہمراہی ایک ہتھیار کا کام دیتے ہیں۔ جب کسی لشکر کے پاس ہتھیار ہی زنگ آلودہ ہوں تو وہ سپہ سالار بے بس ہوتا ہے۔

یہی حالت اس وقت خوام فرزند کی تھی۔ اس کے ہمراہی امراء کی حالت بڑی کمزور ہو چکی تھی اور وہ مزید کسی بھی قلعے کو فتح کرنے کے لیے تگ و دو کرنا پسند نہ کرتے تھے جس کی وجہ سے خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش نے بھی ملک گیری کی ہوس کو مزید پھیلانے کی کوشش نہ کی۔ اور اس نے جو ملک اس کے پاس تھا اس کے بہتر انتظامات و انصرام میں ہی اپنی اور علاقے کی بھلائی کو روایت دی۔

اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس وقت کے امراء ہمراہی جو کہ ان کے لیے ہاتھ اور پاؤں کا کام دیتے تھے وہی مفلوج حالت میں ہو چکے تھے ان کے نہ ہوتے ہوئے کوئی دوسرا کچھ کرنے کے اہل نہیں ہوتا ہے۔ امراء اور فوجیں اپنے اپنے علاقوں میں جا کر آرام کرنے کے ارادے میں تھے۔ جس کی وجہ سے انھوں نے اپنے اپنے علاقوں میں جا کر آرام کرنا شروع کر دیا اور خان اعظم نے بھی ان کی رائے کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے مزید ملک گیری کو پھیلانے کے ارادے کو موقوف کر دیا۔

خان اعظم کی جوناگڑھ کی تسخیر

۱۰۰۰ھ میں دربار اکبری میں یہ اطلاع خاص و عام میں پھیل گئی کہ دولت خاں جو جامہ کی لڑائی میں تیر کھا کر بھاگ گیا تھا۔ وہ تیر اجل کا نشانہ ہوا ہے تو خان اعظم نے اپنا ایک لشکر آراستہ کر کے مقابلہ کے لیے نکلا اور اس نے جوناگڑھ پر قبضہ کرنے کا ارادہ مصمم کر لیا کیونکہ یہ ملک سورٹھ کا حاکم نشین شہر تھا۔ تو اس کے لیے پہلی اچھی بات یہ ہوئی کہ:

"جوم کے بیٹے اس ملک کے چند سرداروں کے ساتھ آ کر لشکر شاہی کے ساتھ مل گئے اور اس کے علاوہ کوکہ، منگلور، سومنات اور ۱۶ بندر بغیر لڑائی کے ان کے قبضے میں آ گئے تھے۔"

یہ خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کی تقدیر کا امتحان تھا۔ اب صرف جوناگڑھ کی تسخیر کا مسئلہ درپیش تھا۔ مگر مرزا عزیز کوکلتاش بھی بڑا باہمت اور استقلال پسند سپہ سالار تھا۔ اس نے بھی اس کو مسخر کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا تو اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے خان اعظم نے جوناگڑھ کا مضبوط

محاصرہ کرلیا۔ اور ان کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ:

''کاٹھی لوگ قلعہ جونا گڑھ میں اس میں تے کا کام کر رہے ہیں۔''

تو خان اعظم عزیز مرزا نے سب سے پہلے ایک سردار کے ذمہ یہ کام لگا کر اس رسد کی سپلائی کو بند کر دیا۔

اب قدرت معاود کے رنگ ملاحظہ ہوں کہ اس دن غنیم کے قلعے کے سنگزین میں آگ لگ گئی۔ جس سے ان کا کافی نقصان ہوا۔ اگرچہ غنیم کا بہت نقصان ہوا تھا مگر انھوں نے اپنے حوصلے بلند رکھے اور ہمت نہ ہاری۔ بلکہ قلعے والے اور باہمت ہو گئے۔ ان کے سو توپ پر فتیلہ پڑتا تھا اور برابر ڈیڑھ من کا گولہ گرتا تھا۔ یہ بنگالی توپچی نے گولہ اندازی میں ایسی جان ڈالی کہ گولی کی طرح حوصلہ سے نکل پڑا اور خندق میں سر کر ٹھنڈا ہو گیا تو خان اعظم نے بھی سامنے کی پہاڑی پر چڑھ کر اپنی توپیں نصب کر دیں اور قلعے پر گولے برسانے شروع کر دیے تو قلعے والے ان کی اس قدر طوفانی گولہ باری سے تنگ آ گئے۔ آخر کار میاں خاں اور تاج خاں سپاہان دوست خاں نے چابیاں ان کے حوالے کر دیں اور ان کی خدمت میں پچاس سردار آ کر حاضر ہو گئے۔ تو خان اعظم نے ان کی بڑی دلداری اور عزت و اکرام ملحوظ نظر رکھا۔ ان کو بھاری خلعتیں، بلند منصب اور بڑی بڑی جاگیریں دے کر خوش کیا اور ان کے ساتھ خود بھی بڑے خوش ہوئے یہ واقعی خوشی کا موقع تھا کہ ان کے قبضے میں سومنات کا مندر آ گیا تھا جو کہ بڑی اہمیت کا حامل قلعہ تھا۔ اب اکبر اعظم شہنشاہ ہند کی سلطنت کا پاٹ سمندر کے گھاٹ تک پہنچ گیا تھا۔ اکبر اعظم کے لیے بھی یہ بڑی خوشی ہونے کا مقام تھا۔ اس کے علاوہ یہ کارنامہ اس کے رضاعی نے ادا کیا تھا۔ جس کے بارے میں سن کر اکبر کا فخر سے سر اور بلند ہو جایا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اکبر اعظم شہنشاہ ہند کی اپنی بھی یہ خواہش دیرینہ تھی کہ اس کی دریا کی قوت مزید فروغ پائے اور اس میں وسعت پیدا ہو۔ تو اس جونا گڑھ کے قلعے کو قبضہ میں کر لینے کے بعد اس کی یہ خواہش کلی طور پر پوری ہو جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے اکبر اعظم خوشی کے مارے سمایا نہ جاتا تھا۔ اور وہ اپنے رضاعی بھائی مرزا عزیز کوکلتاش کو مبارکباد کے فرمان جاری کر رہا تھا۔ اس نے عزیز مرزا کو بہت سے انعام و اکرام سے بھی نوازا کیونکہ مرزا عزیز نے یہ بہت بڑا کام سرانجام دیا تھا۔ اور انھوں نے خان اعظم مرزا عزیز کو محمود غزنوی کے نام سے پکارنا شروع کیا جو کہ اس کے لیے بڑے فخر کی بات تھی کیونکہ محمود غزنوی کا نام خطہ ہند میں بڑے احترام سے لیا جاتا تھا اور وہ بڑی معزز شخصیت تھی۔

خان اعظم کا مظفر کا خاتمہ چاہنا

اب خان اعظم کا ارادہ تھا کہ فساد کو ختم کرنے کے لیے مظفر کا خاتمہ ضروری ہے۔ ورنہ فساد ختم نہ ہوگا۔ تو اس مقصد کے لیے خان اعظم نے کئی سرداروں کو فوجیں دے کر روانہ کیا اور ان سرداروں کے ساتھ اپنے بیٹے انور کو بھی ہمراہ روانہ کیا۔ مگر مظفر نے ''ملک ہار'' کے راجہ کے ہاں پناہ لے رکھی تھی کیونکہ دوارکا کا مندر بھی اس جگہ پر تھا اور راجہ بھی اس کی مدد کر رہا تھا۔ جب یہ افواج وہاں پہنچیں تو دوارکا کا مندر بغیر لڑائی کے ان کے قبضہ میں آ گیا۔ مگر راجہ نے مظفر کو بمعہ اس کے اہل و عیال کے ایک جزیرے میں بھجوا دیا تھا۔

تو جب لشکر شاہی کی فوجوں نے راجہ پر زور دیا اور اس کو بھی جان کا خطرہ محسوس ہوا تو وہ بھی اس کے پیچھے بھاگ گیا تو لشکر شاہی نے اس کے پیچھے گھوڑے دوڑا کر اس کو راستے سے ہی پکڑ لیا۔ تو اس نے مقابلہ کرنا چاہا اور وہ خوب جان توڑ کر لشکر شاہی کا مقابلہ کرتا رہا۔ چونکہ میدان جنگ

ایک ناہموار زمین پر واقع تھا اس پر گھوڑے وغیرہ کام نہ دے سکتے تھے۔ جس کی وجہ سے لشکر شاہی اور راجہ کی فوجوں میں دست بدست لڑائی ہوتی رہی۔ دونوں فوجوں نے خوب بہادری اور دلاوری سے ایک دوسرے پر تلوار زنی کی۔

تو شام تک میدان جنگ میں خون کی ہولی کھیلتے رہے۔ مگر قضائے الٰہی سے راجہ کے گلے پر ایک چھوٹا سا تیر کا زخم آ گیا تو راجہ کی جان خلاصی ہوئی۔ مگر مظفر گڑھ میں گرتا پڑتا نکل کر کچھ میں جا پہنچا۔ وہاں کے راجہ نے اسے چھپا لیا اور یہ مشہور نام کر دیا کہ:

''وہ دریا میں ڈوب گیا ہے۔''

مگر جب خان اعظم کو اس اطلاع دی تو خان اعظم نے اپنے بیٹے عبداللہ کو فوج دے کر روانہ کیا۔ جام یہ خبر پا کر بہت گھبرایا اور بال بچوں کو ساتھ لے کر بھاگ نکلا کہ ایسا نہ ہو کہ تہمت یا بدگمانی میرے خانہ دولت کو برباد نہ کر دے۔ عبداللہ سے وہ راستے میں آ کر مل گیا اور اپنی بنیاد اخلاص کو مستحکم کیا۔

کچھو کے راجہ نے بھی وکیل بھیجے اور اس کے ساتھ کچھو کے راجہ نے بہت ہی عجز و انکسار کا بھی مظاہرہ کیا اور کچھو کے راجہ نے کہا کہ:

''بیٹے کو حاضر دربار اور خلف کی تلاش کا انتظام کرتا ہوں۔''

جب یہ ساری روئداد کی اطلاع خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کو جوناگڑھ میں ملی تو اس نے لکھا کہ:

''اگر صدق دل سے دولت خواہی بادشاہی اختیار کی ہے تو مظفر کو ہمارے حوالے کر دو۔''

کچھو کے راجہ نے بھی چوں تصاویر کر کے ہی اپنا وقت گزارنے کے طریقے کو اختیار کیا مگر خان اعظم نے کہا کہ:

''اب لمبی تقاریر اور لچھے دار فقرات سے کام نہیں بنتا بلکہ غنیم کو میرے حوالے کر دو ورنہ برباد کر دوں گا اور تمہارا ملک جام کے دامن میں ڈال دوں گا۔''

جب راجہ کے لیے تمام راستے بند ہو گئے تو راجہ نے کہا کہ:

''موربی کا ضلع میرے علاقے میں تھا وہ مجھے دے دو تو میں مظفر کی جگہ بتا دیتا ہوں۔ تم جا کر وہاں سے گرفتار کر لو۔''

خان اعظم نے راجہ اس شرط کو قبول کر لیا اور چند سوار اس کے ہمراہ..... مظفر کی گرفتاری کے لیے روانہ کر دیئے جام کے آدمی بھی ان کے ہمراہ گئے۔ مظفر وہاں بے خبر تھا تو اس سے کہا گیا کہ:

''آپ سے فلاں سردار ملنے آیا ہے۔''

تو مظفر بلا تکلف اس کی ملاقات کے لیے باہر آیا تو اس کو شاہی لشکر کے آدمیوں نے گرفتار کر لیا۔ اس کو گرفتار کر کے سب خوش ہو رہے تھے مگر اس کو وہاں سے لے کر نکلنے کا بھی ایک بڑا مسئلہ تھا جس کے لیے مناسب اندھیرے کا انتظار تھا۔ جب رات کا اندھیرا چھا گیا تو مظفر کو لے کر اندھیرے میں لے کر نکلے اور انھوں..... خان اعظم کے پاس جوناگڑھ میں پہنچ گئے۔ رات کو وہاں اہتمام کیا تو صبح کے وقت نماز کے بہانے سے مظفر اٹھا اور وضو اور طہارت کی غرض سے ایک درخت کے نیچے گیا اور کافی دیر تک واپس نہ آیا۔ تو ان کو بھی فکر لاحق ہوا تو لشکر شاہی کے فوجیوں نے آواز دی مگر آواز کے جواب میں کچھ نہ آیا تو لشکر شاہی کے آدمیوں کے وہاں جا کر خود دیکھا تو وہاں بکرے کی طرح ذبح ہوا پڑا تھا کیونکہ مظفر کو بھی

اپنے انجام کا احساس تھا کہ اب تو غنیم کے ہاتھ میں ہوں۔ وہ سخت سلوک کریں گے۔

مظفر حجامت کے لوازمات بھی اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ حجامت کے سامان میں ایک عمدہ قسم کا استرا بھی ہوتا تھا۔ جو کہ اس کے آج کام آ گیا تو لشکر شاہی کے آدمیوں کے مظفر کا سر کاٹ کر خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کو پیش کر دیا تو خان اعظم نے مظفر کے سر کو حضور کے دربار میں بھجوا دیا اور انھوں نے سکون کا سانس لیا کہ اب فساد کی جڑ کٹ گئی ہے۔ اب دوبارہ فساد برپا نہیں ہوگا۔ تو یہ خان اعظم کوکلتاش کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔

اکبر اعظم شہنشاہ ہند کی عملداری کی وسعت

اکبر اعظم شہنشاہ ہند کے دور سلطنت میں اس کی عملداری میں بہت وسعت واقع ہوئی تھی اور ان کی عملداری کی وسعت دریائے شور کے کنارے تک پھیل گئی تھی اور پندرہ بندراری کی حکومت میں شامل ہو چکی تھیں مگر حیرت کی بات یہ بھی کہ اکبر اعظم شہنشاہ ہند نے دین اکبری الہی کے نام سے تجویز کیا تھا جس کو ہند کے بعض علماء نے تسلیم کیا اور بعض اس کی مخالفت میں اپنی زبان درازی کرتے رہتے تھے۔ مگر اکبر شہنشاہ ہند بڑا ہی مصلحت پسند اور متحمل مزاج انسان تھا۔ اس نے جلد بازی اور تعصب سے کبھی بھی کام نہ لیا تھا۔ اس کی فراخ دلانہ حکمت عملیوں کی وجہ سے اس قدر وہ ہندوستان کے علاقے کو وسیع کر سکا تھا۔ وہ اپنے پیروکار سے بہت ہی محبت اور پیار کرتا تھا۔ ان کو یعنی اولاد کی طرح سمجھتا تھا اور ان کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتا تھا۔

تو ایک ایسا عالم کے چند اعتراضات جو کہ ملا عبد القادر بدایونی نے ذیل میں تلمبند کیے جاتے ہیں تا کہ اس وقت کی حماقت کی آزادی اور لوگوں کے اظہار خیالات کی آزادی کی جھلک نظر آئے۔ ایک عرضداشت جو کہ اس نے روانگی کے وقت لکھی تھی۔

"چند بدخواہان دین و دولت نے آپ کو راہ راست سے ہٹا کر بد عاقبتی کے رستے میں بدنام کر دیا ہے اور نہیں جانتے کہ:

i- کون سے بادشاہ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟
ii- کیا آیا کلام اللہ جیسا قرآن آپ کے لیے نازل ہوا ہے؟
iii- یا شق القمر جیسا معجزہ ظاہر ہوا ہے؟
iv- یا صفا جیسے اصحاب آپ کے ہیں؟"

آپ اپنے تئیں اس بدنامی سے متہم کرتے ہیں؟ بہ نسبت ان خیر خواہوں کے جو حقیقت آپ کے بدخواہ ہیں۔ عزیز کوکہ مدت رکھتا ہے۔ اور قصد بیت اللہ کرتا ہے کہ وہاں بیٹھ کر آپ کے راہ راست پر آنے کی دعا کرے گا۔ امید ہے کہ اس گنہگار کی دعا قاضی الحاجات کی درگاہ میں ضرور قبول ہو کر اثر بخشے گی۔ اور وہ آپ کو راہ راست پر لائے گا۔"

ان دنوں میں حسن تدبیر اور تلوار زنی کی برکت سے اکبر اعظم کی سلطنت دریائے شور کے کنارے تک جا پہنچی تھی۔

اول وہ بندر پور پہنچا۔ یہ مقام سمندر کے کنارے واقع تھا اس میں بڑا وسیع اور سنگین قلعہ تھا اور وہاں گھر بھی پتھروں کے ہی تعمیر ہو چکے تھے۔ تو وہاں سے بنگلور گیا اور وہاں کے لوگوں سے کہا کہ:

"بندر دیو کو دبائے جاتا ہوں۔"

اور امرا شاہی کو رخصت کر کے ان کی جاگیروں میں روانہ کر دیا تھا۔ حکام بندر سے اقرار نامہ حاصل کرتے تھے کہ آپ کی اجازت کے بغیر سوداگران ملک غیر کو لنگر گاہ دیو میں نہ آنے دیں گے۔ اس سے یہ مطلب واضح تھا کہ پرتگالی قوم برسا کو دبائے اور دھمکائے رکھے۔ اس کا...... میں پھیل رہا تھا کہ وہ دب گئے۔ عزیز مرزا نے کئی بار بادشاہی بنوائے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام "جہاز الٰہی" بھی تھا اور یہ بھی قرار ہو گیا جہاز الٰہی آدھا دیو بندر میں بھریں گے۔ باقی آدھے کو جہاں کپتان چاہے بھر لے اور جہاز جہاں چاہے جائے کوئی روک نہ سکے۔ جام اور بہارا دھر کے باالاقتدار حاکم تھے۔ انھیں اس دھوکہ میں رکھا گیا کہ ہم براہ سمندر بندر بندر سندھ پہنچیں گے اور وہاں سے ملتان کے راستے دربار حضور میں جا کر آداب بجا لائیں گے اور تمھیں رفاقت کرنی ہوگی۔ اسی عرصہ میں رواں دواں رہے اور پرتگالیوں کا عہد نامہ بھی حضور سے دستخط ہو کر آ گیا۔ اور سومنات کے گھاٹ پر پہنچ کر بخشی بادشاہ وغیرہ اشخاص کو قید کر لیا کہ مبادا فوج کو سمجھا کر متفق کر لیں اور مجھے روکیں۔

سومنت کے پاس بندر "بلاور" میں پہنچ کر جہاز الٰہی میں سوار ہوا۔ فورمہ، انور، عبدالرسول، عبداللطیف، مرتضیٰ قلی، عبدالقوی چھ بیٹوں اور چھ بیٹیوں کو اہل حرم کو نوکر، چاکر، لونڈی غلام کو اس جہاز الٰہی میں بٹھایا۔ اور ان کے ملازموں کی تعداد بھی سو سے زائد تھی۔ ان کو اپنے ہمراہ لیا اور زادراہ میں جو کچھ بھی ساتھ لے سکا وہ بھی لے لیا۔ کھانے پینے کے لیے کافی ذخیرہ حاصل کیا اور ہندوستان کو ہندوستانیوں کے حوالے کر کے عازم مکہ ہوا، تا کہ حج کی سعادت حاصل کر سکے۔

جس وقت وہ خیمہ سے نکل کر جہاز الٰہی کی طرف گیا تو ایک عالم تھا جس کے مشاہدے سے دیکھنے والوں کی آنکھوں میں آنسو اور دلوں میں دریائے شرق لہراتے تھے۔ تمام افواج اور لشکر آراستہ کھڑے تھے جب وہ لشکر کے سامنے آ کر کھڑا ہوا اور اس کو سلامی دی گئی وہ سپاہی جو کہ ہمیشہ اس کے دوش بدوش لڑائی میں ہوئے تھے اور انعامات سے مالا مال ہوئے تھے ان کی آنکھوں میں آنسو لبریز ہے تھے اور ان کے دل غمگین ہوتے جا رہے تھے۔ اس نے جن لوگوں کو قید کر رکھا تھا۔ ان کو بھی رہا کر دیا گیا اور ان سے معذرت خواہ ہوئے اور سب سے دعا کے خیر کی التجا کی اور اس وقت پر خلوص انداز سے لمبے لمبے ہاتھوں سے سلام کرتا ہوا جہاز میں سوار ہوا اور اس نے ناخدا سے کہا کہ:

"خانۂ خدا کے رخ پہ بادبانی کھول دو۔"

اکبر اعظم کے تاثرات

جب اکبر کو ان حالات کا علم ہوا تو اسے بہت ہی ناگوار گزرا اور اس کا بہت رنج ہوا۔ اس کے دل سے مختلف قسم کے خیالات فقرات کی صورت میں ظاہر ہونے لگے اور اکبر شہنشاہ نے کہا کہ:

"مرزا عزیز کو میں ایسا چاہتا ہوں کہ وہ اگر مجھ پر تلوار بھی کھینچ لے...... ضبط کرتا۔ وہ ذرا مجھے کر دیتا تب ہاتھ بلاتا۔"

"افسوس کہ اس کم فرصت نے محبت کی قدر نہ جانی۔ اور سفر کو بیٹھا۔ خدا کرے کامیاب منعقد ہو اور خیر و خوشی سے واپس آئے۔

میں یہود اور نصاریٰ اور غیروں سے بھی اپنائیت کے راستے میں ہوں اور وہ تو پروردگار عالم کے راستے پہ جاتا ہے۔ اس سے

کیوں کر مخالفت کا خیال ہو سکتا ہے۔ محمد عزیز سے ایسی محبت ہے کہ وہ مجھ سے تیز جا بھی چلے تو میں سیدھا ہی چلوں گا اس کی برائی نہ چاہوں گا۔ بڑا خیال یہ ہے کہ اگر رنج دوری میں ۔ ں کا کام تمام ہو گا تو اس کا انجام کیا ہو گا۔ کاش کہ اب بھی کیے پر پچھتائے اور پھر آئے۔"

اس غم و غیرہ کی حالت میں اکبر نے کہا کہ:

"چند روز ہوئے جی جی میرے پاس آئیں۔ ایک کٹورہ پانی کا میرے سر سے وار کر پیا اور کہا کہ:

الٰہی! بہ خویشتن بدر گرفتم۔"

میں نے حال پوچھا تو کہا کہ:

"آج رات کو میں نے ایک ایسا خواب دیکھا ہے۔"

مجھے بھی اس بات کا خیال تھا مگر معلوم ہوا کہ میرے قالب میں بیٹے کو دیکھا تھا اور جی جی تو مارے غم کے دیے کے قریب ہو گئی۔

بادشاہ نے بہت دل جوئی اور دلداری کی۔

اس کے بڑے بیٹے شمس (شمس الدین) نے بچپن سے حضور میں پرورش پائی تھی۔ اسے ہزاری منصب دیا۔ شادمان کو پانصدار کر دیا۔ آداو جاگیر میں دیں۔ ادھر جو ملک خالی پڑا ہوا تھا۔ اس کی حکومت مراد کے نام کر کے بندوبست کر دیا۔

خان اعظم کی مکہ روانگی

جب خان اعظم ہندوستان سے مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہوا تھا تو اس نے یہ دعویٰ کیے تھے کہ:

"ہم اکبر بادشاہ کے بھائی ہیں۔ اس کا جاہ و جلال نے پیغمبری بلکہ خدائی کے اقرار لیتا ہے اور میں ایسا دین دار اور حق پرست ہوں کہ اس کی درگاہ کو چھوڑ کر چلا آیا ہوں۔ مگر وحدہٗ لاشریک ذوالجلال والاکرام۔ کا دربار تھا۔ وہاں اسے کسی نے بھی نہ پوچھا۔ انھوں نے بغاوت ترک ہند پر ہلایا۔ وہ ہزاروں اور لاکھوں سے حاضر ہوئی۔ لیکن اس دروازے پر ایسے ایسے بہت بیٹھ برس جاتے تھے۔"

مکہ شریف اور وہاں کے خدام اور علمائے خاطر میں بھی نہ لائے۔ اس کی تیغ معافی اور وہاں بھی ان کے ہمراہ تھی اور وہاں بھی بیچوں کی سی ضدیں جاری تھیں۔ ان کی بدولت وہاں بھی کافی ٹھوکریں کھائیں۔ غرض اصل خدا کے گھر میں گزارہ نہ ہو سکا تو پھر نقل خدا کا گھر ہی پسند آیا۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں انھوں نے حجرے خرید لیے تھے اور ان میں رہنے کی کوئی تکلیف نہ تھی۔ اور ان حجروں میں حاجی اور زائرین آ کر قیام کریں۔ اور مدینہ منورہ میں ہر سال کے مطابق پچاس برس کا خرچ ادا کر دیا اور رخصت ہوئے۔ یہاں لوگوں کا یہ خیال تھا کہ آپ تشریف نہیں آئیں گے مگر اچھو تک آ گئے۔

مکہ معظمہ سے خان اعظم کی واپسی

۱۰۰۳ھ میں اچانک یہ خبر پھیل گئی کہ:

"خان اعظم مکہ معظمہ سے حج کی سعادت حاصل کر کے آگئے ہیں اور وہ گجرات پہنچ گئے ہیں اب حضور میں چلے آئے ہیں۔"

یہ سن کر اکبر بادشاہ پھولوں کی طرح کھل گئے تو بادشاہ سلامت نے اپنے رضاعی بھائی کے لیے ہیبت سے خلعت اور کڑے اور عمدہ گھوڑے روانہ کیے۔ محل کے اندر بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ مبارک بادیں ہوئیں۔ خان اعظم بھی اس قدر بے چین اور بے قرار تھے کہ وہ بھی اپنے بھائی اکبر بادشاہ کے بغیر ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتے تھے انھوں نے بھی گجرات سے عبداللہ کو ساتھ لیا اور سیدھے لاہور اکبر بادشاہ کے پاس پہنچ گئے۔ اگرچہ یہ بڑا لمبا اور تکلیف دہ سفر تھا مگر انھوں نے چوبیس دن کی مسافت طے کر کے لاہور میں آ کر اکبر بادشاہ کو سلام کیا۔ اس نے خواجہ کو کہہ دیا۔

"تم سارے قافلہ کو ساتھ لے کر منزل پہ منزل آ جاؤ۔"

تو جب لاہور پہنچے اور حضور کے دربار میں حاضر ہوئے تو حضور کے سامنے آ کر انھوں نے اپنا سر رکھ دیا۔ جس کو اکبر نے خود اٹھایا۔ مرزا عزیز کوکلتاش کہتے تھے کہ:

"آنکھوں سے آنسو بہتے تھے اور خوب بھینچ کر مرزا عزیز کوکلتاش کو اکبر بادشاہ نے گلے لگایا۔"

ان کی والدہ "جی جی" کو بھی دربار میں ہی بلا لیا گیا۔ اگرچہ وہ چلنے سے بھی معذور تھی۔ مگر اپنے جواں سال بیٹے کی جدائی میں جان بلب ہو رہی تھی اور وہ بہت ہی زیادہ پریشان تھیں۔

"جی جی جب دربار میں اپنے پیارے بیٹے کو ملی تو اس وقت کانپ رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں اس کے تھر تھرا رہے تھے بہرحال ماں کی ممتا سے نہ رہا گیا۔ اس نے آ کر زار و زار رونا شروع کر دیا۔ جی جی (والدہ) ایسے دوڑ کر اپنے پیارے بیٹے کے گلے لگی کہ دیکھنے والے بھی بڑے متاثر ہوئے اور انھوں نے والدہ کے ساتھ اونچی آواز سے رونا شروع کر دیا۔ بادشاہ کے تو پہلے ہی آنسو جاری تھے اور وہ حیران دیکھ رہے تھے۔

خان اعظم نے اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر اور عاجزی سے اکبر بادشاہ کے حق میں دعا قبول کرائی ہوگی تو بادشاہ نے اس موقع پر پانچ ہزاری منصب پھر عنایت فرمایا اور انھوں نے فرمایا کہ:

"گجرات، دوپنجاب اور بہار میں جہاں کہیں جا کر جاگیر لے لو۔"

تو خان اعظم مرزا عزیز کو بہار کا علاقہ پسند آیا تو اکبر بادشاہ نے ان کے بیٹوں کو بھی منصب اور جاگیریں عطا کیں۔

گویا کہ خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش مکہ معظمہ سے بخیر و عافیت اپنے وطن اپنے عزیز و اقارب میں حج کی سعادت حاصل کرنے کے بعد پہنچ گئے۔

خان اعظم کی اونچی پرواز

خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش مکہ معظمہ سے حج کی سعادت حاصل کرنے کے بعد وطن تشریف لائے تو ان کی حالت ہی بدل گئی تھی۔ وہ آتے ہی مریدوں میں شامل ہو گئے اور انھوں نے اکبر کے حضور میں سجدہ کیا جو کہ غلط بات تھی۔ داڑھی درگاہ میں چڑھا دی اور جو جو لوازم خوش اعتقادی کے تھے ان سب پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ اب وہ ہر..... اور مجلس میں آگے آگے ہوتے تھے ان کو حاجی پور، غازی پور میں جاگیر ملی تھی۔ دین

الٰہی کے اصولوں کی غلامی سے تعلیم حاصل کرنے لگے۔

اور ان پر اس قدر اللہ تعالیٰ نے احسانات فرمائے کہ وہ وکیل مطلق ہو کر سب سے بلند پروان پر پہنچ گئے۔ اور اس کے پاس چند روز بعد لیراذک (مہر انگشتری) اور پھر مہر توزوک (مہر درباری) ان کو دے دی گئی۔ اس مہر گول دائرہ کے درمیان میں جلال الدین اکبر بادشاہ کا نام روشن تھا۔ عصر مذکورہ فرامین عطائے منصب و جاگیر و مہمات ملک واری کے عظیم شان فرمانوں پر اعزاز و اعتبار بڑھاتی ہیں۔ تو خان اعظم مرزا عزیز کوکتاش بادشاہ اکبری قیمتی مہروں کے ذمہ دار واحد وکیل بن کر ابھرے تھے۔ اکبر بادشاہ کو ان پر بڑا ہی اعتماد اور یقین تھا کہ انھوں نے ان کے حوالے مہر بادشاہی کر دیں جو کہ بڑے اعزاز اکرام کی بات ہے۔

خان اعظم مرزا عزیز کی والدہ کی وفات

ماں کی شفقت اور پیار انمول ہوتا ہے۔ ماں کی قدر ہر ایک کے لیے خواہ کوئی بادشاہ ہو یا گداگر، سپہ سالار ہو یا سپاہی میدان جنگ، امیر ہو یا غریب چھوٹا ہو یا بڑا، عربی ہو یا عجمی، ہر ایک کے لیے بے کراں ہوتی ہے کیونکہ سبھی اس کی گود میں پل کر جوان ہوتے ہیں تو خان اعظم اور اکبر بادشاہ دونوں رضاعی بھائی تھے اور دونوں ہی خان اعظم کی والدہ محترمہ کو "جی جی" کہہ کر پکارتے تھے اور وہ بھی اپنے بچوں کی طرح دونوں کو حقیقی اور ان سے پیار و محبت کا مظاہرہ کرتی تھیں مگر خواہ مائیں ہوں یا باپ، چھوٹا ہو یا بڑا، بادشاہ ہو یا گداگر سب کو ایک مقررہ وقت پر اس دنیا فانی سے رخصت ہونا ہے یہ قدرت الٰہیہ کا اٹل فیصلہ ہے۔ اس کی زد سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کے پیارے پیغمبر، اولیائے کرام وغیرہ بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکے تو ان کے علاوہ باقی مخلوق کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ یعنی ہر ایک کے لیے موت لازمی امر ہے تو ۱۰۰۷ھ میں اکبر بادشاہ نے قلعہ اسیر کا محاصرہ کر رکھا تھا تو خان اعظم ان کے مقررہ تھے۔ انھوں نے اس محاصرے کے میدان میں اہم خدمت سے انجام دیں۔

۱۰۰۸ھ میں ان کی والدہ (جی جی) کا انتقال ہو گیا۔ ان کی وفات کا بادشاہ اکبر کو بھی بہت دکھ اور رنج ہوا مگر سب نے مل کر بڑا ہی افسوس کیا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ (آمین)

نحوست کا سیارہ

۱۰۱۶ھ خان اعظم مرزا عزیز کوکتاش کے لیے نحوست کا سیارہ ثابت ہوا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ:

اکبر بادشاہ بیمار ہو گیا۔ ان کا بہت علاج کر دایا گیا گو کوئی بھی تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی تو انھوں نے اور راجہ مان سنگھ نے مل کر اکبر بادشاہ سے ان کا ماضی الضمیر معلوم کرنے کی کوشش کی تو اکبر بادشاہ نے حکم دیا کہ:

"خسرو کی ولی عہدی کی رسمیں ادا کر دی جائیں۔"

وہ اصل میں جہانگیر سے عشق رکھتا تھا صرف محبت ہی نہیں رکھتا تھا۔

اس دور اندیش، معاملہ فہم، تجربہ کار بادشاہ نے سمجھا کہ اس وقت نئی بنیاد ڈال کر یہ عمارت اٹھانی برف کے ستونوں پر گنبد قائم کرنا ہے۔ وہ

ان کے ارادوں کو بھانپ گئے اور اکبر بادشاہ نے حکم دیا کہ:

"راجہ مان سنگھ بنگالہ میں جا کر اس وقت جاگیروں کو سنبھالے اور ان کا بندوبست کرے۔"

تو اس وقت جہانگیر کسی جگہ پر جا کر خاموش بیٹھ گیا تھا تو شیخ ابوالفضل ان کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئے۔ خان اعظم نے جب سنا کہ راجہ مان سنگھ یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔ اور وہ خسرو کو بھی اپنے ساتھ لیے جا رہے ہیں تو اس وقت انھوں نے اپنے قبائل کو راجہ کے گھر روانہ کر دیا اور کہلا بھیجا کہ:

"اب میرا بھی یہاں رہنا مناسب نہیں ہے میں کیا کروں گا۔ خزانوں اور اجناس خانوں کے بغیر چارہ نہیں اور باربرداری کا کوئی انتظام نہیں ہے۔"

راجہ نے کہا کہ:

"میرا بھی دل یہی چاہ رہا ہے کہ اس وقت میں تم سے جدا نہ ہوں مگر مجھ سے خود سامان نہیں سنبھل سکتا۔"

تو خان اعظم مرزا عزیز قلعہ میں رہ گئے تو آخر کار اکبر اعظم شہنشاہ ہند اس دار فانی سے دارالبقا کی طرف کوچ کر گئے اور سب کو اس فانی دنیا میں اکیلے ہی اپنے مالک حقیقی کے پاس چلے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب وہ لوگ جو اپنے بادشاہ کو بنا سجا کر دولہا بنا کر تخت کی زینت بنائے تھے۔ اب اس کو کندھا دے کر خاک کے سپرد کرنے والے تھے۔ اکبر بادشاہ کا انتقال خان اعظم مرزا عزیز کے لیے بڑا سانحہ تھا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ وہ ان کا رضاعی بھائی اور دوسرے وہ ان کا ہر لحاظ سے خیال رکھتا تھا۔ ان کی دلجوئی اور ہمدردی کرتا تھا۔

تو اکبر اعظم کے فوت ہو جانے سے سلطنت ہند میں بڑی تبدیلی واقع ہوئی۔

جہانگیر کی تخت نشینی

اکبر بادشاہ کے فوت ہونے کے بعد ان کے بیٹے جہانگیر کو تخت نشین کیا گیا تو ان کی تخت نشینی کے موقع پر تمام امراء وزراء اور سرداروں نے دربار میں حاضر ہو کر مبارک بادیں اور نذرانے پیش کیے۔ جہانگیر نے تخت نشین ہونے کے بعد خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کی عزت افزائی کی۔ انھوں نے اپنے باپ کی روایات کو قائم رکھا اور جہانگیر بادشاہ نے خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کو کہا کہ:

"جاگیر پر نہ جاؤ بلکہ میرے پاس ہی رہو۔"

جہانگیر اصل میں خان اعظم سے دل میں گھبراہٹ بھی محسوس کرتا تھا وہ اس سے مطمئن نہ تھا۔ اس کو اپنے پاس رکھنے کا یہ بھی ایک مقصد ہو گا کہ وہ مجھ سے دور جا کر بغاوت کرانے میں اہم کردار ادا کرے گا اور اگر میرے پاس رہے تو ایسی صورت پیدا نہیں ہوگی جب خسرو باغی ہو گیا تو اس کے دل میں اس خیال کو تقویت ملی اور اس نے سوچا کہ:

"خسرو میں بغاوت کرنے کی جرأت نہ تھی اس میں بڑا دخل خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کی رہنمائی کا ہوگا۔"

تو جب جہانگیر نے خسرو کی بغاوت کو فرو کر لیا اور ملک میں امن و امان ہوا تو یہ عتاب و خطاب میں آئے۔ اس میں کچھ شک نہیں تھا کہ:

"خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کو خسرو کی بادشاہت کا بڑا ارمان تھا۔"

وہ خسرو کی حکومت کی خوشی میں آپے سے باہر ہو رہا تھا اور وہ اپنے رازداروں کو کہہ رہا تھا کہ:

"کاش ایک کان میں کوئی کہے کہ خسرو بادشاہ ہو گیا ہے اور دوسرے کان میں حضرت عزرائیل موت کا پیغام دے دیں مجھے مرنے کا بالکل افسوس نہ ہو گا مگر ایک دفعہ خسرو کی بادشاہت کی خبر سن لوں۔"

اب خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کی یہ حالت تھی کہ:

جب وہ دربار شاہی میں جاتے تھے تو اپنے کپڑوں کے نیچے سے کفن پہن کر جاتے تھے۔ کیونکہ وہ اپنی گفتگو میں سخت بے باک انسان تھے ان کی زبان ان کے قابو سے باہر تھی۔ جو کچھ بھی ان کے منہ میں آتا تو وہ کہہ دیتے تھے خواہ وہ جائز ہوتا یا ناجائز۔ موقع محل کو بھی مدنظر نہ رکھتے تھے۔ جس کی وجہ سے شہنشاہ جہانگیر اور اکثر درباری بھی اس کے نالاں اور پریشان حال تھے۔ چنانچہ اسی جوش غضب کے دنوں میں جہانگیر شہنشاہ نے امراء خاص کو ٹھہرا لیا تھا تو ان کو خلوت میں لے گئے اور خان اعظم کا قدم جلسہ مشاورت میں ڈال دیا۔ جب ان کے مقدمہ پر امراء کی بحث ہوئی تو امیر الامرا نے کہا کہ:

"اس کو قتل کر دینے میں کونسی دیر لگتی ہے؟"

بادشاہ کی مرضی دیکھ کر مہابت خاں نے کہا کہ:

"میں تو سپاہی آدمی ہوں۔ مجھے تو کوئی صلاح و مشورہ نہیں آتا۔ میں تو فوری کارروائی کا دلدادہ ہوں۔ تحکم کی ضرورت ہوتی ہے۔"

خان جہاں (خان اعظم) کا خیر خواہ تھا یا کہ وہ نیک نیت تھے اس نے کہا کہ:

"حضور! میں تو اس کے مقدر کو دیکھتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ ایک جہاں شاہزادوں کی نظر گزرا۔ جہاں دیکھا مقدر کا نام روشن آیا اور وہیں خان اعظم کا نام بھی روشن موجود۔ قتل کرنا اس کا کچھ مشکل نہیں۔ ظاہر میں کوئی خطا نظر نہیں آتی۔ اگر اس کو حضور نے قتل کیا تو تمام عالم میں وہی مظلوم مشہور ہو گا۔"

جہانگیر شہنشاہ خود بھی بڑا متحمل مزاج اور سمجھدار شخص تھا اس لیے یہ سن کر ذرا سوچنا چاہا تو اتنے میں سلیمہ سلطان بیگم نے پردے کے پیچھے سے کہا کہ:

"حضور! اکل کی بیگمات اس کی سفارش کو آئی ہیں۔ حضور آئیں۔ حضور آئیں تو آئیں ورنہ سب باہر نکل پڑیں گی۔"

تو جہانگیر بادشاہ گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ اور خود ہی حرم میں تشریف لے گئے تو وہاں سب بیگمات نے مل کر اکبر بادشاہ کو سمجھایا کہ:

"خان اعظم کی خطا معاف ہو گئی۔"

اب یہ آگ و سلگتی سلگتی بجھ گئی۔ منافقین کے منہ میں مٹی آ گئی۔ منہ کالا ہوا۔

مگر جہانگیر نے خان اعظم مرزا کوکلتاش کے چند مزید خطوط بھی پائے۔ جس کی رو سے یہ ظاہر ہوا کہ مرزا عزیز کوکلتاش فطرتاً ہی دشمن ذہن رکھتا تھا۔ ورنہ اکبر جیسے بادشاہ جس نے اس کو زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا وہ اس کے دل میں اس قدر رنج اور گھٹیا خیالات رکھنا بعید از قیاس بات تھی۔ مگر اکبر بادشاہ کو اس کی والدہ کے دودھ کی لاج نہ ہوتی تو اس کو اپنے دور اقتدار میں یا تو پھانسی پر لٹکا دیتا یا قتل کر دیتا تھا۔ تو جہانگیر شہنشاہ نے بھی دور اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے اس کے اعمال بد سے درگزر کیا اور اس کی تقصیروں کو معاف کر دیا تاکہ مزید بات نہ بگڑے۔ کیونکہ بہت سی لحاظ داری..... راستے میں حائل ہوتی تھیں۔

جہانگیر بادشاہ بھی اکبر بادشاہ کی طرح بڑا ہی متحمل مزاج اور نیک فطرت انسان تھا۔ اس نے کسی سے انتقام لینے کی کوشش نہ کی تھی۔

خسرو کی رحلت

خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کا ستارہ گردش سے نکل کر ظاہر ہوا مگر دوبارہ وہ گرداب میں پھنس کر رہ گیا۔ وہ برہان پور میں آرام سے بیٹھا تھا اور امارت کی بہار میں لوٹ رہا تھا تو معلوم ہوا کہ:

"بادشاہ اودھے پور کی مہم پر جانا چاہتا ہے۔"

تو اس بوڑھے سپہ سالار کو بھی جوش جوانی میں آیا اور اس نے بھی عرض کیا کہ:

"اگر حضور اجازت دیں تو بندہ بھی اس مہم میں جانثار ہو۔"

اس پیشکش جانثاری سے جہانگیر بادشاہ بہت خوش ہوا اور کمک مدد توپ خانے، اسلحہ خزانے وغیرہ وغیرہ دے کر ان کو روانہ کیا اور اودھے پور کے کوہستان میں جا کر مہم کا آغاز ہوا اور جہانگیر شہنشاہ نے وہاں سے کوچ کر کے اجمیر شریف میں جا ڈیرے لگائے اور شاہزادہ خرم تمام ضروری سامان و حرب سامان دے کر روانہ کیا اور وہاں جا کر انھوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔

غرض بادشاہ کے دل پر یہ نقش ہو گیا کہ سارا فساد خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کا پیدا کردہ ہے۔ اس معاملے میں سب سے زیادہ پھٹا خوردہ ان کا خسر تھا اور وہ جرم بغاوت میں خود بھی معتوب تھا۔ چنانچہ شہزادہ نے صاف طور پر لکھ دیا کہ:

"خان اعظم اسی اعانت سے مہم کو برباد کرنا چاہتا ہے۔"

اس کا یہاں رہنا کسی حالت میں بھی مناسب نہیں ہے تو شہنشاہ جہانگیر نے مہابت خاں کو روانہ کر دیا وہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ:

"خان اعظم کو اپنے ساتھ لے کر آؤ اور وہ بھی ان کے ساتھ چلے گئے۔"

اور خان اعظم اور ان کے بیٹے عبداللہ کے ساتھ حاضر دربار کر دیئے۔ اور ان کو آصف خاں کے سپرد کر دیا گیا تاکہ وہ ان کو گوالیار کے قلعہ میں محبوس رکھے۔ اس کا آنا جانا بھی بند کر دیا گیا۔

مگر آصف خاں نے عرض کیا کہ:

''قید خانہ میں خان اعظم قُل پڑھتا ہے۔''

تو بادشاہ نے حکم دیا کہ:

''تمام خانہ داری کے لوازمات اور آسائش کا سامان وہیں بھیج دو اور دسترخوان پر تمام کھانے لگانے لگے۔''

خان اعظم کا کہنا ہے کہ:

''یہ مجھے ذہن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ خدا جانے ادھر کی ادھر یہ معاملہ کیوں کر ہو گیا۔''

کچھ عرصہ کے بعد خسرو رہا ہو گیا مگر خسرو (داماد) ابھی تک قید خانے میں مقید رہا۔ خان اعظم ان کے پاس گئے اور بڑی عجز و انکساری کے ساتھ التجا کی تو بادشاہ جہانگیر نے یہ حکم دیا کہ:

''خسرو بدستور دربار میں حاضر ہوا کرے۔''

۱۰۳۰ھ میں خسرو فوت ہو گیا۔ جہانگیر نے ایک مرتبہ اس کے باپ سے کہا تھا کہ:

''میں دیکھتا ہوں کہ خسرو ہمیشہ آزردہ اور مکدر رہتا ہے اس کا دل کسی طرح بھی شگفتہ نہیں ہوتا ہے۔ اسے تم اپنے ساتھ لیے جاؤ اور اس کو اپنی حفاظت میں رکھو۔''

تو خسرو بھائی کے ساتھ دکن میں تھا کہ اچانک اس کے پیٹ میں قولنج کا درد اٹھا اور فوری طور پر فوت ہو گیا۔ ۱۰۳۲ھ میں جلوس اٹھارہ میں داور بخش خسرو کے بیٹے کو صوبہ گجرات عنایت ہوا اور انہیں بھی ساتھ رخصت کر دیا گیا۔

خسرو کے فوت ہو جانے سے خان اعظم کی بیٹی بیوہ ہو گئی جس کا ان کا بڑا دکھ ہوا اور یہ دکھ ان کے لیے ایک گہرے زخم سے کم نہ تھا۔

خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کی رحلت

۱۰۳۳ھ میں جلوس انیس جب منعقد ہوا تو اس میں بد مزاجی اور خوش مزاجی نفاق و اتفاق کے جھگڑے تمام ہوئے۔ ساری باتیں زندگی کے ساتھ ہوتی ہیں تو جب وہ مر گئے تو ان کی ساری باتیں اور معاملات بھی ختم ہو گئے۔

''خان اعظم عزیز مرزا کوکلتاش نے دنیا سے انتقال کیا۔''

اور جنازہ کو دلی میں لایا گیا اور سلطان مشائخ کے ہمسایہ میں اتکہ خاں سوئے ہوئے تھے۔ ان کے پہلو میں بیٹے کو لا کر ماں زمین کے سپرد کر دیا گیا تھا۔

خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کی صحت، شجاعت اور سخاوت کی تعریف کرنا بھی ضروری ہے۔ جہانگیر نے اپنے تزوک میں لکھا ہے کہ خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کو اس کی ماں کے دودھ کی وجہ سے اکبر شہنشاہ نے اس کو اعلیٰ و عالی مقام عطا کیا تھا اور اس کی ہر بات کو اپنے بچوں کی طرح برداشت کرتے تھے۔ خان اعظم مرزا عبارت نویسی میں بڑا ملکہ رکھتے تھے مگر عربی زبان بالکل نہ جانتا تھا۔ لطیفہ گوئی میں بے مثل تھا شعر بھی اچھے کہتا تھا۔

خان اعظم مرزا عزیز کی علمی استعداد

خان اعظم مرزا عزیز کی علمی صلاحیتیں اور علمی استعداد عالمانہ تھی۔ لیکن دربارداری اور مصاحب میں بھی بے نظیر تھے۔ وہ فارسی کے فصیح البیان انشا پرداز تھے اور عمدہ مطلب نگار تھے۔ زبان عربی کو حاصل نہ کیا تھا۔ اس سے وہ ضرور محروم تھے۔

ان کا قول ہے کہ:

''جب کسی معاملے میں کوئی مجھ سے کہتا ہے کہ تو میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ہی ہوگا۔ اور اسی بنا پر کارروائی کی صورت سوچتا لگتا ہوں۔ مگر جب وہ کہتا ہے کہ نواب صاحب! آپ خلاصانہ سمجھیں میں سچ کہتا ہوں۔ تب مجھے شک گزرتا ہے جب وہ قسم کھاتا ہے تو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ جھوٹا ہے۔''

مصاحب اور علم مجلس میں بے نظیر تھے اور بڑے مزے کی باتیں سناتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ:

امیر کے لیے چار بیبیاں چاہیے۔

i- مصاحبت اور ہم قوموں کے لیے ایرانی۔

ii- خانہ سامان کے لیے خراسانی بیوی چاہیے۔

iii- بچے کے لیے ہندوستانی بیوی کی ضرورت ہوتی ہے۔

iv- چوتھی ترکانی تاکہ اسے ہر وقت مارتے دھاڑتے رہیں کہ دوسری بیبیاں ڈرتی ہیں۔

خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش جنت ونفاق اور بدکلامی میں سرآمد عہد تھے۔ اور تند غضب تھے۔ جب کوئی عامل ان کی سرکار میں معزول ہو کر آتا تھا تو مستوفی اس کو روپیہ طلب کرتا۔ اگر دے دیا تو دے دیا۔ ورنہ اتنا مارتا تھا کہ وہ جان سے ہاتھ ہو لیتا تھا مگر خوبی یہ تھی کہ مار کھا کر بھی نکلتا تو پھر کوئی مزاحمت میں نہ ہوتی تھی۔ لاکھ روپیہ ہی کیوں نہ ہو؟ پ ..... اس کا خصاص اپنے منشیوں پر لازمی برستا تھا۔ رائے رنگا درس ان کے خاص دیوان تھے تو ایک موقع پر اور منشیوں نے گنگا اشنان کی رخصت لی۔ تو نواب نے اس وقت خوشی کے موڈ میں تھے تو انھوں نے کہا کہ:

''دیوان جی! تم ہر برس اشنان کو نہیں جاتے ہو۔''

تو اس نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا کہ:

''میرا اشنان تو حضور کے قدموں میں ہو جاتا ہے۔''

وہ سمجھ گئے اور یہ قانون منسوخ کر دیا گیا۔

خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش نماز کے پابند تھے۔

مگر مذہب کا بہت متعصب تھا۔

ان کی طبیعت میں زمانہ سازی بالکل نہ تھی۔ نوجوانی کے زمانے میں روح موج ہوئی اور اس کی بدولت اعتمادالدولہ اور آصف خاں کے دربار میں بھی ایک عالم کی رجوع تھی۔ مگر یہی نہ گئے۔ بلکہ نورجہاں کے دروازے تک بھی قدم نہ اٹھایا۔ برخلاف خان خاناں کے وہ ضرورت کے وقت رائے گوردھن اعتمادالدولہ کے دیوان کے گھر پر بھی جا حاضر ہوئے تھے۔ خان اعظم مرزا کوکلتاش بڑے ہی سخت مزاج اور تیکھے مزاج کے انسان تھے۔ وہ ہر بات کو صاف صاف الفاظ میں کہنے سے گریز نہ کرتے تھے۔ خواہ اس میں دوسروں کو شاہی غصہ لگے یا وہ برا محسوس کریں۔ وہ سچی بات بادشاہ کو بھی کہنے سے گریز نہ کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے ان سے اچھے بھلے انسان ناراض ہو جاتے تھے اور وہ ان سے نقصان بھی اٹھاتا ہے مگر اس کی فطرت ہی ایسی تھی کہ اس کو وہ بدل نہ سکتا تھا۔

خان اعظم کے باعزت واحترام بیٹے

خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کے درج ذیل آٹھ بیٹے تھے۔ جن کو ہر ایک کو شہنشاہ اکبر اعظم نے جاگیریں دے رکھی تھیں۔ ان کو منصب کے اعتبار سے یہ اعزاز حاصل تھا۔

	نام	منصب
i-	شمس الدین	ہزاری منصب
ii-	خورم	ہشت صدی منصب
iii-	انور	شش صدی
iv-	شادمان	پانصدی منصب
v-	عبداللہ	چارصدی منصب
vi-	عبداللطیف	دوصدی منصب
vii-	مرتضیٰ قلی	صدوپنجاہی منصب
viii-	عبدالقوی	صدوپنجاہی منصب

اکبراعظم نے خان اعظم کی زندگی میں ان کے بیٹوں کو مناسب حد تک جاگیریں اور منصب شاہی دے رکھے تھے کیونکہ اکبر بادشاہ بڑا ہی نرم مزاج اور دوراندیش بادشاہ تھا وہ کسی کو ناراض کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ خواہ وہ ہندو یا مسلمان، اونچی ذات کا ہو یا نچلی ذات کا فرد ہر ایک کی خوشی کا خیال رکھتا تھا۔ تاکہ خود بھی خوش رہے۔ خان اعظم کے چند بیٹوں کو جہانگیر کے عرصہ میں بھی جاگیر اور منصب سے نوازا گیا تھا۔ جس کی تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے۔

i- شمس الدین

یہ خان اعظم مرزا عزیز کوکتاش کا سب سے بڑا بیٹا تھا اور جہانگیر قلی خطاب تھا اور تین ہزاری کے مرتبہ تک پہنچا تھا۔

ii- شادمان

خان اعظم کے یہ بیٹے شادمان خان ہوئے تھے۔

iii- شہزادہ خورم

اکبر اعظم کے عہد میں جو نا گڑھ پہ تھا۔ اور گجرات میں باپ کے ساتھ تھے جہانگیری عہد میں کامل خاں کا خطاب دیا گیا تھا۔

iv- مرزا عبداللہ

جہانگیر نے سردار خاں خطاب دیا جبکہ گوالیار کے قلعے میں قید ہوئے تو یہ بھی ان کے ساتھ گئے۔

v- مرزا انور

زین خاں کوکہ کی بیٹی اس سے منسوب تھیں۔ وہ تمام تین ہزاری اور دو ہزار کے درجے تک جا پہنچے تھے۔ خان اعظم بڑے ہی سخت مزاج اور ایک جاہل مسلمان سپاہی تھا۔

خان اعظم کی سیرت

خان اعظم مرزا عزیز کوکتاش اکبر بادشاہ کے رضاعی بھائی تھے۔ اکبر ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ اور اس کے ناز و نخرے بھی اٹھاتا تھا۔ اس کے حالات زندگی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ:

وہ ایک جاہل مزاج مسلمان تھا۔ وہ بڑا سپاہی اور ضدی امیر زادہ تھے اور اس میں بعض ایسی بھی حرکات اور باتیں تھیں کہ جن کی وجہ سے اسے احمق بھی کہا جاتا تھا۔ کم فہم انسان تھا جو کہ اس خاندان کے اوصاف میں شامل تھا۔ ان کے چچا میر محمد خاں اتکہ خاں اور خان کلاں کہلاتے تھے۔ اکبر نے کمال وہاں گکھڑ کے ساتھ یہ کہا کہ:

اس کے بھائی بندوں نے سرشوری کر کے نکال دیا ہے تم اب فوج لے جاؤ اور اس کا حق دلوادو۔ چند امیر خوب فوج اور بھی ساتھ تھے۔ بادشاہی سرداروں نے جا کر پہاڑوں کو ہلا ڈالا۔ آدم خاں گکھڑ خاں کا چچا قید ہوا اور دل شکر خاں اس کا بیٹا کشمیر کو بھاگ گیا مگر وہ پکڑا گیا۔ مگر دونوں اپنی موت سے مر گئے۔ امرائے شاہی نے کمال خاں گکھڑ کو سپرد خاک کر دیا اور آگرہ میں آ کر اکبر بادشاہ کو سلام کیا تو اس وقت خان کلاں سب سے پیش پیش تھے تو اکبر بادشاہ نے اس کی سلامی جیتنے کے لیے دربار شاہی ترتیب دیا۔ اور خان اعظم نے پوری بہادری کے ساتھ ایک قصیدہ بھی لکھا۔ اس دن امراء، وزراء، اور اکابرین سلطنت کو بھی حاضر ہونے کا حکم دیا گیا تھا تو خان اعظم مرزا عزیز کوکتاش نے کہا کہ:

"ایسے دربار کا میرا قصیدہ پڑھنا تو بڑی بات اور بڑی شان ہے۔"

بادشاہ کو اس گھرانے کی عزت و احترام کو بڑھانا اور فروغ دینا مقصود تھا۔ اکبر بادشاہ نے دربار میں اس لیے سجایا تھا کہ وہ دیکھیں خاں کلاں کیا کہتے ہیں اگر ان کو انعام واکرام نے کیسے نواز ا جاتا ہے۔

عبدالملک خاں ان کا (خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش) کا داماد تھا وہ آگے آ کر بولا کہ:

خانم	دیگر	آمدیم	نجوابید

کہ	نامردان	دیگر	ہم	در	رکاب	شما	بودند

اس پر زور کا قہقہہ لگایا گیا۔ خاں کلاں نے اپنی دستار زمین پہ دے ماری اور کہا کہ:

"بادشاہ ہوں، دادا دوست ایں مردک نا قابل کہ بر مشفقت مراضائع ساخت۔"

خان اعظم مرزا عزیز بڑا بہادر سپہ سالار اور فہم وفراست کا مالک درباری تھا۔ اس نے ساری زندگی شاہانہ انداز میں بسر کی۔

خان اعظم مرزا عزیز کو کامل خاں کا خطاب

۱۰۰۷ھ کے جلوس کے موقع پر خسرو کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ جو کہ خاں اعظم کا نواسہ رشتہ میں لگتا ہے کیونکہ خسرو خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کا داماد تھا۔ تو بادشاہ اکبر نے بہت خوشی کا اظہار کیا اور اس خوش نصیب بچے کا نام بلند اختر رکھ دیا۔ تو اس خوشی کے موقع پر خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کو گجرات کی جاگیر عطا ہوئی اور اس کے ساتھ یہ بھی حکم ہوا کہ:

"حضور دربار ہے۔"

جہانگیر قلی خاں اس کا بڑا بیٹا جا کر ملک کا کاروبار سنبھالے کیونکہ وہ بڑا جوان اور سمجھدار بیٹا تھا اور ملک کے انتظامات سنبھالنے کی پوری صلاحیتیں رکھتا تھا۔

۱۰۰۸ھ کے جلوس میں اسے داور بخش یعنی خسرو کے بیٹے کا اتالیق مقرر کیا گیا۔ اس سن میں جلیل القدر دکن پر بھیجے گئے اور مہم بگڑ گئی۔ معلوم ہوا کہ ان کی اس خرابی کی وجہ ان کا آپس کا نفاق اور بے اتفاقی تھی۔ جس میں خان خاناں مرزا عبدالرحیم کا ہاتھ واضح تھا۔ اس نے خان اعظم کو چند امرا اور وزرا کے ہاتھ فوج کمک دے کر بھیجا تھا اور اس کے علاوہ بہت سا سامان و زر و مال بھی ان کے ساتھ کیا گیا اور اس کے ساتھ پانچ لاکھ روپیہ امداد کے طور پر عنایت ہوا اور اس سن میں خورم پسر خان اعظم مرزا عزیز کو جونا گڑھ کی حکومت دے کر بھیجا گیا اور اس کامل خان کا خطاب ملا۔ ۱۰۲۰ھ میں خان اعظم کے بیٹے کو شادمان خاں کا خطاب دے کر ایک ہزاری..... صدی ذات پانسو سوار کے ساتھ علم (جھنڈا) مرحمت ہوا۔

اکبر اعظم کا رویہ اور سلوک خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کے بارے میں بڑا ہی نافرمانہ طرز اور جاہل رشتے قسم کا تھا۔ اکبر اس پر بڑا ہی مشفق اور مہربان تھا اور اسی طرح اس کی اولاد اور اس کے خاندانی افراد کے بارے میں بھی اکبر اعظم بڑا اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتا تھا۔ اکبر اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کو اپنا رضاعی بھائی سمجھ کر اس کے ساتھ ہمدردانہ سلوک روا رکھتا تھا۔ جس کی وجہ سے مرزا عزیز بڑا ہی ضدی اور بعض اوقات گستاخانہ

حرکات بھی کر جاتا تھا۔ جن کو اکبر بڑی فراخدلانہ انداز میں برداشت بھی کر لیتا تھا۔

اکبر اعظم شہنشاہ ہند ہونے کے باوجود وہ اس پر اس قدر مہربان اور نرم سلوک روا رکھتا تھا کہ جس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

خان اعظم مرزا عزیز بعض اوقات اپنے جذبات میں آ کر اکبر اعظم شہنشاہ ہند کے ساتھ بے ادبی کا بھی مظاہرہ کرتا تھا مگر اکبر اسے محض چھوٹا بھائی سمجھ کر اس کی باتوں کو برداشت کرتے ہوئے خاموش رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس عظیم سلطنت کے حکمران کو ایسا ہی عظیم قسم کا ایک حوصلہ اور صبر و تحمل بھی عطا کر رکھا تھا۔ مگر خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش ان تمام نوازشات کے باوجود اکبر اعظم کے بارے میں نفاق بھی رکھتا تھا اور اس پر شاکی بھی تھا۔ جس کا اظہار اکبر اعظم کے وفات کے بعد جہانگیر شہنشاہ کے دور اقتدار میں اس کے چند مراسلہ جات کو پکڑنے سے افشا ہوئے۔ مگر پھر بھی جہانگیر بادشاہ نے اسے معاف کر دیا اور اس سے کوئی انتقامی کاروائی نہ کی۔ اگرچہ خان اعظم مرزا عزیز کا رویہ بالکل ہی غلط اور نازیبا تھا مگر شہنشاہ ہند نے اس کے ساتھ نرم مزاجی کا ثبوت دیتے ہوئے اس کو معاف کر دیا اور اس کی جاگیریں اور مناصب جو اس کو شہنشاہ اکبر اعظم کے زمانے اس کو مل چکے تھے۔ وہ اس کو دے کر روانہ کر دیا گیا جو کہ ایک مثال ہے۔

☆ ☆ ☆

باب ۱۰

منعم خاں خانخاناں

۱۔ منعم خاں اپنی ذات سے خاندان امارت کا بانی کہلایا۔

۲۔ اکبر بادشاہ کی تاج پوشی کے وقت منعم بیگ کی عمر تقریباً پچاس برس سے زائد تھی۔

۳۔ منعم خاں بڑا سنجیدہ مزاج، دوراندیش احتیاط کا پابند انسان تھا اور حکم کا پابند تھا۔

۴۔ منعم خاں اکبر کا اتالیق مقرر ہوا۔

۵۔ جب ہمایوں کے بھائیوں نے ہمایوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا تو منعم خاں ہمایوں کے ساتھ تھا۔ اس نے پوری مدد کی۔

۶۔ منعم خاں اپنی سلامت روی کی چال کو نہ چھوڑتے تھے خواہ وہ کیسے ہی جوش وخروش کی حالت میں ہوں۔

۷۔ منعم خاں کا ایک لڑکا غنی خاں تھا جو کہ لائق باپ کا ناخلف نالائق بیٹا ثابت ہوا۔ وہ اس کو اپنے ساتھ نہ رکھ سکا تھا۔

۸۔ منعم خاں کو فرمارواے ترکستان نے علیحدہ تحائف بھجوائے۔

منعم خاں خانخاناں پر ایک طائرانہ نگاہ

پیدائش	:	ترکستان میں
نام	:	منعم بیگ
والد	:	بیرم بیگ
خاندان	:	ترک
خطاب	:	خاں خاناں۔ کوکل خاں
اولاد	:	ایک لڑکا جس کا نام غنی خاں
جاگیر	:	گجرات کا علاقہ
رفاہی کام	:	مساجد، عمارات رفاہی اور پلوں کی تعمیر

حالات زندگی

منعم خاں ترک قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ ترکستان میں پیدا ہوگا۔ مگر تاریخ اس کے بارے میں خاموش ہے۔ اس کا اصل نام منعم بیگ تھا اور اس کے باپ کا نام بیرم بیگ تھا تو ہمایوں کی خدمت میں منعم خاں ہو کر ان کا اور فضیل بیگ ان کے بھائی کا نام بھی سلسلہ تاریخ میں جاری ہوا۔

اس کے ابتدائی حالات میں دنیا میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک عمدہ نوکر تھا اور حکم اسے اس کا آقا دیتا تھا اس پر عمل کرتا تھا۔ وہ بڑا ہی اصول پرست اور فرمانبردار قسم کا ملازم تھا۔ منعم خاں شیر شاہی معرکوں میں ہمایوں کے ساتھ تھا اور تباہی کی حالت میں شریک حال رہا تھا اور اس نے مصیبت کا سفر جو سندھ سے جودھ پور تک کیا تھا اس میں اور اس کی واپسی میں وہ ان کے ہمراہ تھا۔

جب اکبر تخت نشین ہوا تو اس وقت منعم خاں کی عمر پچاس سال کے قریب تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں جو ترقی نہ کی تو اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ وہ بڑا ہی سنجیدہ مزاج، دور اندیش اور احتیاط کا پابند بندہ تھا اور وہ آگے بڑھنے میں ہمیشہ آقا کے حکم کا منتظر رہتا تھا۔ سلاطین سلف کے زمانے میں ملک گیری، شمشیر زنی اور ہمت کے عہد تھے ان میں وہی شخص ترقی کر سکتا تھا جو ہمت و حوصلے اور دلاوری کا مادہ رکھتا تھا۔

اور اس کی سخاوت رفیقوں کا مجمع اس کے گرد رکھتی ہو۔ ہر کام میں آگے قدم رکھے اور آگے بڑھ کر تلوار زنی میں اپنے کمالات کا مظاہرہ کرے۔ منعم خاں بھی ان اوصاف سے اچھی طرح مزین تھا مگر جو کچھ بھی وہ کرتا تھا وہ اپنی حیثیت کے مطابق کرتا تھا۔

اس کے حالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ:

''وہ عزت کو بہت عزیز رکھتا تھا۔''

اور یہ اس کے کردار کی خوبی تھی کہ:

''اس جگہ پر وہ قدم نہ ڈالتا تھا جہاں سے اس کو قدم کو واپس اٹھانا پڑے یا اس کو ندامت کا سامنا ہو اور تنازع کے مقام پر وہ نہیں ٹھہرتا تھا۔''

اس سلسلے میں اس کے اس واقعے کو یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب بدگویوں کی چغل خوری سے ہمایوں کابل سے یلغار کر کے قندھار پر گئے تو بیرم خاں نے خود چاہا کہ منعم خاں کو اس کی جگہ قندھار پر چھوڑ دے۔ لیکن جس طرح ہمایوں نے نہ اتفاق کیا اسی طرح منعم خاں نے بھی نہ مانا۔

مشکل کے وقت مردوں کا ساتھ دینا اصل میں مردوں کا کام ہوتا ہے تو جب ہمایوں سندھ میں شاہ حسن ارغون کے ساتھ جنگ کر رہا تھا اور افسر ادبار اور فوج بدنصیبی کے علاوہ کوئی ان کے ساتھ ساتھ نہ رہتا تھا تو اس وقت منعم خاں نے بھی ایک بدنامی کا داغ اپنی پیشانی پر لگا لیا۔ جبکہ لشکر کے

لوگ بھاگ کر جا رہے تھے تو ان کو اطلاع ملی کہ:

"منعم خاں کا بھائی اور منعم خاں خود بھی لشکر کے ساتھ بھاگنے پر تیار ہیں۔"

تو جب ہمایوں کو خبر ملی تو اس نے ان کو قید کر لیا تا کہ وہ اس سے بھاگ کر جدا نہ ہو جائیں۔ مگر اس کے باوجود منعم خاں بھی بھاگ گیا تو اس عرصہ میں بیرم خاں آن پہنچے تو وہ بادشاہ کو ایران لے گئے تو جب وہاں سے واپس لوٹے تو افغانستان میں یہ بھی آ کر مل گئے۔

زمانے کے چغل خوروں نے ہمایوں کو بھی ان سے بدظن کر دیا تھا تو ہمایوں نے چاہا کہ:

"قندھار بیرم خاں سے لے کر منعم خاں کے حوالے کر دیا جائے مگر منعم خاں نے خود ہی انکار کر دیا تھا۔"

اور منعم خاں نے کہا کہ:

"ہندوستان کی مہم سامنے ہے اور اس وقت حکام کا الٹ پلٹ کرنا مناسب نہیں ہے۔"

۹۶۱ھ میں ہمایوں افغانستان کا بندوبست کر رہا تھا تو بیرم خاں قندھار کا حاکم تھا اور اکبر کی عمر اس وقت دس سال کی تھی تو ہمایوں نے منعم خاں کو اکبر کا اتالیق مقرر کر دیا اسی سال ہمایوں ہندوستان پر فوج لے کر روانہ ہوا۔

اکبر کی تخت نشینی

جب اکبر ہندوستان میں ہمایوں کے بعد تخت نشین ہوا تو شاہ ابوالمعالی کا بھائی میر ہاشم ادھر تھا۔ کھمر وہ ضحاک۔ غوربند اس کی جاگیر میں شامل تھے تو شاہ نے بدبختی کے آثار دیکھے تو اس نے میر ہاشم کو بلا کر قید کر لیا۔ ادھر بادشاہ خوش ہوئے۔

جب ہمایوں ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو بدخشاں کا ملک مرزا سلیمان کو دے آیا تھا اور ابراہیم مرزا اس کے بیٹے سے بخشی بیگم اپنی بیٹی کی شادی کر دی تھی تو جب ہمایوں مر گیا تو مرزا سلیمان اور اس کی بیگم کی نیت بگڑی۔ ہمایوں کی فاتحہ خوانی کا بہانہ کر کے کابل آئی تو اس نے ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا تھا اس سے سب کچھ لوگوں سے غور سے سنا۔ اس نے دیکھا کہ کابل میں منعم خاں ہیں یا بیگمات ہیں۔ تو اس نے یہ سارے حالات معلوم کر لیے اور ادھر سے مرزا سلیمان بھی فوج لے کر نکلا اور مرزا ابراہیم اپنے بیٹے کو ساتھ لائے کہ اس سے ہمایوں کی بیٹی منسوب تھی۔

الغرض مرزا نے آ کر کابل کا محاصرہ کر لیا تو منعم خاں نے آمد آمد کی خبر سن کر اکبر کو مراسلہ لکھا اور خندق فصیل کی مرمت کر کے قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ احتیاطاً لڑائی میدان میں ذرتی چونکہ خشی حصہ کرتے تھے۔ مگر ان کا جواب بھی دیا جاتا تھا۔ اتفاق سے اکبر نے چند امیر فوج کے ساتھ بیگمات کو لینے کے لیے بھیج دیے وہ ابھی تک نہ پہنچے تھے کہ وہاں یہ خبر پھیل گئی کہ:

"ہندوستان سے مدد آ گئی ہے۔"

یہ سن کر مرزا سلیمان پریشان ہو گیا۔ اس نے قاضی نظام کو قاضی خاں بنایا تھا۔ اس کو بہت سے سلام و پیغام سمجھا کر منعم خاں کے پاس بھیجا تا کہ وہ صلح پر رضامند ہو جائے۔ منعم خاں کا تعلق بھی تیمور خاندان سے تھا اور قاضی نظام نے شریعت سے خونریزی کی قباحتوں سے بھی آگاہ کیا جیسا کہ قرآن پاک میں مذکور ہے کہ:

ترجمہ: ''جس نے ایک نفس کو ناحق قتل کیا کہ گویا اس نے ساری انسانیت کو قتل کیا، برابر ہے۔''

مگر منعم خاں بھی عمر رسیدہ اور خیال رسیدہ آدمی تھے انھوں نے بھی باتوں کے جواب باتوں سے دیے۔ جس سے قاضی نظام کی ہوش ٹھکانے آ گئی۔ اس پر عقیدت حاصل واضح کر دی۔ کہ سامان کافی ہے اسے میدان جنگ میں یا ہر تنگ کر لڑائی کرنا تھا مگر اس نے کہا کہ:

''ابھی تک ہمایوں کا کفن بھی میلا نہیں ہوا اور زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اس کی عنایات کا ہی احساس و خیال کرو۔ کفران نعمت برا عمل ہے اور محاصرہ اٹھا لو اہل عالم کیا کہیں گے۔''

قاضی ناامید ہو کر صلح کی طرف مائل ہوئے تو منعم خاں بھی مصلحتاً اس کی طرف راغب ہوئے۔ ایلچی روانہ کیے گئے تا کہ صلح کی شرائط طے ہوں تو صلح کی پہلی شرط یہ طے پائی کہ:

مرزا کے نام کا خطبہ دیا جائے (مرزا انضمام کا) ہماری سرحد بڑھائی جائے۔''

تو منعم خاں نے چند آدمی گمنام مسجد میں بلا کر اس کا خطبہ پڑھوا دیا تو مرزا سلیمان اسی دن محاصرہ اٹھا کر روانہ ہو گیا اور وہ نئے علاقے میں اپنا معتبر چھوڑ کر واپس چلے گئے مگر وہ ابھی بدخشاں نہ پہنچے تھے کہ:

''ان کا معتبر ایک ناک اور دو کان سلامت لے کر پہنچ گیا۔''

منعم خاں نے اپنی حکمت عملی سے کابل کو تباہی و بربادی سے بچا لیا۔ جب منعم خاں دور تک میدان صاف دیکھا تو دولت بابری میں خواجہ جلال الدین محمود ایک مصاحب دربار تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ تیز طبع، آتش دماغ تھے اور اس پر طرہ یہ تھا کہ ہم شاہ قلی ہیں۔ اس غروری نخوتوں اور تمسخری تیزیوں نے تمام اہل دربار کو پریشان کر رکھا تھا۔ خاص کر منعم خاں ان حالات سے جل کر کوئلہ ہو رہا تھا اور دربار کا بھی حال معلوم تھا کہ:

''منعم خاں ناراض ہے ہمایوں کے وقت میں منعم خاں کو اپنی صحبت اور طاقت کہاں تھی جو کہ خواجہ سے انتقام لیتے اب وہ کابل میں بااختیار حاکم ہو گئے تھے۔''

خواجہ غزنی کے حکمران تھے (خواجہ جلال الدین) تو منعم خاں نے ان کے ساتھ وعدے و پیمان کر کے ان کو غزنی میں بلایا اور اس کو گرفتار کر کے قید کر لیا اور اس کی بینائی معذور کر دی۔ مگر خواجہ جلال الدین بڑے صاحب کرامات تھے۔ تو چند دنوں کے بعد خواجہ جلال الدین اپنے بھائی کے پاس بھاگ گئے اور وہ قلات اور کوئٹہ سے ہوتے ہوئے دربار اکبری میں جا حاضر ہوئے مگر منعم خاں کو جب یہ خبر ملی تو اس نے اپنے آدمی دوڑائے اور اس کو دوبارہ گرفتار کر کے لے آئے اور اس کو قید میں ڈال دیا اور چند روز کے بعد اس کا کام تمام کر دیا تو اس کا خون ناحق کر دیا گیا جو کہ افسوس کا مقام تھا۔

میر اتکہ کا قتل

دربار میں بیرم خاں کے قتل کی باتیں اور مشورے جو شروع ہوئے تو مشاورت والوں نے اکبر کو مشورہ دیا کہ:

جو پرانے نمک خوار اور وفادار تھے ہیں انھیں اس مہم میں شامل کیا جائے۔''

چنانچہ منعم خاں کو کابل سے بلا لیا گیا تو اس نے وہاں غنی خاں کو جو منعم خاں کا بیٹا تھا۔ اس کو چھوڑ دیا اور وہ چلتے چلتے لدھیانے کے مقام

پر اکبر سے آملا۔ آداب سلام بجالایا تو اکبر اس وقت خاں خاناں کے تعاقب میں تھا اور اس وقت شمس الدین محمد خاں اتکہ اکبر بادشاہ کے آگے آگے تھا تو اس نے اکبر بادشاہ نے خان خاناں کے خطاب کے ساتھ وکالت کا منصب بھی حاصل کیا جو کہ سب سے بڑا منصب تھا۔ جب خاں خاناں کا فیصلہ ہو گیا تو منعم خاں خاناں تھے اکبر مہم سے فارغ ہو کر آگرہ میں آ پہنچے تو منعم خاں کو انعام دیا گیا مگر منعم خاں کو یہ بھی خیال تھا کہ اسے خاں خاناں کا عہدہ مجھے آج یا کل ملے گا مگر حالات نے رخ بدل لیا۔ اکبر کو شعور آنے لگا اور اس نے سلطنت کے امور میں اپنی دلی اور عقل سے حل کرنے شروع کر دیے اس وقت میر اتکہ وکیل مطلق تھے۔ ماہم اور ماہم والوں کو یہ بات ناپسند تھی۔ ادھم خاں جو کہ منعم خاں کے بیٹے تھے ان کے سینے میں حسد کی آگ جل رہی تھی تو منعم خاں نے اس آگ پر مزید تیل چھڑکا۔

جس سے وہ آگ مزید بھڑکی اور شہاب الدین نے اس آگ پر تیل ڈالا۔ جس سے اس میں مزید تیزی آ گئی تو اس نے دربار میں برسر عام میر اتکہ کو قتل کر دیا۔ لیکن جب وہ قصاص میں قتل کیا گیا تو اس کے حواریوں کو خطرے نظر آئے سب سے پہلے شہاب الدین کا رنگ فق ہو گیا اور منعم خاں بھی پریشان ہوئے اور گھبرائے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے مگر اکبر بادشاہ نے اشرف خاں میر منشی کو بھیج کر واپس بلا لیا مگر ان کا دل مطمئن نہ تھا اس لیے وہ چند دنوں کے بعد قاسم خاں میر بحر کے ساتھ آگرہ سے بھاگ نکلے۔ ان کے ہمراہ دو تین اور بھی آدمی تھے۔ اس نے یوسہ کے مقام پر کشتی کی سیر کو بہانہ بنایا اور وہاں جا کر مغرب کی نماز ادا کی اور کابل جانے کا ارادہ کر لیا اور سفر کی تکالیف برداشت کرتے ہوئے علاقہ میان دوآب میں پہنچ گئے جو کہ میر محمود منشی کی جاگیر کا علاقہ تھا۔ اس وقت جنگل میں قیام تھا۔ وہاں کا کاشتدار قاسم علی اسپ قلاب سیستانی گشت کر رہا تھا وہ ادھر آ نکلا مگر انہیں پہچانا نہ تھا مگر لباس اور شکل و صورت سے سردار نظر آتے تھے اور کہیں مصیبت سے روپوش ہو کر بھاگے جا رہے ہیں۔ تو اسے گرفتار کر کے اپنے علاقے میں لے گیا سید محمود بہارہ یہ وہ بڑے عالی ہمت اور سردار عالی شان دربار اکبری کے تھے۔ اور اس علاقے میں ان کی جاگیر تھی اور وہ بھی کہیں نزدیک ہی تھے۔ ان کو حالات سے واضح کیا گیا تو ان سے ان کی پہچان کے لیے کیا گیا۔ تو انھوں نے آ کر ان کو پہچانا۔ بڑے پیار و نیاز کی باتیں ہوئیں تو اس کو موقع کو غنیمت جان کر اپنے گھر لے آئے اور مہمان داری کے حق ادا کیے اور ان کو خود لے کر حضور اکبری میں حاضر ہوئے مگر اکبر کو لوگوں نے بہت کچھ سمجھایا بجھایا تھا۔ مگر اکبر نے کہا کہ:

"فقط وہم سے منعم خاں نے ایسا کیا ہے وہ نہ جائے گا اور اگر گیا بھی تو کہاں جائے گا؟"

کابل تو وہ راہی علاقہ ہے کوئی اس کے گھر کے گرد بھٹکنے نہ پائے۔

جب وہ آیا تو سب کے سب شرمندہ ہو گئے۔ بادشاہ سلامت نے اس کی بہت دلجوئی کی اور وکالت کا منصب اور خاں خاناں کا خطاب سے عطا فرمایا۔

منعم خاں کی دلاوری میں ناکامی

منعم خاں اب اکبر خاں کے دربار میں تھا اور اس کا بیٹا غنی خاں کابل میں تھا جو کہ وہاں باپ کی جگہ پر قائم مقام تھا۔ مگر چونکہ غنی خاں بجھ دار تھا۔ اس کو حکومت کے امور سمجھنے کی صلاحیت نہ تھی اور نہ اس کے پاس کوئی ٹھوس بنیادوں پر مبنی تجربہ ہی تھا۔ جس کی وجہ سے اس نے اپنی تن مانی اور غلط حکمت عملی سے لوگوں کو پریشان حال کر دیا تھا اور لوگ اس سے بہت ہی تنگ تھے۔ اسی لوگوں کی پریشانی کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ حکیم مرزا کی

ماں "اچوچک بیگم" بھی تنگ آ گئی تھی۔ فضیل خاں بیگ منعم خاں کا بھائی تھا۔ مگر اس کی آنکھیں کام نہ کرتی تھیں۔ مگر وہ فتنہ وفساد کی تاک میں پوری آنکھیں رکھتا تھا۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ اس کی صرف آنکھیں بینائی سے پوری تھیں۔ مگر اس کا دماغ تو بالکل صحیح و سالم کام کرتا ہے وہ ہر قسم کے مسائل کا حل دماغ سے نکال لیتا ہے اور فتنہ وفساد کے امور میں وہ خوب ابھر سکتا تھا۔

فضل خاں بیگ بھی اپنے بھتیجے غنی خاں کی غلط حکمت عملی اور حکومتی امور میں ناتجربہ کاری کے امور سے تنگ تھی۔ اس نے اور اہل خدمت نے "اچوچک بیگم" کو غنی خاں کے خلاف بھڑکایا تو ایک دن ابوالفتح اور اس کے بیٹے کے صلاح ومشورے سے یہاں تک تعزیت آ پہنچی کہ:

ایک دن غنی خاں فالیز کی سیر سے واپس آیا تھا تو لوگوں نے شہر کا دروازہ بند کر دیا اور اس کو اندر آنے نہ دیا اور آخر کار قید کے خطرے سے بھاگ کر کابل کا خیال چھوڑ کر ہندوستان کی طرف چل پڑا۔ وہاں فضیل خاں بیگ بیگم نے مرزا کا اتالیق مقرر کر دیا۔ وہ چونکہ آنکھوں سے کورا تھا تو وہ اتالیقی کا کام کیا کر سکتا تھا۔

تو اس نے بھی یوں بددیانتی کا مظاہرہ کرنا شروع کیا کہ اچھی اچھی جاگیریں جن میں زرخیز زمین اور آباد علاقے خود سنبھال لیے اپنے رشتے داروں اور دوستوں کو عنایت کیا اور خراب اور بری بری جاگیریں مرزا کو اور اس کے رشتہ داروں کو دیں۔ فضیل خاں بیگ عقل سے بھی کورا تھا۔ آنکھوں نے تو پہلے ہی اندھا تھا تو باپ خود غرضی، بداعمالی اور شراب خوری کے نشے چڑھاتا تھا اور لوگ اس سے پہلے ہی تنگ تھے۔ آخر کار ابوالفتح دختر زکی خاطر بزم وفا میں مارے گئے اور اس کا سر کاٹ کر نیزے پر چڑھا دیا گیا۔ فضیل خاں بھاگ نکلا مگر وہ گرفتار ہو گیا اور وہ آ کر بیٹے کے پاس آیا۔

اس وقت کابل کے صاحب اقتدار ولی خان بیگ تھے۔ ولی بیگ نام کے مطابق بالکل ہی ولی تھے اور انھوں نے بادشاہی کی ہوائیں اڑانا شروع کر دیا۔ تو وہاں کے شور شغف کو دیکھ کر حیران نے خیال کیا کہ:

"کہیں کابل ہی ہاتھ نہ نکل جائے۔"

منعم خاں ہمیشہ کابل کی آرزو کرتا رہتا تھا جس کی اس کے ذہن میں بہت سی وجوہات تھیں۔ اس نے اکبر بادشاہ نے حکیم مرزا کی اتالیقی اور حکومت کابل اس کے نام پر کرتے اسے ادھر روانہ کیا اور اس کے ساتھ بہت سے اہم امیر اور سردار کر دیے۔ منعم خاں تو بہت خوش تھے مگر وہ اس شوار شر اور کابلیوں کو خاطر میں نہ لاتے اور حضور کی..... قدر نہیں جانتی اور وہ حکم پاتے ہی روانہ ہو گئے۔ اور منزلیں مارتے ہوئے جلال آباد جا پہنچے۔ انھوں نے کمک اور دیگر سرداروں کا بھی انتظام نہ کیا۔

جب بیگم چوچک اور اس کے امرا کو ان کی آمد کی اطلاع ملی تو انھوں نے سوچا کہ:

منعم خاں کے بیٹے نے یہاں بہت ذلت اٹھائی ہے اور بھائی بھتیجے خواری میں مارے گئے ہیں۔ لہٰذا خدا جانے کہ کس طرح یہ ہم سے انتقام لے گا؟

تو اہل فساد نے مرزا حکیم کو بھی ساتھ ملا لیا اور سب مقابلے کے لیے تیار ہو گئے اور انھوں نے خیال کیا کہ:

"اگر ہم نے فتح حاصل کی تو بہتر ورنہ شکست کی صورت میں یہاں نہ رہیں گے اور پھر بادشاہ کے پاس چلے جائیں گے۔"

غرض بیگم نے ایک سردار کو فوج دے کر آگے بڑھایا تا کہ قلعہ جلال آباد کو مضبوط کریں تو جب منعم خاں کو اس خبر کی اطلاع ملی تو اس نے ایک تجربہ کار اور آزمودہ کار سردار کو فوج دے کر مقابلے کے لیے بھیجا۔ مگر وہ اس کمک کے پہنچنے سے پہلے قلعے کو استحکام کر چکے تھے۔

آخر کار انھوں نے جلال آباد کے میدان میں جا کر لڑائی شروع کر دی۔ مرزا حکیم اور بیگم بھی لڑائی میں آ کر شامل ہو گئے۔ منعم خاں بڑے جوشیلے تھے مگر انھوں نے سلامت روی کی حیثیت کو نہ چھوڑا تھا تو اس نے ایک سردار جبار بیڑی کو بھیجا کہ وہ مرزا حکیم سے جا کر بات کریں تا کہ دونوں میں لڑائی کی کیفیت پیدا نہ ہو اور آسانی سے دونوں میں صلح ہو جائے اور بات بن جائے تو بہتر ہے اور اگر باتوں سے کام نہ نکلے تو جنگ کو چند دنوں تک کے لیے ملتوی کر دیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلے اور معاملہ بگڑ جائے۔

منعم خاں اور حیدر محمد خاں دونوں کابل کے عاشق تھے۔ لہٰذا انھوں نے تیاری کر کے روانہ ہوئے اور چار باغ کے میدان میں خواجہ رستم کی منزل پر میدان جنگ ہوا۔ خان خاناں کے اپنے اصول مقرر تھے جب ان کو چھوڑ کر یا ان سے ہٹ کر کام کرتے تھے تو ان کو ضرور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا تو اس میدان جنگ میں اس قدر خونریزی ہوئی کہ دونوں افواج کا بہت ہی نقصان ہوا اور ان کا سردار جو ہراول بن کر آیا تھا وہ لڑائی میں مارا گیا اور انھوں نے شکست کھائی تو شاہی فوج کے بہت سے سپاہی کابلیوں کے ساتھ جا ملے تو اپنا سارا مال و متاع کابلیوں کے ہاتھ میں لٹا کر واپس لوٹے۔

منعم خاں بے ہوش حالت میں پشاور پہنچا آخر کار اکبر بادشاہ کو بھی اطلاع دی اور کہا کہ:

"بندہ منعم خاں نے نعمت حضوری کی قدر نہ جانی اور اس بدحالی کی سزا پائی ہے۔ اب شرم کے مارے منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوں۔ اگر اجازت ہو تو مکہ معظمہ چلے جاؤں تا کہ اپنے گناہوں کی معافی مانگوں اور جب حضور میں حاضر ہونے کے قابل ہوا تو حاضر ہوں گا اور اگر میری التجا قابل قبول نہیں تو پنجاب کے علاقے میں کچھ جاگیر مرحمت فرمائیں تا کہ اپنی حالت درست کر کے شرف قدم بوسی حاصل کر سکوں۔"

اب منعم خاں شرم اور ڈر کے خوف سے پشاور میں بھی قیام نہ کر سکا اور وہاں سے گکھڑوں کے علاقے میں آ گیا۔ تو وہاں سلطان آدم گکھڑ اس کے ساتھ بڑے اچھے طریقے سے پیش آیا۔ اور اس نے مہمان نوازی کی روایت کو قائم رکھا۔ اب منعم خاں کی حالت بہت بری تھی کہ:

اب کابل سے شکست خوردہ تھا اکبر کو شرم کے مارے منہ دکھانے کے قابل نہ تھا۔

اس کے پاس نہ فوج اور نہ دیگر وسائل تھے کہ جن کے سہارے دوبارہ کسی سے مقابلہ کرے۔

بہر حال اکبر بادشاہ بڑا ہی سمجھدار اور دور اندیش حکمران تھا۔ اس کا دل سلطنت کی وسعت کے مطابق بڑا تھا۔ اس نے منعم خاں کو تسلی اور دلاسے دے کر جواب دیا کہ:

"کچھ فکر نہ کرو تمہاری سابقہ جاگیر بحال ہے۔ اپنے ملازم اس علاقے میں بھیج دو۔ اور خود بھی چلے جاؤ۔ آپ پر عنایات اس قدر ہوں گی کہ تمہارے سارے نقصانات پورے ہو جائیں گے۔ یہ تو افسوس کا مقام نہیں ہے۔ میدان جنگ میں ایسی صورتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

انشاء اللہ! جو نقصان ہوئے ہیں وہ پورے ہو جائیں گے۔"

اس سے اکبر بادشاہ کے اس جواب سے منعم خاں کو کافی تسلی ہوئی تو وہ دربار میں جرأت کر کے حاضر ہوا اور جلد آگرہ کے قدیم دار ہو گئے۔

اکبر بادشاہ کی علی قلی خاں پر فوج کشی

۹۷۳ھ میں اکبر نے علی قلی خاں پر فوج کشی کی تو منعم خاں کو بھی ساتھ رکھا اور اس کو فوج دے کر آگے روانہ کیا تو اس نے وہاں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے جس سے بادشاہ بھی خوش ہوا۔ آخرکار منعم خاں اپنی نیک نیتی کی وجہ سے کامیاب ہوا اور مہم کا خاتمہ صلح وصفائی پر ہوا۔ تو دشمنوں نے منعم خاں کے بارے میں اکبر خاں کو بہت سے شبہات میں ڈالا مگر لوگوں کی باتوں کا اکبر بادشاہ پر کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے کوئی قدر نہ ٹھہایا۔

اکبر بادشاہ کی منعم خاں نے معاملات کا مطالعہ کرنے سے صورت حال کردار ی سامنے آتی ہے کہ وہ بہت ہی وسیع الخیال اور وسیع الذہن شخص تھا۔ اس نے سب کے ساتھ مل کر حکومت کرنے کی پالیسی پر عمل ہونے کو سیکھ لیا تھا جس سے وہ کامیابی سے گامزن تھا۔ وہ دوست و دشمن دونوں کو ساتھ لے کر چلنا پسند کرتا تھا اور اپنے درگزر کرنے کے اصول کو وسیع کرتا جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ ہندوستان میں طویل عرصے تک کامیابی سے حکومت کرتا رہا۔ جب تک ایسی حکومت اس کے بعد بھی کسی حکمران نے نہ کی۔

منعم خاں کا داؤد سلیمان کا خاتمہ کرنا

داؤد ملک سلیمان پر قابض ہوا اور تخت نشین ہوا تو اس کو باپ کا خیال تک نہ آیا۔ اس نے تاج شاہی کو سر پر سجایا اور بادشاہی کی ہوا میں لہرانے لگا۔ دنیا کو وہ بالکل ہی فراموش کر گیا۔ اس نے اپنے ملک میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوانا بھی شروع کر دیا اور سکہ بھی جاری کر دیا مگر ایسا ناخلف ثابت ہوا کہ اس نے اکبر بادشاہ کو اس معاملے میں ذرا برابر اطلاع نہ دی اور دربار اکبری کے آئین کو بالکل ہی فراموش اور نظر انداز کر گیا۔

ان دنوں میں اکبر گجرات کو فتح کرنے کے بعد سورت میں تھے تو آخرکار اس کو اس کے حالات کا علم ہوا اکبر بادشاہ نے منعم خاں کو حکم دیا کہ:

"داؤد کو درست کر دیا ملک بہار فوراً فتح کر لو"

تو منعم خاں لشکر جرار لے کر وہاں کے لیے حکم کی تعمیل میں روانہ ہوا۔ اس نے داؤد سلیمان کو ایسا دبایا کہ اس نے لودھی ان کے قدیم دوست کو درمیان میں ڈال کر دولا کھ نقد اور بہت سی اشیاء گراں بہا پیش کیں اور منعم خاں جنگ کے لیے گئے مگر صلح کے شادیانے بجاتے آ گئے اور داؤد خاں کا بھی محاسبہ ہو گیا اکبر بادشاہ بھی اس کے اس بہادری کے عمل سے بہت خوش ہوا۔

منعم خاں کی سیرت و کردار

منعم خاں کے حالات زندگی کے مطالعہ کرنے سے یہ بخوبی قاری کے ذہن میں آتا ہے کہ وہ رفاقت کا جوش بہت رکھتا تھا اور اس کا دل دوستوں کی دردمندی سے بہت جلد اثر پذیر ہو جاتا تھا۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیرم خاں کا حال لڑتے لڑتے ابھی تک اس کے خیالات خلوص عقیدت پر مائل ہو گئے اور اکبری ...... میں حاضر ہونے کے پیغام بھیجا تو اس وقت حریفوں نے بھی اپنا کام کر دکھایا وہ اس طرح کہ اکبر کے دل میں بھی اس کے بارے میں شک و شبہات پیدا کر دیئے اور اس کو اکبر بادشاہ کی طرف سے جلدی کوئی جواب موصول نہ ہوا تو اس کو بھی خطرہ لاحق ہوا تو ملا صاحب لکھتے ہیں کہ:

ابھی جنگ کی حالت تھی اور وکیلوں کی آمد و رفت جاری تھی کہ منعم خاں وہاں پہنچ اور خان خاناں کو لایا گیا۔ یہ اس کے دل اور نیت کی صفائی کا معاملہ تھا کہ ورنہ خان خاناں کا منصب اور خطاب بھی اس کو مل چکا تھا۔ اس کے دل میں رقابت کے خیال اور منصب چھن جانے کا خطرہ پڑ جاتا تو کوئی عجب بات نہ تھی۔

منعم خاں بڑا ہی صلح پسند، نرم خو کا انسان تھا۔ اس نے علی قلی خان کے معاملے میں بہت ہی نرمی کا ثبوت دیا۔ مگر ٹوڈرمل نے عرض لکھی کہ:

''بہادر خاں بھائی خاں زماں کا اپنی حرکت سے باز نہیں آتا۔''

تو بادشاہ نے عرض سن کر کہا کہ:

''منعم خاں کی خاطر سے ہم اس کی خطا معاف کر چکے ہیں۔ اس کو لکھ دو کہ تو جیں واپس لے آؤ۔''

خان زماں دوبارہ بگڑا اور منعم خاں سے ملتجی ہوا کہ اس نے دیکھا کہ اب میری عرض کی کوئی گنجائش نہیں رہی تو اسے بھی لکھا اور ذیل کے درباریوں کے وساطت سے دوبارہ عرضی لکھی کہ:

i- شیخ عبدالنبی صدر ii- میر مرتضےٰ شریفی

iii- ملا عبداللہ سلطان پوری

آپ دست بستہ آنکھیں بند، سر جھکائے کھڑا تھا۔

آخر کار گناہ معاف کر ہی دیا۔ وہ جانتا تھا کہ بعض لوگوں نے حسد کی وجہ سے ان دونوں بھائیوں کے درمیان نا اتفاقی کو پیدا کیا ہے۔ یہ اور وہ پرانے جاں نثار تھے اور سلطنت کے حقدار تھے۔ اس لیے بیچ میں بھی خان زماں کو اکثر دربار کی ایسی باتوں کی خبریں اور تدارک کی صلاحیں اور مشورے دیتا رہتا تھا۔ جس میں حریفوں کے حسد سے بچنے کی سعادت مندی کی راہ پر آ جائے کہ نمک حرام نہ کہلائے۔ چغل خوروں نے عرض کی کہ:

''منعم خاں اس سے ملا ہوا ہے وہ اپنی نیک نیتی سے ایک قدم آگے نہ بڑھا۔''

ہم نے یہ بھی مطالعہ کیا ہے کہ بیرم خاں کی مہم درپیش تھی جو منعم خاں کابل سے بلایا ہوا آیا اور لدھیانے کے مقام پر حاضر دربار ہوا۔ اس نے منعم خاں کو بھی پیش کیا جو کہ تردی خاں کا بھانجا تھا اور ایسے موقعے پر اس کو پیش کرتا کہ گویا اس کو ترقی کے مینار تک پہنچانا مقصود تھا تو ایک دن دربار خلوت میں منعم خاں کو ایسے الفاظ کہے کہ تو رہ ترکانہ اور دربار بادشاہ کے خلاف تھے۔ جس سے اکبر نے ناراضگی محسوس کی۔ منعم خاں ان دنوں میں بنگالہ میں تھا۔ شجاعت خاں کو اس کے پاس بھجوا دیا گیا اور اس کو بتا دیا گیا کہ تمھارے بارے میں ایسے الفاظ ادا کیے گئے ہیں اس سے تم خود ہی مطلب اخذ کر لو کہ اس کا کیا مطلب تھا مگر آفرین ہے منعم خاں کے حوصلے پر۔ وہ بڑے حوصلے اور عزت و توقیر سے پیش آیا اس کی دل جوئی اور خاطر مدارت کی اور لائق جاں جاگیر اپنے پاس تجویز کر دی۔ وہ بھی بلند نظر امیر زادہ تھا۔ اس نے نہ اس کے پاس رہنا پسند کیا اور نہ اس کی جاگیر کو ہی قبول کیا آخر کار خان خاناں نے اس کو بھی قبول کر لیا اور پھر اس نے اکبر اعظم کے دربار میں اس کی صفائی کے لیے عرضی لکھی اور اس کو عزت و احترام کے ساتھ ڈھیروں سامان دے کر رخصت کیا۔ وہ بڑا ہی ہمدرد اور مہربان قسم کا انسان تھا۔ بعض اوقات قسمت کا ستارہ بھی الٹ راستے اختیار کر لیتا ہے تو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

منعم خاں کو احکام نجوم اور شگون کا بھی بڑا خیال رہتا تھا۔ کابل میں جب ان کے بھائی بندوں نے اس کے خلاف فساد کھڑا کر دیا اور

یہاں سے گئے تو قلعہ اٹک پر معرکہ ہوا۔ اس دن انھوں نے لڑائی روکنے کی کوشش کی کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ:

"منحوس ستارے سامنے ہیں۔"

گوجر خاں کی لڑائی جس میں وہ زخمی ہوئے وہاں بھی جام میں یہی شربت تھا اور الفت کی بات تو یہ ہے کہ دونوں جگہ اس شربت کا گھونٹ نگلنا پڑا۔

جو کہ قسمت میں لکھا ہے جہان ہووے گا وہی
پھر عبث کا ہے کو طالع آزمائی کیجئے

اگرچہ ہمدردی اور رحم و کرم ان کے اصل ساتھی تھے مگر خواجہ جلال الدین کے ساتھ کابل میں جو ہاتک کیا۔ وہ نہایت بدنما داغ اس کے دامن نیک نامی پر رہا۔

منعم خاں کے رفاعی کارنامے

منعم خاں نے ہندوستان کے مشرقی اضلاع میں مساجد اور عالیشان عمارات کی تعمیر کروائی گویا کہ اس نے اپنی عالی ہمتی اور شخصیت کی نشانیوں کو مستقل کے لیے قائم کیا۔ جون پور میں بہت سی عمارات ہوائیں مگر ۹۷۵ھ کو دریائے گومتی پر پل باندھا اور اب تک وہ پل جوں کا توں موجود ہے اور لوگوں کے کام میں آ رہا ہے۔ یہ بڑے لطف کی بات ہے اور معماروں کی کاریگری اور منعم خاں کی ایمانداری کا ثبوت ہے کہ تقریباً پانچ سو برس کا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود اب تک اس پل کا ایک ذرہ برابر بھی خراش تک نہیں آئی اور اس کی اینٹوں میں ذرہ برابر جنبش نہیں آئی۔ اس کے زمانے کی طرز عمارت اور تراش کی خوبیاں منہ بولتی ہندوستان کی قدیمی تعمیروں کی شان و شکوہ بڑھاتی ہیں اور ہر وقت کے آنے والے غیر ملکی سیاحاں عالم سے داد و تحسین ملتی ہیں۔ یہی پل ہے جسے لوگ کہتے ہیں کہ:

ان کے غلام کا نام فہیم تھا اور پل مذکور بھی اس کے ذم کے اہتمام سے بنا تھا۔ پل کے مشرقی جانب ایک مشرقی طرز کا حمام بھی موجود ہے۔

منعم خاں اپنے خاندان کے بانی تھے۔ اور انھوں نے اپنی زندگی بڑی محنت اور جان جوکھوں میں ڈال کر گزاری اس نے تاریخ میں اپنا نام پیدا کیا۔ اکبری دور میں اس نے خان خاناں کا خطاب حاصل کیا۔ اکبر اعظم فرمانبرداری اور تعمیل ارشاد کی بدولت اس نے بہادری اور دلاوری کے کارنامے سر انجام دیے۔ لوگوں میں عزت کا مقام حاصل کیا جس کی وجہ سے اکبر اعظم شہنشاہ ہند نے خوش ہو کر اس کو وسیع جاگیروں سے نوازا اب تو اس نے اپنے خاندان اور آباؤ اجداد کا مختلف جنگوں میں نام روشن کیا۔ اکبر اعظم کی سلطنت کو وسعت بخشی۔

گویا وہ اپنے خاندان کے اس قدر ے ستارے اور خوش نصیبی کے بانی تھے مگر افسوس کا مقام ہے کہ یہ خوش نصیبی ان کی حد تک ہی محدود رہی۔ ان کے بعد اس کے خاندان میں قائم رہ سکی۔ جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کی اولاد میں صرف ایک ہی اکلوتا بیٹا تھا۔ جس کا نام غنی خاں تھا جو کہ اپنی نالائق حرکات کی وجہ سے اپنے آپ کو باپ کے نقش قدم پر نہ چلا سکا اور وہ باپ کی طرح میدان جنگ بہادری اور دلیری کے کارنامے سر انجام نہ

دے سکا۔ لوگوں میں باپ کی طرح عزت واحترام کا مقام حاصل نہ کر سکا اور اپنے آباؤ اجداد کے وقار کو قائم نہ رکھ سکا۔ گویا کہ اس نے اپنی زندگی کو روشن نہ کر سکا۔ غنی خاں کے حوالے باپ نے کابل کی حکومت کی تھی۔ اس کو اچھی طرح قائم نہ رکھ سکا اور اپنی غلط حکمت عملی کی وجہ سے لوگوں نے چیخنا شروع کر دیا۔ جس طرح کہ آج ہمارے ملک میں لوگ مہنگائی کے ہاتھوں واویلا کر رہے ہیں تو وہاں شاہی خاندان کے لوگ اس کی غلط حکمت عملی کی وجہ سے بیزار اور ناراں ہو گئے تو انھوں نے سب نے مل کر بغاوت کر دی تو وہ خود وہاں سے نکل کر بھاگ کھڑا ہوا۔ لوگوں نے اس پر قلعہ کے دروازے بند کر دیے جو کہ ایک حکمران کے لیے باعث شرم ہے تو وہ اپنی جان و عزت بچا کر بھاگ نکلا تھا۔ منعم خاں خود بھی اپنے بیٹے کی عقل و دانش اور سمجھداری سے اچھی طرح واقف تھا۔ جس کی وجہ سے اس نے کبھی بھی اس کی طرف داری نہ کی۔ اور اس کو کبھی بھی اپنے ساتھ نہ رکھا تھا۔ تو کابل کے فساد کے بعد وہ نا معلوم کن کن مقامات پہ مارا مارا پھرتا رہا۔ آخر کار وہ دکن کی طرف نکل گیا اور وہاں جا کر ابراہیم عادل شاہ کی حکومت میں ملازمت اختیار کر لی اور اس کے بعد اس کے حالات سے تاریخ خاموش ہے کہ اس کے بعد اس نے کہاں زندگی گزاری اور اس حالات میں اس کی زندگی گزری؟

بہر حال منعم خاں کا وہی اکلوتا بیٹا تھا جو کہ بہت ہی زیادہ نالائق اور ناخلف ثابت ہوا اور باپ کی طرح اپنی زندگی نہ گزار سکا اور نامعلوم کن حالات میں زندگی گزار کر وہ اس فانی سے رخصت ہوا۔ باپ کو اپنے بیٹے کی رفاقت کی تمنا رہی کیونکہ وہ بیٹے کے عادات و اطوار کو قائم نہ رکھ سکا اور اس کی طرح میدان جنگ کا سپاہی یا سپوت اپنے آپ کو ثابت نہ کر سکا۔ جس کی وجہ سے باپ نے بیٹے کی رفاقت کی تشنگی کو محسوس نہ کیا اور یہی وجہ ہے کہ اکثر مورخین نے اس امر پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ ضرور لکھا ہے کہ:

''منعم خاں اپنے خاندان کی عزت اور وقار کا بانی تھا اس نے اپنے خاندان کا نام عالم ہندوستان میں روشن کیا۔ شہنشاہ اکبر کے عہد میں اس نے میدان جنگ اور دربار میں ایک مقام حاصل کیا۔ لوگوں سے عزت و احترام پایا۔ مگر اس کے مرجانے کے بعد اس کے خاندان کا کوئی فرد ایسا نہ ہوا جو اس کے بعد اس کی عزت و وقار کو قائم رکھ سکتا۔''

اور آخر کار منعم خاں اپنے ساتھ ہی اپنے خاندان کی عزت و وقار کو دار البقا کی طرف لے گیا کہ آج تک اس کا خاندان اس کے مقام کو حاصل نہ کر سکا۔

منعم خاں اپنے آقا اکبر بادشاہ کا بہت ہی تابعدار اور فرمانبردار تھا۔ اس کی ہر بات پر من وعن عمل کرنے کا عادی تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ ۹۷۲ھ میں جب اکبر بادشاہ جونپور اور غازی پور دریا پر آیا تھا۔ تو وہاں جس مقام پہ پل ہے وہاں اکبر اعظم نے کھڑے ہو کر تعمیر کا حکم دیا تو منعم خاں خان خاناں نے اسی وقت معماروں کو بلا کر اس جگہ پل تعمیر کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ اگرچہ اس جگہ پر پل تعمیر کرنے پر معماران اور دیگر لوگوں نے عذر بھی پیش کیا مگر منعم خاں نے ماننے سے انکار کر دیا اور صرف اکبر اعظم شہنشاہ ہند کی تجویز کے مطابق پل تعمیر کرانے پر مصر رہا۔ آخر کار اس جگہ پہ پل تعمیر کروا دیا گیا جو کہ اس کی آقا کی قدردانی اور تابع فرمانی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کا نام بھی تاریخ میں روشن رہا مگر یہ نام صرف اس کی زندگی تک ہی محدود رہا۔

☆ ☆ ☆

کتابیات

1- تاریخ اسلام — حمید الدین
2- رود کوثر — شیخ محمد اکرم
3- آب کوثر — شیخ محمد اکرم
4- دربار اکبری — شمس العلما محمد حسین آزاد
5- سلطنت مغلیہ کا مرکزی نظام حکومت — ابن حسن
6- آئین اکبری — علامہ ابوالفضل

ماخذات

۱۔ موج کوثر — شیخ محمد اکرام
۲۔ تزک بابری — رشید احمد اختر ندوی
۳۔ ہمایوں نامہ — رشید احمد اختر ندوی
۴۔ شاہ جہان نامہ — علامہ صالح کمبوہ
۵۔ محلات حیدری — مولوی عبدالرحیم
۶۔ تاریخ ہندوستان — مولوی محمد ذکاءاللہ
۷۔ تاریخ لاہور — کنہیا لال
۸۔ تزک تیموری — ابو ہاشم ندوی

(ختم شد)